دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
دسمبر 2012
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول

چینی نکتہ چینی
11 — مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں نامۂ پیام، محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

بدقسمت
18 — کاشف زبیر
انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں زندگی کی لطافتوں اور سنگینیوں کو اجاگر کرتی ایک دل گداز داستان

دعوائے خون
69 — آصف ملک
ماں اور باپ کی محبت جو اپنی اولاد کے لیے الگ الگ امتحان سے گزر رہی تھی

الٹ پھیر
83 — بابر نعیم
جلد بازی کی نذر ہو جانے والی واردات کا پُرلطف ماجرا

دانا دشمن
87 — مختار آزاد
دوستی اور محبت کے محاذ پر تنہا رہ جانے والے وفا پرست کا المیہ خاص

للکار
98 — طاہر جاوید مغل
محبت کے محاذ پر بچھڑے ہوئے شخص کی جنگ... اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

جینے کی آرزو
141 — تنویر ریاض
باپ اور بیٹی کی جدائی کا قرض...... جس کا کفارہ ناگزیر تھا



جلد 42 • شمارہ 12 • دسمبر 2012 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •



مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول



نجات
151 — سلیم انور
اپنی محبت کو ثابت کرنے والے عاشق کے تیکھے کارنامے

آخری جیت
155 — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
کبھی نہ ہارنے والے کی آخری جیت کا دلچسپ و انوکھا ماجرا

گرداب
166 — اسما قادری
تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چالبازی کا مقدر کا کھیل ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

مفید مشغلہ
203 — میمونہ عزیز
مختلف انداز و اطوار سے مزین ایک منفرد کہانی کے اتار چڑھاؤ

دیوانہ
217 — جمال دستی
ایک دیوانے کی ڈرامائی آمد سے رگوں میں سنسنی دوڑا دینے والی دلچسپ کہانی

ٹیڑھی کھیر
231 — سرور اکرام
اس شکاری کی عیاریاں جو ایک ہی تیر سے کئی شکار کر رہا تھا

تخلیق
256 — مریم کے خان
بدلے کی آگ میں جلتے ایک شاہ پرست... کینہ فطرت کی ہنگامہ خیزیاں



پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من۔۔۔ السلام علیکم!

آخر کار یہ سال بھی تمام ہونے کو ہے۔۔۔ سیکڑوں پاکستانی اس سال بھی اپنے پیاروں اور جگر گوشوں سے محروم ہو گئے۔ کہیں قدرتی آفات و حوادث کی کارفرمائی تھی اور کہیں انسانی غفلت نے المناک سانحوں کو جنم دیا جن میں کراچی کی ایک گارمنٹ فیکٹری میں زندہ جل جانے والوں کی بڑی تعداد سرفہرست ہے۔۔۔ امریکی اور مقامی دہشت گردی کا نشانہ بننے والے معصوم شہریوں کی تعداد اس پر مستزاد ہے۔۔۔ اور پھر ضروریاتِ زندگی کے بحران، بنیادی ضرورت کی اشیا کی ہوش ربا گرانی سے بوکھلائے ہوئے ستم زدہ عوام جب شاہان دوراں کے روشنیاں چمکاتے اور ہوٹر بجاتے، لمبے لمبے کارواں ایمبولینسوں تک کو روک کر ویران سڑکوں سے گزرتے دیکھتے ہیں تو ان کو گمان ہوتا ہے کہ وہ اب بھی غلامی در غلامی کے دور میں جی رہے ہیں، جانے اس طوق سے آزادی کب نصیب ہوگی۔۔۔ شاید کہ نئے سال میں ہمیں وہ دن دیکھنے کو مل جائے جب ہمارے حکمراں زمینی حقیقتوں کا ادراک کرنے لگیں اور عوام میں عوام کی طرح گھل مل کر رہنے اور چلنے پھرنے کو اپنی زندگی کے لیے خطرہ نہ سمجھیں۔۔۔ یہ ادراک ہی انہیں اس قابل کر سکے گا کہ وہ عوامی مسائل کو سمجھ کر تیزی سے حل کریں۔۔۔ یہ تبدیلی اب ہمارے اور آپ کے ہاتھ میں ہے کیونکہ 2014ء کو انتخابات کا سال قرار دیا جا رہا ہے۔۔۔ یہ آپ کا اختیار ہوگا کہ آپ اپنا خون چوسنے والی جونکوں کو چن لیں یا پھر ذات، برادری، مسلک، زبان اور علاقے کی قید سے آزاد ہو کر ان لوگوں کو آگے لائیں جو سچے دل سے خدمت گزاری کا عہد کرتے ہوں اور ان کے دامن داغ دار نہ ہوں۔۔۔

تمام اہالیانِ وطن کو رہبرِ قوم قائداعظم محمد علی جناح کا یومِ پیدائش اور دنیا بھر کے عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت۔۔۔ یعنی کرسمس مبارک ہو۔۔۔ آیئے اب سی این جی کی 3 کلومیٹر لمبی قطار سے نکل کر چلتے ہیں اپنی محفل کی طرف جہاں انداز و الفاظ کی ایک سبک دنیا آپ کی منتظر ہے۔

ہاشم آباد کراچی سے ادریس احمد خان کی نپی تلی آرا ”نومبر کا جاسوسی ڈائجسٹ دو دن تاخیر سے ملا۔ سرورق کی حسینہ کوئی تصویر دیکھ رہی تھی۔ آگے بڑھے تو چینی نکتہ چینی سے آغاز کیا جہاں پہلے نمبر پر ثاقب تبسم نظر آئے، مبارک باد۔ دیگر دوستوں کی آرا سے محظوظ ہوئے۔ پھر سلسلے وار کہانی للکار سے شروع کیا۔ بھارت کی سرحد کے قریب تخریبی کارروائیاں کرنے والوں کی سرکوبی کے لیے عمران اور تابش کی کوشش جاری و ساری ہے۔ دوسرا سلسلہ گرداب ہے، اس میں بھی بھرپور دلچسپیاں ہیں۔ اس میں بھی امیار کی چالیں اور سازشیں عروج پر ہیں۔ تیسری تحریر ایچ اقبال جیسے کہنہ مشق لکھاری کی تحریر آخری منزل تھی۔ ان کی تعریف نہ کرنا گویا بدذوقی میں شمار ہوگا۔ بہترین جرم کے تانے بانے سلجھانا اور الجھانا ایچ اقبال کا ہی کام ہے، بے شمار مبارک باد اور تحسین۔ مریم نے جس طرح محبت کی لاج رکھ لی، اس طرح قانون کی بھی پاسداری کی، بہت خوب۔ قرض کو محبت پر اور محبت کو قرض سے مربوط کر کے دونوں کو سرخرو کر دیا۔ بابر نعیم کی سزا بھی منفرد تھی۔ قرض بھی اچھی لگی۔ قربانی کے بکرے نے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا سبب بنایا۔ بولتی کار بھی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت تھی جس میں محقق کار کی ظاہری حالت دیکھ کر جرم کی موجودگی کا اندازہ لگایا جو سو فیصد درست ثابت ہوا اور مجرم کو گرفتار کیا۔ مرگ شیریں میں لیوک اور جسٹن نے ہمت اور بہادری سے کام لے کر بچوں کی زندگیوں سے کھیلنے والوں کو گرفتار کرا دیا جو معاشرے میں موت بانٹ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو موت سے ہمکنار کر رہے تھے۔ آج ہمارے معاشرے میں بھی یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ بچوں کے اسکولوں کے سامنے کھڑے ریڑھی والے چھوٹے معصوم بچوں کو غیر معیاری اور مضرِ صحت اشیا فروخت کرتے ہوئے عام نظر آ رہے ہیں۔ ایسے شیطان صفت لوگوں سے اللہ بچائے۔ ہمیشہ کی طرح سرورق کی دونوں کہانیاں خوب صورت اور عبرت ناک تھیں۔“

محمد شکیل حسین کاظمی کا تبصرہ اسلام آباد سے ”میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے گھر میں جاسوسی کو دیکھ رہا ہوں۔ ہمارا جاسوسی سے تعلق تین نسلوں پر محیط ہے۔ میرے دادا جان سے یہ سلسلہ شروع ہو کر مجھ تک آن پہنچا ہے۔ (اور آگے۔۔۔) جاسوسی خریدنے سے پہلے ہی قدرت اللہ نیازی صاحب کا پیغام موصول ہو گیا کہ میرا تبصرہ رونقِ محفل ہے، لہٰذا میرا انتظار دو چند ہو گیا۔ اس لیے جاسوسی ملتے ہی سرورق دیکھنے کی فرصت نہیں ملی۔ سیدھا اپنے تبصرے پر جا کر نظر رکی اور تراش خراش کا معائنہ کیا۔ ثاقب تبسم صاحب کی واپسی بہت شاندار رہی جس نے آتے ہی میدان مار لیا۔ مبارک باد وصول کریں کیونکہ آپ کا حق بنتا ہے۔ فوجی صابر علی صاحب آپ کی محبت کا بہت شکریہ۔ آپ کی شمولیت ہمارے لیے دلی مسرت کا باعث ہے جبکہ سب سے زیادہ محبت آمیز تبصرہ محترمہ غزالہ صاحبہ کا لگا۔ سید عباس برادر! مجھے نمایاں رہنے کا شوق ہے چاہے کشش سے ہو جاؤں یا خاموش رہنے سے۔ فرحتی نے ملتان والی خالہ کی طرح کافی دل کی بھڑاس نکالی جو ویسے پر گوشت نہ ملنے پر چراغ پا ہو جاتی ہیں۔ محفل میں ایک شعر پڑھا جو کہ علامہ اقبال سے منسوب تھا مگر میری معلومات کے مطابق وہ صادق حسین شیرازی کا شعر ہے جو سیالکوٹ کے ایک گمنام شاعر تھے۔ ویسے بھی ہر عقاب اور شاہین والا شعر اقبال کا نہیں ہوتا۔ یہ میں نہیں تحمل عباس جعفری کی کتاب ”بے حقیقت کچھ“ میں لکھا ہے۔ اس کا مطلع یوں ہے:

تو سمجھتا ہے حوادث ہیں ستانے کے لیے
یہ ہوا کرتے ہیں ظاہر آزمانے کے لیے

محفل سے رخصت ہوئے تو للکار کی آغوش میں جا گرے۔ مغل صاحب! آپ نے واقعی کمال کر دیا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ تابش کی فائٹ آنکھوں کے سامنے چل رہی ہے اور ہم خود اس کہانی کے کردار ہیں۔ اتنا بھرپور ایکشن اور رومانس آپ کا ہی خاصہ ہے۔ دوسری طرف گرداب میں اسما قادری صاحبہ نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پوری کی پوری قسط بہترین اور سنسنی خیز رہی۔ آفتاب، کشور اور ماہ بانو جیسے ملے واقعی حیران کن تھا۔ سرورق کے رنگوں کی بات کریں تو

احمد اقبال صاحب کی دائرے میں سفر بہت سبق آموز کہانی تھی کہ لالچ بُری بلا ہے۔ کھردری جیت اچھی کہانی تھی مگر ایک چیز سمجھ میں نہیں آئی کہ رخسار کو لالچ تھا تو پہلے جب زین کنگال تھا تب کیوں ساتھ تھی اس کے پاس اچانک دولت دیکھ کر لالچ پیدا ہو گیا۔ (انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی... لالچ نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی) کاشف زبیر نے عید کی مناسبت سے قربانی کا بکرا پیش کیا جو بے حد پسند آیا۔ کافی دفعہ بے ساختہ قہقہہ لگانے پر مجبور ہونا پڑا۔ میرا خیال ہے اب کاشف زبیر صاحب کو شنو اور جلیل کی شادی کروا دینی چاہیے کیونکہ سیزن چل رہا ہے۔" (کس چیز کا؟ کہیں آپ بھی اس کی لپیٹ میں تو نہیں!)

کبیر والا سے اختر عباس تھراج، ظفر اقبال ظفری کی مشترکہ کاوش "اس دفعہ پیارا رسالہ حسب معمول 5 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل پر ایک نگاہ ڈالی۔ سرورق گزارے لائق تھا۔ اس دفعہ صدارت کی سیٹ ایک ماہ کی معینہ مدت کے لیے ثاقب نے سنبھالی۔ آنٹی اور نانی، دادی غزالہ کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ ویسے نانو آپ کی عمر کے اس حصے میں بھی جاسوسی کا دامن آپ کے ہاتھ میں ہے اگر آپ کپڑوں کی دکان کا مکمل ایڈریس بتاتیں تو میں ضرور آتا۔ بشیر حسن اور نیلم کم بیک۔ عدنان یوسف! ایک بات بتاتا چلوں، پی کام میں نے کیا ہے جبکہ میرے کزن ظفر اقبال نے ایم ایس سی (میتھ) کر رکھا ہے اور وہ ایک اسکول میں جاب کرتے ہیں۔ ویسے عدنان بھائی! اگر ماہ تاب تمہیں اینٹ مار بھی دے تو جھک کر ایک طرف ہو جانا اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دینا کیونکہ ان کی صنف نازک ہوتی ہے۔ ماہا ایمان آئیں اور دعا کر گئیں۔ قمرتی بھائی! جنت میں بھی صنف نازک کی جگہ ہوگی، گھبراؤ مت۔ ان کا مقابلہ کرنا سیکھو۔ ویسے ماہ تاب کی بونگیاں اچھی ہوتی ہیں کیوں روک رہے ہو؟ (بالکل آپ جیسی؟) پشاور سے عثمان اگر ہمایوں سعید کو بک اسٹال والے کا پتا مل گیا تو یہ موصوف جاسوسی کے بجائے خود لنگ جائیں گے۔ اسلام آباد سے سید شکیل کاظمی کا تبصرہ بڑا پیارا اور دلکش تھا، بالکل شاہ صاحب کی طرح۔ شاہ جی آپ کی بات ٹھیک ہے کیونکہ کچھ مہمان خصوصی آخر میں خطاب کرتے ہیں گویا اس ماہ آپ گیسٹ تھے۔ اسماعیل اجاگر! مجھے بہت افسوس ہوا کہ آپ سے کوئی دوستی نہیں کرتا تو آپ ہم سے فرینڈ شپ کر لو، ہمیشہ مخلص پاؤ گے۔ رہی بات ماہا کی تو ان کو تنگ کرنے میں مزہ آتا ہے۔ ہمارے اپنے علاقے سے سنسان دل یا پریشان دل پتا نہیں کیوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ کو جانتا ہوں۔ سب سے پہلے شہنشاہ مغل طاہر جاوید کی للکار پڑھی۔ آہ، مزہ آ گیا ہے۔ گرداب میرے خیال میں پھر اپنے معمول میں آ رہی ہے۔ ماہ بانو، آفتاب اور کشور سے مل گئی ہے۔ چودھری غصے سے لال پیلا نظر آ رہا ہے۔ اسما قادری سے درخواست ہے کہ اسٹوری میں محبت کو بھی شامل کریں اگر کہانی میں رومانس بڑھ جائے تو کہانی کا مزہ دوبالا ہو جائے گا۔ کاشف زبیر کی کہانی بہت زیادہ پسند آئی۔ جی الدین نواب نظر نہیں آ رہے۔ کبھی تو ان کی کہانی بھی شامل کر لیا کریں۔ ہر ماہ صرف انتظار ہی کرتے رہتے ہیں۔" (آپ کا انتظار جلد ختم ہونے والا ہے۔)

پنجاب سے ماہا ایمان کی قلابیں "جاسوسی اس بار سرد نومبر کی چھ تاریخ کو کچھ اس ادا سے ملا کہ رت ہی بدل گئی۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی بلاتامل دل سے واہ کی سرگم نکلی۔ دلکش اور خوب صورت رنگوں کے امتزاج نے سرورق کو جیسے ایک نئی زندگی بخش دی ہو۔ ٹائٹل اس بار قدرے ہٹ کر تھا۔ اس سرورق کا ہیئر اسٹائل غضب کا تھا جو میں عنقریب ٹرائی کروں گی۔ محفل میں آئے جہاں ثاقب تبسم نگینہ عرصے بعد دربان بنے بیٹھے نظر آئے۔ موصوف چونکہ صاحب کتاب ہیں سو الفاظ کے کھلاڑی تو ہیں۔ اچھا تبصرہ فرمانے کا پرانا تجربہ بھی ہے ان کے پاس۔ سو ویلڈن جناب۔ فوجی صابر علی بھی خاصے تجربہ کار معلوم ہوئے، جناب فوجی کہیں یا سپاہی بات تو ایک ہی ہے کہ پاک فوج زندہ باد۔ میرے ابو بھی ایک ریٹائرڈ آرمی آفیسر ہیں اور ہمیں ان پر فخر ہے۔ مزے کی بات یہ کہ جاسوسی، سسپنس پڑھنے کی لت مجھے انہی سے لگی ہے۔ ہم نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ کہانیوں پر تبادلۂ خیال بھی کرتے ہیں۔ محترمہ غزالہ آنٹی! آپ کی دعا سلام سر آنکھوں پر۔ بہت شکریہ آپ کی محبت کا، جوابا آپ کے لیے ڈھیروں پیار۔ عدنان یوسف! آپ تین چار بار کی کوششوں کے بعد افراتفری پھیلانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ عثمان غنی بیچ خاصی امن پسند طبیعت کے مالک ہو۔ گڈ، لگے رہو منے بھائی۔ نوید ساجد! میرے بھائی یہ زحمت نہ کرنا بھوتوں سے کافی ڈر لگتا ہے ہمیں۔ محمد اسماعیل اجاگر! آپ جانتے ہیں کہ بدقسمت ہے وہ جس کا کوئی دوست نہ ہو۔ غور کریں تو محفل میں سب دوست ہی ہیں۔ سنسان دل آپ کے لیے مفت مشورہ ہے کہ آپ ایزی Eno استعمال کریں، ہاضمے کی شکایت جلد دور ہو جائے گی اور آپ جلد ہی ایک اچھے سے نام کا انتخاب کر پائیں گے۔ کیسا؟ چنگ لگا نہ چکری اور رنگ بھی چوکھا۔ انکل سے بابا بننے والے انعام و تنظیم تفسیر عباس بابر! سرورق کی حسینہ کا خوب صورت نہ ہونا آپ کے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ آپ کو چاہیے ایسی دوشیزائیں دیکھنے سے پرہیز کریں جو ڈائریکٹ دل کے متاثرہ حصے پر حملہ کرتی ہیں۔ مظہر شہباز بٹ کافی عرصے بعد آئے۔ آپ کی سسٹر نہیں آئیں؟ سعید عباسی! آپ کی یادآوری کا شکریہ۔ ماہتاب ڈیئر! تبصرے پڑھتے ہوئے پین کلر پاس رکھا کرو تو اتنی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ قمرتی صاحب! دنیا میں ہی جل کڑھ کر جہنم کی کیا خوب پریکٹس کر رہے ہو۔ مستقبل میں کام آئے گی۔ محفل سے چھلانگ لگانے کے بعد ہمارا پیراشوٹ سید حاگرداب پر جا ٹکتا ہے۔ لیکن پھر ایزی جیمبر کی طرح فہرست کی طرف واپس مڑی کہ دیکھ لوں احمد اقبال یا کاشف زبیر کی کوئی سوغات موجود ہو، اسی سے آغاز کروں۔ سو قربانی کا بکرا سے آغاز کیا جہاں راجا اور شاہ کا بکرا کھو چکا تھا۔ جلیل کے کارنامے کاشف زبیر کے لفظوں کا پیراہن پہن کے سونے پہ سہاگا ہو جاتے ہیں۔ گرداب میں شہریار ایکشن میں نظر آیا۔ سلو کسی بڑی ہلچل کے بغیر ہی قابو میں آ گیا۔ کشور اور ماہ بانو کی دوستی کا آغاز ہو گیا۔ آفتاب اینڈ فیملی ایک بار پھر بچ نکلی، قسم سے رشک آتا ہے مغربی پولیس پر۔ للکار فل اسپیڈ پہ چل رہی ہے۔ راجا کا کام تمام ہو گیا۔ ڈائیلاگ ڈیلیوری اور پچو یشنز بہت مزے کی ہوتی ہیں۔ پہلی طویل تحریر آخری منزل ہمیشہ کی طرح نام بڑے اور درشن چھوٹے کے مصداق نکلی کیونکہ مجھے ایچ اقبال صاحب کی تحریریں کم ہی پسند آتی ہیں۔ پسند اپنی اپنی۔ قلم کاروں کے بادشاہ، منظر نگاری اور کردار نگاری کے راجا احمد اقبال کی دائرے میں سفر اپنے ہی خوابوں کے فشار میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جانے والی لڑکی کا دل گداز فسانۂ حیات بہت ہی اثر انگیز تھا۔ اسٹیج، پچویشنز، ڈائیلاگ ڈیلیوری اور موضوع پر گرفت سب کچھ ہی پرفیکٹ تھا۔ دولت کی زنجیر میں جکڑے ذہین لوگوں کی یکجائی کا انوکھا ملاپ دوسرے نمبر پر رہا۔ مختصر تحریروں میں فاتح اور بولتی کار نے ہماری بولتی بند کر دی۔" (مکتوبات کو ایڈٹ کرنا ازحد ضروری ہوتا ہے۔ اور اس دفعہ تو خطوط کی تعداد دیکھتے ہوئے ہم سوچ رہے ہیں کیا کاٹیں اور کیا چھاپیں۔ ہماری مجبوری کو محسوس کریں)

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی واپسی "مزاج بخیر۔ 5 تاریخ کو ماہ نومبر کا تازہ ترین شمارہ خریدا۔ ٹائٹل اس بار کچھ منفرد تھا۔ ٹائٹل



گرل کے جھٹکے نے متوجہ کیا۔ دوستوں کی محفل میں انٹری دی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ شہریار کی کارکردگی بہت متاثر کن تھی۔ ماہ بانو اور کشور کا ملاپ بے حد اچھا لگا۔ چودھری کی نیت کب بھرے گی۔ اس کا بدترین انجام ہونا چاہیے۔ اموات کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ للکار بہترین جا رہی ہے۔ آخری منزل اور دونوں رنگ بہترین تھے لیکن کاشف زبیر جلیل کے ساتھ چھا گئے۔"

ٹیکسلا سے دلنشین بلوچ کی افسردگی "نومبر کا کلرفل جاسوسی اپنی پوری آن بان شان کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ حسینہ اپنے جدید ہیئر اسٹائل، شدید آوچڑے اور باعثِ تنقید ڈریسنگ کے ساتھ آبدیدہ لگ رہی ہے۔ وحید عظمت! آپ کو چڑیل مبارکاں (بھئی یہ چڑیل سے میں نے خود ایجاد کیا ہے چڑیل) مشغلی + بھائی کا ملن + سالگرہ + بائیک لیا لیکن ان سب کے بعد آپ کی خود غرضی کھل کے سامنے آ گئی...... آپ کو جاسوسی اور سسپنس کی طرف لوٹنا مبارک ہو۔ ساتھ میں اتنے شاندار جھوٹوں پر بھی مبارک باد قبول فرمائیں، اتفاق ہوگا۔ محمد اسماعیل اجاگر صاحب! آپ کی ہر سطر کے ہر لفظ سے متفق ہوں۔ خاص کر یہ جملہ کہ جو ملا مطلب کے لیے ملا اور یہ کہ تلاشِ محسن میں گم ہوں پر محسن کو محسن نہ ملا۔ محترمہ غزالہ صاحبہ! آپ نے نامعلوم مقام سے خط لکھا لیکن یہ بات کہ آپ کے بیٹوں کی دکان سرائے عالمگیر میں ہے تو کہیں آپ ٹیکسلا میں ہی تو نہیں رہتیں؟ پلیز وضاحت کریں۔ ثاقب تبسم کرسی صدارت مبارک عرصہ دراز کے بعد آئے خیریت؟ اب کچھ کہانیوں کی طرف۔ للکار میرے دل کی پکار زبردست اسٹوری طاہر جاوید مغل صاحب مبارک باد قبول فرمائیں۔ گرداب میں اسما قادری صاحبہ مضبوط گرفت کیے ہوئے ہیں۔ کہانی ٹھہراؤ سے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی ہے۔"

حدیشہ کرن پشاور سے اظہار کرتی ہیں "جاسوسی سے میرا تعلق پانچ سال پرانا ہے مگر محفلِ یاراں میں پہلی بار حاضری دے رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ خوش آمدید کہا جائے گا۔ (خوش آمدید) سب سے پہلے سرورق پر نظر ڈالی۔ اس دفعہ سرورق بہت اچھا تھا۔ دوستوں کی محفل میں پہنچے جہاں پہلے نمبر پر ثاقب تبسم براجمان تھے۔ باقی ماہتاب، سعید عباس کے ساتھ ساتھ سب دوستوں کے تبصرے بھی بہت پسند آئے۔ تفسیر صاحب! جو مفت مشورہ آپ راج صاحب کو دے رہے ہیں اس پر آپ خود عمل کیوں نہیں کر لیتے ہاں؟ اور عدنان صاحب! سب پر جب اللہ رحم کر سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔ آمنہ پٹھانی، مرزا سسٹرز اینڈ دلنشین بلوچ! آپ سب کہاں غائب ہیں، جلدی سے محفل میں کم بیک کریں کیونکہ محفل میں لڑکیوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ للکار اس مرتبہ بہت زبردست رہی۔ تابش نے اس مرتبہ تو اکیلے ہی مار دھاڑ کا فریضہ سرانجام دیا۔ اس کے علاوہ گرداب میں بھی تھوڑی تیزی آئی ہے۔ باقی پورا جاسوسی ہی مجموعی طور پر زبردست رہا اور ہاں، یہ اس محفل میں ہمارا پہلا خط ہے۔ پلیز پلیز اسے ضرور شائع کر دیں۔"

رانا محمد فیصل جاوید فرام علی پور کی درخواست "جاسوسی سے میرا تعلق ویسا ہی ہے جیسا ہیر کا رانجھا کے ساتھ، لیلیٰ کا مجنوں کے ساتھ۔ اگر جاسوسی شیریں ہے تو ہم فرہاد۔ بات کرتے ہیں سلسلہ وار کہانیوں کی۔ اسما قادری جی یقین مانیے آپ کے قلم میں اتنی ہی طاقت ہے جتنی حق کے لیے لڑنے والے مجاہد کی للکار میں تلوار میں ہوتی ہے۔ انکل مغل! انسانی جذبات میں تلاطم برپا کر دیتے ہیں آپ۔ للکار پڑھتے ہوئے ہوش ہی نہیں رہتا۔ انکل جی گزارش ہے کہ میر انظار روی کی ٹوکری میں مت ڈالیے گا۔ میری دوسری کاوش ہے، پہلی ردی کی ٹوکری میں چلی گئی تھی۔"

علی فیض رسول وڈانچ نیو سینٹرل جیل بہاولپور سے لکھتے ہیں "عرصہ چار سال سے خاموش قاری ہوں جاسوسی کا لیکن خط آپ پہلی مرتبہ لکھ رہا ہوں۔ حسب معمول اس مرتبہ بھی جاسوسی 7 تاریخ کو ملا۔ سرورق بہت اچھا تھا۔ اس کے بعد محفلِ یاراں میں گئے تو ثاقب تبسم صاحب کرسی صدارت پر براجمان تھے، ثاقب صاحب مبارکاں۔ تفسیر عباس صاحب کا خط پڑھا، بہت مزہ آیا۔ ان کے بعد ماہا ایمان جی کی واپسی دیکھی پھر کہانیوں کی طرف آ گئے۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی، بہت اچھی لگی۔ شہریار کا میدان میں آنا اچھا لگا۔ اس کے بعد للکار پڑھی۔ تابش کو خوب موقع مل رہا ہے ثروت کے قریب آنے کا اور پھر کہانی میرے اپنے شہر فقیر والی میں لیکن بدقسمتی سے میں اس وقت فقیر والی کی جگہ بہاولپور میں سزائے موت کا منتظر ہوں۔ سرورق کی دوسری کہانی پڑھی۔ کھردری جیت، بہت اچھی کہانی تھی۔ زین کے ساتھ رخسار کی بے وفائی۔ آخری منزل پڑھی، بہت اچھی تھی۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔"

ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل آف نسووال کھوکھراں سے حاضر ہیں "6 نومبر کو صاحب سرکار نے شرف باریابی عطا فرمایا۔ محبوب کا چہرہ بیضوی نکھرے والی کرشمہ کپور اور سگار پیتے ہوئے دلیپ کمار سے سجا تھا۔ گن البتہ ایسے ماڈل کی تھی کہ اسلحے کے گڑھ میں رہتے ہوئے بھی آج تک نہیں دیکھی۔ اشتہاری حسیناؤں کو بڑے غور و فکر سے ملاحظہ فرمانے کے بعد "کریلوں" اور "کریلیوں" کے ڈھیر پہ ڈھیر ہوئے۔ لیکن یہ کیا؟ آپ نے مجھے قدموں میں (یعنی سب سے آخر پر) جگہ عطا فرمائی۔ وہ بھی 99 فیصد ایڈیٹ کی قینچی چلا کر...... رحم، ظلِ الٰہی رحم! یہ دنیا مجھے عقل مند سمجھنا کب شروع کرے گی؟ (کوشش جاری رکھیں، کبھی نہ کبھی وہ دن آ جائے گا) ثاقب تبسم نگینہ کے منہ میں گھی شکر! کس بات پر؟ ارے بھئی فرنٹ سیٹ سنبھالنے پر! صدارت مبارک ہو۔ فوجی صابر علی! کہیں آپ سیاست میں آنے کا تو نہیں سوچ رہے؟ مغل شہنشاہ کی للکار نے اس دفعہ نیا موڑ لیا۔ کہانی ثروت، تابش کے گرد سرحدی گاؤں فقیر والا کے چکر لگاتی رہی اور راجا لالچ کی بھینٹ چڑھ گیا۔ گرداب میں اس دفعہ سلو پھنسا اور ساتھ ہی افتخار شاہ بھی نیو یارک پولیس کی نظروں میں آ گیا۔ شہریار نے کراچی ٹیسٹ پاس کر لیا۔ بچارے مشارم کو شفقتِ مادر سے محروم ہونا پڑا۔ یوں محسوس ہوا جیسے تمام واقعات حقیقی ہوں۔ پہلے رنگ میں احمد اقبال نے خوب رنگ جمایا۔ بیوی، سیکریٹری، داشتہ اور طوائف کے فرق کو واضح کیا۔ امیر کبیر بوڑھے ایسے گل کھلاتے رہتے ہیں۔ دوسرا رنگ واقعی کھردری جیت تھی۔ مخصوص مذہبی نظریات والے انتہاپسند جنونی جدید ٹیکنالوجی کو اپنے مقاصد کے لیے اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ واہ امجد جاوید واہ، کراچی کے موجودہ حالات پر مبنی ایچ اقبال کی اسٹوری آخری منزل سبق آموز تھی جس میں بالآخر فرض کو محبت پر سبقت حاصل ہوئی۔"

رئیس احمد کی ہارون آباد سے آمد "آج پہلی بار جاسوسی بزم یاراں میں داخل ہو رہا ہوں۔ امید ہے آپ شکریہ کا موقع دیں گے۔ کرسی صدارت پر ثاقب تبسم نگینہ براجمان تھے۔ تبصرہ پڑھ کے محسوس ہوا کہ وہ واقعی کرسی صدارت کے حق دار تھے۔ چھوٹی کہانیوں کو پڑھنے کے بعد ہم پہنچے طاہر جاوید مغل کی

للکار پر۔ واہ کیا خوب صورت منظر نگاری کی ہے انکل نے، دل خوش کر دیا۔ گرداب میں کچھ نیا نہیں تھا، سوائے شہریار کے مشن کے حوالے سے۔ اس کے بعد آخری منزل پڑھی۔ عادل کے ماضی کے متعلق حقائق نے دل پر گہرا اثر کیا۔ اس کے بعد سرورق کے پہلے رنگ کی طرف بڑھے جہاں احمد اقبال صاحب اپنے سابقہ موڈ کے ساتھ موجود تھے، چند سے حقائق کو اپنے نرم انداز سے بیان کرتے نظر آئے۔ دوسرے رنگ میں کہانی بہت الجھی ہوئی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آئی۔''

**گاؤں پلی، ملاکنڈ ایجنسی سے بلال لودھی کی چہکار** ''ویرانیوں کے اس موسم اور ہاسٹل کی تنہائیوں کے ماحول میں جاسوسی کی خوش گوار آمد، اپنا اپنا سا لگا۔ وہی دوست اور وہی جان پہچان والے ناموں سے مزین کہانیوں کے سلسلے، وہ دن جیسے اپنے گھر میں گزارے۔ ٹائٹل سادہ سا تھا جس میں حسبِ معمول صنفِ نازک کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ بہت عرصے بعد ثاقب تبسم صاحب حاضر ہوئے اور پہلے نمبر پر آئے۔ بی کاز اولڈ از گولڈ۔ مبارک قبول کیجیے۔ کہانیوں کا اسٹارٹ ایچ اقبال صاحب کی آخری منزل سے کیا۔ کنول کا کردار زبردست تھا۔ اتنی ذہین لیڈی پولیس آفیسر اور وہ بھی اپنے ولیس میں، بہت اچھا لگا۔ پر مکافاتِ عمل تھا شاید جو عادل اپنے باپ اور بھائی کا بھی خون کر گیا۔ سزا زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ ہمیشہ کی طرح کاشف زبیر کی جنگل میاں اور راجا کی قربانی کا بکرا بہت زبردست لگی۔ اپنی فیورٹ للکار کو پڑھا۔ عمران کے بغیر قسط ایسی لگی جیسے چینی کے بغیر چائے۔ یوسف کو انڈیا ایکسپورٹ کیا جا رہا ہے اور تابی و ثروت کو اس کو بچانے کی خاطر اپنی جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ کہانی کا اختتام سنسنی خیز تھا۔ مغربی کہانیوں میں بولتی کار اس ماہ کی نمبر ون کہانی تھی۔ یہ کہانی جاسوسی کی شایانِ شان تھی۔ مونک کی ذہانت پر دنگ رہ گئے۔ مختصر کہانیاں خود کردہ اور فاتح اچھی لگیں۔ گرداب میں مہربان لارا کی وجہ سے آفتاب اور کشور کی جان بچ گئی۔ کشور کو دیارِ غیر میں شناسا ماہ بانو ملی۔ چودھری امریکا سے بھاگ آیا۔ شہریار کی بہادری نے سلو کا قصہ تمام کیا۔ احمد اقبال کی دائرے میں سفر اچھی کہانی تھی۔ آخر میں کھردری جیت سے لطف اندوز ہوئے جو کہ ایک تصوراتی کہانی تھی۔ جس میں زین خالی جیب سے ارب پتی بن گیا۔ آخر میں رخسار کے دھوکے نے چونکا دیا جبکہ زین نے سب کی دولت اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کی۔ بحیثیت مجموعی ہمیشہ کی طرح اس ماہ کا جاسوسی متاثر کن تھا۔''

**پشاور سے انجینئر عمیر شہزاد بنگش کی پریشانی** ''ہمیشہ کی طرح اس ماہ بھی ہماری بے کس عوام کی چیخ و پکار کام نہیں آئی اور حکومت کی طرح ایڈیٹر صاحب کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ بالآخر جاسوسی وہی 6 تاریخ کو ہی ہماری گرفت میں آیا۔ سرورق پر نظر پڑی تو ذاکر انکل اپنا تاثر قائم کرتے میں کامیاب نظر آئے اور جو لوگ ان کو بوڑھا سمجھنے اور کہنے لگے تھے، ان کا منہ یہ کہہ کر بند کر دیا کہ اب بھی میرے ہاتھوں میں جادو ہے۔ چینی نکتہ چینی کی محفل کے دروازے پر دستک دی۔ اس کے بعد ثاقب تبسم کو اپنے حریفوں پر برتری حاصل کیے ہوئے کرسیٔ صدارت کے انتخابات کو جیتتے ہوئے دیکھا۔ عدنان یوسف بھائی! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ ماہتاب گل! آپ نے انکل جی کے بارے میں جو بات کہی، بالکل سچ کہی۔ دل کو سکون ملا۔ چلو کوئی تو میرا ہم خیال نکلا۔ انور یوسف زئی بھائی آپ کی دور اندیشی کی داد دینی پڑے گی۔ واہ واہ کیا بات کہی قمر تی نے کہ جس جگہ صنفِ نازک نہ ہو وہ جگہ جنت ہے۔ سوچ کر ہی دماغ کو سکون ملتا ہے۔ (دماغ کو ہی سکون مل سکتا ہے..... دل کو نہیں) عثمان غنی صاحب! آپ کے شہر میں ہو کر بھی کبھی آپ نے مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کی۔ محمد اسماعیل اجاگر آپ خود ایک اچھا دوست بننے کی کوشش کرو۔ ایک نہ ایک دن آپ کے دوستوں کو آپ کی اچھائی کا احساس ضرور ہوگا۔ باقی تبصروں میں مرزا افتخار، شکیل حسین کاظمی، نوید ساجد اور سعید عباسی پسند آئے۔ کہانیوں میں آخری منزل پڑھی۔ کہانی شروع سے لے کر آخر تک زبردست تھی۔ لیکن اس میں ہماری پولیس کا جو کردار تھا وہ کچھ بھایا نہیں۔ اور یقین بالکل بھی نہیں آیا کہ ہمارے ملک کی سوئی ہوئی پولیس اس طرح کوئی کارنامہ سرانجام دے سکتی ہے۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے کیونکہ ایک تو رسالہ لیٹ اور اوپر سے مصروفیت کی وجہ سے آدمی پریشان ہوتا ہے کہ کہانیاں پڑھے یا خط لکھے، سو اس لیے اس دفعہ مختصر تبصرہ لکھ رہا ہوں۔'' (شکریہ!)

**قمر تی، کہوٹہ راولپنڈی سے لکھتے ہیں** ''ماہ نومبر کا شمارہ 6 تاریخ کو خریدا۔ جاسوسی کا ٹائٹل تیزی سے زوال کی جانب گامزن ہے، ذاکر انکل کی اب وہ پہلی والی بات نہیں رہی۔ محفل میں پہنچے۔ خطوط میں ثاقب تبسم نگینہ کی واپسی شاندار آغاز میں ہوئی۔ اچھا تبصرہ تھا لہٰذا مبارک باد ان کا حق بنتی ہے۔ محترمہ غزالہ ایک نامعلوم مقام سے آئیں اور ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ کر رخصت ہو گئیں۔ عدنان یوسف نے بھی اچھا اظہارِ رائے کیا۔ کراچی سے ادریس احمد خان! صرف ایک لفظ کہوں گا آپ کے لیے لاجواب۔ ماہا ایمان! میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے اور عقل و شعور بھی اب دے ہی دے، آمین۔ اور جہاں تک بات ہے ہمایوں سعید کی تو ہم پوری محفل میں اعلان کرتے ہیں کہ ہمایوں سعید اب ہمارے اچھے دوست بن چکے ہیں اور اگر اب کسی نے ان کی طرف غلط نظروں یا بُرے ارادوں سے دیکھا تو..... (ان کا حشر بھی ہمارا جیسا ہوگا) سید شکیل کاظمی! آپ ڈرتے بہت ہو اور جو ڈر گیا وہ.....؟ سنسان دل اور ماریہ ملک کو موسٹ ویلکم۔ ڈاکٹر مغل صاحب! میں نے آپ کو یاد ہی کیا تھا کہ آپ حاضر ہو گئے۔ کہانیوں میں اس دفعہ ایچ اقبال آخری منزل لائے اور چھا گئے۔ عادل نے ایک غلط راہ چنی اور اس کا خمیازہ اسے والد، بھائی اور مرینہ کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ سرورق کی پہلی کہانی میں فضا پر بہت ترس آیا سب کچھ حاصل کر کے بھی وہ تہی داماں رہی۔ دوسری کہانی کاروباری ہتھکنڈے پر مبنی تھی، رخسانہ نے زین کو چونا لگایا مگر زین اس دفعہ بھی جیت گیا۔ مختصر کہانیوں میں فاتح ٹاپ پر رہی۔ بولتی کار پڑھ کر تو لگا مونک سب کچھ جان سکتا ہے بغیر ٹیلی پیتھی کے بھی۔ مونک جیسے لوگوں کی ہمیں سخت ضرورت ہے۔ قصہ مختصر جاسوسی بہترین رہا ٹائٹل کو چھوڑ کر۔''

**پشاور سے عثمان غنی کی ناپسندیدگی** ''ماہ نومبر کا ٹائٹل نہایت ہی عجیب تھا۔ لڑکی نے جس آدمی کی تصویر پکڑ رکھی تھی، وہ آدمی، گویا مُردوں میں شمار ہو سکتا ہے۔ بس عجیب الخلقت ٹائٹل کو نظر انداز کر دیا۔ اشتہارات کو بھی پھلانگتے ہوئے اپنی محفل چینی کم مٹھاس زیادہ میں پہنچے۔ سب سے پہلے مسندِ خاص پر ثاقب تبسم کو براجمان پایا۔ موصوف کو بہت عرصے بعد ہمارا خیال آیا۔ خیر دیر آید، درست آید۔ فوجی صابر علی نے ثاقب تبسم کی وزیری قبول کی۔ بس صابر بھائی! آپ کی باتیں اڑتے تیروں کی طرح ادھر سے ادھر گزرتی رہیں باقی دوستوں کے سروں پر گزرتی رہیں۔ ماہتاب گل جی! آف کورس، ہمارا تعلق ریڈیو پاکستان سے ہے۔ بہت دنوں کے بعد ماہا ایمان کی واپسی ہوئی ہے مگر وہ بھی ایسے جیسے دور سے صرف ہاتھ ہلایا اور غائب۔ ماہا بس اللہ آپ کو آپ کے ہر امتحان میں کامیاب و کامران کرے۔ ویسے آتے ہی آپ نے جھڑکیاں سب کو دے دیں، مزہ آ گیا۔ اس ماہ کا جاسوسی 40 فیصد کامیاب رہا۔ آخری منزل، دہشت گردی کے موضوع پر لکھی ہمایوں اقبال کی کہانی اچھی رہی۔ بابر نعیم کی سزا بہترین رہی۔ قرض بھی اچھی تھی۔ قربانی کا بکرا کاشف ویسے تو میرا من پسند



مصنف ہے مگر اس بار کہانی مزہ کن نہیں تھی جو جنگل سیریز کا حصہ رہا ہے۔ رنگوں میں پہلا رنگ قدرے بہتر تھا۔ لطفانے جیسے سب کچھ پانے کے بعد کھو دیا تو دوسری طرف کھردری جیت میں زین نے سب کچھ کھونے کے بعد پھر سب کچھ پا لیا، امیزنگ۔ لیکن مجھے دونوں رنگ پسند نہیں آئے۔ فاتح میں دونوں بھائی ایک جیسے تھے۔ خود کردہ، جمال شاہ کی من کو بھا گئی۔ للکار اس بار ایکشن سے بھرپور تھی جبکہ گرداب انتہائی بور تھی۔ مرگِ شیریں نے بہت متاثر کیا کہ وہاں کی گورنمنٹ اپنے معصوم بچوں کے لیے کس حد تک جا سکتی ہے۔''

**پشاور سے بلقیس خان کی بیزاریاں** ''جاسوسی کا شرفِ دیدار 10 تاریخ کو ہو سکا۔ جاسوسی میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ جاسوسی میں، میں صرف للکار کا مطالعہ کرتی ہوں یا زیادہ سے زیادہ رنگوں میں کوئی رنگ پڑھ لیتی ہوں یا ابتدائی صفحوں کی کہانی میں الجھ جاتی ہوں۔ ٹائٹل اس ماہ کا بہت ہی زیادہ خوب صورت تھا۔ لڑکی نے جس شخص کی تصویر ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی، وہ یقیناً کسی قاتل کی لگ رہی تھی۔ لڑکی، پریانکا چوپڑا کی نقل لگی۔ نہ تو میں انگریزی کہانیاں پڑھتی ہوں اور نہ کبھی پڑھی ہیں۔ ویسے ایک بات بتائیے کہ یہ انگریزی اسٹوریز اردو ترجمہ ہوتی ہیں یا پھر یہ ہمارے رائٹر خود اپنے ذہن سے بناتے ہیں۔ (ترجمہ ہوتی ہیں) للکار کی یہ قسط بہت ہی سنسنی خیز رہی۔ اس کہانی کا مزہ ابھی تک برقرار ہے۔ کبھی بھی گرداب کو نہیں پڑھا۔ میں گرداب میں پھنسنا نہیں چاہتی۔ پہلا خط ہے جھوٹ تو نہیں لکھ سکتی جی، باقی یہ بھی سچ ہے کہ محفل کی نوک جھونک میں بھی کسی کو نہیں دیکھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ بس بھائی کا خط دیکھا تو سوچا میں بھی ایک خط لکھ ڈالوں۔ کیا آپ سب یقین کریں گے کہ پورے ڈائجسٹ میں صرف للکار پڑھی اور بس باقی کوئی کہانی نہیں پڑھی۔ للکار کی اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔''

**طاہرہ گلزار کی پشاور سے خفگی** ''چینی نکتہ چینی کے بے وفا دوستو..... انکل! میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔ آپ سے میری کٹی ہے کہ مسلسل آپ میرے خطوط کو بلیک لسٹ کر رہے ہیں۔ یہ خط بغیر کہانیوں پر تبصرے کے لکھ رہی ہوں۔ آج 12-11-7 کو شام 5 بجے جاسوسی میرا پیارا، سویٹ سا کیوٹ سا دوست ملا اور اسی وقت سے خط لکھنے بیٹھ گئی۔ انکل! آپ نے صحیح کہا کہ کسی قوم کی آزادی اور معاشی و معاشرتی ترقی کے لیے عدلیہ کا آزاد ہونا کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ ثاقب تبسم نگینہ صاحب! آپ کو کس حکیم نے مشورہ دیا ہے کہ آپ اتنی غور سے حسینہ پُر فتنہ و فساد و جنگ و جدل کو دیکھو۔ اگر حسینہ اتنی ہی مکار ہے تو پلیز آپ کیوں اس کو اتنی تفصیل سے دیکھتے ہو، نہ دیکھا کرو۔ عدنان یوسف! اف اللہ بنوں سے ایک اور مرغا۔ ہمایوں سعید راج کیا کم تھے کہ آپ بھی تشریف لائے، ہاہاہا۔ سعید عباس صاحب! کیوں انکل نے کیا ٹائٹل پر آپ کی تصویر لگائی تھی کہ خود کو دیکھ کر ڈر گئے۔ ماہا ایمان! میری دلی دعا ہے کہ اللہ آپ کو بہت اچھے نمبروں سے پاس کرے، آمین۔ ماہا جی! کوئی بھی کسی کا مخالف نہیں ہے بس تنقید کرنا اور چھیڑ چھاڑ کرنا ان دوستوں کی عادت ہے ورنہ اللہ نہ کرے کہ کہیں آپ کو ذرا سی بھی تکلیف ہو تو دوستوں کو نظر آئی تو سب سے زیادہ یہی مخالفین آپ کے لیے دعاؤں میں آگے ہوں گے۔ تنویر عباس بھائی! کیا بات ہے، آپ نے تبصرہ بڑے غصے کی حالت میں لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے گرمی لگنے لگی اور تپش محسوس ہوئی۔ بھائی! آپ نے سب کو یاد کیا لیکن اپنی اس بدنصیب باجی کو بھول گئے نا آپ۔ شاید آپ مجھ سے ناراض لگتے ہیں۔''

**مظفر آباد سے افتخار حسین اعوان کی آمد** ''نومبر کا جاسوسی حسبِ روٹین 5 تاریخ کو ملا۔ چینی نکتہ چینی کی محفل میں عرصہ دراز بعد حاضری دے رہا ہوں۔ تاخیر اور غیر حاضری کی وجہ ناگزیر وجوہات ہیں یا مسائل سمجھ لیں جن کی وجہ سے محفل میں حاضری دینا بھول چکا تھا۔ البتہ جاسوسی اور سسپنس پڑھنا نہیں بھولا۔ جاسوسی اور میرے ساتھ کو 12 سال اور 9 ماہ ہو چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں ابھی صرف چھ سالگرہ ہی منا سکا ہوں، کیونکہ میری زندگی میں پیدائش سے لے کر اب تک پیدائش کی تاریخ آئی ہی چھ بار ہے۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں، میرا مطلب یہ نہیں کہ میں ابھی چھ سال کا ہوا ہوں، 29 فروری میری پیدائش کا دن ہے۔ اب 29 فروری ہی ہر سال نہ آئے تو میں مناؤں کیسے؟ سرورق جاسوسی کے عین مطابق تھا البتہ سرورق کی حسینہ بلکہ حسینہ تھی ہی نہیں۔ ابتدا گرداب سے ہوئی شروع سے آخر تک پڑھتے ہوئے کان کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ سلو کا مسئلہ تو شہریار نے حل کر دیا البتہ ماہ بانو کی انٹری ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اگلی قسط میں ماہ بانو کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ للکار بھی اس مرتبہ اچھی تھی۔ تابی بے چارہ اس مرتبہ اکیلا ہی ایکشن میں ہے۔ عمران کا ساتھ ہوتا تو اچھا لگتا ہے۔ ایچ اقبال صاحب کی کاوش آخری منزل ایک سبق آموز تحریر تھی۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ بُرے کام کا بُرا نتیجہ ہی ہوتا ہے۔ عادل صاحب نے جو راہ چنی تھی، اس کا پھل یہی تھا۔ احمد صاحب پہلی دفعہ آئے اور آتے ہی چھا گئے۔ کھردری جیت نے دل جیت لیا۔ زین علی کا کردار سو سو تھا۔ وہ سچی محبت کرنے والا نوجوان تھا۔ یہ آج کل کی لڑکیاں..... رخسانہ پیسوں کی خاطر اسے چونا لگا گئی۔ دائرے میں سفر، احمد اقبال صاحب ہمیشہ کی طرح زبردست کاوش لے کر آئے۔''

**کراچی سے مسز ربیعہ شاہین کی تنقید** ''نومبر 2012ء کے جاسوسی میں احمد اقبال کی کہانی دائرے میں سفر پڑھی۔ احمد اقبال منجھے ہوئے بہترین لکھاری ہیں لیکن اس کہانی کو پڑھ کر محسوس ہوا جیسے انہوں نے بہت جلدی میں کہانی لکھی ہو۔ دلچسپی تو آخر تک برقرار رہتی ہے لیکن پلاٹ کمزور ہے۔ کہانی پر ان کی گرفت کمزور ہے جب سارا پلان عمر عادل کا بنایا ہوا تھا اور صرف دولت حاصل کرنے کے لیے تھا تو آخر اس بڈھے کو غلط وقت پر مارنے کی اسے کیا ضرورت تھی جبکہ ابھی وہ دولت قانونی طور پر منتقل بھی نہ کر سکا تھا جس کی وجہ سے نہ صرف وہ بلکہ کہانی کی ہیروئن بھی شاملِ تفتیش ہو جاتی ہے اور آخر کار عمر عادل کو موت کی سزا ہو جاتی ہے۔ اگر عمر عادل بڈھے کو دو ماہ بعد مارتا تو اس کی پلاننگ صحیح ثابت ہوتی۔ اس سے لگا کہ انہوں نے کہانی جلدی میں لکھی اور ہیروئن کو اس کے پرانے گھر میں واپس لانے کے لیے پلاٹ کو توڑ مروڑ ڈالا اور پھر ہیروئن کے مکالمے جو وہ پہلی ہی ملاقات میں بڈھے سے بولتی ہے۔ وہ بھی کچھ حقیقت سے دور لگے۔ اسما قادری اور طاہر جاوید مغل کی للکار اور گرداب رسالے کی جان ہیں۔ اسما قادری کی گرداب تو بالکل ہمارے ملک کے آج کے حالات پر صادق آتی ہے۔ عمار آزاد کی مرگِ شیریں پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کی پولیس کس طرح کام کرتی ہے اور ہماری پولیس؟ ہمارے ہاں تمام تر جرائم پولیس کی پشت پناہی میں ہوتے ہیں اور پولیس ہی کی وجہ سے اتنے پھیل گئے ہیں کہ ملک تباہ ہو گیا ہے۔ بہرحال رسالہ اچھا ہے امید ہے احمد اقبال پھر اپنے پرانے رنگ میں واپس آ جائیں گے۔''

میانوالی سے حنا گل کا تبصرہ ”میں پچھلے پانچ سال سے جاسوسی کی خاموش قاری ہوں، بارہا سوچا کہ محفل میں خط لکھا جائے لیکن ایک طالب کی حیثیت سے اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ اس دفعہ سوچا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، مجھے خط لکھنا ہے۔ نومبر کا شمارہ چھ تاریخ کو ملا۔ سرورق کو نظرانداز کرتے ہوئے سیدھے اپنی محفل میں داخل ہوئے۔ محفل کی صدارت ثاقب تبسم نگینہ کے ہاتھ میں تھی مبارک باد۔ ماہا جی کا خط پڑھ کر ایسا لگا جیسے ان کا خط نہ ہو کیونکہ انداز تحریر ان کے انداز سے کچھ ہٹ کر لگا۔ باقی خطوط میں تفسیر بھائی کا خط اچھا لگا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ کہانی میں بہت سے واقعات یکے بعد دیگرے رونما ہوئے۔ اب شہریار کا اصل مشن سامنے آئے گا۔ للکار بھی اس دفعہ اچھی رہی۔ ابتدائی صفحات میں ایچ اقبال آخری منزل کے ساتھ موجود تھے۔ اچھی کہانی تھی۔ رنگوں میں پہلا رنگ احمد اقبال کا دائرے میں سفر تھا۔ کہانی شوبز کے سلیمان خان سے شروع ہوئی لیکن بعد میں سلیمان خان کا کہیں ذکر بھی نہیں ہوا اور تمام کہانی فضا کے گرد گھومتی رہی۔ دوسرا رنگ کھردری جیت امجد جاوید کا تھا۔ موصوف شاید نئے آئے ہیں۔ بہرحال، کہانی اچھی لگی۔ کاشف زبیر کا عید کے لمحوں کو یادگار بنانے والا قربانی کا بکرا لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔ سزا اور قرض مناسب تھیں۔ تنویر ریاض کی بولتی کار بھی پسند آئی۔ عبدالقدیر کا پھندا اور مختار آزاد مرگ شیریں کے ساتھ آئے اور دونوں کہانیاں اچھی لگیں۔ سلیم انور کی فاتح آخر میں بھی فتح یاب ہوا۔“ (کوشش کیا کریں، اپنی اصل رائٹنگ میں خط لکھیں۔ دوسرے انتہائی پرسنل باتوں سے اجتناب برتیں۔ یہ آپ کے لیے بھی مفید ہے اور ادارے کے لیے بھی... پہلی دفعہ خط لکھا، خوش آمدید۔ آئندہ بھی آتی رہیے گا)

عدنان یوسف قرام بنوں سے باعثِ عجلت لکھتے ہیں ”یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ جاسوسی کس تاریخ کو ملا۔ کرسی پر ثاقب تبسم کو پایا، مبارک باد قبول فرمائیے۔ مبشر حسن تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔ میں کچھ بزی ہوں۔ کہانیوں میں صرف للکار پڑھی وہ بھی رات دس بجے، آخرکار راجا سے عمران اور تابش کو نجات مل گئی اور وہ بھی راجا کی لالچ کی وجہ سے... اب عمران کی انٹری ضروری ہوگی اس سچویشن میں... کہانی بہت پاورفل رہی، باقی رسالہ ابھی تک پڑھا نہیں ہے۔“

فوجی صابر علی کا سندھ رجمنٹ حیدر آباد کینٹ سے سیلیوٹ ”اس دفعہ شمارہ 5 اکتوبر کو ملا۔ سرورق میں اس دفعہ کوئی خاص بات نہ تھی کہ اس کو بیان کروں۔ اشتہارات کو نظرانداز کر کے اپنی محفل میں پہنچے تو صدارت کی کرسی پر ثاقب تبسم صاحب کو براجمان پایا۔ آپ نے رکنیت بحال کرنے کا بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے اور امید ہے اب یہ بحال رہے گی۔ اس کے بعد اپنا خط پا کر بے حد خوشی ہوئی آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ کو جو درخواست کی اس پر عمل کیا۔ مجھے یہاں کتابی کیڑے کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن جب بتاتا ہوں کہ یہ میرا خط ہے تو میرے دوست مانتے نہیں کہتے ہیں کہ حیدرآباد میں اکیلے تو نہیں ہو۔ گزارش ہے کہ ساتھ چند نام تحریر کر رہا ہوں ان کو ضرور شائع کیجیے گا بہت مہربانی۔ بشیر احمد فاروق، عالم تنویر، احمد گوندل، مشتاق سلیمی، حسن طارق پلیز یہ نام ضرور شائع کیجیے گا۔ آنٹی غزالہ کو ہم محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ پلیز آئندہ بھی حاضری دیا کریں۔ بزرگ کے ہونے سے ہر کام میں برکت ہوتی ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ آفتاب اور کشور کا مصیبتوں نے امریکا میں بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ للکار اس دفعہ ایکشن اور پیار محبت بھولی بسری یادوں سے بھرپور ایک نیا چودھری سامنے آیا ہے۔ راجا کی موت کا افسوس ہوا دیکھیں اب آگے کیا بنتا ہے۔ آخری منزل اپنے انداز کی منفرد کہانی تھی جس میں دہشت گردی، محبت، فرض شناسی، ذہانت کو بہت خوب صورتی سے کہانی میں سمویا گیا۔ کھردری جیت اچھی کہانی تھی۔ دولت کے پجاری اور رخسار کی بے وفائی نے حیران کر دیا۔ کاشف زبیر صاحب نے عید قربان پر واقعی زبردست عیدی دی ہے، تمام قارئین کے لیے۔ باقی کہانیاں بھی جاسوسی کے معیار کے عین مطابق تھیں۔ مجموعی طور پر شمارہ دل کو بھا گیا۔“

ضلع گوجرانوالہ سے ثاقب تبسم نگینہ کا آئینہ ”ماہ نومبر کا شمارہ پانچ تاریخ کو ملا، اس ماہ کے شمارے کا بطور خاص انتظار اس لیے بھی تھا کہ میں نے گزشتہ شمارہ پر مدت بعد تبصرہ بھیجا تھا۔ یہ امید تھی کہ میرا خط شائع ہو جائے گا۔ سرورق پر نظر پڑی تو دو احساسات ایک ساتھ دل میں جاگے، ایک یہ کہ اس بار سرورق پر موسم کی مناسبت سے سردمہری کا غلبہ ہے اور دوسرے یہ کہ اس بار سرورق انتہائی بارعب اور سنجیدگی سے بھرپور ہے۔ سرورق کے سحر سے نکل کر محفل بازو میں قدم رکھتے ہی قدم رک گئے، میرا خط صفِ اول سے بھی پہلی صف میں تھا، حیرانی اور خوشی نے ایک بار پھر دو احساسات جگا دیے۔ ایک یہ کہ اتنے عرصے بعد مجھے خوش آمدید کہا گیا ہے اور دوسرے یہ کہ مجھے خبردار کیا گیا ہے کہ آئندہ میں اس محفل سے غیر حاضر نہ رہوں۔ جلدی جلدی ایچ اقبال کی آخری منزل کی طرف بڑھا اور پھر بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس طویل کہانی میں تمثیل اور تاویل کا خوب صورت اشتراک تخیل کی تمام رعنائیوں کا مظہر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ آخری منزل اس شمارے کا کامیاب پہلا زینہ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد بابر نعیم کی تجویز کردہ سزا نے بھی بھرپور معاشرتی عکس اجاگر کیا۔ جمال دتی کا قرض ایک ایسے مرض کی طرح تھا جس کا علاج صرف اور صرف موت ہی تھا۔ یہ کہانی انسانی مجبوری اور بے حسی کی علامت تھی۔ کاشف زبیر کا قربانی کا بکرا خاص تحفہ تھا۔ کاشف زبیر نے ایک مدت بعد اپنے تمام کرداروں کو زندہ کیا۔ مزاح کی آڑ میں جھگڑے، جذبۂ قربانی کی کمی، منفی رویوں کی عکاسی اور دکھاوے کی عبادت کا محاصرہ اس کہانی کا خاصہ تھی جو بہت دلیری کا کام ہے۔ ایسی ہی سنجیدہ دلیری طاہر جاوید مغل کی للکار میں ہمیشہ نظر آتی ہے۔ اس بار بھی للکار میں توازن کی تمام شرائط پوری طرح نظر آئیں۔ للکار نے ایک بولتی کار دکھائی جو تنویر ریاض لے کر آئے تھے۔ اس کار میں بیٹھ کر خوف اور خطروں کی فضا میں ایک خاص طرح کا انی میلم بھی ملا کہ یہاں کیا کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ لوگ جرم پہ جرم کیے جاتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ ایسے ہی ہلکے پلاٹ کے ساتھ شاہ جمال کی پیش کردہ خود کردہ بھی اچھی کہانی تھی۔ یہ نفسیاتی موضوع پر ایک پُرمغز کہانی تھی، جس نے اسما قادری کے گرداب میں پھنسا دیا جہاں وہ مسلسل اس کوشش میں نظر آئیں کہ ان کے کرداروں اور کرداروں کی الجھی گتھیاں سلجھ جائیں۔ اگر یہ کام جلد ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے تاکہ ہم کسی نئی الجھن کا سامنا بھی کر سکیں۔ ابھی میں گرداب میں ہی پھنسا تھا کہ عبدالقدیر نے پھندا دکھا کر مجھے پریشان کر دیا۔ بداعتمادی اور ذہنی کشمکش کی خوب صورت تصویر کشی اس مختصر کہانی کو ہلکا فسانے کی جان تھی۔ مختار آزاد کی مرگ شیریں مجموعی طور پر اچھی کہانی تھی تاہم اس کے مکالموں میں زیادہ جان محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن سلیم انور نے فاتح میں مکالمہ نگاری، کردار نگاری اور منظرنگاری کی تمام صفات کو پورا کیا تھا۔ احمد اقبال نے دائرے میں سفر کر کے ایک انوکھی داستان رقم کی۔ اس کہانی کو بلاشبہ انسانی زندگی کا بھرپور عکس کہا جا سکتا ہے۔ منیب نازک کے مزاح کو ذرا اور طرح سے پڑھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ آخر میں امجد جاوید کی کھردری



جیت کا بھی مزہ چکھا۔ یہ آخری کہانی دولت آلود گندگی میں لپٹی ایک ایسی زندگی کی کہانی تھی جس میں درندگی اور شرمندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ تمام تر ریشہ دوانیوں کو کامیابی سے سمیٹ کر یادگار انجام بنایا گیا تھا اس لیے یہ کہانی بھی یادگار رہی۔“

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی شمولیت ”جاسوسی اس بار 5 تاریخ کو قریبی بک اسٹال سے مل گیا مگر گھر واپسی کے دوران ہی سردیوں کی پہلی ژالہ باری ہو گئی۔ اچھا ہوا کہ میں نے سر نہیں منڈایا ورنہ محاورہ سچ ثابت ہو جاتا۔ سرورق اس بار کچھ بہتر لگا۔ شاید قارئین کی ناپسندیدگی ذاکر صاحب تک پہنچ گئی۔ خطوط میں اس بار بھی کافی نئے لکھنے والے نظر آئے۔ فوجی صابر علی اور سعید صاحب! یہاں اسلام آباد میں اب ڈرائی فروٹس کا سیزن آ گیا ہے۔ فکر نہ کریں، میں آپ سب کو یاد رکھوں گا۔ لاہور کی بی بی ماریہ ملک کا شکریہ کہ میرا مختصر اور سادہ سا تبصرہ پسند آیا۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ یہ قسط عمران کے کارناموں کے بغیر بھی دلچسپ اور جاندار رہی۔ یوسف کو انڈیا اسمگل کرنے کی تیاریاں مکمل ہیں۔ راجا نے کس صفائی سے ثروت اور تابی کو چودھریوں کی حویلی سے نکال لیا گو کہ شدید زخمی ہوا۔ قسط کے آخر میں لگتا ہے کہ ثروت اور تابی کو بچانے کے لیے کچھ اجنبی آن پہنچے ہیں۔ گرداب کی اس قسط میں شہریار جاوید اپنے پہلے امتحان میں سرخرو ہوا جبکہ چودھری کا داخلہ امریکا میں مستقل بند ہو گیا اور شاید اس کا گھناؤنا کاروبار بھی اب بند ہوتا نظر آتا ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی احمد اقبال کی دائرے میں سفر جاسوسی کے اس شمارہ کی جان تھی اور یقیناً پہلے نمبر پر رہی۔ ہمارے موجودہ معاشرے میں فضا جیسی جانے کتنی مجبور لڑکیاں ایسے حالات کی شکار ہو کر تباہ و برباد ہوتی ہیں۔ سرورق کی دوسری کہانی کھردری جیت ایک فارمولا فلم جیسی تھی جس میں کوئی نیا پن نہ تھا۔ عید قربان کی مناسبت سے کاشف زبیر کی کہانی قربانی کا بکرا دلچسپ تھی۔ شمارے کی پہلی کہانی ایچ اقبال کی آخری منزل بس گزارے لائق تھی۔ مغربی کہانیوں میں مرگِ شیریں سب سے بہتر تھی۔ اس بار خاص نمبر کی تیاری تو شروع ہو چکی ہوگی۔ کوشش کریں کہ طبع زاد کہانیاں زیادہ ہوں۔“ (ضرور)

بنوں سے محمد ہمایوں سعید کے جوابات ”جوں جوں جاسوسی لیٹ ہوتا گیا۔ ہم اہم عبوری فیصلے کرتے گئے۔ مگر جیسے ہی جاسوسی تشریف لایا، ہماری حالت اس عاشق صادق کے مثل ہوئی جو ناراض ہونے کا بھونڈا ڈراما کرنے کی کوشش تو کرتا ہے مگر کامیاب نہیں ہو پاتا۔ ثاقب تبسم صاحب اور نہیں تو کم از کم یہ زنانہ تخلص ہی چینج فرما لیجیے۔ فوجی بھائی! مشورہ لاعلاج اس لیے کہ جب تک تفسیر صاحب اور ماہا ایمان صاحبہ کے سائے ہمارے سروں پر سلامت ہیں تب تک محفل میں شور شرابا چلتا رہے گا۔ کیونکہ بچے وہی سیکھتے اور کرتے ہیں جو گھر کے بڑے کرتے ہیں۔ غزالہ آنٹی! بہت بہت ویلکم اور بے تحاشا حیرت کہ آپ جاسوسی تب سے پڑھ رہی ہیں جب وہ معرضِ وجود بھی نہیں آیا تھا۔ للکار کی حالیہ قسط محبت کے انوکھے احساسات سے مزین تھی جو کہ مغل انکل کا خاصہ ہے۔ حالات جو بھی ہوں تابش اور ثروت جیسے محبت پرستوں کا قرب ہی ہمارے لیے باعثِ سکون ہے۔ گرداب میں چودھری ایک بار پھر ایکٹیو ہو گیا ہے۔ آفتاب اور کشور معجزاتی طور پر بچ تو گئے مگر سکون غارت ہو گیا۔ شہریار نے بھی را کا خطرناک مشن ناکام کر کے داد سمیٹی۔ سرورق کی پہلی کہانی دائرے میں سفر بہت دلچسپ رہی۔ حالات و واقعات کی بہت شاندار منظرنگاری کی گئی۔ کسی جگہ بھی کسی لمحہ بھی کوئی بات حقیقت سے دور محسوس نہ ہوئی۔ فضا کے ایک دائرے کے سفر کو دل سے محسوس کیا۔ باوجود اس کے کہ اس نے بہت غلط کام بھی کیے مگر پھر بھی ساری ہمدردیاں سمیٹنے میں کامیاب رہی۔ سلیم انور کی کہانی فاتح بھی خوب رہی۔ کاشف زبیر جلیل اینڈ راجا لیے حاضر تھے۔ قربانی کا بکرا ڈھیر ساری مسکراہٹیں دینے میں کامیاب رہی۔ شنو کو کم رول دیا گیا جس کا افسوس ہوا۔ بابر نعیم کی سزا اور تنویر ریاض کی بولتی کار بھی توجہ حاصل کرنے میں پوری طرح کامیاب رہیں۔“

راجن پور سے ماہ تاب گل رانا کے مشورے ”سرورق اس مرتبہ کمال تھا۔ حسینہ حسن و جمال کا نمونہ تھی میرے جیسی... بالکل بھی نہیں تھی کیونکہ میں تو میں ہوں۔ لیکن آپ غلط نہ سمجھیں۔ میں، میں بکری والی نہیں ہے۔ فہرست کی سجاوٹ قابلِ داد ہے اور ثاقب تبسم کو مبارک باد۔ فوجی صابر! واؤ آپ فوجی ہیں۔ مجھے تو خاکی وردی سے عشق ہے۔ مبشر حسین! بہت فاسٹ دور ہے، ایسے میں جب تک آپ نظر آتے ہیں ان ہیں ورنہ جو نظروں سے اوجھل ہوئے پھر تو کون، میں کون۔ سوا سچے ہونے کا احساس دلانا پڑتا ہے۔ عدنان یوسف پنگھوڑا لینے کے موڈ میں نظر آئے۔ خیر یہ تو وقت بتائے گا کہ کون سیر ہے اور کون سوا سیر۔ سعید عباس! آپ کے شہر میں میری آواز FM-104 نہیں چلتا تو کیا ہوا، راجن پور میں آ کر سن لیں۔ ویسے کچھ لوگوں نے یہ طریقہ اپنایا ہے کہ میرے پروگرام کی ٹائمنگ یعنی صبح نو سے دس ہے۔ راجن پور اپنے جاننے والوں کے پاس میسیج پر کال کرتے ہیں اور پھر فون پر ریڈیو سنتے ہیں۔ نوید ساجد! آپ ذاکر انکل کو تصویر بھیجیں یا نہ بھیجیں مجھے ضرور سینڈ کر دیجیے گا۔ وہ کہا ہے نا کہ آج کل بچے چھوٹے موٹے بھوتوں سے نہیں ڈرتے۔ سنسان، ویران، پریشان، حیران، بیابان وغیرہ دل! فرسٹ آف آل ویلکم 2 جاسوسی اور جہاں تک آپ کا سوال ہے تو آئینہ حسین لڑکیوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔ کیوں انکل جی؟ تفسیر عباس صاحب! میں نے جو محسوس کیا لکھ دیا، باقی میں وضاحت تو نہیں دوں گی البتہ اگر آپ کو میری بات بری لگی تو میں معذرت خواہ ہوں۔ بلیک لسٹ میں اعجاز احمد کو دیکھ کر ہرگز دکھ نہیں ہوا تاہم افسوس ضرور ہوا۔ اور ایک قاری کی معرفت سے مجھے راج برادر کی زندگی میں در آنے والی تبدیلی کا علم ہوا تو برا اور آپ کو زندگی کے نئے اور فی الحال حسین موڑ میں داخل ہونے پر مبارک باد۔ للکار زبردست یار! کیا قسط تھی۔ اتنا ایکشن، کیا زبردست ٹوئسٹ آیا کہانی میں۔ گرداب پڑھ کے دل خوش ہو گیا۔ وطن کے محافظوں کی کامیابیاں ان کی محنت کا صلہ۔ ایسے ہی لوگوں کی بدولت یہ ملک قائم ہے اور ان شاء اللہ رہے گا۔ لوجی کشور کو ماہا تو نے ملا دیا اور یقیناً راوی چین ہی چین ہوگا۔ احمد اقبال آئے اور چھا گئے۔ بڑی زبردست اور سبق آموز کہانی ہے ان لڑکیوں کے لیے جو کہ ٹیلی ویژن خاص طور پر اسٹار پلس کی مصنوعی دنیا کی چکاچوند سے متاثر ہو کر اس دنیا کی باسی بننے کی تمنا دل میں پالتی ہیں۔ شاہ جمال، خود کردہ بہترین رہی۔ عید الاضحی کا خاص تحفہ جلیل اور راجا کی بکرا دوستی ہم نے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ ابتدائی صفحوں پر آخری منزل موضوع وہی عام سا ہونے کے باوجود ایچ اقبال صاحب کے انداز تحریر کی بدولت خاص ٹھہری۔ امجد جاوید کے قلم سے نکلا سرورق کا دوسرا رنگ کھردری جیت کو بلاشبہ اس ماہ کی بہترین تحریر قرار دیا جا سکتا ہے، زبردست تحریر تھی۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

محمد عمار کشف، ضلع گجرات۔ طاہر نواز، جھنگ صدر۔ توحید رضا اینڈ خضر عباس، خانیوال۔ اقرا امیا نو شیر شاہ کراچی۔ ایم عزیر اسد، چکوال۔ سنسان دل، جودھپور کبیر والا۔ وسیم اکرم، خیبر پختونخوا ضلع دیر۔ سائرہ وقار، کراچی۔ توقیر عباس بنوری، بکھر کوٹ، ضلع بھکر۔ انجم فاروق ساحلی، لاہور۔ نوید ساجد، برنج

# بدقسمت

کاشف زبیر

بچپن... زندگی کے تمام ادوار میں سنہرا اور یادگار دور سمجھا جاتا ہے... مگر بعض اوقات کسی کا بچپن ظلم و سفاکیت کی نذر ہوجاتا ہے... اس معصوم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا... اس کی زندگی پر اچانک ہی بدقسمتی کے سائے چھاگئے... اس کے سادہ و معصوم ذہن پر وہ تحریریں نقش ہوگئیں... جنہوں نے تادم اسے الجھنوں اور تفکرات میں مبتلا رکھا۔ ماضی کی پرچھائیوں کی طویل رفاقت کے بعد ان سے جدائی کا خیال اس کے لیے سوہانِ روح تھا... وہ اپنی دنیا میں مقید تھا جس سے آزادی اسے قبول نہ تھی...

**انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں زندگی کی اذیتوں اور سنگینیوں کو اجاگر کرتی ایک دل گداز داستان**

نیا بننے والا دارالحکومت اتنا آباد نہیں ہوا تھا۔ تعمیرات کا سلسلہ جاری تھا۔ نئے سیکٹر بن رہے تھے اور سرکاری دفاتر کے لیے نئی عمارات کی تعمیر بھی جاری تھی۔ دور دراز سے یہاں آکر بسنے والے سرکاری ملازمین کے لیے بے شمار کوارٹرز بن چکے تھے اور مزید ابھی زیرِ تعمیر تھے۔ یہ ایک ایسا ہی سیکٹر تھا جہاں سڑک کے ساتھ ایک سرکاری عمارت بن رہی تھی۔ کچھ دور ترتیب سے درمیانے درجے کے مکانات تھے اور ان کا ایک جیسا ڈیزائن اور پیلا رنگ بتا رہا تھا کہ یہ سرکاری کوارٹرز ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی لیکن یہ سب آباد تھے۔ سڑک کے ایک طرف جنگل تھا اور دوسری طرف سرکاری دفاتر تھے۔ زیرِ تعمیر عمارت سے کچھ ہی دور تین لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ان کی عمریں دس گیارہ کے آس پاس تھیں۔

بیٹنگ کرنے والے لڑکے نے زوردار ہٹ لگائی... گیند سڑک تک آئی اور پھر لڑھکتی ہوئی فٹ پاتھ کے نیچے موجود بارش کا پانی سیوریج میں لے جانے والے خانے میں جانے لگی۔ تینوں لڑکے بیک وقت بھاگے۔ ان کے پاس یہی بال تھی اور اگر یہ خانے میں چلی جاتی تو ان کا کھیل یہیں ختم ہوجاتا۔ ان کے پاس کوئی دوسری بال نہیں تھی۔ بال کی رفتار سست تھی لیکن وہ دور تھے اور جب تک

...... پاس آتے، بال خانے میں گھس گئی۔ آگے والے لڑکے نے بلاتکلف خانے میں ہاتھ ڈال دیا۔ اندر کیڑے مکوڑوں اور گٹروں میں پلنے والے چھوٹے جانوروں کی موجودگی کا پورا امکان تھا مگر اس وقت اسے صرف گیند کا خیال تھا۔ اس کے دونوں ساتھی پُرامید نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے لیکن جب اس کا خالی ہاتھ باہر آیا تو ان کے منہ لٹک گئے۔

بیٹنگ کرنے والے نے بلا زور سے زمین پر مارا۔ "یہ آخری بال تھی۔"

"شاٹ تم نے مارا تھا۔" باؤلنگ کرانے والا لڑکا بولا۔

"ہاں مگر حامد کا قصور ہے۔" بیٹنگ کرنے والے نے فیلڈنگ کرنے والے لڑکے کی طرف دیکھا۔ "یہ بال روکنے کے لیے بھاگا ہی نہیں تھا۔"

"میرا قصور نہیں ہے۔" فیلڈر نے صفائی پیش کی۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ بال گٹر میں چلی جائے گی۔"

"یہ گٹر نہیں ہے۔" بلے باز نے کہا۔ "صرف پائپ ہے جو فٹ پاتھ کے نیچے سے گزر رہا ہے۔ آگے جا کر یہ گٹر سے ملتا ہے۔"

"تُو نے بنایا تھا نا جو تجھے پتا ہے۔" باؤلر نے اس کا مذاق اڑایا، اس کا نام عبید تھا۔

"ہاں، یہ میرے سامنے بنا تھا۔ اس وقت تم دونوں یہاں نہیں تھے۔" بلے باز نے متانت سے جواب دیا۔ وہ وقاص تھا۔

"ہم آگے نہ دیکھیں شاید بال اگلے سوراخ تک چلی گئی ہو۔" حامد نے تجویز پیش کی۔ تینوں کے باپ سرکاری ملازم تھے اور انہیں یہاں رہائشی کوارٹر ملے ہوئے تھے۔ حامد کی تجویز پر انہوں نے فٹ پاتھ کے ساتھ موجود اگلے سوراخ بھی دیکھے لیکن بال نہیں تھی، شاید وہ پائپ میں رک گئی تھی اور جب بارش ہوتی تو پانی کے زور سے گٹر میں چلی جاتی۔ بال کے تعاقب میں وہ زیرِ تعمیر عمارت تک چلے آئے۔ مزدور کچھ دیر پہلے ہی کام ختم کر کے گئے تھے۔ یہاں فٹ پاتھ پر تازہ پلاستر تھا اور یہ ابھی گیلا تھا۔ وقاص بلے باز تھا اور ان تینوں میں وہی اپنے انداز سے لیڈر لگتا تھا۔ تازہ سیمنٹ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"کیا خیال ہے، اس پر اپنا نام لکھیں؟"

عبید کو بھی یہ خیال اچھا لگا لیکن حامد ڈر گیا۔ "کوئی آنہ جائے۔ یہاں چوکیدار ہوتا ہے۔"

"ابھی تو کوئی نہیں ہے۔" وقاص نے چاروں طرف دیکھا اور زمین سے ایک تنکا اٹھالیا۔ "پہلے میں لکھوں گا۔"

اس نے گیلے سیمنٹ پر تنکے کی مدد سے اپنا نام لکھا، پھر تنکا عبید کو پکڑا دیا۔ اس نے اپنا نام لکھا اور تنکا حامد کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ہچکچایا۔ "یہ ٹھیک نہیں، بعد میں یہ نام ہمیں پکڑوا دیں گے۔"

"کچھ نہیں ہوتا یار۔" عبید نے اسے زبردستی تنکا پکڑا دیا۔ "کسی کو کیا معلوم ہمارے نام کیا ہیں؟"

مجبوراً حامد نے اپنا نام لکھنا شروع کیا لیکن ابھی اس نے صرف 'حا' لکھا تھا کہ ایک پرانی سیاہ رنگ کی کار آکر وہاں رکی اور اس سے ایک لمبا چوڑا آدمی اتر کر ان کی طرف آیا۔ حامد اسے دیکھتے ہی خوف زدہ ہو گیا۔ تنکا اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ آدمی نے بارعب لہجے میں پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم سرکاری ملکیت کو خراب کر رہے ہو۔"

"نہیں جناب۔" حامد نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "ہم اپنا نام لکھ رہے تھے۔ آپ کہتے ہیں تو اسے مٹا دیتے ہیں۔"

آدمی نے حامد کی طرف دیکھا۔ وہ گورا چٹا اور نازک سے نقوش والا لڑکا تھا۔ آدمی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی تھی۔ اس نے گرج کر کہا۔ "نہیں، تم جرم کر چکے ہو اور تمہیں اس کی سزا ملے گی۔"

وقاص اور عبید آہستہ سے پیچھے ہٹے اور پھر یک دم بھاگ کھڑے ہوئے لیکن حامد سے بھاگا بھی نہیں گیا۔ وہ کھڑا رہ گیا تھا۔ آدمی نے اسے بازو سے پکڑ کر کار کی طرف دھکیلا۔ اس نے معمولی سی مزاحمت کی اور کمزور لہجے میں بولا۔ "آپ... مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"سزا دینے تاکہ آئندہ تم سرکاری چیز کو نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہ کرو۔" آدمی نے کہتے ہوئے اسے کار کی پچھلی نشست پر دھکیل دیا۔ تب حامد نے دیکھا کہ وہاں ایک آدمی اور بیٹھا تھا۔ جب کار روانہ ہوئی تو حامد نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے دونوں ساتھی کوارٹروں کے ساتھ والے میدان میں کھڑے کار کی طرف دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ بہت تکلیف میں تھا۔ اس کے جسم میں درد کا سمندر موج در موج تھا۔ وہ ایک تاریک کوٹھری میں زمین پر پڑی دری پر سکڑا سمٹا لیٹا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ سزا کا یہ انداز





بھی ہوتا ہے۔ وہ آدمی جا چکا تھا جس نے اسے کار میں بٹھایا تھا۔ کچھ دیر بعد کوٹھری کا دروازہ کھلا اور وہ شخص اندر آیا جو کار کی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ پھر اسی تکلیف سے گزرنا پڑے گا۔ وہ بے ساختہ چلّا اٹھا۔ "نہیں... خدا کے لیے نہیں... مجھے چھوڑ دو... مجھے جانے دو۔"

مگر آنے والا اس پر رحم کرنے نہیں آیا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس کی چیخوں سے کوٹھری لرزنے لگی تھی۔

☆☆☆

حامد لرز رہا تھا، کانپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے ہانپنے جیسی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کے ساتھ بستر پر موجود شرمین کے لیے یہ سب نیا نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ اپنے شوہر کو بارہا خواب میں اسی طرح لرزتے اور کانپتے دیکھ چکی تھی۔ کبھی کبھی اس کے منہ سے التجائیں نکلتی تھیں اور کبھی وہ چلّانے لگتا تھا۔ شروع میں یہ بہت زیادہ ہوتا تھا پھر شرمین کے مجبور کرنے پر اس نے ایک ماہرِ نفسیات سے رجوع کیا اور اس کے علاج سے اسے فائدہ ہوا لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ سوتے میں اسی طرح خواب میں ڈر جاتا تھا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ اس کا علاج تو بچپن سے جاری رہا ہے۔ شرمین کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے حامد کو آہستہ سے ہلایا۔ "حامد... حامد۔"

وہ چونک کر بیدار ہو گیا۔ خاصی سردی میں بھی اس کا چہرہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے شرمین کی طرف دیکھا۔ "تم نے اچھا کیا جو مجھے جگا دیا۔"

"پھر وہی خواب...؟"

حامد نے سر ہلایا اور اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ صبح کی روشنی کھڑکی سے جھلک رہی تھی۔ عقب سے شرمین نے اسے پکارا۔ "آج احمد کا اسکول میں پہلا دن ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" حامد نے کہا اور باتھ روم میں چلا گیا۔

احمد ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ چھٹے سال میں لگا تھا۔ وہ شادی کے بارہ سال بعد پیدا ہوا تھا۔ جب حامد اور شرمین اولاد کے لیے ہر جتن کر کے مایوس ہو چکے تھے، ایسے میں احمد نے آکر ان کی مایوس اور بے رنگ زندگی میں رنگ بھر دیے تھے۔ وہ جیسے پھر سے جی اٹھے تھے۔ شرمین خاموش طبع اور کاموں میں مگن رہنے والی عورت تھی۔ حامد بھی اسی فطرت کا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں میں محبت ہونے کے باوجود ان کے گھر میں خاموشی رہتی تھی۔ یہ خاموشی احمد کے آنے کے بعد کسی قدر ٹوٹی تھی۔ مگر احمد بھی بہت زیادہ شوخ اور شور کرنے والا بچہ نہیں تھا پھر بھی ان کے گھر میں اس سے زندگی آگئی تھی۔ احمد میں ماں باپ کی جان تھی شاید اسی لیے اسے کسی قدر تاخیر سے اسکول میں داخل کرایا گیا۔ اب بھی وہ دونوں فکرمند تھے کہ احمد کو اسکول میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ حامد تیار ہو کر نیچے آیا تو شرمین احمد کو بتا رہی تھی کہ اسے اسکول میں بہت اچھے دوست ملیں گے۔

"جیسے مجھے ملے تھے۔" حامد نے ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"پاپا! آپ کے دوست بہت اچھے ہیں؟" احمد نے معصومیت سے کہا۔ "مجھے وقاص انکل اور عبید انکل بہت اچھے لگتے ہیں۔"

حامد اور شرمین نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا پھر حامد نے سر ہلایا۔ "ہاں بیٹا وہ بہت اچھے دوست ہیں۔"

حامد سوچنے لگا کیا یہ سلسلہ اس کے بیٹے کے ساتھ بھی چلے گا؟ حامد دوستوں کے معاملے میں بدقسمت نہیں تھا لیکن دوستوں میں بدقسمت ضرور تھا۔ وہ تینوں ایک جیسے پس منظر سے تعلق رکھتے تھے۔ تینوں کے باپ ایک ہی سرکاری محکمے میں تقریباً ایک جیسے درجے کے ملازمین تھے۔ حامد گریجویشن کرنے کے بعد باپ کی جگہ بھرتی ہو گیا۔ وہ اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ کلرک بھرتی ہونے کے بعد چوبیس برس میں وہ سیکشن آفیسر بن گیا تھا۔ اس کے ساتھ کے لوگوں نے بہت تیزی سے ترقی کی اور اس سے کہیں آگے نکل گئے تھے۔ شاید اس میں ترقی کرنے کے گُن نہیں تھے۔

"پاپا!" احمد نے اسے آواز دی۔ "چلیں دیر ہو رہی ہے۔"

اس نے محبت سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ آج اسکول کا پہلا دن تھا اور وہ بالکل بھی پریشان نہیں تھا۔ اس کے بجائے اس کے چہرے پر اعتماد تھا۔ حامد نے گہری سانس لی۔ احمد کے ماضی میں شخصیت کو تہ و بالا کر دینے والا کوئی سفاک واقعہ نہیں تھا اس لیے وہ پُراعتماد تھا اور شاید آگے بھی ایسا ہی رہتا۔ وہ احمد کو لے کر باہر نکل آیا۔ حامد اسی علاقے میں رہتا تھا جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ ماضی کے سرکاری کوارٹرز ری نیوشن کے مرحلے سے گزر کر خوب صورت مکانوں میں بدل گئے تھے۔ ان میں ایک حامد کا مکان بھی تھا۔ یہ اس کے باپ کو الاٹ ہو گیا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے مکان ٹھیک کرایا تھا پھر حامد نے چند سال پہلے اوپر دو کمرے بنوائے

تھے۔ اب مجموعی طور پر یہ خوب صورت اور تقریباً نیا جیسا مکان تھا۔

کوارٹرز کے ساتھ والا میدان سرسبز پارک میں بدل گیا تھا۔ اس سے آگے والی سڑک اب دو رویہ ہو گئی تھی۔ سڑک کے پاس کئی کئی منزلہ سرکاری عمارتیں تھیں ان میں ایک عمارت وہ بھی تھی جو حامد کے بچپن میں تعمیر ہوئی تھی اور اس کے سامنے فٹ پاتھ پر اس نے وقاص اور عبید کے ہمراہ اپنا نام کندہ کرنا چاہا تھا۔ اچانک احمد چلّایا۔ "پاپا! بال..."

ایک ٹینس بال پانی کے ساتھ بہتی سڑک کے کنارے فٹ پاتھ تلے بارش کا پانی لے جانے والے خانے کی طرف جا رہی تھی۔ حامد بیٹے کے ساتھ دوڑا لیکن جب تک وہ سڑک پار کرتے بال خانے میں جا چکی تھی۔ احمد نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اندر جھانکا۔ "احمد! ہاتھ اندر مت ڈالنا، کوئی کیڑا کاٹ لے گا۔"

احمد کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے فٹ پاتھ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "پاپا! یہ کیا لکھا ہے۔"

فٹ پاتھ صبح سویرے دھلا تھا اس لیے بالکل صاف تھا۔ اس پر برسوں پرانے دھندلے پڑ جانے والے نشانات بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ تین دوستوں نے برسوں پہلے اپنے نام لکھے تھے جو آج بھی برقرار تھے۔ حامد حیران رہ گیا... اس دن کے بعد سے آج پینتیس برس بعد وہ ان ناموں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا، اس میں شک کی گنجائش نہیں تھی کہ یہ انہی کے لکھے نام تھے۔ برسوں پہلے جب انہوں نے یہ نام لکھے تو اس وقت حامد نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ نام اس کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ بن جائیں گے۔ وہ اور اس کے دوست دوبارہ اس طرف نہیں آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عمارت تعمیر کرنے والوں نے یہ نام مٹا دیے ہوں گے مگر نام ابھی تک موجود تھے، بس دھندلے پڑ گئے تھے۔ سب سے اوپر وقاص لکھا تھا پھر عبید اور آخر میں اس کا ادھورا نام تھا، اس کی ادھوری شخصیت کی طرح۔

☆☆☆

وقاص اپنے خوب صورت مکان کے خوب صورت... بیڈروم میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کی بیوی فاریہ جاتے ہوئے کھڑکی کا پردہ ہٹا گئی تھی اور نرم گرم سی دھوپ بستر تک آ رہی تھی۔ وقاص نے کمبل سے چہرہ نکال لیا اور دھوپ سے لطف اندوز ہونے لگا۔ نیچے سے بچوں کے شور کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ ان آوازوں کو سن کر مسکرانے لگا۔ یہ آوازیں اس کا فخر و غرور تھیں۔ وہ اپنے بچوں سے جنون کی حد تک پیار کرتا تھا۔

اس گھر سے باہر بہت سارے لوگ اس سے خوف کھاتے تھے لیکن گھر کے اندر وہ سراپا محبت تھا۔ اس کے بچے بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔

"وقاص..." نیچے سے فاریہ چلّائی۔ "ناشتا..."

ماریہ کھل کھلا کر ہنسی۔ "ماما... نکاح ٹوٹ جاتا ہے نام لینے سے۔"

وقاص کو لگا جیسے ڈھیر سارے چاندی کے گھنگرو فرش پر بکھر گئے ہوں۔ اس نے حیرت سے سوچا ماریہ اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ اس طرح ہنس سکے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ لڑکیاں کب ایسے ہنستی ہیں۔ اس نے حساب لگایا۔ ماریہ ستاسی میں پیدا ہوئی تھی تو اس مارچ میں وہ اٹھارہ سال کی ہو جائے گی۔ وقاص چونک کر اٹھ بیٹھا۔ "میرے خدا! وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ ماریہ جوان ہو گئی ہے۔"

ماریہ دوسرے نمبر پر تھی۔ اس سے بڑا ایاز تھا جو دو سال بڑا تھا۔ ماریہ سے تین سال چھوٹی سونل تھی اور اس سے تین سال چھوٹا ریاض تھا۔ یہ چار بچے اس کی زندگی تھے۔ وہ سوچوں میں گم تھا کہ نیچے سے فاریہ پھر چلّائی۔ وقاص بستر سے اٹھ گیا۔ اگرچہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ واش روم سے فارغ ہو کر وہ نیچے آیا تو چاروں بچے ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ ایاز اب اس کے ساتھ جاتا تھا۔ ماریہ کالج کے تیسرے سال میں تھی۔ وقاص نے باری باری سارے بچوں کو پیار کیا۔ ماریہ بولی۔ "پاپا! آج آپ مجھے سمیرا کے گھر سے لے لیجیے گا۔ میں کالج سے وہیں چلی جاؤں گی۔"

سمیرا ان کے پرانے محلے میں رہتی تھی اور ماریہ کی بچپن کی دوست تھی۔ وقاص نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے لیکن ان کی گلی میں میری گاڑی نہیں جاتی ہے۔"

"آپ مجھے کال کر دیجیے گا، میں خود آ جاؤں گی۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" وقاص نے ناشتے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیا کام ہے؟" فاریہ نے چائے کا کپ وقاص کے سامنے رکھا۔ "ابھی تم تین دن پہلے بھی تو گئی تھیں۔"

"ماما! کیا انسان دوستوں سے کسی کام سے ملتا ہے؟ کیوں پاپا! آپ اپنے دوستوں سے صرف کام سے ملتے ہیں؟" ماریہ نے سوالیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔

"نہیں، دوست زندگی کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔" وقاص نے سنجیدگی سے کہا۔

"جیسے انکل عبید اور انکل حامد پاپا کے دوست ہیں۔" ریاض نے کہا۔



"تم نے ٹھیک کہا بیٹے۔"

"بس تو سمیرا میری اکیلی ہی دوست ہے۔"

ابھی وقاص ناشتا کر رہا تھا کہ باری باری سارے بچے اٹھے اور خدا حافظ کہتے ہوئے گھر سے نکل گئے۔ ایاز کو وقاص کے ساتھ ورکشاپ جانا تھا لیکن اسے کہیں اور بھی کام تھا۔ اس نے کہا۔ "پاپا! میں دس بجے تک آ جاؤں گا، آپ چلے جائیے گا۔"

فاریہ اپنا ناشتا لے کر اس کے سامنے آ بیٹھی۔ وقاص نے چائے لیتے ہوئے کہا۔ "تم ماریہ کو اس طرح مت ٹوکا کرو۔"

"اس کی عمر ہو گئی ہے کہ اسے ٹوکا جائے۔" فاریہ بولی۔ "نوجوان لڑکیوں کا زیادہ دیر گھر سے باہر رہنا درست نہیں ہوتا ہے۔"

"ماریہ سمجھ دار ہے۔"

"محبت کے معاملے میں ساری لڑکیاں نا سمجھ ہوتی ہیں۔"

وقاص نے حیرت سے فاریہ کو دیکھا۔ "یہ محبت کہاں سے آ گئی درمیان میں... کیا ماریہ..."

"محبت اسی عمر میں ہوتی ہے اور ظاہر ہے، ماں باپ کو بتا کر نہیں ہوتی۔ اس سے پہلے کہ لڑکی کوئی ٹھوکر کھائے، یہ ماں باپ کی ذمے داری ہوتی ہے کہ اس کا خیال رکھیں۔ ہم ماریہ کا ویسے خیال نہیں رکھ رہے ہیں۔" فاریہ کا لہجہ کسی قدر تیز ہو گیا تھا۔

"لیکن میں مفروضے کی بنیاد پر اپنی بیٹی پر کوئی پابندی لگانے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"مرضی آپ کی۔" فاریہ نے کسی قدر برہمی سے کہا۔

وقاص اس کی طرف توجہ دیے بغیر اٹھ گیا۔ آج اسے کئی ضروری کام نمٹانے تھے۔ آٹو موبائل میں ڈپلوما کرنے کے بعد اس نے کچھ عرصے ویہنز انڈسٹری میں کام کیا تھا پھر اپنی ورکشاپ کھول لی۔ بیس برسوں میں وقاص آٹوز کا ایک نام بن گیا تھا۔ اب اس کے کسٹمرز بڑے لوگ تھے اور اس کے پاس ساری بڑی گاڑیاں آتی تھیں۔ اس کی ورکشاپ میں گاڑیوں کی سروس سے لے کر ان میں تبدیلی تک تمام سہولیات موجود تھیں۔ وہ اپنے گاہکوں کو گاڑیوں کے پرزے تک منگوا کر دیتا تھا جو انہیں کہیں اور سے نہیں مل سکتے تھے۔

مگر یہ سامنے کا بزنس تھا۔ اس کا اصل کام کچھ اور تھا جس کے بارے میں اس کے چند ساتھی ہی جانتے تھے۔ وقاص گھر سے نکلا اور دارالحکومت کے کمرشل ایریا میں آیا جہاں اس کی ورکشاپ تھی۔ یہ خاصے بڑے رقبے پر پھیلی تھی اور عام آٹوز ورکشاپ کے مقابلے میں یہاں نہ تو گندگی تھی اور نہ ٹوٹی پھوٹی گاڑیاں اور ان کے پرزے بکھرے ہوئے تھے۔ مرمت کا تمام کام اندر ہوتا تھا اور سامنے اس کا خوب صورت دفتر تھا جس میں شیشے کا کام زیادہ تھا۔ وہ ورکشاپ پہنچا تو وہاں شاہ زیب عرف شاہ جی اور باؤ کہلانے والا رفیق ناجی اس کے منتظر تھے۔ یہ دونوں اس کے خاص ساتھی تھے۔ دونوں تنومند اور گٹھے ہوئے جسموں کے مالک تھے اور صورت سے ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ وقاص نے شٹر اٹھا کر دفتر کا گلاس ڈور کھولا۔ وہ تینوں اندر آ گئے۔

"کیا خبر ہے؟" وقاص نے ان سے پوچھا۔

"چار گاڑیاں کل یہاں پہنچ رہی ہیں۔"

"راستے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

شاہ جی مسکرانے لگا۔ "انجان مت بنو، اگر مسئلہ ہوتا تو سب سے پہلے تمہیں پتا چلتا۔"

"یہاں موجود دو گاڑیوں کی کیا پوزیشن ہے؟" باؤ نے پوچھا۔

وقاص کھڑا ہو گیا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

وہ ورکشاپ کے ہال میں آئے۔ یہاں ایک طرف دو گاڑیاں ریشم جیسے کپڑے کی چادروں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ وقاص نے باری باری دونوں پر سے چادریں کھینچ کر اتار دیں۔ نیچے دو چمچماتی ہوئی غیر ملکی گاڑیاں برآمد ہوئیں۔ ایک لگژری کار تھی اور دوسری فور وہیل ڈرائیو تھی۔ وقاص نے دونوں گاڑیوں کے خانوں سے ان کے کاغذات نکالے اور انہیں تھما دیے۔ شاہ جی اور باؤ گاڑیوں کے چیسس اور انجن نمبر سے کاغذات ملا کر دیکھنے لگے۔ آدھے گھنٹے کے معائنے کے بعد وہ مطمئن نظر آنے لگے۔ انہوں نے کاغذات واپس گاڑی میں رکھے اور ان پر چادریں ڈال دیں۔ وہ واپس دفتر میں آئے۔ وقاص نے کپ بورڈ سے ایک بوتل اور تین گلاس نکالے۔ یہ غیر ملکی شراب تھی۔ شاہ جی اور باؤ کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وقاص نے تین گلاسوں میں نکالی اور انہوں نے اپنے اپنے گلاس اٹھا لیے۔

"دونوں گاڑیاں آج شوروم میں چلی جائیں گی۔"

"رجسٹریشن آفس میں کام مکمل ہے؟" باؤ نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے پوچھا۔

"ظاہر ہے، اس کے بغیر کون ان گاڑیوں کی اچھی قیمت دے گا۔" وقاص نے کہا۔ "آج کل شہر میں آنے والے راستوں پر چیکنگ سخت ہو رہی ہے۔"

شاہ جی ہنسا۔ ''انہیں گاڑیوں کی نہیں، اسلحے اور دہشت گردوں کی تلاش ہوتی ہے۔''

''پھر بھی ہمیں احتیاط کرنی چاہیے۔'' وقاص نے سرد لہجے میں کہا۔ ''آج کل کام زیادہ ہے اس لیے گاڑیاں ایک ایک کرکے لانا۔''

وقاص کے حکم پر ان دونوں کے منہ لٹک گئے کیونکہ باری باری کا مطلب تھا، گاڑیاں دیر سے تیار ہوں گی اور ان کا حصہ بھی دیر سے ملے گا لیکن وقاص باس تھا، اس کا کہا حکم تھا۔ پڑوسی ملک سے بغیر رجسٹریشن کی ری کنڈیشن اور چوری کی گاڑیاں عارضی جعلی کاغذات کی مدد سے یہاں لائی جاتی تھیں اور پھر ان کو مرمت اور کلر کے مراحل سے گزار کر نیا رنگ وروپ دیا جاتا تھا۔ ان کے چیسس اور انجن نمبر بدلے جاتے تھے اور ان کے مطابق کاغذات بنوائے جاتے تھے۔ یہ سارے کام اس ورکشاپ کی آڑ میں کیے جاتے تھے۔ اس کام میں رجسٹریشن آفس کا عملہ بھی شامل تھا، تب ہی ان کا کام چلتا تھا۔

☆☆☆

ماریہ بہت پیاری اور نازک سی لڑکی تھی۔ اس کا باپ اسے بچی سمجھتا تھا لیکن درحقیقت اب وہ ایک نوجوان لڑکی تھی جو نوجوان لڑکیوں والے جذبات رکھتی تھی اور اس کی آنکھوں میں جوانی کے سپنے چمکتے تھے۔ وہ سمیرا کے گھر پہنچی تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ وقاص سات بجے سے پہلے گھر نہیں جاتا ہے۔ کالج سے وہ ڈیڑھ بجے ہی نکل گئی تھی۔ اس کے بعد پانچ بجے تک کا وقت اس نے عدنان کے ساتھ ایک پارک میں گزارا۔ انہوں نے لنچ ایک چھوٹے سے کیفے میں کیا تھا۔ عدنان تقریباً بائیس برس کا خوش شکل اور مناسب جسامت کا لڑکا تھا۔ اس کے گھر میں ایک بیوہ ماں اور ایک چھوٹا بھائی نعمان تھا جو گونگا اور بہرا تھا۔ عدنان گھر کا واحد کفیل تھا اور گریجویشن کے بعد ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ریسپشنسٹ کی جاب کر رہا تھا۔ ان دنوں اس کی نائٹ تھی اس لیے وہ دن میں ماریہ سے مل سکتا تھا۔ ان کی پہلی ملاقات پھولوں کی ایک نمائش میں ہوئی تھی جہاں ماریہ کالج کی ساتھی لڑکیوں کے ہمراہ گئی تھی۔ پہلی نظر میں وہ ایک دوسرے کو پسند کر بیٹھے تھے۔ جب ایک بار دلوں میں آگ لگ جائے تو انسان اسے بجھانے کے راستے تلاش کر ہی لیتا ہے۔ ایسے ہی انہوں نے بھی میل ملاقات کے راستے تلاش کرلیے تھے۔

عدنان جاب کے ساتھ ہوٹل مینجمنٹ کورس کر رہا تھا جس کے بعد اسے اسی ہوٹل میں اچھی نوکری مل جاتی۔ اس نے ماریہ سے وعدہ کیا تھا کہ ترقی پاتے ہی وہ اپنی ماں کو اس کے گھر بھیجے گا۔ ماریہ کو اپنے باپ سے ڈر لگتا تھا اس لیے وہ گھر میں اب تک اس کا ذکر نہیں کرسکی تھی۔ عدنان حیران ہوتا تھا۔ ''جب وہ تم سے اتنی محبت کرتے ہیں تو تم ان سے ڈرتی کیوں ہو؟''

''میں نہیں جانتی۔'' ماریہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''لیکن نہ جانے اس معاملے میں پاپا سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''ہم نے محبت کی ہے، کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔'' عدنان نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''ہماری نیت اچھی ہے۔ مجھے یقین ہے ہماری منزل بھی آسان ہوگی۔''

ماریہ نے سر ہلایا۔ ''لیکن نہ جانے کیوں مجھے ڈر لگتا ہے، کہیں ہماری محبت کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' عدنان نے صدق دل سے کہا۔

ماریہ سمیرا کے گھر میں موجود تھی۔ وہ ماریہ اور عدنان کی محبت کے بارے میں جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ماریہ اس سے ملنے کے بہانے عدنان سے ملنے آتی ہے۔ سمیرا کو ڈر لگتا تھا کہ بات کھلی تو وہ بھی لپیٹ میں آئے گی اور اس کی ماں اسے نہیں بخشے گی لیکن ماریہ کی محبت میں وہ اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھی۔ سمیرا اسے اپنے کمرے میں لے آئی اور دونوں سہیلیاں سرگوشی میں بات کرنے لگیں۔ ماریہ اسے آج کی ملاقات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ سردیوں کے دن تھے اور چھ بجے تک سورج غروب ہونے کے بعد تاریکی چھا جاتی تھی۔ ماریہ کو بےچینی ہونے لگی۔ اس نے وقاص کا نمبر ملایا لیکن وہ انگیج جا رہا تھا۔ کئی بار ملانے پر نمبر انگیج ملا تو وہ کھڑی ہوگئی۔

''میں خود چلی جاتی ہوں، پاپا مصروف ہوں گے۔''

''اکیلے۔'' سمیرا فکر مند ہوگئی۔

''ہاں، کالج بھی تو اکیلے آتی جاتی ہوں۔ اسٹاپ یہاں سے کتنا دور ہے۔ وہاں سے مجھے وین مل جائے گی۔''

سمیرا نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ نکل پڑی۔ گلی سے نکل کر وہ پارک کے ساتھ والی سڑک پر چلنے لگی جس کے ایک طرف جنگل تھا۔ پورے دارالحکومت میں جابجا اس قسم کے اگائے ہوئے جنگل تھے۔ یہ سڑک آگے جاکر مین روڈ سے ملتی تھی۔ اس وقت یہاں سناٹا اور ویرانی تھی۔ ماریہ کو خوف آنے لگا۔ سرد ہوا درختوں سے ٹکرا کر سنسناتے جیسی مدہم آواز پیدا کررہی تھی اور ماحول کو مزید ڈراؤنا بنا رہی تھی۔ اچانک ماریہ کو ایسا لگا جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ وہ سہم کر رک گئی۔ اس نے آس پاس دیکھا لیکن سڑک پر کوئی نہیں تھا۔ شاید پارک یا جنگل کی طرف سے آواز آئی تھی۔ ماریہ





کے رکتے ہی سناٹا چھا گیا تھا جیسے چلنے والا رک گیا ہو۔ اس نے پھر چلنا شروع کیا اور اس بار اس کے قدم تیز تھے۔ دوسرے قدموں کی آہٹ پھر آنے لگی۔ ماریہ نے سہم کر پارک کی طرف دیکھا مگر بظاہر کوئی نہیں تھا۔ ماریہ تیز قدموں سے سڑک کی طرف جانے لگی۔ اچانک پارک اور سڑک کے درمیان والی جھاڑیوں میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ ماریہ نے اس طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ پلٹی اور اندھادھند بھاگ نکلی۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس کا رخ جنگل کی طرف ہے۔

☆☆☆

ڈی ایس پی عبید دفتر میں بیٹھا ہوا فائلوں میں سر کھپا رہا تھا۔ دارالحکومت کی پولیس میں سہولتیں اور آسانیاں بہت تھیں لیکن ساتھ ہی کام بھی بہت تھے۔ انویسٹی گیشن آفیسر کی حیثیت سے اس کے پاس کئی کیس تھے۔ ان میں ڈکیتی اور قتل کے علاوہ چوری یا دوسرے عام کیسز بھی تھے۔ ایک مہینے پہلے عبید کو ایک کیس دیا گیا تھا۔ ایک یا کئی گروہ بیرون ملک سے گاڑیاں اسمگل کرکے یہاں ان کی دو نمبر رجسٹریشن بنا کر انہیں فروخت کر رہے تھے۔ ایسی کئی گاڑیاں پکڑی گئی تھیں۔ رجسٹریشن آفس میں ان کے کاغذات جعلی نکلے تھے۔ متعلقہ افسران نے ان پر موجود سائن سے انکار کردیا تھا اور ٹیسٹ پر ان کا انکار درست نکلا تھا۔

بہرحال یہ ثانوی درجے کا کیس تھا۔ اصل کیس ڈکیتی اور قتل کے تھے کیونکہ میڈیا میں ان کا چرچا زیادہ ہوتا تھا اور افسران بالا کی طرف سے دباؤ آتا تھا اس لیے عبید کی توجہ اس پر کم تھی۔ کام بہت زیادہ تھا اور اسے اہم کیسز کی طرف توجہ دینی پڑتی تھی۔ اکثر کام کی وجہ سے وہ دیر سے گھر جاتا تھا۔ اس رات بھی وہ دیر سے گھر پہنچا۔ اس کی بیوی شہلا اور بچے انتظار کر رہے تھے کیونکہ اس نے انہیں بچوں کے لیے نئی آنے والی فلم دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے ٹکٹ منگوا لیے تھے۔ وہ گھر پہنچا تو بیوی بچوں کا موڈ خراب تھا کیونکہ فلم شروع ہونے میں صرف آدھ گھنٹا رہ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے انہیں گاڑی میں بٹھایا اور سنیما روانہ ہوگیا۔ وہ اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے کہ فلم شروع ہوگئی۔ بچے تو کچھ دیر میں اپنی کوفت بھول کر فلم میں گم ہوگئے تھے مگر شہلا کا موڈ خراب تھا۔ انہوں نے ڈنر بھی باہر کرنا تھا لیکن جب عبید کو دیر ہوئی تو اس نے بچوں کو گھر میں بنا کر کھلا دیا تھا۔ مارے غصے کے اس نے خود کچھ نہیں کھایا تھا۔ عبید نے اس کا ہاتھ تھام کر سرگوشی کی۔ ''موڈ خراب ہے آئی جی صاحب کا؟''

''بات نہ کریں مجھ سے۔'' وہ دانت پیس کر بولی۔

''سوری یار! اوپر سے آرڈر تھا، ساری فائلیں نمٹا کر اٹھنے کا حکم تھا۔''

''میں نہیں جانتی۔ جب آپ آ نہیں سکتے تھے تو پروگرام کیوں بنایا تھا؟''

''تم جانتی ہو پولیس کی نوکری کیسی ہوتی ہے۔ دن رات، سردی گرمی اور چھٹی کا دن... کچھ پتا نہیں ہوتا کب بلاوا آجائے۔ دفتری روٹین میں تاخیر تو معمول کی بات ہے۔''

عبید کی معذرت کے بعد شہلا کا موڈ کسی قدر بہتر ہوگیا۔ ''میں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔''

''ابھی انٹرویل ہوجائے تو میں لے کر آتا ہوں۔''

انٹرویل میں عبید زنگر برگر اور فرنچ فرائز اور بچوں کے لیے پاپ کارن اور اسی قسم کی چیزیں لے آیا۔ جب وہ واپس گھر جا رہے تھے تو سب بہت خوش تھے۔ البتہ عبید کا تھکن سے بُرا حال تھا۔ وہ صبح چھ بجے کا اٹھا ہوا تھا۔ نہا دھو کر وہ سونے کے لباس میں آیا تو شہلا اس کے لیے دودھ کا گلاس لے آئی۔ اس نے گلاس دیتے ہوئے کہا۔

''شرمین کا فون آیا تھا۔ حامد بھائی آج کل پھر سوتے میں ڈرتے ہیں۔''

عبید سنجیدہ ہوگیا۔ ''وہ بدقسمت ہے۔ حالانکہ اسے اتنی اچھی بیوی ملی ہے اور بیٹا بھی اتنا پیارا ہے۔ لیکن ماضی کا آسیب اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔''

''ان کے ساتھ ہوا بھی بہت بُرا تھا۔'' شہلا نے دکھ سے کہا۔ ''جب سے آپ نے مجھے بتایا کہ بچپن میں ان کے ساتھ کیا سانحہ گزرا، مجھے بچوں کے باہر جانے سے خوف آنے لگا ہے۔''

''اس وقت حالات ایسے نہیں تھے اور وہ واقعہ بھی بس ایک ہی ہوا تھا۔ ورنہ تو ہم جنگلوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ گھر والوں کو فکر بھی نہیں ہوتی تھی۔ آج کل حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ روز قتل، ڈکیتی اور بچے غائب ہونے یا ان کے ساتھ زیادتی کے کیسز سامنے آرہے ہیں۔''

عبید کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑا سترہ سال کا بیٹا حامد تھا۔ وہ کالج میں سیکنڈ ایئر میں تھا۔ اس سے چھوٹی پندرہ سال کی بیٹی امامہ تھی اور پھر بارہ سال کی بیٹی اسما تھی۔ تینوں بچے بہت سمجھ دار اور اچھی سوچ کے مالک تھے۔ ماں باپ نے ان کی تربیت درست انداز میں کی تھی اور ساتھ ہی ان پر کڑی نظر بھی رکھی تھی۔ شہلا نے خالی گلاس لیتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ لوگ پکڑے نہیں گئے تھے؟''

پکڑے گئے تھے۔ ایک سرکاری کنٹریکٹر تھا اور دوسرا اس کا دوست تھا لیکن ثبوت کھلا کر اور اوپر کے اثر رسوخ کی وجہ سے بچ گئے تھے۔"

"ہمارے ہاں مجرموں کو سزا دینے کا رواج نہیں ہے۔" شہد بولی۔

"یہ نظام سے زیادہ اسے چلانے والوں کی کمزوری ہے۔" عبید نے سر ہلایا۔ "میں کل جاؤں گا حامد کی طرف... اگر دیر ہوگئی تو کھانا بھی وہیں کھاؤں گا۔"

"اتوار کو نہ چلیں...؟ بچیاں بھی احمد سے ملنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔"

"نہیں، میں جلد اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" عبید نے کہا اور صبح کا الارم لگانے کے لیے موبائل اٹھالیا۔

☆☆☆

وقاص کے موبائل پر شاہ جی کی کال تھی۔ "مسئلہ ہوگیا ہے۔"

"کیسا مسئلہ؟" وقاص بولا۔ وہ دفتر سے اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا کیونکہ اسے سمیرا کے گھر سے ماریہ کو لینا تھا۔ شاہ جی بتانے لگا کہ ایک گاڑی روک لی گئی تھی۔ پولیس نے کاغذات پکڑ لیے تھے۔ انجن نمبر ذرا مختلف نکل آیا تھا۔ اب گاڑی اور ڈرائیور دونوں بند تھے۔ وقاص غصے میں آگیا۔ وہ شاہ جی کو بے نقط سنانے لگا کیونکہ گاڑیوں کا انتخاب، خریداری، کاغذات کی تیاری اور پھر یہاں تک منتقلی اس کی ذمے داری تھی۔ شاہ جی سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"معاملہ ابھی پولیس کے پاس ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کچھ کھلا پلا کر کام نکل جائے۔"

"کام نکلنا چاہیے۔" وقاص نے کہا۔ "مجھے کل تک بندہ اور گاڑی دونوں آزاد چاہئیں۔" اس نے فون بند کر دیا پھر اس نے چابیاں اٹھائیں اور باہر آکر دفتر بند کیا۔ پیچھے ورکشاپ میں کام جاری تھا۔ اس میں آمد و رفت کا گیٹ الگ تھا۔ نکلنے سے پہلے اس نے ورکشاپ کا ایک چکر لگایا اور وہاں کام کرنے والوں کو ہدایات دے کر روانہ ہوگیا۔ ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ اپنے پرانے علاقے میں پہنچ کر اس نے ماریہ کو کال کی لیکن اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ وقاص فکرمند ہوگیا۔ ماریہ اپنا موبائل کبھی بند نہیں کرتی تھی۔ وقاص کو خیال آیا کہ بیٹری نہ ختم ہوگئی ہو۔ وہ جھنجلا گیا۔ اب اسے گاڑی پارک کے پاس چھوڑ کر سمیرا کے گھر تک پیدل جانا پڑتا۔ لوگوں نے کیاریاں اور آرائشی چیزیں بنا کر گلیاں تنگ کر دی تھیں۔ اس گلی میں اس کی بڑی گاڑی نہیں جاتی تھی۔ اس نے گاڑی پارک کے ساتھ روکی اور اتر کر سمیرا کے گھر تک آیا۔ بیل بجانے پر سمیرا کا باپ شیخ قادر بخش باہر آیا۔ اس نے گرم جوشی سے وقاص سے ہاتھ ملایا اور ماریہ کے بارے میں پوچھنے پر بولا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ چلی گئی ہے لیکن میں سمیرا سے پوچھتا ہوں۔"

سمیرا خود گیٹ پر چلی آئی۔ "انکل، ماریہ تو خود چلی گئی تھی۔ وہ آپ کو کال کر رہی تھی لیکن آپ کا نمبر انگیج جا رہا تھا۔"

"خود کیوں چلی گئی؟ اگر نمبر انگیج جا رہا تھا تو اسے انتظار کرنا چاہیے تھا۔" وقاص نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں اسے کال کر رہا ہوں تو اس کا نمبر بند جا رہا ہے۔"

"نمبر بند جا رہا ہے؟" سمیرا پریشان ہوگئی۔ "انکل! اسے پھر کال کریں۔"

وقاص نے دوبارہ ماریہ کا نمبر ملایا لیکن وہی جواب ملا کہ مطلوبہ نمبر بند ہے۔ اس نے سمیرا سے پوچھا۔ "وہ کتنی دیر پہلے نکلی ہے؟"

"شاید بیس منٹ ہوئے ہیں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وین سے چلی جائے گی۔"

وقاص پریشان تھا۔ سمیرا کے گھر سے اسٹاپ تک درمیان میں سنسان علاقہ آتا تھا جس کے ایک طرف پارک تھا اور دوسری طرف جنگل تھا۔ سردی میں سرِ شام ہی یہاں سناٹا چھا جاتا تھا۔ بیس منٹ کا مطلب تھا کہ ماریہ ابھی گھر نہیں پہنچی ہوگی۔ وہ واپس گاڑی تک آیا اور روانہ ہوتے ہوئے اس نے گھر فاریہ کو کال کی۔ "ماریہ بیس منٹ ہوئے ہیں سمیرا کے گھر سے خود چلی گئی ہے۔ جیسے ہی گھر پہنچے، مجھے موبائل پر کال کرنا۔"

"خود کیوں چلی گئی؟ اسے آپ کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔" فاریہ بھی فکرمند ہوگئی۔

"اس نے کال کی تھی، میرا نمبر انگیج تھا۔ میں نے اسے کال کی تو اس کا نمبر بند جا رہا ہے۔"

فاریہ کی پریشانی بڑھ گئی۔ "خدا خیر کرے... وہ کبھی اپنا موبائل بند نہیں کرتی ہے۔"

"ممکن ہے بیٹری ختم ہوگئی ہو۔ تم پریشان مت ہو، میں گھر آرہا ہوں۔"

مین روڈ پر آنے کے بعد وہ اس عمارت کے پاس سے گزرا جہاں کبھی اس نے عبید اور حامد کے ساتھ فٹ پاتھ پر اپنا نام لکھا تھا اور دو آدمی حامد کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ انہوں





نے اس کے ساتھ زیادتی کی اور پھر اسے جنگل میں پھینک کر چلے گئے۔ جب پولیس نے اسے تلاش کیا تو وہ مرنے کے قریب تھا۔ ہسپتال میں اس کی جان بچ گئی تھی اور جسم کے زخم بھی بھر گئے تھے لیکن روح کے زخم آج بھی تازہ تھے۔ وقاص اس سے کم ملتا تھا کیونکہ اسے حامد کا سامنا کرتے ہوئے ہمیشہ شرمندگی ہوتی تھی۔ اسے لگتا کہ اس کے ساتھ جو ہوا اس میں اس کا بھی قصور ہے۔ ان کی دوستی برقرار تھی لیکن اس میں ایک نامحسوس سا پردہ آگیا تھا۔ وہ جب ملتے، ان کی باتوں اور رویے میں اعتماد کی کمی ہوتی تھی۔

جلد حامد کا خیال اس کے ذہن سے نکل گیا اور ماریہ کی فکر غالب آگئی۔ وہ تیز ڈرائیو کر رہا تھا مگر حدِ رفتار سے تجاوز کرنے سے گریزاں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ٹریفک پولیس والے فوراً پیچھے آجائیں گے اور چالان کے چکر میں اسے دیر ہوگی۔ مزید بیس منٹ بعد وہ اپنے گھر کے سامنے تھا۔ یہاں سارے بڑے مکان تھے۔ کم سے کم نصف کنال پر بنے ہوئے بنگلے اور کوٹھیاں تھیں۔ یہ بنگلا بتانے کے لیے کافی تھا کہ وقاص نے کتنی ترقی کی تھی۔ بیس سال پہلے وہ اپنے باپ کے معمولی سے کوارٹر نما مکان میں رہتا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی اب بھی وہیں تھا۔ وہ تعمیرات کے محکمے میں کام کرتا تھا اس لیے اس نے سرکاری کوارٹر نہایت شاندار بنالیا تھا۔ جیسے ہی اس نے گاڑی روکی فون نے بیل دی۔ اس نے موبائل دیکھا۔ فاریہ کال کر رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"ماریہ نہیں آئی ہے۔" فاریہ رونے والے لہجے میں بولی۔ "آپ کہاں ہیں؟"

"گھر کے سامنے... اندر آرہا ہوں۔" وقاص نے کہا اور موبائل بند کر دیا۔ ماریہ کے نہ آنے کا سن کر اس کے دل کی کیفیت عجیب سی ہونے لگی تھی۔ وقاص نہایت مضبوط اعصاب رکھتا تھا۔ بڑے سے بڑا حادثہ بھی اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا تھا لیکن اس وقت صورتِ حال مختلف تھی۔ وہ ایک جوان بیٹی کا باپ تھا۔ رات ہونے کے باوجود گھر نہیں پہنچی تھی اور اس کا کچھ پتا بھی نہیں تھا۔ وہ اندر آیا تو فاریہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مومل، ایاز اور ریاض گھر میں تھے۔

"ماریہ کہاں ہے؟" فاریہ نے پوچھا۔

وقاص جھنجلا گیا۔ "مجھے نہیں معلوم... میں ابھی کوشش کر رہا ہوں۔"

فاریہ چپ ہو کر آنسو پینے لگی۔ وقاص نے سمیرا کے باپ کا نمبر ملایا۔ "شیخ صاحب! میں وقاص بات کر رہا ہوں... ہاں بات پریشانی کی ہے۔ ماریہ ابھی تک گھر نہیں پہنچی ہے... آپ سمیرا سے بات کرائیں... ہاں بیٹی! وہ نہیں آئی ہے... تمہیں یقین ہے اس نے گھر جانے کو کہا تھا... وہ تمہارے ہاں کب پہنچی تھی... پانچ بجے؟" وقاص کے لہجے میں حیرت آگئی۔ "لیکن کالج سے تو وہ ڈیڑھ بجے نکل جاتی ہے... تمہیں نہیں معلوم ہے... ٹھیک ہے۔"

وقاص نے فون بند کر کے فاریہ کی طرف دیکھا۔ "وہ پانچ بجے سمیرا کے گھر پہنچی تھی... جبکہ کالج سے وہ ڈیڑھ بجے نکل جاتی ہے۔"

فاریہ چونک گئی پھر اس نے وقاص کا بازو پکڑا اور اسے ایک طرف لے گئی۔ "وقاص! میں آپ سے کہتی تھی کہ لڑکی ذات کو اتنی چھوٹ نہ دیں۔"

"مجھے اپنی بیٹی پر اعتماد ہے۔" وقاص نے اپنا بازو چھڑا کر درشت انداز میں کہا۔ "اس کے ساتھ کچھ ہوا ہے، جو وہ گھر نہیں پہنچی ہے۔ ممکن ہے وہ کسی حادثے کا شکار ہوگئی ہو۔"

فاریہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ "کچھ بھی ہو... پلیز اسے تلاش کریں۔"

وقاص نے سر ہلایا۔ اس نے ایاز کو بلایا۔ "شاہ جی اور باؤ کو کال کرو اور ان کے ساتھ جا کر اسپتالوں میں دیکھو۔"

"ٹھیک ہے پاپا۔"

ایاز کے جانے کے بعد وقاص نے عبید کا نمبر ملایا لیکن وہ بند جا رہا تھا۔ وقاص سمجھ گیا کہ وہ گھر والوں کے ساتھ تفریح کرنے نکلا ہے۔ صرف اسی صورت میں اس کا موبائل نمبر بند ہوتا تھا۔ اس نے عبید کو میسج کر دیا کہ ایمرجنسی ہے، جیسے ہی فون آن کرے اس سے رابطہ کرے۔ اب اسے پولیس اسٹیشنز میں جا کر خود دیکھنا تھا۔

☆☆☆

حامد نے چھٹیاں لی ہوئی تھیں۔ وہ جس ڈاکٹر کے زیرِ علاج تھا اس نے اسے ایک ہفتہ آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ دفتر میں اس کی سال کی خاصی چھٹیاں جمع تھیں اس لیے اس نے چھٹی کی درخواست دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ہفتے بھر کی چھٹی کر لی۔ احمد کو اسکول چھوڑ کر وہ کچھ ضروری کام نمٹانے چلا گیا۔ پھر واپس آکر احمد کو اسکول سے لیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے مسرور لہجے میں حامد کو بتایا۔ "پاپا! میں نے پہلے دن تین دوست بنالیے ہیں۔ وہ سب ہمارے گھر کے پاس رہتے ہیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ ان کے ساتھ شام کے وقت کھیل سکیں گے۔"

"پاپا! میرے پاس بال نہیں ہے۔"

"میں آپ کے لیے بال لے آؤں گا۔" حامد نے اس سے وعدہ کیا۔

شرمین نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ کھانے کے بعد حامد نے گھر میں کئی ہفتوں سے التوا میں پڑے کام نمٹائے۔ ایک واش روم کا نل مسئلہ کر رہا تھا، اسے تبدیل کیا۔ دو تین بجلی کے بٹن خراب ہو گئے تھے، انہیں بھی بدل دیا۔ اس قسم کے چھوٹے موٹے کام وہ خود کر لیتا تھا بس اسے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اب فرصت تھی تو اس نے سوچا یہ کام نمٹا دوں۔ مکان کے عقب کی دیوار بارش سے خراب ہو رہی تھی۔ اس کا رنگ اتر گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اچھا والا پلاسٹک پینٹ لا کر کر دے کیونکہ بارش دیر تک ہوتی تو دیوار کی سیلن اندر تک آجاتی تھی جس سے اندر کی دیوار کا رنگ بھی متاثر ہو رہا تھا۔ اور بھی کچھ چھوٹے موٹے کام تھے جنہیں اس نے اپنی چھٹیوں میں نمٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔ سوئچ بورڈ سے بٹن تبدیل کرتے ہوئے اسکرو ڈرائیور سلپ کرنے سے اس کے ہاتھ کی پشت زخمی ہو گئی تھی۔ زخم گہرا نہیں تھا لیکن لمبا تھا۔ اس نے روئی پر ڈیٹول لگا کر صاف کر دیا اور پٹی نہیں کی۔ پٹی شرمین کی نظروں میں آجاتی تو وہ پریشان ہوتی۔ وہ ویسے ہی اس کی طرف سے پریشانی میں رہتی تھی۔ کام نمٹا کر اس نے کچھ دیر ٹی وی دیکھا۔ شرمین، احمد کو لے کر سونے چلی گئی۔ وہ دوپہر میں سونے کی عادی تھی۔ پانچ بجے اٹھ کر اس نے حامد کو چائے بنا کر دی اور رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ حامد تیار ہوا۔ سردی کی مناسبت سے اس نے جیکٹ پہن لی تھی۔ شرمین نے پوچھا۔

"باہر جا رہے ہیں؟"

"ہاں، کچھ منگوانا ہے تو بتاؤ، مجھے بھی کچھ چیزیں لینا تھیں۔"

"نہیں، کچھ نہیں منگوانا۔"

"پاپا! میری بال۔" احمد نے یاد دلایا۔

"ہاں بیٹا، وہ بھی لاؤں گا۔ مجھے یاد ہے۔" حامد نے اسے تسلی دی اور گھر سے نکل آیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور سردی بڑھ گئی تھی۔ اس نے پارک والی سڑک سے جانے سے گریز کیا اور پارک کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

عدنان ہوٹل جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی شام چھ سے رات دو بجے تک تھی۔ ملازموں کو لانے اور چھوڑنے کے لیے ہوٹل کی گاڑیاں تھیں لیکن عدنان اس لیے نہیں جاتا تھا کہ ماں کو اتنی رات گئے نیند سے اٹھ کر دروازہ نہ کھولنا پڑے۔ اسے ماں اور بھائی سے بہت محبت تھی۔ اس کی تیسری محبت ماریہ تھی۔ نائٹ یا ایوننگ شفٹ کی صورت میں وہ ہوٹل میں ملازمین کے لیے مخصوص کمرے میں رک جاتا تھا۔ وہیں اپنی نیند پوری کر کے وہ صبح... کلاس لینے چلا جاتا تھا اور بارہ بجے گھر آجاتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار ماریہ اس سے ملنے آتی تھی۔ وہ دونوں نزدیکی پارک میں ملتے تھے۔ باہر کچھ کھاتے پیتے تھے۔ عدنان کی ماں سعدیہ، ماریہ سے واقف تھی۔ ایک بار عدنان اسے گھر لایا تھا اور ماریہ بہت شرماتے ہوئے سعدیہ سے ملی تو وہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔ سعدیہ نے بیٹے سے کہا۔

"میں ابھی جا کر بات کر لیتی ہوں۔ کہیں اس کے گھر والے کہیں اور بات نہ طے کر دیں۔"

"نہیں امی... پہلے میں اپنا کورس کر لوں اور میری ترقی ہو جائے۔ ابھی تو میں کلرک ہوں اور ماریہ کا باپ بہت دولت مند ہے۔ وہ ایک کنال کے گھر میں رہتے ہیں۔ بس میری حیثیت اتنی ہو جائے کہ وہ انکار نہ کر سکیں۔ اور جہاں تک کسی دوسرے رشتے کا تعلق ہے تو ماریہ کی مرضی کے بغیر کہیں اس کی بات نہیں ہو سکتی۔"

عدنان دوسری بار ماریہ کو اپنے گھر لے کر نہیں گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو ماریہ سے ہونے والی ملاقاتوں کے بارے میں نہیں بتاتا تھا لیکن جس دن وہ ماریہ سے مل کر آتا تھا، سعدیہ کو خود پتا چل جاتا تھا۔ عدنان عام طور سے پانچ بجے گھر سے نکلتا تھا۔ ایک گھنٹے میں وہ ہوٹل پہنچ جاتا۔ گاڑی اسے بس اسٹاپ سے پک کر لیتی تھی لیکن دوسرے ملازمین کو لیتے ہوئے وقت لگ جاتا تھا۔ آج وہ لیٹ ہو گیا تھا اس لیے وہ چھ بجے جا رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکلا تو لاؤنج میں نعمان اور اس کا دوست شفیق بیٹھے تھے۔ عدنان کا چہرہ سخت ہو گیا۔ اس نے اشاروں میں نعمان سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ نعمان نے بتایا کہ وہ اور شفیق اپنے آنے والے ٹیسٹ کی تیاری کر رہے ہیں۔ عدنان کو ان کے پاس کتاب یا ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ وہ ان کی خبر لیتا لیکن اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے اشاروں میں نعمان سے کہا۔

"میں تم سے کل بات کروں گا۔"

نعمان سترہ سال کا ہو رہا تھا اور میٹرک میں تھا۔ دونوں بھائیوں میں بہت محبت تھی۔ خاص طور سے نعمان اس کا دیوانہ تھا۔ بھائی کی بات اس کے لیے پتھر پر لکیر ہوتی تھی لیکن وہ پڑھنے میں بے پروا تھا۔ اس کا دوست شفیق گونگا تھا اور دونوں گونگوں بہروں کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ گھر سے نکل کر پارک کی طرف آیا۔ بس اسٹاپ تک جانے کا شارٹ کٹ اسی طرف سے پڑتا تھا۔ اسے نزدیکی مارکیٹ میں اپنے کورس کے حوالے سے ایک کتاب تلاش کرنی تھی مگر وقت نہیں تھا۔ وہ کتاب لینے جاتا تو ہوٹل ملازمین کو لے جانے والی دوسری وین بھی نکل جاتی۔ وہ پارک میں داخل ہوا تو تاریکی چھانے والی ہی تھی۔

☆☆☆

حامد گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹ پر تھا اور انگلیاں خون آلود ہو رہی تھیں۔ چلتے ہوئے اسے تکلیف ہو رہی تھی لیکن وہ ہمت کر کے چل رہا تھا۔ ساڑھے سات بجے وہ گھر میں داخل ہوا تو شرمین اسے دیکھ کر چونکی اور پھر خون دیکھ کر بدحواس ہو گئی۔ "میرے خدا... حامد، یہ کیا ہوا ہے؟ آپ کا کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟"

شور سن کر احمد نشست گاہ سے نکل آیا جہاں وہ ٹی وی پر ویڈیو گیم کھیل رہا تھا۔ وہ چلایا۔ "پاپا خون..."

"احمد! آپ اندر جاؤ۔" حامد نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔

احمد خاموشی سے واپس چلا گیا۔ شرمین اسے سہارا دے کر کمرے میں لائی۔ اسے بستر پر لٹا کر جیکٹ اور شرٹ اوپر کر کے اس کے زخم کا جائزہ لیا۔ پھر پریشان لہجے میں بولی۔ "آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہوگا۔"

"نہیں، گہرا زخم نہیں ہے۔ ایک بائک والے نے مار دیا تھا۔"

شرمین باتھ روم سے میڈیکل کٹ لے آئی۔ پہلے مدر ٹنکچر روئی پر لگا کر زخم صاف کیا۔ حامد دانت بھینچ کر تکلیف برداشت کرتا رہا۔ ذرا دیر میں شرمین نے زخم صاف کر دیا۔ زخم کو ٹانکوں کی ضرورت تھی لیکن اس کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔ مدر ٹنکچر نے زخم جلا کر خون روک دیا تھا۔ شرمین نے اس پر خشک کرنے والا پاؤڈر چھڑکا اور چکنی پٹی رکھ کر اوپر سے ٹیپ لگا دیا۔ پھر حامد کو ایک پین کلر اور ایک اینٹی بایوٹک کیپسول دیا۔ وہ اس کے لیے دودھ لے آئی تھی۔ حامد دودھ پیتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھا۔ اس نے گلاس اٹھایا تو شرمین نے اس کے ہاتھ کا زخم دیکھ لیا۔

"یہ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، چوٹ لگی تھی۔" حامد نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"آپ بتاتے کیوں نہیں ہیں... کیا ہوا ہے؟" شرمین تقریباً چیخ اٹھی۔ وہ بھی حامد کی طرح بہت جلد نروس ہو جاتی تھی۔

"ایک بائک والے نے ٹکر مار دی تھی۔" حامد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "اس کا ہینڈل میرے پیٹ پر لگا۔ اگر براہِ راست لگتا تو میرے پیٹ میں گھس جاتا۔ لیکن ترچھا لگا تھا اس لیے بچ گیا۔"

"آپ نے اسے پکڑا نہیں؟ اسے تو پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے تھا۔"

"نہیں، میرا قصور بھی تھا۔ میں سوچوں میں گم تھا اور اسے آتے نہیں دیکھ سکا۔ بالکل آخری وقت میں دیکھا تھا اسی لیے بچ بھی گیا پھر گرنے کے بعد مجھے کچھ دیر ہوش نہیں رہا تھا۔"

"یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟"

"شاید ایک گھنٹا پہلے کی۔"

حامد خالی ہاتھ تھا۔ شاید اسے مارکیٹ تک جانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور اس سے پہلے حادثہ پیش آگیا۔ شرمین دکھی لہجے میں بولی۔ "آپ اتنا کھو کیوں جاتے ہیں؟... خدانخواستہ کوئی بڑی گاڑی ہوتی تو..."

"تو کچھ نہیں، میں اسپتال میں ہوتا یا مردہ خانے میں۔" حامد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"پلیز! ایسی باتیں مت کریں۔" شرمین رو دی۔ "خدا آپ کو محفوظ رکھے۔ آپ کے سوا ہمارا ہے ہی کون...؟"

"جن کا کوئی نہیں ہوتا، ان کا بھی خدا ہوتا ہے۔" حامد نے سنجیدگی سے کہا اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔ "ابھی میں کھانا نہیں کھاؤں گا، مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ آرام کریں۔"

"احمد پریشان ہوگا، اسے تسلی دینا کہ مجھے معمولی سی چوٹ لگی ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔"

"میں اس کی بال نہیں لا سکا، کل لا دوں گا۔"

"میں سمجھا دوں گی۔" شرمین نے سر ہلایا اور لائٹ بند کر کے کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

عبید نے موبائل آن کیا۔ اس کی عادت تھی جب بیوی بچوں کے ساتھ کہیں تفریح پر جاتا تو موبائل آف کر دیتا تھا تاکہ اسے ایمرجنسی میں نہ بلایا جا سکے۔ عبید اپنے کام سے لگن رکھنے والا ایماندار آفیسر تھا اسی لیے ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا۔ یہ نصف کنال کا گھر اس کے دو بھائیوں کی

کوششوں سے بنا تھا جو سعودی عرب میں ملازمت کرتے تھے۔ عبید نے باپ کی اچانک موت کے بعد بڑے بھائی کی ذمے داریاں نبھاتے ہوئے دونوں بھائیوں کو پڑھایا اور دو بہنوں کی شادی کی۔ وہ سب باپ کی طرح اس کی عزت کرتے تھے۔ باپ کو ملنے والا سرکاری کوارٹر فروخت کرکے انہوں نے یہ پلاٹ لیا تھا۔ اس پر تین منزلہ مکان کی تعمیر دونوں بھائیوں نے کی اور اب وہ شادی شدہ تھے اور اوپر ان کی فیملیاں تھیں۔ مکان تینوں بھائیوں کے نام پر تھا۔ عبید کے دونوں بھائی بہت اچھا کماتے تھے جبکہ عبید کا اپنی تنخواہ اور گاؤں میں زمینوں سے آنے والی رقم سے گزارہ ہو جاتا تھا۔

موبائل آن کرتے ہی کچھ دیر میں میسج آ گیا۔ وقاص کا نام دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اس نے میسج کھولا۔ ایمرجنسی کا پڑھ کر اس کی پیشانی پر شکنیں آ گئیں۔ وقاص سے اس کی بچپن کی دوستی تھی لیکن شادی کے بعد وہ بتدریج اس سے اور حامد سے دور ہو گیا تھا۔ دوستی کا رشتہ اب بھی برقرار تھا لیکن اس میں پہلے جیسی گہرائی اور وسعت نہیں رہی تھی۔ اس سے پہلے وقاص نے کسی ایمرجنسی میں اس سے رابطے کو نہیں کہا تھا۔ اس نے کال ملائی تو شہلا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ شب خوابی کا لباس پہن کر آ گئی تھی۔ عبید نے آنکھوں سے اسے اشارہ کیا کیونکہ وقاص نے کال ریسیو کر لی تھی۔

"عبید بات کر رہا ہوں، خیریت...؟"

"نہیں یار۔" وقاص لہجے سے بہت پریشان لگ رہا تھا حالانکہ وہ شدید دباؤ میں بھی پُرسکون رہنے والوں میں سے تھا۔ "ماریہ غائب ہے۔"

عبید چونک کر بیٹھ گیا۔ "ماریہ غائب ہے... کیا مطلب؟"

شہلا یہ سنتے ہی تیزی سے اس کے پاس آئی اور موبائل سے کان لگا دیا۔ وقاص کہہ رہا تھا۔ "مطلب یہ کہ غائب ہے۔ تم پولیس والے ہو، تمہیں پتا ہوگا کہ لوگ کیسے غائب ہوتے ہیں۔"

"تم جذباتی ہو رہے ہو۔" عبید نے اسے ٹوک دیا۔

"ہاں کیونکہ میں ایک جوان بیٹی کا باپ ہوں اور وہ چھ گھنٹے سے لاپتا ہے۔" وقاص چلّایا۔ "ہم تمام اسپتال، مردہ خانے اور پولیس اسٹیشن دیکھ چکے ہیں لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔"

"تم کہاں ہو؟"

"میں پرانے علاقے کے پولیس اسٹیشن میں ہوں جہاں آخری بار ماریہ کو دیکھا گیا ہے۔"

عبید نے پولیس اسٹیشن کا معلوم کیا اور بولا۔ "میں آ رہا ہوں۔"

شہلا پریشان ہو گئی۔ عبید بستر سے اٹھا تو اس نے کہا۔ "میرے خدا! وہ کتنی معصوم اور پیاری سی بچی ہے۔ خدا کرے، وہ خیریت سے ہو۔"

عبید نے کپڑے بدلتے ہوئے کہا۔ "تم فون کرکے فاریہ بھابی کو تسلی دو۔"

"میں بھی چلتی ہوں۔ آپ مجھے ان کے ہاں چھوڑ دیجیے گا۔ اس وقت انہیں ہماری ضرورت ہے۔"

عبید نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے لیکن پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ میں اوپر بتا دیتا ہوں۔ وہ لوگ بچوں کا خیال رکھیں گے۔"

عبید تیار ہو کر اور اوپر بتا کر آیا تو شہلا بھی تیار ہو گئی تھی۔ اس نے صرف کپڑے بدلے تھے۔ سوئٹر پہنا تھا اور شال کے ساتھ پرس بھی لے لیا تھا۔ بچے سو رہے تھے۔ اوپر سے عبید کے بھائی کی بیوی آ گئی تھی۔ وہ بچوں کو دیکھ لیتی۔ عبید نے پہلے پولیس اسٹیشن کا رخ کیا۔ وہاں وقاص ڈیوٹی پر موجود پولیس افسر سے جھگڑ رہا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کو تلاش کرے اور اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھائے۔ عبید کو دیکھ کر اس نے کہا۔ "عبید! میری بیٹی چھ گھنٹے سے غائب ہے اور یہ کچھ کرنے کے لیے صبح کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ڈیوٹی پر موجود اے ایس آئی ایک ڈی ایس پی کو دیکھ کر مستعد ہو گیا۔ "جناب! یہ صاحب پوری بات بتا نہیں رہے ہیں اور صرف چیخ چلا رہے ہیں۔"

"تم نے ایف آئی آر درج کرا دی؟" عبید نے وقاص سے پوچھا۔

"وہ بھی درج ہو جائے گی لیکن پہلے یہ کچھ کریں تو..."

عبید اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ "وقاص! یہ مسئلہ قانونی ہے، جذبات سے حل نہیں ہوگا۔ تمہیں معلوم ہے قانونی طریقہ کار پورا کیے بغیر کارروائی آگے نہیں بڑھتی ہے۔"

وقاص نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔ "مجھے قانون مت پڑھاؤ۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے، جتنی قانون شکنی قانون کے رکھوالے کرتے ہیں اتنی تو مجرم بھی نہیں کرتے۔ بااثر لوگوں کے لیے یہی پولیس بغیر کسی رپورٹ کے حرکت میں آ جاتی ہے۔"





"وہ بااثر ہوتے ہیں لیکن ہم دونوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہے۔ ہمارا تعلق عام طبقے سے ہے۔ دوسرے میں خود کوئی غیر ضابطہ کام کرنا پسند نہیں کرتا۔"

"تمہارے یہاں تک آنے کا شکریہ۔" وقاص نے ... میں کہا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اب تم پرانی دوستی کا خیال بھی نہیں کرو گے۔"

... کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے خود پر ضبط کرنا پڑ رہا ہے۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "وقاص! مجھے تمہارے جذبات کا اندازہ ہے لیکن میں ایک بار پھر کہوں گا کہ قانونی طریقہ کار اپناؤ۔ اس کے بعد ہی میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں گا۔"

وقاص کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر یک دم اس کے شانے ڈھلک گئے۔ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ "جوان بیٹی کا باپ کتنا مجبور ہو جاتا ہے، یہ مجھے آج پتا چلا۔"

چند منٹ بعد وہ ایف آئی آر لکھوا رہا تھا۔ اس میں اس نے حاصل شدہ تمام معلومات بیان کر دی تھیں۔ ایف آئی آر درج ہوتے ہی عبید نے اس کی کاپی حاصل کی اور اے ایس آئی سے انویسٹی گیشن والوں کے نام درخواست بھی حاصل کر لی کہ وہ اس کیس کو دیکھیں۔ اے ایس آئی نے بادل ناخواستہ اس کے حکم پر عمل کیا۔ عام طور سے پولیس والے اپنا کیس کسی کو نہیں دیتے ہیں مگر وہ ڈی ایس پی کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ عبید نے اسے حکم دیا کہ چھ سات افراد کی نفری تیار رکھے۔ ممکن ہے انہیں تلاش کے لیے جانا پڑے۔ وہ وقاص کے ساتھ باہر آیا تو شاہ جی اور باؤ بھی وہاں آ گئے تھے۔ وقاص انہیں دیکھتے ہی تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور کچھ کہنے لگا۔ جب تک عبید ان کے پاس آتا، وہ بات ختم کر چکا تھا۔ وقاص نے ان دونوں کا تعارف کرایا۔

"یہ شاہ زیب اور یہ رفیق تاجی میرے دوست ہیں۔ ماریہ کی تلاش میں میری مدد کر رہے ہیں۔ اور یہ..."

"ڈی ایس پی صاحب کو کون نہیں جانتا۔" شاہ زیب نے عبید سے ہاتھ ملایا۔

"میں تم دونوں کی مدد کا شکر گزار ہوں۔ اب تم لوگ آرام کرو۔" وقاص نے کہا تو وہ دونوں فوراً چلے گئے۔ ایاز بھی آیا تھا لیکن وہ دوسری گاڑی میں تھا۔ عبید نے وقاص سے کہا۔ "اب میں تمہارے گھر چلوں گا۔ شہلا میرے ساتھ ہے۔"

"بھابی آئی ہیں؟" وقاص چونکا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا... چلو۔"

## اچھی باتیں

اللہ تعالیٰ تین دعاؤں کو قبول فرماتا ہے:

☆ والدین کی دعا اولاد کے حق میں۔

☆ مسافر کی دعا مقیم کے حق میں۔

☆ مظلوم کی دعا۔

اللہ تعالیٰ ایسے مردوں پر لعنت کرتا ہے جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں اور ایسی عورتوں پر لعنت کرتا ہے جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔ (بخاری)

اللہ تعالیٰ تمہاری شکل و صورت اور دولت کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہاری نیت اور عمل کو دیکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ (لوگ) گونگے بہرے اور یقیناً تمام جانداروں سے بدتر ہیں جو عقل سے کچھ کام نہیں لیتے۔ (سورۂ انفال)

(مرسلہ: شاہینہ ناز بٹ، لاہور)

وہ سب اپنی اپنی گاڑیوں میں وقاص کے گھر پہنچے تھے۔ فاریہ کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ پھر بلک اٹھی۔ "میری بچی..."

شہلا نے اسے گلے لگایا۔ "تم فکر مت کرو، ماریہ مل جائے گی۔"

عبید کے اشارے پر شہلا، فاریہ اور موبل کو اندر لے گئی۔ ایاز بھی اندر چلا گیا۔ عبید اور وقاص نشست گاہ میں رک گئے۔ عبید نے کہا۔ "اب مجھے ساری بات تفصیل سے بتاؤ۔"

"میں ایف آئی آر میں سب لکھوا چکا ہوں۔"

عبید نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا اندازہ ہے کہ بہت کچھ تم نے ایف آئی آر میں نہیں لکھوایا ہے۔ اچھا، میرے کچھ سوالوں کا جواب دو۔ ماریہ، سمیرا کے گھر کب پہنچی تھی؟"

"پانچ بجے۔" وقاص بولا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ماریہ سمیرا کے گھر کب پہنچی تھی مگر اسے معلوم تھا کہ عبید، سمیرا اور اس کے گھر والوں سے معلوم کرے گا اور اسے پتا چل جائے گا اس لیے اس نے بتا دیا۔

"پانچ بجے سے پہلے وہ کہاں تھی؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" وقاص سپاٹ لہجے میں بولا۔ "کالج سے وہ ڈیڑھ بجے نکل جاتی ہے۔"

"یعنی ڈیڑھ بجے سے پانچ بجے تک وہ کہاں رہی اس کا علم کسی کو نہیں ہے؟"

وقاص اس کے انداز پر تیز لہجے میں بولا۔ "عبید! میں

ماریہ پر شک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"
"لیکن پولیس کی گاڑی شک کے بغیر آگے نہیں بڑھتی ہے۔" عبید نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ ماریہ گھر آنے کے لیے نکلی تھی؟"
"ہاں۔"
"تمہارے پاس شہر کا نقشہ ہے؟"
وقاص ایک مفصل نقشہ لے آیا جو پلاسٹک پر خوب صورتی سے چھپا ہوا تھا۔ عبید نے نقشہ میز پر بچھایا اور دونوں اس پر جھک گئے۔ عبید نے انگلی رکھی۔ "یہاں سمیرا کا گھر ہے... یہ ہمارا پرانا محلہ ہے۔ بس اسٹاپ تک جانے کے دو راستے ہیں، ایک پارک سے گزرتا ہے لیکن پارک میں گھنے درخت ہیں اور کوئی لڑکی یا عورت شام کے بعد وہاں سے اکیلی نہیں گزر سکتی ہے۔ ماریہ یقیناً سڑک کی طرف سے گئی ہو گی۔ یہ اسٹاپ ہے اور چلتا ہوا مین روڈ ہے یہاں سے اسے وین مل جاتی۔ فرض کرتے ہیں ماریہ وہاں سے نکل گئی تھی اور وین میں بیٹھ گئی تھی... اب وہ کہاں آکر اترے گی؟"
"یہاں۔" وقاص نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ "ہمارے گھر سے اسٹاپ صرف دو گلی دور ہے۔"
"یہ راستہ سنسان ہے؟"
"بالکل بھی نہیں... یہ سارا علاقہ بہت پُر رونق ہے۔ رات دس گیارہ بجے تک اس موسم میں بھی چہل پہل رہتی ہے۔"
"ماریہ کے ساتھ کچھ ہوا ہے تو ان تین جگہوں پر ہوا ہے۔ ایک سمیرا کے گھر سے بس اسٹاپ تک، دوسرے سفر کے دوران وین میں... تیسرا اس علاقے کے بس اسٹاپ سے گھر تک۔ یہ بتاؤ کہ اگر کوئی اسے اسٹاپ پر لفٹ کی آفر کرے تو کیا وہ قبول کر لیتی؟"
وقاص نے فوراً انکار کر دیا۔ "ہرگز نہیں... وہ ذہین اور باشعور لڑکی ہے۔ وہ کبھی ایسی آفر قبول نہیں کر سکتی ہے۔"
"میرا بھی یہی اندازہ ہے۔ وہ ٹیکسی میں بھی سفر نہیں کر سکتی ہے۔ یعنی وہ بس اسٹاپ تک آئی ہو گی تو لازمی وین میں بیٹھی ہو گی۔ اس روٹ پر مسلسل وین چلتی ہیں اور ہر پانچ منٹ بعد وین آتی ہے۔ وین میں کوئی اس کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے اور نہ اغوا کر سکتا ہے۔ یہاں بس اسٹاپ پر رونق ہوتی ہے اور راستہ بھی سنسان نہیں ہے، آباد اور پُر رونق ہے۔ اس لیے یہاں اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو لازمی اس کا چرچا ہوتا اور پولیس کو اطلاع دی جاتی۔ یہاں موجود لوگ صاحب حیثیت ہیں اور کوئی اس ڈر سے اطلاع نہیں چھپاتا کہ پولیس بعد میں اسے پریشان کرے گی۔"
وقاص رفتہ رفتہ پُرسکون ہو رہا تھا۔ عبید کی باتوں سے اسے امید ہو چلی تھی کہ وہ درست انداز میں تفتیش کر کے ماریہ کا پتا چلا لے گا۔ اس دوران میں شہلا آئی اور ان کے سامنے چائے رکھ کر چلی گئی۔ عبید نے چائے کا گھونٹ لیا اور بولا۔
"اب ایک ہی جگہ رہ جاتی ہے جہاں ماریہ کے گم ہونے یا اس کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آنے کا امکان ہے۔" اس نے نقشے پر پرانے علاقے میں پارک اور جنگل والی سڑک پر انگلی رکھی۔ "میرا خیال ہے کہ ماریہ کے ساتھ یہیں کچھ ہوا ہے اور ہمیں تلاش کا آغاز یہیں سے کرنا چاہیے۔"
"تب جلدی کرو، وہ بالکل ویران جگہ ہے۔ جنگل بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔" وقاص بے چین ہو گیا...... "خدانخواستہ اسے نقصان نہ ہو جائے۔"
عبید نے اپنے دفتر کا نمبر ملایا۔ وہ انویسٹی گیشن آفس میں ہوتا تھا۔ اس نے ڈیوٹی پر موجود افسر سے چھاپا مار اور تلاش کرنے والی پارٹی مذکورہ علاقے میں بھیجنے کی ہدایت کی اور کہا کہ پارٹی کا انچارج اس کے موبائل نمبر پر اس سے رابطہ کرے۔ پھر اس نے ریسکیو والوں کو کال کی اور ان سے ماریہ کی تلاش کے لیے آدمی بھیجنے کو کہا۔ یہ دونوں کام کر کے وہ کھڑا ہو گیا۔ "اب تم آرام کرو۔ میں موقع پر جا کر معاملہ دیکھتا ہوں۔"
وقاص کھڑا ہو گیا۔ "سوری یار... شروع میں ذرا جذباتی..."
"کوئی بات نہیں، دوستوں میں ہوتا ہے۔ ماریہ تمہاری ہی نہیں، میری بھی بیٹی کی طرح ہے۔ اگر میری بیٹی بھی غائب ہو جاتی تو میں اسے باپ بن کر نہیں بلکہ پولیس والا بن کر ہی تلاش کرتا۔" عبید نے کہا اور وقاص کا شانہ تھپک کر باہر آگیا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے شہلا کا نمبر ملایا۔
"میں ایک جگہ ماریہ کی تلاش کے لیے جا رہا ہوں۔ تم یہیں رکو۔"
"فاریہ کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے اسے ٹرنکولائزر دے کر سلا دیا ہے۔"
"تم نے ٹھیک کیا۔ اب تم بھی آرام کرو، پتا نہیں کل کا دن اس گھر کے لیے کیا پیغام لاتا ہے۔"
شہلا ہراساں ہو گئی۔ "عبید! کیا کوئی خطرے کی بات بھی ہے؟"
"جوان لڑکی کی گم شدگی سے زیادہ خطرناک بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے وہ اب زندہ نہ ہو۔"





"...للہ نہ کرے۔" فاریہ نے بے ساختہ کہا۔ "فاریہ مر جائے گی۔"
"کیا کہہ سکتے ہیں۔" عبید نے ٹھنڈی سانس لی۔ "...تم ذہنی طور پر ہر صورت حال کے لیے تیار رہو اور فی الحال لیٹ کر آرام کرو۔"
عبید نے موبائل بند کر دیا اور تیزی سے ڈرائیو کرنے لگا۔ یہ اس کی ذاتی گاڑی تھی۔ اس میں وائرلیس نہیں تھا ورنہ وہ تلاش کے لیے جانے والی پولیس پارٹی سے رابطہ کر لیتا۔

☆☆☆

شرمین کسی قدر پریشان سی نشست گاہ میں بیٹھی تھی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ احمد اپنے کمرے میں سو چکا تھا۔ حامد بھی سو رہا تھا۔ شرمین کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ اسے لگ رہا تھا حامد نے اس سے غلط بیانی کی ہے۔ اس کی چوٹ کی وہ وجہ نہیں تھی جو وہ بیان کر رہا تھا۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔ نہ تو پھٹے تھے اور نہ ان پر مٹی لگی تھی۔ صرف شرٹ پر سامنے جہاں زخم تھا، اس جگہ رگڑ جیسا نشان تھا۔ زخم ایسا تھا جیسے سخت نکیلی لکڑی سے ہوتی اور کسی قدر گہری خراش آجائے۔ اس میں کھال تقریباً کٹ جاتی ہے۔ آخر حامد نے اس سے جھوٹ کیوں بولا؟ ہاتھ کے زخم کے بارے میں بھی اس نے ٹال دیا تھا۔ حامد صرف دودھ لے کر سو گیا تھا۔ شرمین نے اسے جو پین کلر دی تھی وہ مسکن بھی تھی اور اس سے نیند آتی تھی۔ خود اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے اس نے کھانا نہیں کھایا۔ سب اٹھا کر ویسے ہی فریج میں رکھ دیا اور صرف چائے بنا کر پی لی۔
اچانک کال بیل بجی تو وہ چونک گئی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے، وہ حیران رہ گئی۔ تین گھنٹے سے وہ اسی جگہ بیٹھی سوچ رہی تھی۔ اس وقت کون آسکتا ہے؟ اس نے خود سے کہا۔ اسے خیال آیا کہ حامد کو اٹھا دے لیکن پھر اس کی تکلیف کا سوچ کر وہ خود دروازے تک آئی۔ مکان محفوظ تھا۔ اس نے گیٹ کے پاس آکر پوچھا۔
"کون ہے؟"
"بھابی میں عبید ہوں۔"
وہ حیران ہوئی اور دروازہ کھول دیا۔ "عبید بھائی! آپ اس وقت... خیریت تو ہے؟"
عبید اکیلا تھا۔ "نہیں بھابی خیریت نہیں ہے۔ ماریہ غائب ہے۔"
"میرے خدا..." شرمین کے منہ سے نکلا۔ وہ عبید کو اندر لے آئی۔ باہر سردی بہت تھی اور اس طرح دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ "یہ کیسے ہوا؟"
"وہ اپنی سہیلی سمیرا کے ہاں آئی تھی۔ یہاں سے چند گلی دور رہتی ہے۔"
"میں جانتی ہوں۔" شرمین نے سر ہلایا۔ "میرے ساتھ اس کی امی بھی درس میں جاتی ہیں۔"
"ماریہ شام چھ بجے کے آس پاس سمیرا کے گھر سے نکلی اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔"
"اللہ خیر کرے... پولیس اسے تلاش کر رہی ہے؟"
"ہاں، نزدیکی پارک کے ساتھ والے جنگل میں دیکھ رہے ہیں۔ میں پولیس اور ریسکیو پارٹی کے ساتھ تھا۔ سوچا آپ لوگوں سے بھی مل لوں۔ ممکن ہے آپ کو اس کے بارے میں کچھ پتا ہو۔"
"لیکن ہم ماریہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"
"پولیس مفروضات پر کام کرتی ہے۔ ممکن ہے آپ جانتے ہوں اور اس کی گم شدگی سے بے خبر ہوتے لہٰذا اس بات کی کوئی اہمیت بھی نہ ہوتی۔ لیکن پولیس کو وہ بات پتا چل جاتی تو ہمیں ماریہ کو تلاش کرنے میں مدد ملتی۔"
"مثلاً ہم ماریہ کے بارے میں کیا جان سکتے ہیں؟" شرمین سرد لہجے میں بولی۔ واضح طور پر اسے عبید کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔
"مثلاً یہ کہ آپ نے یا حامد نے ماریہ کو کسی کے ساتھ دیکھا ہو اور آپ لوگوں کے نزدیک یہ بات اہم نہ ہو۔"
شرمین نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے پچھلے کئی مہینے سے ماریہ کو نہیں دیکھا ہے۔"
"حامد... ممکن ہے اس نے کچھ دیکھا ہو۔"
"وہ نہیں دیکھ سکتے۔ چھ بجے سے پہلے وہ گھر آگئے تھے۔" شرمین نے کہا۔ "وہ شام کو گئے تھے تو ان کو کسی بائیک والے نے ٹکر مار دی تھی۔ پیٹ اور ہاتھ میں چوٹ آئی ہے۔ ابھی دوا کھا کر سو رہے ہیں۔"
"اوہ... پہلے کیوں نہیں بتایا؟" عبید فکر مند ہو گیا۔ "اس نے ڈاکٹر کو دکھایا؟"
"نہیں، زخم بہت گہرا نہیں ہے۔ میں نے خود ڈریسنگ کر دی تھی۔ امید ہے دو تین دن میں ٹھیک ہو جائیں گے۔"
"ٹھیک ہے، میں کل آؤں گا۔ اگر زخم خشک نہیں ہوا تو اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔"
"میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔" شرمین بولی لیکن عبید کھڑا ہو گیا۔ "نہیں مجھے واپس جانا ہے، اگر ان لوگوں کے سر پر نہ کھڑے ہو تو یہ کام نہیں کرتے ہیں۔"

شرمین اسے چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئی۔

"سوری عبید بھائی! میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکی۔ اگر ماریہ مل جائے تو پلیز مجھے اطلاع کر دیجیے گا۔ صبح میں خود فاریہ کے پاس جاؤں گی۔"

"شہلا وہیں ہے، آپ چاہیں تو اس کے نمبر پر کال کر سکتی ہیں۔"

"اللہ کرے بچی مل جائے۔" شرمین نے صدقِ دل سے دعا کی۔

"آپ دعا کریں، ہماری پوری کوشش ہے۔" عبید نے کہا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ شرمین ساکت کھڑی تھی۔ اس نے عبید سے غلط بیانی کی تھی اور وہ ڈر رہی تھی کہ اگر عبید نے حامد سے پوچھ لیا تو وہ بتا دے گا کہ وہ ساڑھے سات بجے کے بعد گھر آیا تھا۔ شرمین دروازہ بند کر کے اندر آئی تو حامد نشست گاہ میں کھڑا تھا۔ اس نے شرمین کی طرف دیکھا۔

"ابھی کون آیا تھا؟"

"آپ جاگ گئے؟ عبید بھائی آئے تھے۔ ایک بُری خبر ہے۔"

"کیسی بُری خبر؟" حامد سپاٹ سے لہجے میں بولا۔ عبید کی آمد کا سن کر اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

"وقاص بھائی کی بیٹی ماریہ غائب ہے۔ وہ شام ہمارے علاقے سے نکلی تھی اور پھر گھر نہیں پہنچی۔"

حامد چونکا۔ "ماریہ غائب ہے؟"

"وہ چھ بجے اپنی سہیلی سمیرا کے گھر سے نکلی تھی۔ شیخ قادر کو جانتے ہیں آپ؟ ان کی مسز میرے ساتھ ہفتہ وار درس میں شریک ہوتی ہیں۔"

"ہاں، جانتا ہوں۔" حامد سوچتے ہوئے بولا۔ "ماریہ کس وقت نکلی تھی؟"

"شام چھ بجے کے آس پاس... جب آپ بھی گئے تھے۔"

حامد نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا مطلب... میں بھی گیا تھا؟"

شرمین گڑبڑا گئی۔ "میرا مطلب ہے آپ بھی اسی وقت باہر گئے تھے۔"

"عبید میرے بارے میں پوچھ رہا تھا؟" حامد کا لہجہ نرم ہو گیا۔

"ہاں... میں نے بتا دیا کہ آپ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور آپ چینج کر کے سو رہے ہیں۔"

"عبید نے میری گھر واپسی کا وقت پوچھا ہوگا؟" حامد نے اگلا سوال کیا۔

"ہاں۔" شرمین کہتے ہوئے ہچکچائی۔ "میں نے سب بتا دیا۔ میں نے کہا آپ چھ بجے سے پہلے گھر آ گئے تھے۔"

حامد نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم نے جھوٹ بولا... لیکن کیوں؟"

"پتا نہیں۔" شرمین دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ "پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ عبید بھائی کسی خاص وجہ سے آئے تھے۔ اس لیے میں نے غلط کہہ دیا۔"

حامد نے اسے گھورا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، عبید کو مجھ پر کسی قسم کا شک ہے؟"

"میں نہیں کہہ سکتی۔" شرمین مضطرب ہونے لگی۔ "لیکن پلیز... اگر وہ پوچھیں تو آپ ان سے یہی کہیے گا کہ آپ چھ بجے سے پہلے گھر آ چکے تھے۔"

"تم نے بلاوجہ جھوٹ بولا... عبید کسی مقصد سے نہیں آیا تھا۔ وہ یہاں تک آیا تھا تو ہم سے ملنے چلا آیا۔"

"رات دو بجے؟" شرمین نے کہا اور اس کے پاس سے ہوتی ہوئی بیڈروم کی طرف چلی گئی۔ حامد باہر کی طرف آیا۔ اس نے صرف پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں سلیپرز تھے۔ وہ دروازہ کھول کر گلی میں آیا۔ سردی شدت کی تھی مگر وہ اس سے بے نیاز لگ رہا تھا۔ وہ گلی کے کونے تک آیا۔ یہاں سے پارک کے پاس جنگل والی سڑک کسی قدر نظر آ رہی تھی۔ وہاں پولیس موبائل کی گھومتی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ پولیس موجود ہے اور ماریہ کی تلاش کا کام جاری ہے۔ حامد کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا پھر تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹ آیا۔

☆☆☆

وقاص نشست گاہ میں جاگ رہا تھا۔ صبح پانچ بجے تک اس نے دو بار عبید کو کال کی لیکن دونوں بار اسے مایوسی ہوئی۔ عبید نے بتایا کہ پولیس اور ریسکیو کے اہلکار مل کر جنگل اور پارک میں تلاش کا کام کر رہے ہیں۔ ابھی تک ماریہ کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ عبید نے مرکزی پولیس کنٹرول روم کو ماریہ کے بارے میں تمام معلومات فراہم کر دی تھیں اور اگر ماریہ کے بارے میں کہیں سے بھی کوئی خبر آتی تو عبید کو فوری پتا چل جاتا۔ لیکن پانچ بجے تک کہیں سے ایسی کوئی خبر نہیں آئی تھی جسے ماریہ سے متعلق سمجھا جاتا۔ شہلا اوپر فاریہ کے ساتھ ہی لیٹ گئی تھی۔ ریاض اور ایاز کو وقاص نے سونے کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ پاس رکھ لیا تھا۔ چند سگریٹ پینے کے بعد اسے غنودگی سی آ گئی۔ آخری سگریٹ اس کے ہاتھ میں سلگ سلگ کر ختم ہو گیا۔ اسے پتا نہیں چلا۔





چانک موبائل نے بیل دی تو وہ چونک کر اٹھا۔ صبح ہو گئی تھی، بج رہے تھے۔ کال عبید کی تھی۔

"عبید! کچھ پتا چلا؟" اس نے پوچھا۔

"وقاص، یہاں پارک والے جنگل آ جاؤ۔" عبید نے مختصر سے انداز میں کہا۔ وقاص کا ماتھا ٹھنکا۔

"تب... کیا ہوا ہے؟ ماریہ مل گئی ہے؟"

"بس تم یہاں آ جاؤ۔ فون پر میں کچھ نہیں بتا سکتا۔" عبید نے کہا۔

"پلیز! یہ بتا دو کہ وہ زندہ ہے؟"

عبید کچھ دیر خاموش رہا۔ "ہاں، وہ زندہ ہے لیکن اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے اسپتال لے جایا جا رہا ہے۔"

پس منظر سے ایمبولینس کے سائرن کی آواز آئی۔ وقاص چلا اٹھا۔ "کیا ہوا ہے اسے؟"

عبید نے سخت لہجے میں کہا۔ "وقاص! تم وقت ضائع کر رہے ہو۔"

عبید کے الفاظ بتا رہے تھے کہ ماریہ کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے۔ وقاص آندھی طوفان کی طرح گھر سے روانہ ہوا۔ اس نے بہت تیز ڈرائیونگ کی تھی اور اس کی قسمت ساتھ دے رہی تھی کہ اسے کہیں ٹریفک پولیس نے نہیں روکا تھا۔ راستے میں ایک خیال رہ رہ کر اس کے ذہن میں آ رہا تھا، اب وہ شاید ماریہ کو زندہ نہیں دیکھ سکے گا۔ بیس منٹ بعد وہ پارک والی سڑک پر داخل ہو رہا تھا۔ اسے دور سے پولیس اور ریسکیو والوں کی گاڑیوں کے ساتھ ایمبولینس بھی دکھائی دی۔ عبید سڑک پر موجود تھا۔ اس کی گاڑی دیکھتے ہی وہ اس کی طرف بڑھا۔ وقاص نے اترتے ہی کہا۔ "ماریہ کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" عبید نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

وقاص نے ہاتھ چھڑا لیا اور چیخ کر اپنا سوال دہرایا۔ "ماریہ کہاں ہے؟"

عبید رک گیا۔ اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ "اسے اسپتال روانہ کر دیا گیا ہے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"مجھے اس کے پاس لے چلو۔" وقاص کا چہرہ اور آواز وحشت زدہ ہو گئی تھی۔ "اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"ہمیں وہ جنگل میں ایک متروک سیوریج لائن میں ملی ہے۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی ہے اور خون بہت ضائع ہو گیا ہے۔"

"گولی لگی ہے؟" وقاص نے بے یقینی سے کہا۔ "کسی نے ماریہ کو گولی ماری ہے؟"

عبید نے سر ہلایا۔ "اس کے پیٹ میں گولی لگی ہے اور اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی سے لڑتی رہی ہے یا پھر اپنی جان بچا کر بھاگتی رہی اور جنگل میں ایک پرانی سیوریج لائن میں گھس گئی۔ ہم نے بو سونگھنے والے کتوں کی مدد سے اسے تلاش کیا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ ایک گھنٹا اور اس حالت میں رہتی تو لازمی مر جاتی۔"

وقاص خلا میں دیکھ رہا تھا۔ "کیا کسی نے اس کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی ہے؟"

"نہیں، بہ ظاہر ایسا نہیں ہے۔ حتمی بات اسپتال میں پتا چلے گی۔"

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی میں یہاں شہادتیں اکٹھی کرنے کا کام کر رہا ہوں اس لیے کچھ دیر میں چلتے ہیں۔"

"میں خود چلا جاتا ہوں۔" عبید نے کہا۔ وہ ماریہ کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ عبید نے سوچا اور ایک ایس آئی کو بلا کر اس کے ساتھ روانہ کر دیا ورنہ اسے اسپتال میں مشکل پیش آ سکتی تھی۔ ایس آئی اس کی گاڑی میں آ گیا۔ وہ اسپتال پہنچے تو ماریہ آئی سی یو میں تھی۔ ایس آئی کی وجہ سے ایک ڈاکٹر بات کرنے کو تیار ہوا۔

"لڑکی کی حالت اچھی نہیں ہے، وہ کومے میں ہے۔ ہم نے آپریشن کر کے گولی نکال دی ہے اور کسی اہم عضو کو نقصان نہیں ہوا۔ اگر اس نے دو دن گزار لیے تو ریکوری کا امکان ہے۔ خون زیادہ بہہ جانے اور بلڈ پریشر گرنے سے دماغ کو نقصان ہوا ہے۔"

وقاص کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بہت مشکل سے ضبط کر رہا ہے۔ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "کیا کسی نے اس پر تشدد کیا ہے یا زیادتی کی ہے؟"

"تم کون ہو؟" ڈاکٹر نے خشک لہجے میں کہا۔

"یہ لڑکی کے والد ہیں۔" ایس آئی نے بتایا تو ڈاکٹر کے تاثرات بدل گئے۔

"آئی ایم سوری! لڑکی کے جسم کے کھلے حصوں پر چوٹوں اور خراشوں کے نشانات ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کسی کے تشدد کے نتیجے میں آئے ہیں یا وہ جنگل میں بھاگ رہی تھی تو جھاڑیوں سے اور گرنے سے بنے ہیں۔ زیادتی کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔"

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی وہ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "آپ اسے باہر سے دیکھ سکتے ہیں۔"

ماریہ بستر پر ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم سے کئی

طرح کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا۔ اس کے ماتھے پر چند خراشوں کے نشانات تھے۔

وقاص نے بہ مشکل اپنے آنسو ضبط کیے۔ وہ رونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک رونا کمزوری کی علامت تھی۔ اس نے گھر کال کر کے ایاز کو بلا لیا۔ "ابھی اپنی ماں کو کچھ مت بتانا۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اسے خیال آیا کہ یہ بات چھپانا ممکن نہیں۔ اس لیے اس نے کہا۔ "اپنی ماں کو بتا دو لیکن اسے اسپتال آنے سے منع کرنا۔"

"ٹھیک ہے پاپا۔۔۔ میں آ رہا ہوں۔" ایاز نے کہا اور فون بند کر دیا۔

نصف گھنٹے بعد عبید بھی آگیا۔ وہ تھکا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں مسلسل جاگنے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے ڈاکٹر سے ماریہ کے بارے میں پوچھا اور پھر وقاص کو لے کر ویٹنگ لاؤنج میں آگیا۔ اس نے کہا۔ "تم گھر جاؤ اور کسی کو یہاں بلا لو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"نہیں، مجھے پہلے اس کتے کے بچے کو تلاش کرنا ہے جس نے ماریہ کو اس حال تک پہنچایا ہے۔"

"یہ کام پولیس پر چھوڑ دو۔ جیسے ہم نے ماریہ کو تلاش کر لیا اسی طرح اس پر حملہ کرنے والے کو بھی تلاش کر لیں گے۔ یہ کیس میں خود دیکھوں گا۔ آج ہی اسے اپنے پاس ٹرانسفر کرا لوں گا۔ اب تم گھر جاؤ۔"

وقاص نے خود پر قابو پا لیا۔ "میں ماریہ کو کسی اچھے اسپتال میں منتقل کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ بھی اچھا اسپتال ہے اور ڈاکٹرز پوری توجہ دیتے ہیں۔ ابھی تم اسے کسی اور اسپتال منتقل کرنے کا رسک مت لو۔"

اس نے جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ماریہ کب ملے گی؟" وہ لاش کا لفظ استعمال کرنے کی ہمت نہیں کر پایا۔

۔۔۔۔۔ "کاش کہ وہ مجھے مل جائے۔" وقاص نے مٹھیاں بھینچ لیں جیسے حملہ آور کی گردن دبا رہا ہو۔ عبید نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"میں تمہارے دکھ کی شدت کو محسوس کر رہا ہوں لیکن حادثات زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں لیکن کیا کروں۔۔۔ تم جانتے ہو کہ ماریہ میں میری زندگی ہے۔ میں اس کے بغیر۔۔۔" وقاص کی آواز بھرا گئی پھر وہ پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ اس نے موبائل نکالا اور کسی کو کال کرتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ عبید کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر حامد کو کال کرنے لگا۔

☆☆☆

حامد سو رہا تھا۔ رات اس کے زخم میں تکلیف بڑھ گئی تھی اس لیے شرمین نے اسے پین کلر کے ساتھ نیند کی گولی دے دی تھی۔ یہ نفسیاتی علاج کرنے والے ڈاکٹر نے تجویز کی تھی کہ جب اسے نیند نہ آئے یا ذہنی پریشانی زیادہ ہو تو یہ دوا استعمال کرائے۔ اس کے موبائل کی بیل بجی تو شرمین جاگ گئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف عبید تھا۔ "ایک افسوسناک خبر ہے۔"

شرمین کا دل دھڑک اٹھا۔ "کیا ہوا عبید بھائی؟۔۔۔ خیریت سے ہے نا؟"

"نہیں بھابی۔۔۔ پارک کے ساتھ والے جنگل سے زخمی حالت میں ملی ہے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے آنے والے اڑتالیس گھنٹے اہم قرار دیے ہیں۔"

شرمین روہانسی ہو گئی۔ "میرا خدا! یہ کیا ہو گیا؟ فاریہ اور وقاص بھائی پر کیا گزر رہی ہوگی۔"

"میں نے سوچا حامد کو اطلاع کر دوں۔ وہ کہاں ہے؟"

"سو رہے ہیں۔" شرمین نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "رات تکلیف بڑھ گئی تھی اس لیے میں نے پین کلر کے ساتھ نیند کی دوا بھی دے دی تھی۔ اب جگاتی ہوں۔"

"نہیں، اگر گہری نیند میں ہے تو کچھ دیر اور سونے دیں۔ شہلا، وقاص کے ہاں ہے۔ وہ فاریہ بھابی کو دیکھے گی۔ آپ دونوں کچھ دیر سے بھی چلے جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں دیکھتی ہوں۔ ابھی تو میں شہلا بھابی کو کال کر لیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے لیکن کھل کر بات مت کیجیے گا ورنہ وہ پریشان ہوگی تو فاریہ بھابی سمجھ جائیں گی۔ بہتر ہے یہ خبر وقاص انہیں دے۔"

شرمین نے کال کاٹی تو اس کی نظر حامد کی طرف گئی۔ وہ جاگ گیا تھا اور آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ شرمین نے آہستہ سے کہا۔ "کسی نے ماریہ کو حملہ کر کے زخمی کر دیا ہے۔ وہ اسپتال میں داخل ہے اور آنے والے اڑتالیس گھنٹے اہم ہیں۔"

☆☆☆

آئی سی یو میں ماریہ کے کمرے کے پاس وقاص، عبید اور حامد تھے۔ تینوں خاموش تھے۔ حامد کا چہرہ متورم تھا اور وہ ذرا جھک کر کھڑا تھا۔ پیٹ کا زخم یقیناً تکلیف دے رہا تھا۔

"میں نے کیس ہینڈاوور کر لیا ہے۔" عبید نے خاموشی





توڑی۔ "تمہیں یقین ہے کہ تم حملہ آور تک پہنچ جاؤ گے؟" وقاص نے پوچھا۔

"یقین سے کچھ کہنا تو مشکل ہے۔" عبید نے کہا۔ "ہم کوشش کر سکتے ہیں۔ اور تم جانتے ہو، میں کس قسم کا پولیس افسر ہوں۔ اگر معاملہ ماریہ کے علاوہ کسی لڑکی کا ہوتا، تب بھی میں اتنی ہی کوشش کرتا۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن اگر تم اسے نہ بھی تلاش کر سکے، تب بھی میں اسے ساری عمر تلاش کروں گا اور وہ جب ملا۔۔۔" کہتے ہوئے وقاص رک گیا لیکن اس کے جبڑے سختی سے بھنچ گئے تھے اور وریدیں ابھر آئی تھیں۔ عبید نے کچھ کہا نہیں۔

وقاص ان تینوں میں سب سے زیادہ جارحانہ رجحان رکھتا تھا۔ بچپن میں بھی وہ ذرا سی بات پر دوسروں سے الجھ جاتا تھا اور مار پیٹ اس کے لیے کھیل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اب وہ پینتالیس برس کا ہونے کو آیا تھا لیکن اس کی طبیعت کی تیزی برقرار تھی۔ ان میں حامد سب سے دھیمے مزاج کا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ کوئی کام مل کر کرتے تھے تو اس میں حامد کی رضا سب سے کم ہوتی تھی۔ عام طور سے وقاص کی مرضی چلتی تھی۔ ان میں عبید معتدل مزاج تھا۔ وہ وقاص کی لیڈرشپ تسلیم کرتا تھا لیکن اس سے بے جا دبتا بھی نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وقاص اس وقت زندگی کے سب سے بڑے جذباتی بحران سے گزر رہا ہے۔ وہ جنون کی حد تک ماریہ سے محبت کرتا تھا۔ کسی ظالم نے اسے بیدردی سے گولی ماری تھی اور اس سے بھی زیادہ بے رحمی سے اسے جنگل میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس شخص کے خلاف وقاص کے جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔" حامد نے پہلی بار کچھ کہا۔ وہ جب سے آیا تھا، خاموش تھا۔ دوپہر کو وہ اور شرمین، احمد کے ہمراہ وقاص کے گھر پہنچے تھے۔ فاریہ کچھ دیر پہلے ہی ماریہ کو اسپتال میں دیکھ کر آئی تھی اور اس کا رو رو کر برا حال تھا۔ شرمین اور شہلا اس کے ساتھ لگ گئی تھیں۔ حامد اور وقاص اس کے بعد اسپتال پہنچے تھے۔ کچھ دیر بعد عبید بھی آگیا تھا۔

"تم دونوں چلے جاؤ۔ میں ابھی کچھ دیر اور یہاں رکوں گا۔" وقاص نے کہا۔ شاید وہ اکیلے رہنا چاہتا تھا۔ عبید نے حامد کو اشارہ کیا تو وہ باہر نکل آئے۔ اسپتال کے لان میں باذ، شاہ جی، ایاز اور ریاض ایک جگہ موجود تھے۔ حامد نے باذ اور شاہ جی کی طرف دیکھا اور عبید سے کہا۔ "وقاص کی دوستی عجیب طرح کے لوگوں سے ہو گئی ہے۔"

"میرا خیال ہے یہ دوست نہیں، اس کے بزنس پارٹنر ہیں۔"

حامد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "میرے علم میں تو یہ ہے کہ ورکشاپ صرف وقاص کی ہے۔"

"میں نے ایک دو بار انہیں وقاص کے ساتھ اس کے دفتر میں دیکھا ہے۔" عبید بولا۔ "ان کے انداز سے لگتا ہے، یہ اس کے بزنس میں برابر کے شریک ہیں۔"

"ہو سکتا ہے، وقاص کے بارے میں میں بہت کم جانتا ہوں۔ آج بھی ملاقات دو مہینے بعد ہوئی ہے۔"

عبید، حامد سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ ابھی تک اسے موقع نہیں ملا تھا اس لیے جب وقاص نے انہیں جانے کو کہا تو اس نے موقع غنیمت جانا۔ اس نے کہا۔ "میں کل رات آیا تھا تمہاری طرف لیکن تم سو رہے تھے۔"

حامد نے سر ہلایا۔ "شرمین نے بتایا تھا۔ تم ماریہ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔"

"ہاں اس کا امکان تھا کہ کل تم نے اسے دیکھا ہو لیکن اسے کوئی اہمیت نہ دی ہو۔"

حامد خاموش رہا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "نہیں، میں نے کل ماریہ کو نہیں دیکھا۔"

"تمہیں یقین ہے؟"

"تمہارے خیال میں، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"نہیں، بعض اوقات آدمی جو دیکھتا ہے وہ بھول بھی جاتا ہے اور یاد دلانے پر اسے یاد آتا ہے۔ یہ لاشعور۔۔۔"

"پلیز۔" حامد نے کسی قدر تند لہجے میں کہا۔ "اس قسم کے لیکچر کے لیے میرا ماہرِ نفسیات کافی ہے۔"

عبید نے سرد آہ بھری۔ "جو بھی ہوا اچھا نہیں ہوا ہے۔"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔" حامد نے کہا۔ "شرمین یہیں رکے گی۔ میں احمد کو لے جاتا ہوں۔"

"میں تمہیں گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔" عبید نے پیشکش کی۔ "ویسے بھی مجھے وہاں کچھ کام ہے۔"

"کیسا کام؟"

"ماریہ کل اپنی سہیلی سمیرا کے گھر سے نکلی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ غائب ہوئی تھی۔"

"ہاں، میں اس کے باپ شیخ قادر بخش کو جانتا ہوں۔ اچھا آدمی ہے۔"

"مجھے امید ہے، وہاں سے مجھے اس کیس کا سرا ملے گا۔"

"تمہیں امید ہے کہ تم حملہ آور تک پہنچ جاؤ گے؟"

"امید پر دنیا قائم ہے۔" عبید گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ انہوں نے وقاص کے بنگلے سے احمد کو لیا۔ شرمین نے وہیں رکنے کو کہا۔ شہلا جا رہی تھی۔ اسے گھر اور بچوں کو دیکھنا تھا اس لیے شرمین نے کہا کہ آج وہ رک جائے گی۔ اسے احمد کی فکر تھی لیکن حامد نے تسلی دی کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرلے گا۔ شہلا نے کہا تھا کہ وہ اگلے روز دوبارہ آجائے گی۔ عبید ان دونوں کو لے کر روانہ ہوا۔ اس نے حامد سے کہا۔ "تم گاڑی کیوں نہیں لے لیتے جبکہ تم لے سکتے ہو۔"

"تم جانتے ہو، میں ڈرائیونگ نہیں کرسکتا۔" حامد نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "یہ میرا مسئلہ ہے۔"

عبید جانتا تھا، اس واقعے کے بعد سے حامد کو گاڑیوں سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ وہ گھر سے باہر اس قسم کی کوئی گاڑی دیکھتا تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے سے گریز کرتا تھا۔ جوان ہوا تو اسے ڈرائیونگ سے خوف آنے لگا اس لیے اس نے صاحب حیثیت ہونے کے باوجود نہ تو کبھی بائیک رکھی اور نہ گاڑی لی۔ عبید نے حامد کو اس کے گھر پر اتارا اور سمیر کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

سمیرا بہت نروس تھی۔ اس نے پہلے کبھی پولیس کا سامنا نہیں کیا تھا۔ ماریہ کے بارے میں سن کر اس کے حواس پہلے ہی گم ہوگئے تھے۔ وہ رونے لگی۔ شیخ قادر بخش بھی سخت پریشان تھا۔ عبید سادہ لباس میں اور اپنی گاڑی میں آیا تھا اس لیے محلے میں کسی کو پتا نہیں چلا کہ شیخ قادر کے گھر پولیس آئی ہے۔ وہ عبید کو اندر ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ عبید نے اسے باہر ہی بتا دیا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے آیا ہے۔ شیخ قادر اندر بتانے گیا تو سمیرا رونے لگی۔ اسے چپ کرانے اور سمجھا بجھا کر عبید کے سامنے لانے میں کچھ وقت لگا۔ اب سمیرا ڈری ہوئی تھی۔

"تم ماریہ کی دوست ہو؟" عبید نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"جی۔" اس نے سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ "اسے کس ظالم نے گولی ماری ہے؟"

"ہم یہی جاننے کی کوشش کررہے ہیں۔ مجھے تم سے ماریہ کے بارے میں کچھ سوالات کرنے ہیں۔"

"وہ کل شام کو ہمارے ہاں آئی تھی اور ایک گھنٹے بعد اکیلی چلی گئی۔ سمیرا اسے روک رہی تھی۔" شیخ [illegible] درمیان میں مداخلت کی تو عبید نے ناگواری سے اسے [illegible]

"شیخ صاحب! آپ سے میں بعد میں بات [illegible] گا۔ فی الحال میں سمیرا سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

شیخ قادر بادل ناخواستہ وہاں سے چلا گیا۔ [illegible] جانے کے بعد عبید سمیرا کی طرف متوجہ ہوا۔ "[illegible] نہیں... ماریہ کے پاپا وقاص میرے دوست ہیں اور اس محکمے میں رہ کر رہے ہیں۔"

"اچھا، آپ وہ عبید انکل ہیں۔" سمیرا چونک گئی۔ "ماریہ نے آپ کا ایک بار ذکر کیا تھا۔"

"ہاں بیٹا، میں وہی عبید ہوں۔ اب آپ سے میں [illegible] سوال کروں گا۔ ممکن ہے آپ کے لیے ان کے جواب [illegible] مشکل ہوں لیکن ماریہ پر حملہ کرنے والے تک پہنچنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا؟"

"جی۔" سمیرا نے سر ہلایا۔

"دوسرے آپ کے اور میرے درمیان جو بات ہوگی وہ راز میں رہے گی۔ میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ یہ بتائیں کہ ماریہ کل کس وقت آپ کے گھر آئی تھی؟"

"پانچ بجے۔" سمیرا نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"اس سے پہلے وہ کہاں تھی؟"

"مم... مجھے نہیں معلوم۔" سمیرا نے اس طرح عجلت میں کہا کہ اس کا جھوٹ خود واضح ہورہا تھا۔

عبید نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اب آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کالج سے ڈیڑھ بجے چھٹی ہونے کے بعد وہ ساڑھے تین گھنٹے کہاں رہی؟"

سمیرا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ "میں سچ..."

"غلط کہہ رہی ہو۔" عبید کا لہجہ سخت ہوگیا۔ "میں نے تمہیں ایک موقع دیا لیکن تم نے ضائع کردیا۔ اب اگر مجھے کسی دوسرے ذریعے سے پتا چل گیا کہ ماریہ اس دوران میں کہاں رہی تھی اور یہ بات تمہارے علم میں بھی تھی تو تم سوچ سکتی ہو تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔"

عبید نے لہجہ سخت لیکن آواز دھیمی رکھی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ڈرائنگ روم کے باہر گھر والے کان لگائے موجود ہوں گے۔ اس کی دھمکی کے بعد ایسا لگا جیسے سمیرا بے ہوش ہوکر گر پڑے گی۔ وہ چند لمحے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی پھر اچانک ہی پھوٹ کر رو دی اور اس بار



[illegible] اس کا [illegible] ماریہ سے سچ نہیں بلکہ اپنے سے تھا۔ اس نے [illegible] آہستہ سے کہا۔ "اگر پاپا کو پتا چل گیا تو وہ مجھے [illegible]"

"[illegible] کو کسی بات کا پتا نہیں چلے گا۔" عبید کا لہجہ دوبارہ [illegible] "میں تمہیں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہاں جو بات [illegible] رہ جائے گی۔ میں اسے سرکاری ریکارڈ کا حصہ [illegible] گا۔"

سمیرا کچھ دیر روتی رہی پھر اس نے اپنے آنسو صاف [illegible] "میں نے خود سے کچھ نہیں دیکھا ہے۔ مجھے ماریہ نے بتایا کہ وہ عدنان نامی لڑکے کو پسند کرتی ہے۔ وہ کسی علاقے میں رہتا ہے لیکن اس کا گھر مجھے نہیں معلوم۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں جاب کرتا ہے اور ماریہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ماریہ ہفتے میں ایک بار میرے گھر آنے کے بہانے اس سے ملتی تھی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ اس سے کہاں ملتی تھی لیکن جس روز وہ میرے ہاں آئی تھی، اس دن عدنان سے کہیں باہر ملتی تھی۔"

عبید نے پولیس کی ملازمت کے دوران لڑکیوں کے گھر سے بھاگنے، اغوا ہونے یا قتل ہونے کے بے شمار کیس دیکھے تھے اور ان میں سے نوے فیصد کیسز میں معلوم یہی ہوتا تھا کہ لڑکی کی کسی لڑکے سے دوستی تھی اور اس کا نتیجہ جرم کی صورت میں برآمد ہوا۔ جب وقاص نے اسے بتایا کہ ماریہ کالج سے ڈیڑھ بجے نکلی تھی لیکن وہ سمیرا کے گھر پانچ بجے پہنچی، تب ہی اسے شک ہوگیا تھا کہ ماریہ کی کسی لڑکے سے دوستی ہے۔ اس کے علاوہ ایسا کوئی کام نہیں تھا جو ماریہ ماں باپ سے چھپ کر کرتی۔ لیکن عبید نے اس شک کا اظہار وقاص کے سامنے نہیں کیا تھا۔ وہ غم کی حالت میں تھا اور ماریہ کے بارے میں ایک لفظ نہیں سنتا۔ عبید نے سمیرا سے مزید سوالات کیے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عدنان نامی یہ نوجوان اسی علاقے میں پچھلی تین چار گلیاں چھوڑ کر کہیں رہتا ہے۔ عبید کو آگے بڑھنے کے لیے جو معلومات درکار تھیں، وہ سمیرا سے مل گئی تھیں۔ اس نے اسے ہدایت کی۔ "اس بارے میں کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے... اپنے گھر والوں کو بھی نہیں۔"

اس نے سر ہلایا۔ "آپ بھی پاپا کو مت بتائیے گا۔"

"فکر مت کرو، تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا بشرطیکہ تم خود کوئی حماقت نہ کرو اور اپنا راز کسی دوسرے کے سامنے فاش کردو۔" عبید نے کہا۔ "اب شیخ صاحب کو بھیج دو۔"

اس نے شیخ قادر سے سرسری نوعیت کے سوال کیے تاکہ اسے شک نہ ہو کہ ڈی ایس پی نے سمیرا سے کوئی خاص بات معلوم کی ہے۔ آخر میں اس نے شیخ قادر کو اپنا موبائل نمبر دیتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگوں سے کوئی مدد نہیں ملی ہے۔ ممکن ہے کیس میں کوئی نئی چیز سامنے آئے تو میں دوبارہ آؤں گا۔ آپ کو بھی اگر ماریہ یا اس پر حملہ کرنے والے کے بارے میں کوئی بات معلوم ہو تو بلا تکلف مجھے کال کرلیجیے گا۔"

"ہم قانون سے تعاون کے لیے تیار ہیں جناب۔"

شیخ قادر نے اتنی آسانی سے جان چھوٹنے پر سکھ کا سانس لیا۔ عبید نے باہر آنے کے بعد سوچا کہ وہ عدنان کی تلاش کا کام مقامی پولیس کے سپرد کردے لیکن پھر اس نے یہ کام خود کرنے کا فیصلہ کیا۔ ماریہ اس کے دوست کی بیٹی تھی اور اسے بھی انکل کہتی تھی۔ عدنان اور ماریہ کے تعلق کے بارے میں جتنے کم لوگوں کو علم ہوتا، اتنا اچھا تھا۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ اس کا تھکن سے برا حال تھا۔ وہ گزشتہ روز صبح سے مصروف تھا۔ بس آج دن میں چند گھنٹے سونے کا موقع ملا تھا اس لیے اس نے باقی معاملات صبح تک کے لیے ملتوی کیے اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ بچے گھر پر ہی رک گئے تھے۔ انہیں بھی دیکھنا تھا۔

☆☆☆

حامد گھر میں تھا۔ احمد کو اس نے آٹھ بجے کھانا دے کر سونے کے لیے بھیج دیا تھا۔ صبح اسے اسکول بھی جانا تھا۔ حامد کا ارادہ تھا کہ صبح احمد کو اسکول چھوڑ کر وہ وقاص کی طرف چلا جائے گا اور پھر شرمین کو لے کر واپسی میں احمد کو بھی اسکول سے لیتا آئے گا۔ اسے بھوک نہیں تھی۔ اس مسئلے میں الجھ جانے کی وجہ سے اس نے پیٹ کے زخم کی دوسری ڈریسنگ بھی نہیں کی تھی۔ اب اسے تکلیف ہورہی تھی۔ اس نے میڈیکل کٹ نکالی اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر پیٹ سے قمیص اوپر کی۔ آہستہ سے ٹیپ اتارا۔ اس کی جلد پر ٹیپ کا نشان پڑ گیا تھا لیکن چپکی پٹی کی وجہ سے زخم کہیں سے چپکا نہیں تھا۔ پٹی آرام سے اتر آئی۔ زخم بہ ظاہر خشک نظر آرہا تھا اور کناروں سے پھولا ہوا تھا۔ اس میں سرخی کم تھی۔ حامد نے اس پر اینٹی بایوٹک پاؤڈر چھڑکا اور دوسری خشک پٹی رکھ کر اوپر سے ٹیپ لگا دیا۔

اسے بھوک نہیں تھی اس لیے اس نے دودھ کے ساتھ دوا لے لی۔ اس میں اینٹی بایوٹک بھی تھی اور پین کلر بھی۔ زخم خاصا گہرا تھا اور چوبیس گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی اس کی تکلیف باقی تھی۔ پھر وہ چائے بنا کر چھت پر آگیا۔ اوپر ایک کمرا بنا ہوا تھا اور اس سے اوپر پانی کی ٹنکی کا ٹاور تھا۔ سیڑھیاں وہاں تک جاتی تھیں۔ حامد اس ٹاور میں آگیا۔

یہاں زیادہ تر مکانات دو منزلہ تھے لیکن حامد کا مکان گلی میں تیسرا تھا اور یہاں سے پارک اور جنگل صاف نظر آرہا تھا۔ وہ ماریہ کے بارے میں سوچنے لگا پھر اسے وقاص کا خیال آیا۔ وہ ہمیشہ وقاص اور عبید پر رشک کرتا آیا تھا۔ اسے اپنے مقابلے میں ان کی زندگیاں کہیں بہتر اور کامیاب محسوس ہوتی تھیں، خاص طور سے وقاص کی۔ وہ سوچتا کہ جو اس کے ساتھ ہوا ہے اگر وہ نہ ہوتا تو خود اس کی زندگی بھی ان کی طرح کامیاب اور بہتر ہوتی۔ اس کی جگہ اگر وقاص یا عبید نشانہ بنے ہوتے تو انہیں شاید اتنا فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ مضبوط شخصیت کے مالک تھے، اس کی طرح کمزور نہیں تھے۔ شاید قدرت بھی کمزور کو منتخب کرتی ہے۔ یہ سب اسی کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ سوچوں میں اتنا گم تھا کہ اسے چائے کا ہوش نہیں رہا۔ سرد اور کھلی فضا میں آتے ہی وہ ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ اچانک اسے سیڑھیوں کی طرف سے آہٹ سنائی دی اور پھر احمد کی آواز آئی۔

"پاپا! آپ یہاں ہیں...؟ مجھے اکیلے ڈر لگ رہا ہے۔"

حامد سیڑھیوں کی طرف آیا۔ اس نے احمد کو گود میں اٹھا لیا۔ "یہاں ٹھنڈ بہت ہے، آپ ایسے ہی چلے آئے؟"

"میں نے آپ کو نیچے دیکھا تو آپ کہیں نظر نہیں آئے۔ پاپا! مجھے بہت ڈر لگا تھا۔ ماما بھی نہیں ہیں۔"

"آپ تو بہت بہادر ہیں۔" حامد اسے نیچے لے آیا۔ "آپ کو نیند نہیں آرہی؟"

"آرہی ہے لیکن آپ میرے ساتھ لیٹ جائیں، تب میں سوجاؤں گا۔"

حامد اسے کمرے میں لایا اور بستر پر لٹا کر خود اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس نے احمد کو کمبل اوڑھا دیا۔ اس نے مڑ کر اپنا چہرہ اس سے لگا دیا۔ "پاپا! آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

حامد نے اسے پیار کیا۔ "میں بھی میری جان۔"

لیکن اسے خیال آیا... کیا وہ ہمیشہ احمد کے ساتھ رہے گا؟ موت تو کسی بھی عمر میں آسکتی ہے، اسے بھی ساتھ لے جا سکتی ہے اور تب احمد کو اس کے بغیر رہنا پڑے گا۔ وہ لرز گیا۔ احمد کو اس کی ضرورت تھی۔ اس کی ذات کا اعتماد اور حوصلہ حامد سے تھا۔ اگر وہ نہ رہتا تو احمد بھی ایک کمزور بچہ بنتا۔ احمد سو گیا تھا۔ حامد نے اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"میرے بچے! میں تمہاری خاطر زندہ رہوں گا۔"

☆☆☆

عبید صبح سویرے اٹھ گیا تھا۔ رات وہ جلدی سو گیا تھا۔ اس نے گھر جا کر کھانا کھایا اور پھر بستر پر لیٹا تو چھ بجے آنکھ کھلی تھی۔ اس نے کچن میں آکر اپنے لیے چائے اور بچوں کے لیے ناشتا تیار کیا اور انہیں اٹھا کر وہ تیار ہو کر دفتر روانہ ہوگیا۔ وہاں اس نے حاضری لگائی اور روزنامچے میں ماریہ کے کیس کی تفتیش کا اندراج کر دیا۔ ابھی تک کیس باضابطہ دفتر کے توسط سے نہیں آیا تھا لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ دفتر میں دوسرے افسران اس قسم کے کیس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے اس لیے کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔ وہ اس سے پہلے بھی تفتیش کرتا تو کوئی اعتراض نہ کرتا۔ اب اسے عدنان کو تلاش کرنا تھا۔ دارالحکومت میں گنے چنے فائیو اسٹار ہوٹلز تھے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ہر ہوٹل جائے۔

لیکن اس نے آسان طریقہ اپنایا اور فون ڈائریکٹری کی مدد سے ہر ہوٹل میں کال کرنی شروع کر دی۔ ڈی ایس پی کا حوالہ اور پولیس ہیڈکوارٹرز سے کال آنے کے بعد اس سے تعاون نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تیسرے ہوٹل میں اسے عدنان نامی ملازم کا سراغ مل گیا۔ عبید نے فون پر ہی اس کے بارے میں تفصیلات طلب کیں۔ جواب دینے والا ہوٹل کا نائب منیجر تھا اور وہ مشکوک تھا کہ پولیس کو عدنان حیات کیوں مطلوب تھا۔ لیکن عبید نے اسے تسلی دی۔ اسے بتایا کہ عدنان ایک گواہی کے سلسلے میں مطلوب ہے۔ عبید ان چند پولیس افسران میں سے تھا جو اپنی تفتیش کے دوران ان لوگوں کی ساکھ کا خیال رکھتے ہیں جن سے پولیس انکوائری کرتی ہے۔ وہ کسی کو بلاوجہ بے عزت کرنے کا قائل نہیں تھا۔

منیجر نے مطمئن ہو کر اسے عدنان کے گھر کا جو پتا دیا، اس سے تصدیق ہوگئی کہ یہ وہی عدنان ہے۔ پتا عبید کے پرانے علاقے کا تھا اور اس کا اندازہ تھا کہ عدنان، سمیرا کے گھر سے چند گلی دور رہتا تھا۔ اس کا کوئی موبائل نمبر نہیں تھا۔ اس وقت موبائل بہت عام نہیں تھا اور بہت سارے لوگ موبائل نہیں رکھتے تھے۔ عدنان کے گھر میں بھی فون نہیں تھا۔ عبید نے شکریہ ادا کر کے فون رکھ دیا اور دفتر سے نکل گیا۔ اس کا رخ وقاص کے گھر کی طرف تھا۔ صبح جب وہ دفتر آرہا تھا تو خاصی دھند تھی لیکن اب سورج بلند ہونے کے بعد دھند غائب ہوگئی تھی اور ہلکی سی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وقاص اسے بنگلے میں اپنے ٹیرس میں بیٹھا نظر آیا۔ عبید براہِ راست سیڑھیوں سے اس کے پاس چلا آیا۔ وقاص کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کا ٹن تھا لیکن پاس آنے پر عبید نے شراب کی بو محسوس کرلی تھی۔

"اب ماریہ کی حالت کیسی ہے؟"

"کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔" وقاص نے کہا۔ "رات





وہ صدمہ کر کے سے دیکھنے گئی تھی۔ ماریہ کو دیکھ کر اس کی اپنی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ اسے نیند کا انجکشن دینا پڑا۔"

"قدرتی بات ہے۔" عبید نے ریلنگ پر جھکتے ہوئے کہا۔ "وہ ماں ہے۔"

"شہلا اور شرمین کی موجودگی سے فوزیہ کو حوصلہ ہوا ہے۔" وقاص نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے کیا کیا؟"

"میں نے بہت کچھ معلوم کیا ہے۔ میں نے کل تم سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس وقت تم صدمے میں تھے لیکن اب تم بات کر سکتے ہو۔"

"کیسی بات؟"

"ماریہ کسی کو پسند کرتی ہے۔"

"یہ بکواس ہے۔" وقاص کا لہجہ تند ہوگیا۔

عبید نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "جناب وقاص صاحب... یہ حقیقت ہے۔ ماریہ تمہارے لیے بچی ہوگی لیکن وہ ایک جوان لڑکی ہے اور جوان لڑکیاں ہی کسی کو پسند کرتی ہیں۔ اس میں کوئی انہونی بات نہیں ہے۔"

وقاص خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا پھر اس نے وحشت بھرے لہجے میں کہا۔ "میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"بھابی..."

وقاص نے اس کی بات کاٹی۔ "اس کو بھی نہیں معلوم کیونکہ وہ خود میرے پیچھے پڑی رہتی تھی کہ بیٹی کو اتنی چھوٹ نہیں دینی چاہیے۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو شاید اس کی نوبت ہی نہ آتی۔ وہ اسے گھر سے باہر ہی نہیں جانے دیتی۔"

عبید نے وقاص کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "عدنان نامی ایک لڑکا ہے، ماریہ اسے پسند کرتی ہے۔ اس سے ملتی ہے۔ کل بھی اس سے ملی تھی۔ سمیرا کے گھر آنے سے پہلے وہ اس کے ساتھ تھی۔"

وقاص کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ "تمہیں یقین ہے؟"

"پولیس والے کسی بات پر یقین نہیں کرتے ہیں۔ لیکن اس پر مجھے یقین ہے اور میں اسے مزید پختہ کرنے کے لیے اسی کی طرف جا رہا تھا۔ سوچا پہلے تم سے اس بارے میں بات کرلوں۔"

"کیا وہی حملہ آور ہے؟"

"نتیجہ اخذ کرنے میں جلدی مت کرو۔ معلومات آہستہ آہستہ سامنے آرہی ہیں۔" عبید نے کہا اور سیدھا ہو گیا۔ "میں نے جو تم سے کہا ہے، وہ تم خود تک رکھو گے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" وقاص نے سر ہلایا۔ "تم فکر مت کرو۔"

عبید جانے کے لیے پلٹا اور پھر رک کر بولا۔ "میرا ایک مشورہ اور ہے۔ بے شک تم استطاعت رکھتے ہو لیکن بیٹا چھوڑ دو۔ بعض اوقات ماں باپ کا کیا دھرا ان کی اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس وقت ماریہ کو تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

عبید کہہ کر اس کی طرف دیکھے بغیر سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ گاڑی اس نے بنگلے کے باہر کھڑی کی تھی۔ وقاص اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اس نے ٹن اتنی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ وہ پچک گیا تھا اور اس میں بھرا ارغوانی سیال بہہ نکلا تھا۔

☆☆☆

عدنان کی حالت بری تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی دنیا اجڑ گئی ہے۔ وہ چند منٹ پہلے گھر میں آیا تھا۔ نعمان اور شفیق اسے لاؤنج میں نظر آئے۔ وہ دونوں سر جوڑے اشاروں سے کچھ بات کر رہے تھے۔ عدنان کو دیکھ کر دونوں چپ ہوگئے۔ عدنان نے سخت تاثرات کے ساتھ پوچھا کہ وہ اسکول کیوں نہیں گئے۔ نعمان نے بتایا کہ ٹیسٹ کی وجہ سے آج چھٹی دی گئی تھی، انہیں کل جانا تھا۔ وہ دونوں خالی بیٹھے تھے، اگر ٹیسٹ کی تیاری کر رہے ہوتے تو ان کے پاس کتابیں ہوتیں۔ عدنان نے ان کو ڈانٹا اور جا کر پڑھنے کا حکم دیا۔ آج وہ صبح جلدی اٹھ گیا تھا۔ اسے گھر کے کچھ کام نمٹانے تھے اس لیے وہ سات بجے ہوٹل سے نکل گیا۔ سعدیہ کچن میں تھی۔ وہ ناشتا بنا رہی تھی۔ اگر نعمان اسکول جاتا تو وہ سات بجے اٹھ جاتی تھی۔ مگر آج نعمان اسکول نہیں گیا تھا اس لیے وہ دیر سے اٹھی تھی۔

عدنان نے ہوٹل میں ناشتا نہیں کیا تھا۔ اس نے سعدیہ سے ناشتا بنانے کو کہا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدل کر ٹی وی آن کر دیا۔ آٹھ بجے کی ہیڈ لائن دیکھنے کے لیے اس نے نیوز چینل لگایا۔ نیوز کاسٹر ہیڈ لائن سنا رہی تھی۔ عدنان ایک دم چونک گیا۔ اسکرین پر ماریہ کی مسکراتی تصویر نمودار ہوئی اور پھر اس کے ساتھ نیوز کاسٹر نے جو خبر سنائی، عدنان کو لگا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ بتا رہی تھی کہ دارالحکومت کی رہائشی اس لڑکی کو پرسوں شام کسی نے ایک نواحی جنگل میں حملہ کر کے شدید زخمی کر دیا اور وہ اسپتال میں داخل ہے جہاں ڈاکٹرز اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پولیس تفتیش کر رہی تھی لیکن تاحال حملہ آور کا کوئی سراغ نہیں لگا تھا۔

"ایسا نہیں ہوسکتا... یہ کوئی خواب ہے۔" اس نے

کہتے ہوئے اپنا بازو نوچ ڈالا لیکن تکلیف نے بتایا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ وہ جاگ رہا ہے۔ اب ٹی وی پر اسپتال کا منظر تھا جہاں ماریہ آئی سی یو کے ایک کمرے میں بستر پر بے حس و حرکت لیٹی تھی اور اس کے منہ پر آکسیجن ماسک چڑھا ہوا تھا۔ میڈیا والوں نے ماریہ کے باپ وقاص سے رابطے کی کوشش کی لیکن اس نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹرز کے مطابق ماریہ کومے میں تھی اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کب ہوش میں آئے۔ یہ بھی امکان تھا کہ وہ سرے سے ہوش میں نہ آئے۔ خبر ختم ہوگئی اور عدنان ساکت بیٹھا رہ گیا۔ یہ سب پرسوں ہوا تھا۔ شاید اسی وقت جب وہ ہوٹل جانے کے لیے نکلا تھا۔ اسے یہ تو پتا تھا کہ ماریہ کو سمیرا کے گھر جانا تھا جہاں سے وقاص اسے پک کر لیتا۔ وہ گزشتہ تیس گھنٹے سے اسپتال میں تھی اور اسے معلوم ہی نہیں تھا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا اور چلّایا۔ ”یہ جھوٹ ہے... بکواس ہے... ماریہ کو کچھ نہیں ہوا... وہ ٹھیک ہے۔“

شور سن کر سعدیہ دوڑی آئی۔ ”عدنان! کیا ہوا ہے؟“

عدنان وحشت زدہ ہو رہا تھا۔ ”امی ابھی... ٹی وی پر دکھا رہے تھے... ماریہ کو کسی نے پرسوں جنگل میں حملہ کر کے زخمی کر دیا ہے... پرسوں شام کو جب وہ اپنے گھر جا رہی تھی... یہ بکواس ہے، جھوٹ ہے۔“

”ماریہ کو... جنگل میں زخمی کر دیا ہے... عدنان! تُو کیا کہہ رہا ہے... پاگل تو نہیں ہو گیا؟“ سعدیہ بدحواس ہو گئی۔

عدنان کے حواس گم ہو گئے تھے۔ سعدیہ نے اسے پکڑ کر زبردستی بیڈ پر بٹھایا اور پانی لے کر آئی۔ اسے پانی پلا کر اس نے بمشکل معلوم کیا۔ اگر اسے یقین نہیں آیا تھا تو اب عدنان کی حالت دیکھ کر آنے لگا۔ عدنان نے ٹی وی بند کر دیا تھا۔ سعدیہ نے اسے آن کیا۔ اس چینل سے خبر نہیں آ رہی تھی۔ سعدیہ چینل بدلنے لگی۔ بالآخر ایک اور چینل سے اس بارے میں خبر آنے لگی۔ سعدیہ نے ماریہ کو آئی سی یو کے بیڈ پر لیٹے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ابھی وہ خبر دیکھ رہی تھی کہ کال بیل بجی۔ اس نے آنسو صاف کیے اور باہر جا کر دیکھا۔ ایک پولیس آفیسر کھڑا تھا۔ اس نے وردی پہن رکھی تھی اور سعدیہ کو اس کی صورت جانی پہچانی لگی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ پولیس آفیسر نے کیپ اتار لی اور بولا۔ ”عدنان حیات کا گھر یہی ہے؟“

”جی یہی ہے۔“ سعدیہ نے کسی قدر ہچکچانے کے بعد کہا۔ اچانک اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ یہ پولیس افسر ماریہ پر ہونے والے حملے کے سلسلے میں یہاں آیا ہے۔ ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی کہ اسے اس کی صورت جانی پہچانی کیوں لگ رہی ہے۔ ”آپ کو عدنان سے کیا کام ہے؟“

”مجھے اس سے ملنا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اس وقت گھر میں ہے۔“

”وہ گھر میں ہے لیکن...“ سعدیہ کہتے ہوئے رک گئی۔

”لیکن کیا...؟“

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ہوا ہے اسے؟“ پولیس افسر نے پوچھا۔ وہ عبید تھا۔ ”کیا میں اندر آ کر بات کر سکتا ہوں؟“

پولیس افسر کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ڈیوٹی پر ہے۔ سعدیہ اسے انکار نہیں کر سکتی تھی، مجبوراً وہ اسے اندر لے آئی۔ پھر اس نے اندر جا کر عدنان کو بتایا کہ ایک پولیس افسر اس سے ملنے آیا ہے۔ ”میرا خیال ہے پولیس کو تمہارے اور ماریہ کے تعلق کا علم ہو گیا ہے۔“ سعدیہ نے سرگوشی کی۔

”لیکن کیسے؟“ عدنان حیران ہوا۔ پھر اسے سمیرا کا خیال آیا۔ ”ماما! پولیس کو سمیرا نے بتایا ہوگا۔ ماریہ اس سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی اور اسے ہمارے بارے میں بھی علم تھا۔“

”ہاں، ہو سکتا ہے۔ ماریہ اسی کے گھر سے جاتے ہوئے اس مشکل میں پڑی تھی۔ پتا نہیں کون اس معصوم کا دشمن تھا؟“ سعدیہ روہانسی ہو گئی۔

”ماما، خود کو سنبھالیں... ابھی ہمیں پولیس کا بھی سامنا کرنا ہے۔ ماریہ اسپتال میں کومے میں ہے۔ وہ حقیقت بیان نہیں کر سکتی اور ہماری پولیس کو آپ جانتی ہیں۔ ان کے ہاتھ جو آ جائے، یہ اسے ہی مجرم بنا دیتے ہیں۔“ عدنان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”کیونکہ ان میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ اصل مجرم تک پہنچ سکیں۔“

سعدیہ مزید پریشان ہو گئی۔ ”یہ تو ہے، دوسرے مجھے اس پولیس افسر کی صورت بھی جانی پہچانی لگ رہی ہے۔“

”میں اسے دیکھتا ہوں۔“

عدنان نشست گاہ میں آیا۔ عبید صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے عدنان سے ہاتھ ملایا۔ ”مجھے عبید اللہ کہتے ہیں۔“

عبید کے مہذبانہ انداز سے عدنان کو حوصلہ ہوا۔ ”عدنان حیات... آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں؟“

عبید نے سر ہلایا۔ ”تم جان گئے ہو گے کہ میں کیوں آیا ہوں؟“

عدنان دکھی نظر آنے لگا۔ ”میں نے ابھی یہ خبر دیکھی ہے... اس سے پہلے مجھے نہیں معلوم تھا کہ ماریہ زخمی حالت میں اسپتال میں داخل ہے۔“

”تم سچ کہہ رہے ہو؟“ عبید نے شک سے کہا۔ ”کل صبح سے تمام چینل بار بار اس خبر کو نشر کر رہے تھے۔“

”میں کل صبح سے اتنا مصروف رہا کہ ٹی وی دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ میری والدہ نیوز چینلز نہیں دیکھتی ہیں اس لیے ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ میں کچھ دیر پہلے کام سے آیا ہوں۔“

”تم ماریہ سے آخری بار کب ملے تھے؟“

”پرسوں شام ساڑھے چار بجے میں نے اسے... آخری بار دیکھا تھا۔“ عدنان نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ عبید کے پوچھنے پر اس نے اس پارک کا بتایا جہاں وہ آخری بار ملے تھے۔

”اس کے بعد تم کہاں گئے؟“

”میں پانچ بجے تک گھر آ گیا تھا۔ مجھے چھ بجے تک ہوٹل پہنچنا ہوتا ہے لیکن اس روز میں لیٹ ہو گیا تھا۔ ہوٹل کی وین پانچ بجے آتی ہے اور پھر چھ بجے وین آتی ہے۔“

”اگر تم پانچ بجے گھر پر تھے تو ظاہر ہے پانچ والی وین سے نہیں گئے تھے۔ تم چھ والی وین سے گئے تھے؟“

عدنان ایک لمحے کے لیے چپ ہوا پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، بدقسمتی سے وہ وین بھی نکل گئی تھی پھر میں ٹیکسی کر کے ہوٹل گیا تھا۔“

”تم کس وقت ہوٹل پہنچے تھے؟“

”سات بجے۔“

”لیکن یہاں سے ہوٹل تک کا راستہ آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ہے۔“

”راستے میں ٹیکسی کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔“ عدنان نے کہا۔

”تم گھر سے کس وقت روانہ ہوئے تھے؟“

”چھ بجنے میں شاید دس منٹ تھے۔“

”میں خود بھی اسی علاقے میں پلا بڑھا ہوں اور مجھے معلوم ہے اگر پارک والا راستہ اختیار کیا جائے تو بس اسٹاپ یہاں سے پانچ منٹ کی مسافت پر ہے... تب تم دس منٹ پہلے روانہ ہونے کے باوجود وین نہ پکڑ سکے۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ عدنان نے بے بسی سے کہا۔ ”لیکن جب میں بس اسٹاپ پہنچا تو تقریباً دس منٹ تک کھڑے ہونے کے باوجود وین نہیں آئی تھی۔ اس کے بعد میں نے ٹیکسی لی تھی۔ وہ راستے میں پنکچر ہوئی جس کی وجہ سے میں سات بجے تک ہوٹل پہنچا تھا۔“

عبید، عدنان کے جواب اپنی چھوٹی سی ڈائری میں نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ اس نے عبید کو بتایا کہ ماریہ سے اس کی ملاقات چھ مہینے پہلے ہوئی تھی اور ان کی ملاقات ہمیشہ کسی پارک یا عوامی جگہ پر ہوتی تھی۔ انہوں نے کبھی کہیں تنہائی میں ملنے کی کوشش نہیں کی۔ ان دونوں کو ہی یہ بات پسند نہیں تھی۔ عدنان اور ماریہ شادی کرنا چاہتے تھے اور عدنان نے ماریہ کو اپنی ماں سعدیہ سے بھی ملوایا تھا۔ عبید نے پولیس کے نقطۂ نظر سے بھی سوال کیے لیکن عدنان کو کسی پر شک نہیں تھا۔ رقیب کا سوال ہی نہیں تھا۔ ماریہ کا کسی اور لڑکے سے ملنا جلنا نہیں تھا بلکہ اس کی لڑکیوں سے بھی کم دوستی تھی۔ کالج سے باہر صرف سمیرا تھی جس سے اس کا ملنا جلنا تھا۔

”ممکن ہے کوئی اور ہو جو ماریہ کو پسند کرتا ہو اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہو؟“

”اگر ایسی کوئی بات ماریہ کے علم میں ہوتی تو وہ لازمی مجھے بتاتی... لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“

”ماریہ کو گھر والوں کی طرف سے خدشہ تھا؟“

”نہیں، اسے یقین تھا کہ سب اس کی پسند پر مان جائیں گے لیکن میں نے ابھی اسے منع کر رکھا تھا کہ پہلے میں اپنا کورس مکمل کر لوں اور مجھے ترقی مل جائے۔ ماریہ دولت مند باپ کی بیٹی ہے۔ میں اپنی حیثیت بہتر بنانا چاہتا تھا تاکہ ان لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو۔“

عبید نے سعدیہ سے بھی بات کی۔ ایک گھنٹے بعد وہ ان کے گھر سے نکلا تو اس کی معلومات میں خاصا اضافہ ہوا تھا لیکن یہ اضافہ اس قسم کا نہیں تھا کہ اس سے فوری طور پر کیس کے حل میں کوئی مدد ملتی۔ وہاں سے نکل کر عبید نے پہلے دفتر جانے کا سوچا لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر کے جائے واردات کا رخ کیا۔ پارک کے کنارے اس نے گاڑی روک دی اور اندازہ لگایا کہ ماریہ کو کہاں سے جنگل لے جایا گیا تھا یا وہ جان بچانے کے لیے بھاگی تھی۔ وہ یقیناً اس وقت سڑک کے درمیانی حصے میں تھی جو آبادی اور مین روڈ سے یکساں فاصلے پر ہے۔ اس نے چیخیں بھی ماری ہوں گی لیکن آس پاس کوئی نہیں تھا جو اس کی فریاد سنتا۔ حملہ آور یا آوروں نے اسے پکڑا نہیں تھا۔ وہ آزاد تھی اور ان سے بچنے کے لیے بھاگی تھی۔ جنگل میں گھسنے کے بعد وہ راستہ کھو بیٹھی اور آبادی کی طرف جانے کے بجائے اس ویران حصے میں جا نکلی جہاں متروک سیوریج لائن تھی اور وہ بچنے کے لیے اس میں چھپ گئی۔ لیکن حملہ آور اس سے پہلے اسے گولی مار چکا تھا۔ زخم خطرناک نہیں تھا مگر ماریہ وہاں چھپی رہی اور بہت زیادہ خون بہہ جانے سے اس کی

حالت اتنی خراب ہوگئی۔ وہ یقیناً بہت زیادہ خوف زدہ تھی، تبھی زخمی ہونے کے باوجود وہ سیوریج لائن میں چھپی رہی۔

☆☆☆

حامد، احمد کو اسکول چھوڑنے کے بعد وقاص کے گھر پہنچا۔ وہ گھر کے ٹیرس میں موجود تھا۔ حامد سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ وقاص سے ماریہ کا پوچھ کر وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وقاص نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''ابھی عبید آیا تھا۔''

حامد نے دیکھ لیا تھا کہ وقاص پی رہا ہے لیکن اس نے یہ بات نظرانداز کردی اور پوچھا۔ ''کوئی پروگریس ہوئی؟''

''اتنی جلدی کہاں...؟'' وقاص نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''یہ ہماری پولیس ہے۔''

''عبید روایتی پولیس افسروں سے مختلف ہے اور پھر یہ تو اس کے دوست کی بیٹی کا معاملہ ہے۔''

ماریہ کے ذکر پر وقاص کے چہرے پر کرب نظر آیا۔ اس نے ٹن سے آخری گھونٹ لے کر اسے نیچے لان میں اچھال دیا۔ ''جس نے بھی میری بیٹی کو اس حال تک پہنچایا ہے، میں اسے اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔''

حامد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ''تم قانون ہاتھ میں لینے کی بات کررہے ہو۔''

''یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔'' وقاص غرایا۔ ''اس نے میری بیٹی کو مارنے کی کوشش کی ہے۔ اسے حساب دینا ہوگا اور حساب میں لوں گا۔''

''عبید نے کوئی خاص بات معلوم کی؟''

وقاص نے سر ہلایا۔ ''اس نے بتایا ہے کہ ماریہ عدنان نامی لڑکے کو پسند کرتی تھی۔ عبید اسی کے پاس گیا ہے۔''

حامد چونکا۔ ''یہ لڑکا بھی ہوسکتا ہے؟''

''ممکن ہے لیکن مجھے جلدی نہیں ہے۔ میں انتظار کررہا ہوں کہ پولیس کسی پر واضح شک کرے۔''

''اس صورت میں پولیس اسے گرفتار کرلے گی۔'' حامد نے کہا۔

''ٹھیک ہے لیکن وہ ہمیشہ پولیس کے تحویل میں نہیں رہے گا اور اگر اسے جیل بھیج دیا گیا تب بھی...'' وقاص بولتے بولتے رک گیا۔ اسی لمحے اسے نیچے شاہ جی دکھائی دیا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو وقاص حامد سے بولا۔ ''تم رکو، میں آتا ہوں۔'' وہ نیچے اتر کر شاہ جی کے پاس آیا۔ ''کیا بات ہے؟''

''گاڑی اور بندہ آگیا ہے۔''

''اسے جہنم میں ڈالو۔ یہ بتاؤ کہ میری بیٹی پر حملہ کرنے والے کا پتا چلنے کے بعد تم کیا کرسکتے ہو؟''

شاہ جی گڑبڑا گیا۔ ''حملہ کرنے والے کا پتا...؟ جیسے تم کہو... تمہیں پتا ہے ہم ماٹ والے بندے نہیں ہیں... جو تم کہتے ہو، وہی کرتے ہیں۔''

''ایک لڑکا ہے عدنان نام کا... اس کا پتا چلانا ہے۔''

''وہ کہاں ملے گا؟'' شاہ جی مستعد ہوگیا۔

''یہ میں نہیں جانتا لیکن پہلے میں جہاں رہتا تھا، وہاں شیخ قادر بخش نامی شخص ہے۔ اس کی بیٹی سمیرا ماریہ کی دوست ہے۔ ماریہ اسی کے گھر سے نکل کر جارہی تھی جب اسے حادثہ پیش آیا۔ سمیرا اور اس کا باپ عدنان کے بارے میں جانتے ہیں۔''

''اگر وہ جانتے ہیں تو میں معلوم کرلوں گا۔ عدنان کا کیا کرنا ہے؟''

''اسے اٹھا کر بنے ٹھکانے پر پہنچا دو۔'' وقاص نے سرد لہجے میں کہا اور پلٹ گیا۔ حامد اوپر سے ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ وقاص آیا تو اس نے کہا۔

''تمہارا یہ دوست کچھ سخت مزاج لگتا ہے۔''

''ہاں۔'' وقاص کرسی پر بیٹھ گیا۔ حامد سمجھ گیا کہ وہ اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا۔

''بھابی کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ابھی تو ٹھیک ہے، کل خراب ہوگئی تھی۔'' وقاص بے دلی سے بولا۔

حامد کچھ دیر وہاں رکا پھر اس نے شرمین کو بلوایا۔ وہ باہر آئی اور وہ گھر کے لیے روانہ ہوگئے۔ حامد نے ایک ٹیکسی روک لی تھی۔ راستے میں شرمین نے اسے بتایا کہ فاریہ کی حالت بُری ہے۔ حامد نے سرد آہ بھری۔ ''اولاد کا دکھ ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''پتا نہیں کس ظالم نے اتنی پھول سی بچی پر گولی چلا دی۔ اللہ کرے وہ بچ جائے اور اس پر گولی چلانے والا پکڑا جائے۔ عبید بھائی پوری کوشش کررہے ہیں۔''

''مجھے یقین ہے کہ ماریہ بچ جائے گی اور اس پر گولی چلانے والا پکڑا جائے گا۔'' حامد نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

شرمین نے اچانک پوچھا۔ ''آپ کا زخم کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہے، میں خود بینڈیج کرلیتا ہوں۔'' حامد نے بتایا۔ ''تم ماریہ کو دیکھنے گئی تھیں؟''

''ہاں، میں اور شہلا بھابی فاریہ بھابی کے ساتھ گئے تھے۔ سامنے یوں بے بسی سے بستر پر پڑے دیکھ کر دل خراب





ہوگیا۔''

حامد نے پہلے ٹیکسی، احمد کے اسکول کے سامنے رکوائی۔ وہاں سے احمد کو لیا اور پھر وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ ٹیکسی ان کے علاقے میں پارک کے پاس پہنچی تو حامد نے ڈرائیور سے رکنے کو کہا۔ اس نے ٹیکسی روک دی۔ حامد نیچے اترا اور ڈرائیور کو کرایہ دیتے ہوئے شرمین سے کہا۔ ''تم احمد کو لے کر گھر جاؤ، میں کچھ دیر میں آرہا ہوں۔''

شرمین نے جنگل کی طرف دیکھا۔ ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''میں آتا ہوں، تم جاؤ۔'' حامد کا لہجہ سخت ہوگیا اور پھر وہ آگے چل پڑا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ جب تک ٹیکسی پارک سے مڑ نہیں گئی، حامد سیدھا چلتا رہا۔ پھر وہ سڑک سے اتر کر جنگل میں داخل ہوگیا۔ اس کا رخ متروک سیوریج لائن کی طرف تھا۔ وہ جنگل کے درمیان سے یوں گزر رہا تھا جیسے یہ جگہ اس کی دیکھی بھالی ہو۔ چند منٹ بعد وہ متروک سیوریج لائن کے دہانے کے سامنے تھا۔ ماریہ اسی دہانے سے اندر گھسی تھی اور پولیس کو وہیں ملی تھی۔ یہاں پولیس کی پیلی پٹی ضرور لگی تھی لیکن کوئی پولیس والا موجود نہیں تھا۔ حامد نے جیکٹ سے ایک چھوٹی ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی میں اندر داخل ہوا۔ اندر بدبو اور گھٹن تھی۔ اس نے ناک پر رومال رکھ لیا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں اندر دیکھتا پھر رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اتنی بدبودار جگہ پر ماریہ اتنی دیر تک کیسے رہی۔ یہاں ہر طرف بڑے چوہے اور ہر طرح کے حشرات الارض چل پھر رہے تھے۔ کوئی لڑکی یا عورت بقائمی ہوش و حواس اس جگہ نہیں رک سکتی تھی۔ وہ چند منٹ سے زیادہ اندر نہیں رہ سکا۔ باہر آتے ہوئے وہ کسی سے ٹکرایا اور اچھل پڑا۔ سامنے عبید کھڑا تھا۔

''تم یہاں کیا کررہے ہو؟''

''میں۔'' حامد خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''میں اس جگہ کو دیکھنے آیا تھا۔''

''لیکن کیوں؟''

''میں نہیں جانتا، بس اچانک مجھے خیال آیا۔''

عبید اسے وہاں سے کچھ دور لے آیا۔ ''میں پوچھنا بھول گیا تھا۔ تمہیں چوٹ کیسے لگی تھی؟''

''ایک بائک والے نے ٹکر ماردی تھی۔'' حامد نے کہا۔ ''اس کا ہینڈل میرے پیٹ پر لگا تھا۔''

''زخم دکھاؤ۔''

حامد نے پیٹ پر سے شرٹ اوپر کی۔ اس نے جیکٹ تلے پوری آستین کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے ٹیپ سے بندھی پٹی الگ کی تو تقریباً خشک ہوجانے والا زخم سامنے آگیا۔ عبید نے زخم کا معائنہ کیا اور بولا۔ ''یہ تو ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی نکیلی لیکن کند چیز سے آیا ہے۔ بائک کا ہینڈل ایسا نہیں ہوتا ہے۔ تمہیں یقین ہے کہ بائک کا ہینڈل تمہارے پیٹ سے لگا تھا؟''

''یقین؟'' حامد سوچ میں پڑ گیا۔ ''مجھے ایسا ہی لگا تھا۔ سب بہت تیزی سے اور اچانک ہوا۔ میں جھٹکے سے فٹ پاتھ پر جا گرا اور بائک والا جلدی سے اپنی بائک اٹھا کر بھاگ گیا تھا۔''

''حادثہ کہاں اور کس وقت پیش آیا تھا؟''

حامد جواب دیتے ہوئے ہچکچایا۔ ''بس اسٹاپ سے ذرا آگے مارکیٹ والے موڑ سے پہلے... شام ساڑھے پانچ بجے کا وقت تھا۔''

''تم کسی کام سے نکلے تھے؟'' عبید نے پوچھا۔

''تمہارے ان سوالات کا مقصد کیا ہے؟'' حامد پریشانی سے بولا۔

''مجھے شک ہے کہ تم سچ نہیں کہہ رہے ہو۔''

حامد کا چہرہ تن گیا۔ ''کیا تم مجھ پر کسی قسم کا شک کر رہے ہو... ماریہ کے واقعے کے سلسلے میں؟''

''میں بتا چکا ہوں۔'' عبید بولا۔ ''جب شرمین نے بتایا تھا تب بھی مجھے لگا تھا۔ وقت کے بارے شبہ ہوا تھا۔''

حامد سوچنے لگا پھر اس نے گہری سانس لی۔ ''میں نے سب سچ بتایا ہے سوائے وقت کے... پتا نہیں شرمین نے تم سے کیوں غلط بیانی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ساڑھے سات بجے گھر پہنچا تھا اور پیدل آیا تھا۔ حادثہ سات بجے کے بعد اسی جگہ پیش آیا تھا۔''

''شرمین نے کس وجہ سے غلط بیانی کی ہوگی؟''

''میں نہیں جانتا کہ اس نے کیوں غلط کہا لیکن شاید وہ میری ذہنی حالت پر فکرمند تھی۔''

عبید سوچ میں پڑ گیا۔ ''سنو حامد! تم شرمین سے کچھ نہیں کہو گے اسے نہیں بتاؤ گے کہ تم مجھے سچ بتا چکے ہو۔''

''وہ مجھ پر شک کررہی ہے۔'' حامد اچانک بولا، جیسے یہ بات اس کے اندر دبی تھی اور اب اس کے منہ سے نکل گئی ہو۔ ''وہ سمجھ رہی ہے ماریہ پر حملہ میں نے...''

''حامد پلیز شٹ اپ۔'' عبید نے کہا۔ ''تم اور شرمین دونوں اس معاملے میں بالکل خاموش رہو۔ کسی سے کچھ نہیں کہو گے۔ سمجھ گئے نا میری بات؟''

حامد نے سر ہلایا لیکن اس کے چہرے پر بے بسی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ عبید اس کے ساتھ باہر آیا اور اسے ایک بار پھر خاموش رہنے کا کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد حامد بھی ست قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

شیخ قادر بخش ان دو بدمعاش نظر آنے والے افراد کے سامنے خوف زدہ تھا۔ وہ شروع میں شریف بن کر اس کے گھر کے اندر آئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک ضروری بات کرنا چاہتے ہیں لیکن اندر آتے ہی ان کا رویہ بدل گیا... ان میں سے ایک نے جیب سے چاقو نکال لیا۔ اور اس کے ریزر بلیڈ جیسی تیز دھار سے ناخن کاٹنے لگا۔ دوسرے نے پوچھا۔ "عدنان کہاں رہتا ہے؟"

"کون عدنان...؟" شیخ قادر نے پوچھا۔

"تم عدنان نامی کتنے لوگوں کو جانتے ہو؟"

"ہم اس عدنان کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جس کا پتا تم نے پولیس افسر کو بتایا تھا۔" چاقو والے نے اس کی نوک صوفے پر رکھ کر اسے کھینچنا شروع کر دیا۔ کپڑا مکھن کی طرح کٹنے لگا۔

"میں نہیں جانتا... یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"شیخ! شرافت کی زبان سمجھو۔ تمہاری کھال اس کپڑے سے زیادہ مضبوط نہیں ہوگی۔" دوسرے کے لہجے میں دھمکی آ گئی۔ "ہم عدنان کا پتا لینے آئے ہیں اور لے کر ہی جائیں گے۔ کیا فائدہ تم نقصان اٹھا کر بتاؤ تو۔"

شیخ قادر خوف زدہ ہو گیا۔ "دیکھو، میں نہیں جانتا کہ تم کس عدنان کی بات کر رہے ہو۔ ایک تو میرا بچہ ہے۔"

"ہم جس عدنان کی بات کر رہے ہیں، وہ جوان ہے۔"

شیخ قادر بخش نے نفی میں سر ہلایا۔ چاقو والا باؤ تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے صوفے کا پورا کپڑا ادھیڑ دیا۔ اندر کا فوم بھی کٹ گیا تھا۔ شیخ قادر نے اسے روکنا چاہا تو اس نے اسے اوندھے منہ گرا کر چاقو اس کی گردن پر رکھ دیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے کوئی نقصان پہنچاتا، اندر سے ایک نوجوان لڑکی آ گئی۔ "میرے بابا کو چھوڑ دو۔ میں تمہیں عدنان کا پتا بتاتی ہوں۔ تم اس عدنان کی بات کر رہے ہونا جو ماریہ کو پسند کرتا ہے؟"

شاہ جی اور باؤ چونک گئے۔ انہوں نے شیخ قادر کو چھوڑ دیا۔ باؤ نے سر ہلایا۔ "ہاں، ہمیں اسی عدنان کی تلاش ہے۔"

"وہ یہاں سے چار گلی آگے رہتا ہے۔" سمیرا نے پتا بتا دیا۔ "اب خدا کے لیے تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے، ہم چلے جاتے ہیں۔" شاہ جی نے جیب سے دو ہزار روپے نکال کر صوفے پر پھینک دیے۔ "اسے ٹھیک کرا لینا لیکن اگر پتا غلط ہوا تو ہم واپس آئیں گے اور اس بار صرف کپڑا نہیں کاٹیں گے۔"

وہ باہر نکل گئے۔ شیخ قادر بیٹی کو گھور رہا تھا۔ سمیرا باپ کی محبت میں دوڑی آئی تھی لیکن اب وہ ڈر رہی تھی کہ اسے ساری بات بتانی پڑے گی اور پھر اس کی شامت آئے گی۔

☆☆☆

عدنان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ جس وقت پولیس افسر آیا تھا تو نعمان اور شیتل اوپر والے کمرے میں تھے۔ انہیں پتا بھی نہیں چلا۔ سعدیہ عدنان کو تسلی دیتے ہوئے خود بھی رو رہی تھی۔ "بیٹا صبر کرو... اللہ نے چاہا تو وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

عدنان سرجھکائے ہوئے تھا۔ "لیکن ماما! ماریہ نے کسی کا کیا بگاڑا تھا... اسے کسی نے کیوں گولی ماری؟"

"بیٹا پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ یہ بہت ذہین آفیسر ہے۔ دیکھو اس نے کتنی تیزی سے تمہارا سراغ لگا لیا لیکن روایتی پولیس افسر نہیں ہے، ورنہ اس وقت تم شاید گرفتار ہوتے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" عدنان بولا۔ "اس کے سوالات سے لگ رہا تھا کہ وہ اس زاویے سے بھی کیس دیکھ رہا ہے۔ ممکن ہے وہ مجھ سے دوبارہ پوچھے اور اگر اس کا شک بڑھ جائے تو وہ مجھے گرفتار بھی کر سکتا ہے۔"

سعدیہ پریشان ہو گئی۔ "تم پر کیوں شک کرے گا؟ تم ماریہ سے محبت کرتے ہو۔"

"یہ تو میں، ماریہ اور آپ جانتے ہیں۔" عدنان نے ٹھنڈی سانس لی۔ "پولیس والے اس پر یقین نہیں کریں گے۔"

سعدیہ سوچ میں پڑ گئی۔ "نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ میں نے بہت پہلے اسے دیکھا ہے۔"

"وہ اسی علاقے کا رہنے والا ہے، یہیں پلا بڑھا ہے۔" عدنان نے وضاحت کی۔

سعدیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم بھول رہے ہو، ہم اس علاقے میں تمہارے پاپا کے بعد آئے تھے۔"

وہ لوگ یہاں بارہ سال پہلے منتقل ہوئے تھے۔ اس سے پہلے وہ شہر کے دوسرے علاقے میں رہتے تھے۔ وہاں اس خاندان کو ایک سانحے کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے بعد سعدیہ کو بچوں سمیت وہ جگہ چھوڑنی پڑی تھی۔ پھر انہوں نے یہاں یہ مکان خریدا تھا۔ سعدیہ نے اس مکان پر اپنی تمام جمع پونجی لگا دی تھی۔ اس وقت وہ ایک سرکاری محکمے میں ملازم





تھی۔ اسی ملازمت سے اس نے بچے پالے تھے اور پھر عدنان کو ہوٹل میں جاب مل گئی تو اس نے زبردستی سعدیہ کو ملازمت چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس وقت سرکاری ملازمین کو گولڈن شیک ہینڈ دے کر فارغ کیا جا رہا تھا۔ سعدیہ کو اچھی خاصی رقم مل گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا کھویا ہوا سکون واپس آ گیا۔ عدنان بہت اچھا لڑکا تھا۔ نعمان بھی ماں کا فرماں بردار تھا۔ اپنی معذوری سے قطع نظر وہ گھر کے بہت سارے کام کر دیتا تھا۔ ماں سے زیادہ وہ بھائی کا دیوانہ تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ گھر میں کیا ہوا ہے ورنہ وہ ان دونوں سے زیادہ پریشان ہو جاتا۔

"نعمان کو مت بتایئے گا۔" عدنان نے کہا۔ "وہ پریشان ہو جائے گا۔"

"تم آج... ہوٹل نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں۔" عدنان نے دوسری طرف دیکھ کر کہا۔ "میں اسپتال جاؤں گا۔"

سعدیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہاں ماریہ کے گھر والے ہوں گے۔ تم کس حیثیت سے جاؤ گے؟"

"میں کسی بہانے سے چلا جاؤں گا۔"

عدنان نہ چاہتے ہوئے بھی پریشان لگ رہا تھا۔ اسی لمحے نعمان اوپر سے آ گیا۔ بھائی کو پریشان دیکھ کر وہ بے قرار ہو گیا۔ اس نے اشارے میں ماں سے پوچھا۔ "بھائی کیوں پریشان ہے؟"

سعدیہ مجبور ہو گئی۔ اس نے اشارے سے بتایا۔ "کسی نے ماریہ کو جنگل میں زخمی کر دیا تھا، وہ اسپتال میں داخل ہے۔"

نعمان کی آنکھیں پھیل گئیں لیکن وہ عدنان کے لیے بے قرار تھا۔ اس نے بھائی کا ہاتھ تھام لیا اور یوں سہلانے لگا جیسے اسے تسلی دے رہا ہو کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اسی اثنا میں کال بیل بجی تو سعدیہ سمجھی دودھ والا آیا ہے۔ دودھ دینے والا عام طور سے چار بجے کے آس پاس آ جاتا تھا۔ وہ برتن لے کر باہر کی طرف گئی۔ اس نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا تو سامنے دو آدمی موجود تھے۔ "عدنان حیات کا گھر یہی ہے؟" ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

سعدیہ کا ماتھا ٹھنکا۔ "ہاں، آپ کون ہیں؟"

"اسے باہر بھیجو، ہم اس سے ملنے آئے ہیں۔"

"وہ گھر پر نہیں ہے۔" سعدیہ نے جھوٹ بول دیا۔ "دفتر چلا گیا ہے۔"

"دفتر کہاں ہے اس کا؟"

"وہ ہوٹل میں کام کرتا ہے۔" سعدیہ نے ہوٹل کا نام بتایا تو وہ دونوں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی سعدیہ اندر آئی اور اس نے عدنان کو ان دونوں کے بارے میں بتایا۔ وہ حیران ہوا۔

"ماما! میں ان سے واقف نہیں ہوں۔"

"میں نے بھی پہلی بار دیکھا ہے، پتا نہیں کون لوگ ہیں۔" سعدیہ پریشان ہو گئی۔ "اللہ خیر کرے۔ یہ ہمارے ساتھ پھر تو کچھ نہیں ہو رہا ہے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عدنان نے اسے تسلی دی اور کھڑا ہو گیا۔ "میں اسپتال جا رہا ہوں۔"

"بیٹا، جلدی واپس آ جانا۔ نہ جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

عدنان نے سر ہلایا اور گھر سے نکل گیا۔

☆☆☆

شاہ جی اور باؤ پارک کے ساتھ والی سڑک پر اپنی گاڑی میں موجود تھے۔ ان کی نظریں اس گلی پر مرکوز تھیں جس میں عدنان کا گھر تھا۔ عورت سے بات کرنے کے بعد جب وہ وہاں سے ہٹے تو شاہ جی نے یقین سے کہا۔ "یہ عورت جھوٹ کہہ رہی ہے۔ لڑکا گھر میں ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو پتا چل جائے گا۔ ہم اس جگہ کی نگرانی کریں گے۔"

گلیاں تنگ تھیں اور اس میں ان کی گاڑی بھی مشکل سے آتی اور اگر وہ گاڑی روک کر بیٹھ جاتے تو گلی بلاک ہو جاتی اس لیے انہوں نے پارک کے ساتھ والی سڑک پر انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ گلی سے کوئی بھی نکل کر آ سکتا تھا۔ انہوں نے عدنان کو نہیں دیکھا تھا اس لیے فیصلہ کیا کہ وہاں سے گزرنے والے ہر نوجوان کو عدنان کہہ کر پکاریں گے اور جو چونکے گا، اسے چھاپ لیں گے۔ انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک گھنٹے بعد عدنان گلی سے نکلا اور جب وہ گاڑی سے آگے نکلا تو شاہ جی نے عدنان کہہ کر پکارا۔ عدنان چونک کر پلٹا تو اسے ایک آدمی گاڑی سے اترتا دکھائی دیا اور جب وہ پاس آیا تو اس کے ہاتھ میں پستول بھی دکھائی دیا۔ عدنان ہراساں ہو گیا۔ آدمی نے آہستہ سے پوچھا۔ "عدنان تم ہی ہو؟"

"ہاں۔" وہ غیر ارادی طور پر بولا۔

آدمی نے پستول اس کے پہلو سے لگا دیا۔ "تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

☆☆☆

حامد خاصی دیر بعد گھر آیا تھا۔ شرمین بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ حامد سڑک پر کیوں اتر گیا تھا اور اس جگہ کیوں اترا تھا جہاں سے کچھ ہی دور ماریہ زخمی حالت میں ملی تھی؟ اس نے شرمین کے سوال پر اتنا درشت رویّہ کیوں اختیار کیا تھا؟ وہ اس سے کیا چھپا رہا تھا؟ جب شرمین اس بارے میں سوچتی تو اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگتا تھا۔ کیا حامد سے کوئی غلطی ہو گئی تھی؟ شادی کے ابتدائی دنوں کے بعد جب حامد کی نفسیاتی کیفیت زیادہ خراب ہونے لگی تھی، تب وہ وقاص کے خلاف بہت بولتا تھا۔ وہ اسے اپنی تباہی کا ذمے دار قرار دیتا تھا۔ اسی کے اکسانے پر انہوں نے فٹ پاتھ پر نام لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ خود تو بچ گیا تھا لیکن حامد پکڑ میں آ گیا اور اس نے اذیت ناک سزا بھگتی تھی۔ ایسی سزا جس نے اسے ہمیشہ کے لیے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ وقاص کے خلاف نفرت کی حد تک چلا جاتا تھا۔ ایسے میں شرمین اسے سنبھالتی تھی۔ اسے یقین دلاتی کہ جو کچھ ہوا، اس میں وقاص کا قصور نہیں تھا۔ یہ اس کی قسمت میں تھا۔ حامد پوچھتا کہ اسی کی قسمت میں کیوں تھا؟ شرمین کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن وہ حامد کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ایک بار اس نے حامد سے کہا۔

”جب آپ وقاص بھائی کو پسند نہیں کرتے ہیں تو ان سے دوستی ختم کر دیں۔“

حامد نے عجیب لہجے میں کہا۔ ”تم نہیں جانتی، جب دوستی ختم ہو جاتی ہے تو سوائے دشمنی کے کچھ نہیں رہتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وقاص سے میری دشمنی ہو۔ نام نہاد سہی لیکن دوستی برقرار رہے۔“

شرمین ڈرتی تھی کہ کبھی حامد، وقاص کو ایسا نقصان نہ پہنچا دے جو ناقابلِ تلافی ہو۔ حامد ویسے بہت ٹھنڈے مزاج کا اور دبی شخصیت کا مالک تھا لیکن بعض اوقات اس کا غصہ اس طرح ابھر کر آتا تھا کہ شرمین بھی ششدر رہ جاتی تھی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں یہ غصہ رنگ نہ لے آئے۔ ماریہ پر حملے اور اس شام حامد کی زخمی حالت میں آمد نے شرمین کے اندر خدشات بھر دیے تھے۔ اوپر سے حامد کا رویّہ بھی شک کو ہوا دینے والا تھا۔ وہ آخر اس سے کیا چھپا رہا تھا؟ اس نے شرمین سے یہ جھوٹ کیوں بولا کہ اسے کسی بائک والے نے ٹکر ماری تھی۔ اس کے پیٹ پر آنے والا زخم کسی ہینڈل سے ٹکر کا نتیجہ نہیں تھا۔ شرمین نے احمد کو کھانا دے کر سونے کے لیے بھیج دیا اور خود نشست گاہ میں آ گئی۔ اس نے حامد کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ کچھ دیر بعد کال بیل بجی اور حامد اندر آیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے کی طرف چلا گیا۔ شرمین ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ وہ اس کے پیچھے کمرے میں آ گئی۔ ”کھانا نکالوں؟“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ حامد نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ شرمین نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اتنا ایب نارمل رویّہ کیوں رکھ رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ میں ایک ایب نارمل آدمی ہوں۔“ حامد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”یہ بتاؤ، تم نے عبید سے جھوٹ کیوں بولا... تمہیں کیا شک تھا؟“

”شک... کوئی شک نہیں... تھا۔“ شرمین گڑبڑائی تو اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

”تمہاری وجہ سے مجھے بھی جھوٹ بولنا پڑا اور...“

حامد بولتے بولتے رک گیا۔ اسے یاد آیا کہ عبید نے اسے یہ بات کسی سے بھی کرنے سے منع کیا تھا۔ شرمین عورت تھی اور اس کے پیٹ میں بات نہیں رہتی۔ وہ حامد کا مزاج سمجھتی تھی اس لیے اس نے درست اندازہ لگایا تھا۔

”کیا عبید بھائی نے آپ سے بات کی ہے؟“

”ہاں، وہ جنگل میں مل گیا تھا۔ اسے شک ہے کہ تم نے اس سے غلط کہا ہے۔ میں چھ بجے کے بعد گھر آیا تھا۔“

شرمین نے سر ہلایا۔ ”آپ ساڑھے سات بجے آئے اور اس وقت آپ شاک کی کیفیت میں تھے۔“

”کیونکہ میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔“ حامد برہمی سے بولا۔ ”اس حوالے سے تمہارے ذہن میں کوئی الٹا سیدھا خیال ہے تو اسے نکال دو۔“

”میرے ذہن میں کوئی خیال نہیں ہے۔“ شرمین ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ”لیکن آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔“

حامد بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ اس کی آنکھیں اچانک پھیل گئیں اور شرمین کو اس سے خوف آنے لگا... پاس آ کر حامد نے آہستہ سے لیکن بہت سرد لہجے میں کہا۔ ”میں تم سے کچھ نہیں چھپا رہا ہوں، اس بات کو یاد رکھنا۔“

”حامد...“ شرمین نے خوف زدہ لہجے میں کہا لیکن حامد اس کی بات سنے بغیر بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اس نے شرمین کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ نہ جانے حامد کے دل میں کیا تھا اور وہ کیا کر رہا تھا یا کیا کر چکا تھا؟

☆☆☆



عبید الجھن میں تھا۔ جب وہ عدنان کے گھر سے نکلا تو اسے لگ رہا تھا کہ وہ سعدیہ کو پہلے بھی دیکھ چکا ہے لیکن کہاں؟ ... یاد نہیں آ رہا تھا۔ پھر اسے جنگل میں حامد مل گیا۔ اس نے عبید کو مزید ذہنی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ وہاں کیوں آیا تھا؟ شرمین نے اس کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا تھا؟ اور حامد نے اقرار کیوں کیا کہ شرمین نے جھوٹ بولا تھا؟ کیا شرمین کو اپنے شوہر پر شک تھا کہ اس نے ماریہ پر گولی چلائی ہے اور اس کوشش میں وہ خود بھی زخمی ہوا تھا... اس لیے اس نے جھوٹ بولا تھا؟ یہ اور ایسے ہی بہت سارے سوالات اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

عبید بچپن میں حامد کو پیش آنے والے حادثے کے بعد سے اس کے خاصا قریب ہو گیا تھا جبکہ وقاص اس سے دور ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے عبید، حامد اور اس کی نفسیاتی الجھنوں کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ حامد بظاہر بڑا ٹھنڈا اور نرم مزاج آدمی ہے۔ اس کی گفتگو میں شاذ ہی گرمی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اس کے اندر گرمی کی لہر سی اٹھتی تھی۔ عام طور سے ایسا ان دنوں میں ہوتا تھا جب وہ خواب میں ڈر جاتا تھا۔ عبید کو میٹرک کے دنوں کا واقعہ یاد تھا۔ وہ اور حامد ایک ساتھ پیپر دے کر سینٹر سے نکلے تھے کہ ایک لڑکا تیزی میں حامد سے ٹکرا گیا۔ اندر سے بہت سارے لڑکے نکل رہے تھے اور دھکم پیل ہو رہی تھی۔ بات معمولی سی تھی لیکن حامد کا ردِعمل شدید تھا۔ اس نے اچانک لڑکے کو گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور نیچے گرا کر بے دریغ لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔ اس کا انداز اس قدر وحشیانہ تھا کہ عبید بھی ششدر رہ گیا تھا۔ پھر اسے ہوش آیا تو اس نے حامد کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کی اور بڑی مشکل سے کامیاب ہوا۔ ذرا سی دیر میں حامد نے لڑکے کو لہولہان کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب عبید اسے ایک پارک میں لایا اور انہوں نے کولڈ ڈرنک پی کر خود کو ٹھنڈا کیا تو حامد نے بغیر کسی شرمندگی کے اعتراف کیا۔ ”یار! مجھے غصہ آ گیا تھا... میں ان دنوں ویسے ہی پریشان ہوں۔“

عبید جانتا تھا کہ اسے ڈراؤنے خواب آ رہے تھے۔ ”یار تم نے اسے لہولہان کر دیا۔“ عبید نے ملامت کی۔ ”اس کا قصور نہایت معمولی سا تھا۔“

”ہاں، بس مجھے غصہ آ گیا تھا۔“ حامد نے بے پروائی سے کہا۔ عبید کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی حامد تھا جو دو دن پہلے بال لگنے سے زخمی ہونے والے بلی کے بچے کے بے آنسوؤں سے رو دیا تھا۔

عبید دفتر آ گیا تھا۔ اس نے باضابطہ ماریہ کے کیس کا چارج لیا اور پھر اس کی فائل تیار کرنے لگا۔ ماریہ کی میڈیکل رپورٹ آ گئی تھی۔ گولی ماریہ کے پیٹ میں لگی تھی۔ کوئی اہم عضو متاثر نہیں ہوا تھا لیکن خون بہت زیادہ بہہ جانے سے دماغ متاثر ہوا تھا اور وہ کوما میں چلی گئی تھی۔ اس کے جسم پر پائے جانے والے خراشوں اور زخموں کے نشانات جنگل میں بھاگ دوڑ کی وجہ سے آئے تھے، اسے کسی نے چھوا نہیں تھا۔ زیادتی کا امکان ڈاکٹر نے پہلے ہی مسترد کر دیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق تمام جسمانی علامات معمول کے مطابق تھیں...

... جسم سے برآمد ہونے والی گولی کی رپورٹ آ گئی تھی۔ یہ اعشاریہ تین تین پستول کی گولی تھی۔ ماریہ پر کوئی دس بارہ فٹ کے فاصلے سے گولی چلائی گئی تھی جو معدے سے ذرا اوپر لگی تھی اور اس نے معدے کو خون لے جانے والی شریان کاٹ دی تھی۔ ماریہ کے ناخن صاف ستھرے تھے اور ان سے کوئی مواد نہیں ملا تھا۔ یعنی حملہ آور نے اس کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی ورنہ وہ ہاتھوں سے دفاع کرتی تو ناخنوں میں قاتل کی کھال کے ریشے یا خون آ جاتا۔

عبید سوچ میں پڑ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ حملہ آور کو ماریہ سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ صرف اسے گولی مارنے آیا تھا۔ اس نے اپنا کام کیا اور چلا گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ماریہ اس وقت یہاں سے گزرے گی اور وہ پستول ساتھ لایا تھا۔ یعنی اس کا ارادہ شروع سے قتل کا تھا۔ اس نے ماریہ کو سامنے سے گولی ماری یعنی ماریہ اس وقت فرار کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ وہ گولی لگنے کے بعد بھاگی تھی۔ دوسری صورت میں گولی اس کی پشت یا پیچھے سے لگتی۔ عبید سوچوں میں گم تھا کہ موبائل کی بیل بجی۔ دوسری طرف وقاص تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

”عدنان کے بارے میں پتا چلا؟“ وقاص نے بلا تمہید پوچھا۔

”ہاں، میں اس سے ملا ہوں۔“ عبید نے محتاط انداز میں کہا۔ ”فی الحال مجھے شک والی کوئی بات نظر نہیں آئی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ وہ سچ مچ ماریہ سے محبت کرتا ہے؟“ وقاص کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”میرا یہی اندازہ ہے۔“

”اگر وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس سے کبھی میں اور تم تعلق رکھتے تھے تو ایک کروڑ پتی باپ کی بیٹی سے شادی کرنا خوشحال مستقبل کی ضمانت ہو سکتا ہے۔“

"اگر تم یہ سمجھتے ہو، تب بھی شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس صورت میں ماریہ کی زندگی اس کی ضرورت تھی۔ اسے گولی مارنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔"

"ممکن ہے ان میں کوئی جھگڑا ہوا ہو۔ تم اسے گرفتار کرکے پولیس والے طریقے سے پوچھتے تو وہ اقرار کر لیتا۔"

"تم جانتے ہو۔ میں روایتی طریقے سے تفتیش کے خلاف ہوں۔" عبید نے سکون سے کہا۔ "ڈنڈے کے زور پر کرائے گئے اعتراف کی عدالت میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔"

"مجھے اعتراف عدالت کے لیے نہیں، اپنے لیے چاہیے۔"

"تب تم ایسا کرو، کسی ایسے پولیس والے سے بات کرو جو تمہاری مرضی کا اقرار کروا دے... تمہاری واقفیت تو ہوگی ایسے پولیس افسران سے؟" عبید کا لہجہ چبھتا ہوا ہوگیا۔

وقاص خاموش ہوگیا پھر اس نے کہا۔ "عبید! تم مجھے مایوس کر رہے ہو۔"

"اگر تم نے مجھ سے یہ توقع کر لی تھی کہ میں ایک دو دن میں ماریہ پر حملہ کرنے والے کو تلاش کر لوں گا تو میں نے یقیناً تمہیں مایوس کیا ہے۔ لیکن تم بھول رہے ہو، کیسز کی تفتیش سالوں بھی چلتی ہے اور بعض اوقات برسوں بعد قاتل اتفاق سے پولیس کے ہاتھ آجاتا ہے۔"

"تم جانتے ہو، مجھ سے صبر نہیں ہو رہا۔" وقاص پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "ماریہ میرے لیے کیا ہے، یہ بھی تم جانتے ہو... میں ابھی اسے اسپتال میں دیکھ کر آرہا ہوں۔ میری بیٹی کا کیا حال ہوگیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن اس سے کیس کی تفتیش پر کیا فرق پڑتا ہے؟"

"تم کوشش کرو۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ عام کیس نہیں ہے۔ اس میں پیچیدگی بہت زیادہ ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ تمہارے کسی دشمن کا کام ہے جس کا تم پر زور نہیں چلا تو اس نے ماریہ کو قتل کرنے کی کوشش کی تاکہ تمہیں تکلیف دے سکے۔ میڈیکل رپورٹ سے ظاہر ہے کہ حملہ آور نے ماریہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور نہ ہی اس نے براہ راست اس پر کوئی تشدد کیا۔ وہ صرف اسے گولی مارنے آیا تھا اور اپنا کام کر کے چلا گیا۔"

"تم نے اچھا نتیجہ نکالا ہے۔" وقاص نے طنز کیا۔

"وقاص!" عبید اس کا طنز نظر انداز کر کے بولا۔ "تمہارا ایسا کوئی دشمن ہے جس پر تمہیں شک ہے؟"

وقاص تھوڑی دیر بعد بولا۔ "نہیں، مجھے کسی پر شک نہیں ہے در حقیقت یو مسٹر پولیس آفیسر۔"

☆☆☆

عدنان فکرمند ضرور تھا لیکن وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ گاڑی میں بیٹھے دونوں افراد نے اسے گن پوائنٹ پر گاڑی میں بٹھایا۔ عدنان نے پوچھا بھی کہ وہ کون ہیں اور اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔ شاہ جی نے اسے جھڑک دیا۔ وہ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ "چپ کر کے بیٹھو... ابھی پتا چل جائے گا۔ اگر سکون سے رہو گے تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

"ورنہ گولی مار کر یہیں پھینک جائیں گے۔" اسے گاڑی میں بٹھانے والے باؤ نے دھمکی دی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور پستول اس کی پسلیوں سے لگا رکھا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اس کی آنکھیں بند کر دی جائیں۔" شاہ جی نے تجویز پیش کی اور ڈیش بورڈ کے خانے سے ایک سن گلاس نکال کر باؤ کو تھما دیا۔ اس نے سن گلاس عدنان کی آنکھوں پر پہنا دیا۔ یہ بالکل تاریک شیشوں کی عینک تھی اور اس میں سائڈوں پر بھی خلا نہیں تھا۔ اب وہ مکمل تاریکی میں تھا۔ اسے قطعی علم نہیں تھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ گاڑی کوئی نصف گھنٹے بعد کہیں رکی اور عدنان نے شٹر اٹھنے کی آواز سنی۔ گاڑی پھر آگے بڑھی اور رک گئی۔ دروازہ کھلا اور کسی نے عدنان کو بازو سے پکڑ کر نیچے اتارا۔ اسے آنکھوں سے عینک ہٹانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ پھر اسے دھکیل کر ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد اس کے سینے پر کوئی چیز لگائی گئی اور پھر اسے کرسی سے راؤنڈ دیا گیا۔ یہ مضبوط پلاسٹک ٹیپ تھا جس نے اسے کرسی سے جکڑ دیا تھا۔ کرسی لوہے کی تھی اور زمین میں نصب تھی۔ وہ اپنی جگہ بندھ کر رہ گیا تھا۔

"میری بات..." اس نے کہنا چاہا تو ٹیپ اس کے منہ پر بھی لگ گیا۔

"اب آرام سے رہے گا کاکا۔" شاہ جی نے اس کا سر تھپکا۔

عدنان مکمل طور پر بے بس ہوگیا تھا اور پہلی بار اسے خوف محسوس ہوا کہ یہ لوگ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟ یہ بات اب وہ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا منہ بند تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ اس کے آس پاس سناٹا تھا۔ اس کا مطلب تھا اسے لانے والے یہاں چھوڑ کر جا چکے تھے۔ اس جگہ سردی تھی اور ایسی بو آرہی تھی جیسی گاڑیوں کے گیراج سے آتی ہے... آئل اور مٹی کے تیل کی بو۔ بہت دیر بعد کہیں سے ہلکی سی چٹ کی آواز آئی اور کوئی



عدنان کے پاس آیا۔ اسے کرسی گھسیٹنے کی آواز آئی۔ پھر اس کے منہ سے ٹیپ اتار دیا گیا۔

"عدنان حیات۔" کسی نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم ماریہ کو جانتے ہو؟"

عدنان چونکا۔ "ہاں... لیکن تم کون..."

اس کا جملہ منہ پر پڑنے والے گھونسے سے ادھورا رہ گیا تھا۔ اس کا سر گھوم گیا اور اسے زبان پر اپنے ہی خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ مارنے والے کا ہاتھ بہت سخت تھا۔ "اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ سوال مجھے کرنے ہیں اور جواب تمہیں دینے ہیں۔"

عدنان نے مشکل سے سر ہلایا۔ اس بار اس نے زبان کھولنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ یہ تیسرا آدمی وقاص تھا۔ اسے پہلی نظر میں اس نوجوان سے نفرت ہوگئی تھی۔ "تم ماریہ سے ملتے ہو؟"

"ہاں..."

"کیوں...؟"

"ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔" عدنان نے کہا تو وقاص نے بے اختیار دوسرا ہاتھ مارا۔ وہ چلایا۔

"جھوٹ بکتے ہو تم... وہ ایسی نہیں ہے۔"

"وہ بہت اچھی ہے۔" عدنان نے خون تھوکا۔ "یہ سچ ہے کہ ہم شادی کرنا چاہتے تھے۔"

وقاص کا ہاتھ تیسری بار اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔

"شادی...؟"

"ہاں... جب وہ گریجویشن کر لیتی اور میں بہتر جاب حاصل کر لیتا تو میری امی اس کے گھر رشتہ لینے جاتیں۔ ہم اس وقت کا انتظار کر رہے تھے لیکن اس سے پہلے..."

عدنان بولتے بولتے رک گیا۔

"تم نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی۔" وقاص کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔

"نہیں۔" عدنان تڑپ گیا۔ "جسے میں زندگی سمجھتا ہوں، اس کی جان کیسے لے سکتا ہوں؟"

"پھر ماریہ پر کس نے حملہ کیا ہے؟"

"اگر مجھے معلوم ہو تو میں خود اسے قتل نہ کردوں۔"

شاہ جی وہاں موجود تھا، باؤ باہر چلا گیا تھا۔ یہ جگہ ان کی ہتھے کی ہوئی گاڑیاں چھپانے کا ٹھکانا تھی۔ یہ جگہ آبادی سے دور اور ایسے کاموں کے لیے بہت موزوں تھی۔ شاہ جی، وقاص اور عدنان کی باتیں بہ غور سن رہا تھا۔ اس نے اشارے سے وقاص کو باہر آنے کو کہا۔ وہ اس کے ساتھ باہر آیا۔ وقاص برہم تھا۔ "کیا بات ہے؟"

"استاد! مجھے یہ لڑکا سچا لگ رہا ہے۔ یہ شرافت سے ہمارے ساتھ چلا آیا۔ اگر اس نے کچھ غلط کیا ہوتا تو اتنی آسانی سے ہمارے ساتھ نہیں آتا۔"

"اسے کیا معلوم تھا کہ تم اسے ماریہ کے حوالے سے لا رہے ہو؟"

"سمجھنے کی کوشش کرو اگر یہ مجرم ہوتا تو بھڑکتا، مزاحمت کرتا لیکن اس کا دل صاف ہے اس لیے بغیر مزاحمت کے ہمارے ساتھ چلا آیا۔"

وقاص نے غور سے شاہ جی کو دیکھا۔ "تم چاہتے ہو اسے چھوڑ دیا جائے؟"

شاہ جی نے سر ہلایا۔ "ہاں... اس کی ماں ہمیں دیکھ چکی ہے اور ممکن ہے کسی نے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے بھی دیکھا ہو۔ اگر یہ غائب ہوا تو بات ہم تک آسکتی ہے۔"

وقاص سمجھ رہا تھا۔ اگر بات ان تک آتی تو پھر وقاص تک بھی آسکتی تھی۔ دوسرے اسے بھی عدنان سچا محسوس ہو رہا تھا۔ اس سے نفرت اپنی جگہ کہ وہ ماریہ سے چھپ کر ملتا تھا۔ یہ انکشاف تھا کہ ماریہ اس کے اعتماد کو دھوکا دے رہی تھی۔ بے شک وہ عدنان سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن اس سے میل جول تو گھر والوں سے چھپ کر ہی رکھا تھا۔ وقاص اسے بچی سمجھتا تھا لیکن فاریہ کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ اب بچی نہیں تھی، جوان لڑکی تھی اور اس نے اپنی سرگرمیاں بھی جوان لڑکیوں والی ہی رکھی تھیں۔ وقاص دوسری طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے گہری سانس لی۔

"ٹھیک ہے... اس کا کیا کرنا ہے؟"

"واپس چھوڑ دیتے ہیں۔ میں اسے سمجھا دوں گا کہ پولیس تک جانے سے گریز کرے ورنہ ہم پھر اسے اٹھا لے جائیں گے۔ یہ اچھا ہوا تم اس کے سامنے نہیں آئے۔"

وقاص نے سر ہلایا۔ "ایسا ہی کرو۔"

شاہ جی نے باؤ کو بلایا۔ اس نے عدنان کو کرسی سے کھولا اور اسے ایک آئس پیک دیا جس سے وہ اپنے سوجے ہوئے جبڑے کی سکائی کرنے لگا۔ ذرا دیر میں اس کا چہرہ تقریباً نارمل نظر آنے لگا تھا۔ اس دوران میں اس کی آنکھوں پر عینک موجود رہی تھی۔ باؤ نے عدنان سے آئس پیک لے لیا اور وہ اسے اندر موجود گاڑی میں لائے۔ شاہ جی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ باؤ عدنان کے برابر میں بیٹھ گیا۔ عدنان محسوس کر رہا تھا کہ اب خطرے کی بات نہیں ہے۔ وہ شاید اسے واپس چھوڑنے جا رہے تھے۔ جلد اس کی تصدیق

بھی ہو گئی۔ برابر میں بیٹھے باؤ نے پستول عدنان کی پسلیوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہم تمہیں چھوڑ رہے ہیں لیکن اگر تم نے پولیس سے رابطہ کیا یا کہیں بھی ہمارا ذکر کیا تو ہم دوبارہ آئیں گے اور اس بار تمہیں ساتھ نہیں لے جائیں گے بلکہ کہیں مردہ چھوڑ جائیں گے۔“

عدنان کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ان لوگوں کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ واقعی ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ وہ تیسرا آدمی ان کا سرغنہ لگ رہا تھا۔ لیکن اسے ماریہ کے قتل یا قاتل سے کیا سروکار ہو سکتا تھا؟ سوچتے ہوئے عدنان کو اچانک خیال آیا کہ کہیں اسے اٹھوانے والا ماریہ کا باپ تو نہیں تھا؟ ماریہ اکثر اپنے باپ کی سخت مزاجی کا ذکر کرتی تھی اور وہ گاڑیوں کا ورکشاپ چلاتا تھا۔ یہ کام کرنے والے اکثر سخت قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے بدمعاشوں سے تعلقات ہوتے ہیں۔ اسے اغوا کرنے والے کچھ اسی قسم کے لوگ تھے۔ وہ اس کے سامنے آئے تھے لیکن تیسرا فرد سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ یقیناً ماریہ کا باپ وقاص تھا۔ آدھ گھنٹے بعد باؤ نے عدنان کی آنکھوں سے عینک اتار لی اور پھر اسے دھکا دے کر گاڑی سے نیچے اتار دیا۔ وہ پارک کے ساتھ والے روڈ پر تھا۔

”ہماری بات یاد رکھنا۔“ باؤ نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔ ”ورنہ ہم پھر آئیں گے۔ تمہارا گھر دیکھا ہوا ہے۔“

”میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔“ عدنان نے کہا۔ ”تم بھی اس شخص کو بتا دینا۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں ماریہ سے محبت کرتا ہوں۔ اسے نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

باؤ نے اشارہ کیا تو شاہ جی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ عدنان انہیں جاتا دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گاڑی کی نمبر پلیٹ جعلی ہو گی۔ یہ دونوں بھی پھر اسے نظر نہیں آئیں گے۔ تاریکی چھا چکی تھی۔ اسے اسپتال جانا تھا اور وہ کہاں جا پہنچا تھا بلکہ لے جایا گیا۔ وہ سرد آہ بھر کر اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ وین سے اسپتال کے سامنے اترا تو رات پوری طرح چھا چکی تھی۔ وہ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ آئی سی یو کے کاؤنٹر پر آیا۔ اس نے ماریہ کا نام بتایا اور بولا۔ ”میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کا اس سے کیا رشتہ ہے؟“ وہاں موجود خاتون نے سوال کیا۔

عدنان پھر ہچکچایا۔ ”وہ میری دوست ہے۔“

”سوری، سوائے رشتے داروں کے کوئی اس سے نہیں مل سکتا اور نہ دیکھ سکتا ہے۔“ عورت نے صاف انکار کر دیا۔

”پلیز۔“ عدنان سراپا التجا بن گیا۔ ”صرف ایک نظر... میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رکوں گا۔“

عورت نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔ ”سوری، میں مجبور ہوں۔ اسپتال کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ دوسرے یہاں اس کے ماں باپ موجود ہیں۔ شاید وہ تمہاری موجودگی پسند نہ کریں۔ اس لیے تم اوپر نہیں جا سکتے۔“

عدنان مایوس ہو کر باہر نکل آیا۔ وہ گیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ عقب سے کسی نے اسے پکارا۔ ”مسٹر! ارے سنو...“

عدنان نہیں رکا کیونکہ پکارنے والے نے اس کا نام نہیں لیا تھا اس لیے وہ خود دوڑا آیا۔ یہ میل نرس کے یونیفارم میں ملبوس جوان آدمی تھا۔ اس نے عدنان کو روکا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ”او بھائی، کہاں بھاگے جا رہے ہو، دوسرے کی بھی سن لیا کرو۔“

”میں سمجھا تم کسی اور کو پکار رہے ہو۔“

”سنو، تم کسی لڑکی کو دیکھنا چاہتے ہو؟“ وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔

عدنان کا دل دھڑک اٹھا۔ ”ہاں... ماریہ نام ہے۔ اسے گولی لگی تھی۔“

”میں ایک منٹ کے لیے تمہیں دکھا سکتا ہوں، صرف پانچ سو دینے ہوں گے۔“

اس وقت وہ عدنان سے اس کی جان بھی مانگتا تو ماریہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے وہ بلا تامل مان جاتا۔ عدنان نے اسے پانچ سو روپے دیے تو وہ اسے عقبی طرف سے اندر لے گیا۔ دوسری منزل پر ماریہ ایک شیشے کی دیوار والے کمرے میں تھی۔ آدمی نے اس سے کہا۔ ”باہر سے دیکھ لو، اندر جانے کی اجازت کسی کو نہیں ہے۔“

سفید اور مرجھائے ہوئے چہرے کے ساتھ ساکت لیٹی ماریہ کو دیکھ کر عدنان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ بہت آہستگی سے سانس لے رہی تھی۔ عدنان دل ہی دل میں اسے پکارنے لگا کہ وہ ایک بار آنکھ کھول کر اسے دیکھ لے اور پھر اس نے ماریہ کے الٹے ہاتھ کی انگلیوں کو ہلتے دیکھا۔ وہ اچھل پڑا۔ اس نے آدمی سے کہا۔ ”دیکھو، وہ ہاتھ ہلا رہی ہے... وہ ہوش میں آ رہی ہے۔“

”وہ کوما میں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اب واپس چلو۔“

عدنان اسے بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خود ماریہ کو ہاتھ ہلاتے دیکھا تھا مگر اس شخص کو یہ خوف تھا کہ ابھی کوئی ڈاکٹر آ گیا تو وہ بھی پکڑا جائے گا۔ اس نے عقبی دروازے سے عدنان کو باہر کرتے ہی دروازہ اندر سے بند کر

لی تھی۔ وہ اس بیک وقت دہشت اور جوش کی کیفیت میں باہر کی طرف چل پڑا۔ ہاتھ ہلنے کا مطلب تھا کہ ماریہ کو ہوش آرہا تھا لیکن کوئی ڈاکٹر اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ہوش میں آرہی تھی اور اسے مزید ٹریٹ منٹ کی ضرورت تھی۔ مگر وہ کیا کرسکتا تھا؟ اسے معلوم تھا کہ اس کی بات کوئی نہیں سنے گا اور اسے دھکے دے کر اسپتال سے نکال دیا جائے گا۔

☆☆☆

شرمین اور حامد ساری رات جاگتے رہے تھے۔ دونوں اپنے اپنے کمبلوں میں کروٹیں بدل رہے تھے۔ صبح شرمین کو نیند آئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو حامد بستر پر نہیں تھا۔ شرمین کو خیال آیا کہ شاید وہ واش روم میں ہے لیکن اندر بالکل خاموشی تھی۔ شرمین نے اٹھ کر دیکھا۔ حامد واش روم میں نہیں تھا بلکہ وہ گھر میں کہیں نہیں تھا۔ اس کے جوتے اور جیکٹ بھی نہیں تھی۔ وہ یقیناً باہر گیا تھا۔ سات بج رہے تھے۔ شرمین نے احمد کو اٹھایا، اسے اسکول کے لیے تیار کرایا اور پھر اسے چھوڑنے بھی گئی۔ اسکول کچھ ہی دور تھا مگر احمد چھوٹا تھا اس لیے اسے چھوڑنے کے لیے کسی کا ساتھ جانا لازمی تھا۔ وہ واپس آئی تو حامد بدستور غائب تھا۔ کبھی کبھی وہ بالکل صبح سویرے واک پر چلا جاتا تھا۔ شرمین ناشتا تیار کر کے اس کا انتظار کرنے لگی۔

ایک گھنٹے بعد اس نے پریشان ہو کر حامد کا موبائل نمبر ملایا لیکن وہ گھر میں بج رہا تھا۔ وہ موبائل اور پرس کچھ لے کر نہیں گیا تھا۔ شرمین فکرمند ہوگئی۔ اس کے ذہن میں وسوسے آرہے تھے۔ خود شرمین کی ذہنی حالت اچھی نہیں تھی۔ ناشتا بنانے کے دوران میں اس سے غلطیاں ہو رہی تھیں۔ پہلی بار اس نے چائے بنائی تو غلطی سے چینی کی جگہ نمک ڈال دیا۔ پھر اسے پھینک کر دوبارہ بنائی۔ حامد روٹی اور سالن سے ناشتا کرتا تھا۔ خود شرمین ڈبل روٹی اور چائے سے ناشتا کرتی تھی۔ جب حامد نہیں آیا تو اس نے خود ناشتا کرلیا.... دس بجے معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا اور اس نے عبید کے دفتر والے نمبر پر کال کردی۔

☆☆☆

عبید ناشتے کی میز پر آیا تو بچے تیار ہو کر اسکول اور کالج جا چکے تھے۔ شہلا اس کے لیے ناشتا نکالنے لگی۔ عام طور سے وہ عبید سے اس کے کام کے بارے میں نہیں پوچھتی تھی لیکن ماریہ سے اس کا تعلق بھی تھا اور دلچسپی بھی۔ اس نے کہا۔ ”کچھ پروگریس ہوئی؟“

عبید نے نفی میں سر ہلایا۔ ”فی الحال صرف اتنا اندازہ ہوا ہے کہ حملہ آور صرف ماریہ کو مارنے آیا تھا۔ اس نے اپنا کام کیا اور غائب ہوگیا۔ اب وہ بالکل تاریکی میں ہے۔“

”وقاص بھائی کا کیا ردعمل ہے؟“

”شدید... اگر گولی چلانے والا اس کے ہاتھ آجائے تو وہ اسے قتل کردے گا۔“

”مجھے بھی یہی لگا ہے۔ گھر میں کئی بار ان کی بلند آواز اور چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ وہ اپنے کمرے میں بند ہوتے تھے اور بہت ریڈ ہو رہے تھے۔“

”وہ اسی مزاج کا شخص ہے۔“

”لیکن مجھے حامد بھائی کا رویہ بہت عجیب سا لگا ہے۔ وہ فاریہ کے پاس نہیں آئے اور صرف ایک بار آئے، وہ بھی شرمین کو لینے۔“

”اس کی کیفیت ان دنوں ٹھیک نہیں ہے۔“

شہلا نے تاسف سے کہا۔ ”بے چارے کب سے اس عذاب میں ہیں۔“

”ہاں، بچپن سے اس کا نفسیاتی علاج جاری ہے لیکن بس عارضی فائدہ ہوتا ہے۔“

ناشتا کر کے عبید باہر آیا۔ شہلا اسے چھوڑنے آئی تھی۔ ”میں دوپہر میں فاریہ کے ساتھ اسپتال جاؤں گی۔ آپ شام کو آتے ہوئے مجھے ان کے گھر یا اسپتال سے لیتے آئیے گا۔“

شہلا رات کو عبید کے ساتھ واپس آگئی تھی۔ فاریہ نے اسے اصرار کر کے بھیج دیا تھا کیونکہ وہ بے آرام تھی، وہاں بھی کام میں لگی رہتی تھی پھر گھر آکر دیکھتی تھی۔ دو دن میں اسے بمشکل دس گھنٹے سونے کا موقع ملا تھا۔ شہلا اس شرط پر آئی تھی کہ وہ کل پھر آئے گی۔ شرمین کا چھوٹا بیٹا تھا اور اسے بہت مشکل ہوتی اس لیے شہلا اور فاریہ نے اسے رکنے سے منع کر دیا تھا۔ دوپہر تک بچے آجاتے تو وہ چلی جاتی۔ عبید گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے لیکن ممکن ہے دیر ہو جائے۔“

”کوئی بات نہیں، دیر ہو جائے تب بھی مجھے لینے آئیے گا۔“

عبید دفتر پہنچا تو لیب سے ماریہ کے پاس سے برآمد ہونے والا سامان آچکا تھا۔ اس میں اس کا پرس، سیل فون، کالج بیگ (یہ بھاگنے کے دوران ایک جگہ گر گیا تھا اور اسی کی دریافت کے لیے عبید نے کتے منگوائے تھے)۔ کچھ رقم اور میک اپ کا چھوٹا موٹا سامان تھا۔ ایک لاکٹ تھا جس پر ”اے“ بنا ہوا تھا۔ عدنان بھی ”اے“ سے آتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹے سے پلاسٹک کے لفافے میں وہ گولی تھی جو ماریہ کے جسم سے نکلی تھی۔



عبید کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر سرد آہ بھر کر اسے ایک طرف رکھ دیا۔ گزشتہ دن اس نے موقع نکال کر پارک اور آس پاس کی بھی تفتیش کی تھی۔ علاقے کے چوکیدار، دوں سے پوچھ گچھ کی لیکن کسی نے بھی ماریہ یا کسی اور کو بھاگتے ہوئے آس پاس اس سڑک پر نہیں دیکھا تھا۔ بس اسٹاپ پر بھی کسی نے کچھ نہیں دیکھا تھا اور نہ کسی نے فائر کی آواز سنی تھی۔ گویا نہ کوئی عینی شاہد تھا اور نہ ہی حملہ آور کے خلاف واقعاتی شہادت تھی۔ حد یہ کہ حملے کے مقصد کا علم بھی نہیں تھا۔ فون کی گھنٹی بجی، اس نے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو، ڈی ایس پی عبید۔“

”عبید بھائی میں شرمین... ہوں۔“

”جی بھابی... حامد ٹھیک ہے؟“

شرمین پھوٹ پڑی۔ ”مجھے ان کی طرف سے ہی پریشانی ہے۔ ان دنوں وہ... وہ بہت عجیب ہو رہے ہیں۔ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے ان سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔“

”بھابی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ حامد سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ آپ جانتی ہیں، یہ اس کا پرانا مسئلہ ہے جو وقفے وقفے سے شدت اختیار کر جاتا ہے۔“

”نہیں... نہیں۔“ شرمین کے لہجے میں بے قراری تھی۔ ”اس بار معاملہ مختلف ہے۔ وہ بہت عجیب ہو رہے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے، انہوں نے کوئی بہت غلط کام کر دیا ہے۔“

”کیا کیا ہے؟“ عبید نے پوچھا۔

”مجھے لگ رہا ہے کہ ماریہ پر انہوں نے ہی...“

”بھابی۔“ عبید نے اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں کہا۔ ”ماریہ اس کے دوست کی بیٹی ہے اور حامد اسے...“

”آپ جانتے ہیں وہ وقاص بھائی کو اپنی بربادی کا ذمے دار قرار دیتے رہے ہیں۔ کئی مرتبہ میں نے انہیں نیند میں بڑبڑاتے دیکھا ہے۔ وہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ وہ وقاص کو نہیں چھوڑیں گے۔“

”بھابی، میری بات سنیں۔“ عبید نے محسوس کیا کہ خود شرمین کی ذہنی حالت بھی ٹھیک نہیں ہو رہی ہے۔ کوئی بیوی اپنے ہوش و حواس میں اپنے شوہر کے بارے میں اس طرح کی بات کسی پولیس افسر سے نہیں کر سکتی ہے۔ ”آپ یہ بات کسی سے نہیں کہیں گی، ٹھیک ہے؟ حامد ایسا نہیں کر سکتا میں اسے جانتا ہوں۔“

”میں اس کی بیوی ہوں...“

”آپ خود ہوش میں نہیں ہیں ورنہ اس قسم کی باتیں نہ کرتیں۔“ عبید نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تفتیش کرنا میرا کام ہے اور یہ مجھے کرنے دیں۔“

اس نے فون رکھ دیا۔ اسی لمحے اس کی نظر دروازے کی طرف گئی۔ وہاں وقاص کھڑا تھا۔ اس کا نصف جسم اندر تھا اور نصف دروازے کے پیچھے۔ وہ اندر آرہا تھا۔ عبید اسے دیکھ کر ایک لمحے کو گڑبڑا گیا کیونکہ جب اس نے وقاص کو دیکھا تو اسے لگا وہ ابھی نہیں آیا تھا بلکہ کچھ دیر پہلے سے وہاں موجود تھا اور فون پر اس کی گفتگو سن لی تھی۔ لیکن وقاص کا چہرہ نارمل تھا۔ اگر اس نے عبید اور شرمین کی گفتگو سن لی ہوتی تو اس وقت نارمل نہ ہوتا۔ اس نے سنبھل کر پوچھا۔ ”وقاص! تم... کب آئے؟“

”بس ابھی۔“ اس نے اندر آکر دروازہ بند کیا۔ ”ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا تم سے ملتا چلوں۔“

عبید جانتا تھا کہ وقاص ایسے ملنے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ وہ خاص طور سے اس سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”آؤ بیٹھو... ماریہ کی حالت کیسی ہے؟“

”ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ چوبیس گھنٹے اہم ہیں۔“ وقاص کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ”مجھے لگ رہا ہے کہ ڈاکٹرز تسلیاں دے رہے ہیں۔ اب تک اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔“

”شہلا کہہ رہی تھی کہ وہ دوپہر کو تمہاری طرف چلی جائے گی۔“

وقاص نے سر ہلایا۔ ”میں شہلا بھابی کا شکرگزار...“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ عبید نے اس کی بات کاٹی۔ پھر اس نے دراز کھول کر اس میں رکھی ماریہ کی چیزیں نکال کر وقاص کے سامنے رکھ دیں۔ ”یہ... ماریہ کا سامان۔“

کالج بیگ پیچھے رکھا تھا، وہ بھی میز پر رکھ دیا۔ وقاص نے گہری سانس لے کر ماریہ کا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ اس میں سے موبائل نکالا۔ وہ بند تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”جب پولیس کو یہ ملا تو کیا بند تھا؟“

عبید نے سر ہلایا۔ ”یہ بند نہیں خراب ہے۔ شاید بھاگتے ہوئے ماریہ سے گرا تھا اور اس میں فالٹ آگیا ہے۔ یہ آن نہیں ہو رہا ہے۔ بہرحال، اس کی سم نکال کر ہم نے اس میں موجود معلومات حاصل کرلی ہیں۔ ایس ایم ایس، ان کمنگ اور آؤٹ گوئنگ کالز کا ریکارڈ ضائع ہوگیا ہے۔ صرف فون بک میں موجود نمبر ہاتھ آئے ہیں۔ ریکارڈ کمپنی سے لینا پڑے گا۔ میں نے درخواست بھجوادی ہے۔“

عبید نے ایک پرنٹڈ کاغذ وقاص کے سامنے کیا۔ ”سیل

سے ملنے والے یہ سارے نمبر ہیں۔ کیا تم ان کے بارے میں بتا سکتے ہو؟''

وقاص نے سوائے ایک نمبر کے باقی تمام نمبروں کے بارے میں بتا دیا اور جو نمبر رہ گیا تھا، عبید کے خیال میں وہ کسی نہ کسی طرح عدنان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے فون کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم ڈائل کر کے معلوم کر سکتے ہو۔''

عبید نے بھی کیا، یہ فکس فون نمبر تھا۔ کال کا جواب ایک خاتون نے دیا۔ ''ڈی ایس پی عبید۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کون بات کر رہی ہیں؟''

''ڈی ایس پی صاحب! میں سعدیہ بات کر رہی ہوں۔ کیا آپ کو معلوم ہو گیا ہے؟''

عبید کا اندازہ درست نکلا کہ فون نمبر عدنان سے متعلق ہے۔ البتہ یہ حیرت کی بات تھی کہ نمبر گھر کا تھا، ہوٹل کے ریکارڈ میں عدنان کا یہ نمبر موجود نہیں تھا۔ شاید اس نے جان بوجھ کر وہاں بھی ظاہر کیا تھا کہ اس کے گھر پر فون نہیں ہے۔ وہ سعدیہ کے انداز پر چونک گیا۔ ''آپ کس بارے میں بات کر رہی ہیں؟''

''کل شام عدنان ماریہ کو دیکھنے اسپتال جانے کے لیے گھر سے نکلا تو دو افراد نے اسے اغوا کر لیا۔ وہی دو افراد کچھ دیر پہلے گھر پر اس کے بارے میں پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ وہ اسے کسی نامعلوم جگہ لے گئے۔ اسے مارا پیٹا اور ماریہ کے بارے میں پوچھتے رہے۔ انہوں نے اس پر ماریہ پر حملہ کرنے کا..... الزام لگایا تھا۔'' سعدیہ نے تیزی کے ساتھ لیکن مکمل بات کی۔

''یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟''

''عدنان نے۔'' سعدیہ اب کسی قدر پریشان ہو گئی۔ ''کیا آپ کو عدنان نے رپورٹ نہیں کی؟''

''نہیں، یہ تو میں آپ سے سن رہا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ عدنان نے اس واقعے کی رپورٹ کیوں نہیں کی؟''

سعدیہ ہچکچائی۔ ''اسے ان لوگوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے پولیس کو رپورٹ کی تو وہ اسے پھر اٹھا کر لے جائیں گے اور اس بار اسے.....''

''عدنان کہاں ہے؟''

''وہ رات کو اسپتال گیا تھا۔ آج صبح بھی اسپتال گیا ہے۔ اس نے ہوٹل سے چھٹی لی ہوئی ہے۔''

''ٹھیک ہے، وہ آئے تو اسے میرے پاس بھیج دیں۔ میں انویسٹی گیشن آفس میں ہوں۔'' عبید نے پتا بتایا۔ ''عدنان نے کوئی خاص بات بتائی؟''

سعدیہ سے بات بھول گئی تھی اس لیے اب وہ پوری بتانے پر مجبور ہو گئی۔ ''وہ اسے جہاں لے گئے تھے، وہاں ایسی کوئی جیسے گاڑیوں کی مرمت کرنے والے گیراج میں آتی ہے۔''

عبید چونکا۔ ''اسے لے جانے والے دو افراد کو آپ نے بھی دیکھا تھا... ان کا حلیہ بتا سکتی ہیں؟''

''ہاں، دیکھا تھا۔'' سعدیہ نے کہا اور جو حلیہ بتایا، تقریباً شاہ زیب اور رفیق ناجی پر پورا اترتا تھا۔ عبید نے ایک بار پھر عدنان کو آفس بھیجنے کی تاکید کے ساتھ فون بند کر دیا۔ وقاص سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عبید نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کل شام تمہارے دوستوں شاہ زیب اور رفیق ناجی نے عدنان کو اغوا کیا اور اسے کہیں لے جا کر مار پیٹ کی۔ وہ اس پر الزام لگا رہے تھے کہ اس نے ماریہ پر حملہ کیا ہے۔''

وقاص نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ لڑکا جھوٹ کہہ رہا ہے۔ وہ دونوں کل شام سے رات تک میرے ساتھ تھے۔''

عبید ذرا آگے ہوا۔ ''وقاص! اگر میں روایتی پولیس والا ہوتا تو ان کو اٹھا کر لے آتا اور وہ اپنے منہ سے اقرار کرتے کہ انہوں نے عدنان کو اغوا کیا تھا لیکن...'' وہ بولتے بولتے رکا۔ ''یہ میری آخری وارننگ ہے، پولیس کی تفتیش میں مداخلت سے گریز کرو۔ مجھے افسوس ہے کہ جو باتیں میں نے تمہیں دوست سمجھ کر بتائیں، تم نے ان کا غلط فائدہ اٹھایا۔ اس لیے اب مجھ سے اس کیس کے سلسلے میں دوستی والی توقعات مت رکھنا۔''

وقاص کھڑا ہو گیا۔ ''میں نے ایسی کوئی توقع رکھی بھی نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا پھر اس نے میز پر رکھے ماریہ کے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا میں یہ لے جا سکتا ہوں؟''

''ہاں، تم یہ لے جا سکتے ہو۔ فی الحال ماریہ کی موبائل ہم تمہیں نہیں دے سکتے۔''

وقاص نے ہینڈ بیگ اور دوسری چیزیں ماریہ کے کالج بیگ میں ڈالیں۔ جب اس نے اس کا لاکٹ اٹھایا تو اس کا چہرہ متغیر ہوا تھا۔ غالباً اس نے بھی ''اے'' کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ وہ سب چیزیں لے کر خاموشی سے عبید کے دفتر سے رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی عبید تشویش زدہ نظر آنے لگا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر شرمین کا نمبر ملایا اور رابطہ ہوتے ہی بولا۔ ''میں عبید بات کر رہا ہوں۔ حامد کہاں ہے؟''

''وہ تو صبح سے واپس نہیں آئے۔''

عبید نے گھڑی کی طرف دیکھا گیارہ بج رہے تھے۔ ''کچھ اندازہ ہے، کتنے بجے سے نکلا ہوا ہے؟''



''میں نے ساڑھے چار بجے کے قریب دیکھا تھا تب تو سو رہے تھے۔ اس کے بعد پتا نہیں کس وقت چلے گئے۔''

روشنی ساڑھے چھ بجے تک ہوتی تھی۔ اگر حامد ساڑھے چھ بجے نکلا تھا اور یقیناً پیدل گیا تھا تو اسے اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ ساڑھے چار گھنٹے بہت تھے۔ عبید نے کہا۔ ''وہ آئے تو سب سے پہلے مجھ سے رابطہ کرے اور پھر کہیں مت جائے۔ یاد رہے گا، یہ بہت ضروری ہے کہ وہ گھر سے نہ نکلے۔''

شرمین، عبید کے انداز پر پریشان ہو گئی۔ ''کیا ہوا عبید بھائی! خیریت تو ہے نا؟''

''نہیں، آپ نے مجھے اور حامد دونوں کو بہت بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ بہرحال جیسے ہی وہ آئے مجھ سے رابطے کے لیے کہیں یا خود مجھے کال کر دیں۔'' عبید نے فون بند کیا تو وہ بچ بچ پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس خبردار کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔

☆☆☆

عدنان مجبور تھا۔ سعدیہ نے اس کے چہرے کا ورم محسوس کر لیا تھا۔ ویسے وہ ماں سے جھوٹ بولنے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے سب سچ سچ بتا دیا۔ سعدیہ تڑپ گئی اور خوف زدہ ہو کر بولی۔ ''جانے کون بدمعاش تھے اور کیا چاہتے تھے؟''

عدنان نے ہچکچا کر کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ وہ ماریہ کے باپ کے آدمی تھے اور جس آدمی نے مجھ سے چھپ کر بات کی تھی، وہ خود ماریہ کا باپ تھا۔''

''بیٹا، اب تم ان چکروں سے دور رہو۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو... اب میں مزید کوئی صدمہ برداشت نہیں کر سکتی۔''

''آپ فکر نہ کریں، ماں۔'' عدنان نے اسے تسلی دی۔

اگلے دن وہ نو بجے تیار ہو کر اور ناشتا کر کے وہ گھر سے نکل گیا۔ اس نے سعدیہ کو بتایا کہ وہ ماریہ کو دیکھنے اسپتال جائے گا اور کہیں باہر سے کال کر کے دفتر میں چھٹی کا کہہ دے گا۔ وہ اسپتال پہنچا۔ اس بار اس نے سامنے سے جانے کے بجائے وہی عقبی راستہ آزمایا۔ خوش قسمتی سے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اسے راستہ یاد تھا۔ وہ اوپری منزل میں آئی سی یو کے اس حصے میں آیا جہاں ماریہ داخل تھی۔ اس نے باہر سے ماریہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ کل کی نسبت بہتر لگ رہا تھا۔ سانس لینے کی رفتار بھی تیز تھی لیکن وہ ساکت تھی۔ عدنان نے آس پاس دیکھا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے شیشے کے آگے پردہ کر دیا اور پھر ماریہ کے پاس آیا۔ پیار سے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور پھر سسک اٹھا۔ ''ماریہ

پلیز... اٹھ جاؤ... دیکھو، میں تمہارے پاس ہوں... تم مجھ سے اتنی بے پروا کبھی نہیں رہیں... تم جانتی ہو، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہوں... پلیز اٹھ جاؤ... سب تمہارے لیے بہت پریشان ہیں۔'' روتے روتے جب اس کا دل ہلکا ہوا اور اس نے آنسو صاف کیے، تب اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس کوئی کھڑا ہے۔ وہ عدنان کو اتنی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ وہ گڑبڑا گیا۔

''تم عدنان ہونا؟'' اس نے پوچھا۔

''جی لیکن آپ...''

''میں حامد ہوں۔ تمہارے محلے میں رہتا ہوں۔''

تب عدنان کو پتا چلا کہ وہ اسے جانا پہچانا کیوں لگ رہا تھا۔ ''آپ یہاں...؟''

''یہ میرے دوست کی بیٹی ہے۔ پہلے وہ بھی اسی محلے میں رہتا تھا۔'' حامد نے وضاحت کی۔

''میں جانتا ہوں وقاص صاحب کو...''

''لیکن تم یہاں اور اس طرح...'' حامد نے جان کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''وہ... میں ماریہ کو پسند کرتا ہوں۔'' عدنان نے جھینپ کر کہا۔

''وہ تم سے ملتی تھی؟''

''جی... ہم شادی کرنا چاہتے تھے۔'' عدنان نے کہا پھر اسے اپنے اور ماریہ کے بارے میں بتانے لگا۔

''اللہ کرے ماریہ ٹھیک ہو جائے اور تم دونوں ایک ہو جاؤ۔'' حامد نے کہا۔ ''لیکن تم اندر کیسے آئے؟''

عدنان جھینپ گیا اور پھر اس نے بتایا کہ وہ کس طرح نرس پاس کر کے اندر آیا ہے۔ حامد رات بھر جاگنے کے بعد صبح سویرے گھر سے نکل گیا تھا۔ اس کے اندر وحشت سی بھر گئی تھی۔ وہ اس وحشت کو کم کرنا چاہتا تھا۔ وہ پیدل چلتا رہا۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی تھی اور جب وہ چونکا تو اسپتال کے سامنے تھا۔ وہ حیران رہ گیا کیونکہ یہ جگہ اس کے علاقے سے کئی میل دور تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر اندر آ گیا۔ وہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا اس لیے اسے کسی نے نہیں روکا۔ وہ ماریہ کے کمرے تک آیا تو شیشے کی کھڑکی پر پردہ دیکھ کر چونکا اور اندر آیا تو ماریہ کے سرہانے اس نوجوان کو دیکھ کر چونکا۔ وہ اس کی آمد سے بے خبر اپنی بات کرتے ہوئے رو رہا تھا۔ حامد متاثر ہوا تھا۔ نوجوان سچ مچ ماریہ سے محبت کرتا تھا لیکن جب وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ انجان بن گیا جیسے ابھی ابھی آیا ہو۔ عدنان نے کہا۔ ''میں کل بھی ماریہ کو دیکھنے آیا تھا تب اس کی بائیں ہاتھ کی انگلیوں نے حرکت کی تھی۔''

''لیکن ابھی تو یہ ساکت ہے۔'' حامد نے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ اب تم چلے جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ وقاص بھی یہاں تمہاری موجودگی پسند نہیں کرے گا۔ وہ ذرا سخت مزاج آدمی ہے۔''

''جی اچھا۔'' عدنان نے بے دلی سے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

کافی دور تک پیدل چلنے سے اس کی ٹانگیں دکھ رہی تھیں اور وہ بھوکا بھی تھا۔ اس نے نکلتے وقت پرس نہیں لیا تھا لیکن وہ اس وقت گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ شرمین کی باتیں رہ رہ کر اس کے اندر گونج رہی تھیں اور اسے گھر جانے کے خیال سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اسپتال سے باہر تھا اور پھر ایک طرف چل پڑا۔

☆☆☆

گھر میں داخل ہوتے ہی عدنان نے محسوس کر لیا تھا کہ سعدیہ فکرمند ہے۔ وہ اسے کچھ کہنا چاہ رہی تھی اور ہچکچا بھی رہی تھی۔ عدنان نے خود پوچھ لیا۔ ''ماما! کوئی مسئلہ ہے؟''

''نہیں بیٹا۔'' سعدیہ نے کہا۔ ''لیکن مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ ڈی ایس پی عبید کی کال آئی تو میں سمجھی کہ تم نے اسے بتا دیا ہے اور پھر میرے منہ سے بھی نکل گیا کل والے واقعے کے بارے میں... اور مجھے پوری بات بتانی پڑی۔''

عدنان پریشان ہو گیا۔ ''ماما! یہ اچھا نہیں ہوا... وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔''

''اب تو ہو گیا ہے۔ ڈی ایس پی نے کہا ہے کہ تم اس سے دفتر میں آ کر ملو۔''

''کیوں؟'' عدنان چونکا۔ ''وہ رپورٹ لکھوانا چاہتا ہے؟''

''اس بارے میں تو اس نے نہیں بتایا۔''

''ٹھیک ہے، میں ان کے پاس ابھی چلا جاتا ہوں۔'' عدنان نے کہا پھر اسے خیال آیا اور اس نے بتایا۔ ''جو ہمارے محلے میں رہتے ہیں وہ مجھے ماریہ کے کمرے میں ملے تھے۔ وہ وقاص انکل کے دوست ہیں۔''

''لگتا ہے یہ تینوں ہی دوست ہیں۔'' سعدیہ نے کہا۔

''میری مراد ڈی ایس پی، حامد صاحب اور ماریہ کے والد سے ہے۔''

''شاید۔'' عدنان نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

سعدیہ نے عقب سے پکارا۔ ''میں کھانا بنا رہی ہوں، کھا کر جانا۔ تم نے ناشتا بھی ٹھیک سے نہیں کیا تھا۔''





عدنان نے لاؤنج سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ نعمان اور شفیق کونے میں بیٹھے اشاروں میں بات کر رہے تھے۔ نعمان کی وجہ سے عدنان اور سعدیہ بھی اشاروں کی زبان جان گئے تھے لیکن نعمان اور شفیق ماہر تھے۔ عدنان غور کرنے پر ہی جان سکتا تھا کہ وہ کیا بات کر رہے تھے لیکن اس نے غور نہیں کیا، وہ الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

عبید کی الجھن ماریہ کے کیس کے معاملے میں بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے شبہ تھا کہ وقاص نے اس کی اور شرمین کی بات سن لی تھی اور اپنے ردعمل سے ظاہر نہیں کیا تھا۔ اگر اس نے سن لیا تھا تو ردعمل کیوں ظاہر نہیں کیا؟ کیا وہ حامد سے خود نمٹنا چاہتا تھا؟ وقاص کے بارے میں عبید جانتا تھا کہ وہ منتقم مزاج ہے۔ اسے کسی سے تکلیف پہنچے تو وہ اسے معاف نہیں کرتا۔ وہ دنیا میں جس ہستی سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے، وہ ماریہ ہے۔ اس پر حملہ کرنے والے کو وقاص کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔ دوپہر تک کچھ ضروری کام نمٹا کر وہ لنچ کے لیے اٹھ گیا۔ دوپہر کا کھانا وہ نزدیکی ریستوران میں کھاتا تھا۔ وہ لنچ کر کے واپس آیا تو دفتر میں عدنان اس کا منتظر تھا۔

''مجھے آپ کا حکم ملا تھا؟''

عبید اسے اپنے دفتر میں لے آیا۔ ''تم نے کل کے واقعے کی رپورٹ کیوں نہیں کی؟''

عدنان نے سادگی سے وضاحت کی۔ ''ان لوگوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے پولیس سے رابطہ کیا تو مجھے اور میرے گھر والوں کو مار دیا جائے گا۔''

''تم باضابطہ رپورٹ کرانے کے بجائے مجھ سے بھی بات کر سکتے تھے۔''

''میں تو آپ کے بارے میں بھی نہیں جانتا۔ ممکن ہے آپ میری بات کا اعتبار نہ کرتے۔'' عدنان نے صاف گوئی سے کہا۔ ''میری ماما کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔''

عبید حیران ہوا۔ ''بالکل یہی بات میں نے تمہاری ماما کو دیکھ کر محسوس کی۔ تم لوگ ہمارے یہاں سے جانے کے بعد اس محلے میں آئے تھے؟''

''جی، ہمیں یہاں آئے ہوئے دس گیارہ سال ہوئے ہیں۔''

''میری فیملی یہاں سے پندرہ سال پہلے شفٹ کر گئی تھی۔'' عبید نے سوچ کر کہا۔ ''یہ بتاؤ تمہارے گھر میں کبھی ایسا کوئی واقعہ ہوا جس میں پولیس شامل ہوئی ہو؟''

عدنان ہچکچایا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''جی... کوئی بارہ سال پہلے میرے والد پُراسرار طور پر غائب ہو گئے تھے۔ وہ بے روزگار تھے اور ان دنوں ہمارے حالات اچھے نہیں تھے۔ امی نے تنگ آ کر جاب کر لی تھی لیکن ان کی تنخواہ اتنی نہیں تھی۔ ابو کو جاب نہیں ملتی تھی۔ پھر ایک دن وہ گھر آئے، انہوں نے اپنا سامان سمیٹا اور عجلت میں چلے گئے۔ انہوں نے امی کو یا مجھے کچھ نہیں بتایا۔ نعمان اس وقت چھوٹا تھا۔''

''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''ابو کے جانے کے ایک دن بعد ہمارے گھر پولیس آئی تھی۔ انہوں نے پورے گھر کی تلاشی لی اور امی سے بھی پوچھ گچھ کی تھی۔''

اچانک عبید کی یادداشت میں وہ کیس ابھر آیا۔ ''رائٹ... مجھے یاد آ گیا۔ یہ ایک میڈیکل اسٹور پر ڈکیتی کی واردات تھی۔ ایک ڈاکو نے اندر گھس کر دکان کے مالک سے رقم طلب کی اور اس کے انکار پر اسے گولی مار دی اور فرار ہو گیا۔ کم سے کم نصف درجن گواہوں نے اسے گولی چلاتے اور فرار ہوتے دیکھا تھا۔ بعد میں ان لوگوں نے تصویر سے حیات شفیع کو شناخت کیا۔''

''میرے ابو نے یہ قتل کیا تھا یا نہیں۔'' عدنان نے افسردگی سے کہا۔ ''لیکن وہ اس کے بعد دوبارہ گھر نہیں آئے۔ ان کے بعد لوگوں نے ہمارا جینا حرام کر دیا تھا، اس لیے امی نے وہ مکان بیچ دیا۔ حالانکہ وہ بہت بڑا تھا۔ اصل میں وہ دادا جان کا مکان تھا اور ابو کی حرکتوں کی وجہ سے انہوں نے مکان امی کے نام کر دیا تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ ابو کہیں اسے بھی نہ بیچ دیں۔ وہ کماتے نہیں تھے اور گھر کی چیزیں بیچ دیتے تھے۔''

''میں اس وقت نیا نیا اے ایس آئی آیا تھا۔'' عبید نے کہا۔ ''میں ماتحت کے طور پر اس کیس میں شامل ہوا تھا۔ بعد میں حیات شفیع کے غائب ہونے کی وجہ سے کیس داخلِ دفتر کر دیا گیا تھا۔ میڈیکل اسٹور کا مالک گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا تھا اس لیے یہ تین سو دو کا کیس بن گیا۔''

''یہی وجہ تھی کہ آپ امی کو دیکھے ہوئے لگ رہے تھے۔'' عدنان نے کہا۔

''کیا تم کل والے واقعے کی رپورٹ لکھوانا چاہتے ہو؟''

عدنان نے سوچا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے۔''

عبید نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ''ٹھیک ہے، ویسے تم بےفکر رہو۔ میں تمہاری حفاظت کا بندوبست کر دوں گا۔''

عدنان نے پوچھا نہیں کہ وہ اس کے لیے کیا کرے گا۔ وہ عبید سے اجازت لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد عبید سوچتا رہا۔ اس کے خیال میں یہ اچھا ہوا کہ عدنان نے رپورٹ نہیں کرائی ورنہ مجبوراً اسے کارروائی کرنا پڑتی۔ اسے مارے جانے والے میڈیکل اسٹور کے مالک کا نام یاد تھا۔ اس نے فون اٹھا کر ریکارڈ کیپر کو کال کی۔ "بارہ سال پہلے خالق داد مرڈر کیس کی فائل لے آؤ... کیس داخلِ دفتر کر دیا گیا تھا۔"

دس منٹ بعد فائل اس کے سامنے تھی۔ اس میں سامنے ہی حیات شفیع کی تصویر تھی۔ تاثرات سے ہٹ کر اس کی صورت عدنان سے ملتی تھی۔ حیات کے چہرے پر سختی اور ایک طرح کا کمینہ پن جھلک رہا تھا۔ اس کی صورت سے منفی شخصیت کا تاثر جھلکتا تھا جبکہ عدنان کے چہرے پر نرمی اور تازگی تھی۔ عبید کیس کی تفصیل پڑھنے لگا۔ مبینہ مجرم حیات شفیع شام چار بجے خالق داد کے میڈیکل اسٹور میں داخل ہوا اور گن پوائنٹ پر اس سے رقم طلب کی۔ اس کی مزاحمت پر حیات شفیع نے اس کے سینے میں گولی ماری اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ تین افراد میڈیکل اسٹور میں موجود تھے۔ مزید تین افراد باہر تھے۔ ان سب نے ڈکیتی اور قتل کی یہ واردات دیکھی تھی۔ عبید واردات کی تفصیل کے بعد تفتیشی رپورٹ اور کیس کی تکنیکی تفصیلات دیکھنے لگا پھر وہ چونک اٹھا۔ اس نے رپورٹ کے اس حصے کو غور سے پڑھا اور پھر فون اٹھا کر محکمے کے اسلحے کے ماہر کو طلب کیا۔ کچھ دیر بعد ماہر محمد رضا خان اس کے سامنے تھا۔ عبید نے رپورٹ اس کے سامنے رکھی اور پھر اسے ماریہ کے جسم سے نکلنے والی گولی دی۔ "مجھے ایک گھنٹے کے اندر اس کے بارے میں رپورٹ کرو۔"

"صرف آدھ گھنٹا لگے گا۔" اس نے یقین دلایا اور فائل اور گولی لے کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

شرمین کی فکر بڑھتی جا رہی تھی۔ احمد کی اسکول سے چھٹی کا وقت ہوا تو وہ خود جا کر اسے لے آئی۔ حامد ابھی تک نہیں آیا تھا۔ جیسے ہی وہ احمد کو لے کر گلی میں داخل ہوئی، اسے وقاص نظر آیا۔ وہ اس کے گھر کے دروازے پر موجود تھا۔

"وقاص بھائی! آپ...؟"

وقاص نے بلا تمہید پوچھا۔ "حامد کہاں ہے؟"

"وہ صبح سے کہیں نکلے ہوئے ہیں۔" شرمین نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "آیئے اندر آیئے۔"

وقاص اس کے ساتھ اندر پہنچ گیا۔ نشست گاہ میں آکر وقاص نے احمد سے کہا۔ "آپ اپنے کمرے میں جاؤ۔"

احمد نے ماں کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلا دیا۔ احمد خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی وقاص کے تاثرات بدل گئے۔ "تم نے عبید کو کال کی تھی؟"

شرمین چونکی۔ "ہاں لیکن..."

"تم نے اس سے کہا تھا کہ تمہیں حامد پر شک ہے... ماریہ پر حملے کا...؟"

شرمین کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ "وہ غلط فہمی..."

"مجھے بتاؤ تمہیں شک کیوں ہوا؟" وقاص اس کی بات کاٹ کر بولا۔ اس کا لہجہ خوفناک حد تک سنجیدہ ہو گیا تھا۔ شرمین کا جسم کانپنے لگا۔

"وقاص بھائی... میں پاگل ہو گئی تھی... اس شام حامد گھر آئے تو زخمی تھے۔ ان کے پیٹ پر زخم تھا، ہاتھ کی پشت پر بھی تھا۔ انہوں نے بتایا نہیں کہ انہیں کیا ہوا تھا... اور پھر ان کا رویہ..." شرمین روہانسی ہو گئی۔

"کیسا رویہ...؟"

"وہ پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ بات بات پر مجھ پر غصہ کر رہے تھے۔"

"شرمین!" اس بار وقاص کا لہجہ نرم تھا۔ "مجھے یاد ہے حامد کے باپ کے پاس ایک پستول تھا۔ جب ہم چھوٹے تھے، تب ایک بار حامد نے مجھے دکھایا تھا۔ وہ پستول اب کہاں ہے؟"

"مجھے یاد نہیں ہے۔" شرمین لرزتے لہجے میں بولی۔

"یاد کرو۔" وقاص نے کہا۔

"وہ شاید حامد نے کہیں رکھا ہے۔"

"تم نے آخری بار وہ پستول کب دیکھا تھا؟"

"شاید دو سال پہلے۔ حامد احمد کے بڑے ہونے کے بعد ایسی چیزوں کو چھپا کر رکھنے لگے ہیں۔"

"اسے اپنے بچے سے بہت پیار ہے۔" وقاص نے کہا تو شرمین رو دی۔

"پلیز وقاص بھائی... حامد نے کچھ نہیں کیا... میں پاگل ہوں جو میں نے ایسا سوچا... ماریہ تو ہمارے لیے بیٹی جیسی ہے۔"

وقاص نے سر ہلایا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ خود پر ضبط کرنے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے۔ پھر وہ اچانک پلٹا اور گھر سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد شرمین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ صدمے اور جذباتی کیفیت نے اسے تقریباً نیم بے ہوش کر دیا تھا۔ پھر احمد نے آکر اسے



محبوبہ۔ وہ اٹھی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ وہ حیران ہوئی، شام کے چار بج رہے تھے۔ وہ فون کی طرف لپکی اور عبید کے دفتر کا نمبر ڈائل کیا لیکن بیل جا رہی تھی، وہ ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ پھر اس نے عبید کا موبائل نمبر ملایا۔ کچھ دیر بعد عبید نے کال ریسیو کی۔ شرمین نے بے تابی سے کہا

"عبید بھائی! شرمین بات کر رہی ہوں... ابھی وہ یہاں آئے تھے۔"

☆☆☆

چلتے چلتے حامد کے پاؤں جواب دینے لگے تھے۔ وہ ایک بس اسٹاپ کی بینچ پر بیٹھ گیا۔ بھوک سے زیادہ اب اسے نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے گزشتہ رات کو بھی برائے نام کھایا تھا۔ وہ اپنے ذہنی ابال سے نجات پانے کے لیے اپنے جسم کو مشقت میں ڈال رہا تھا۔ شاید جسمانی تکلیف اسے اس کرب سے نجات دلا دیتی۔ بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی کیونکہ کسی نے اسے ہلایا تو وہ چونک کر بیدار ہوا تھا۔ وہ دوبارہ چونکا۔ اس کے سامنے وقاص کھڑا تھا۔ اس نے عجیب لہجے میں پوچھا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں... پتا نہیں... بس ایسے ہی۔" حامد نے بے ربط جواب دیا۔

"شرمین بتا رہی تھی کہ تم صبح سے گھر سے نکلے ہوئے ہو؟"

"ہاں، اب میں گھر جا رہا تھا لیکن تھک کر یہاں بیٹھ گیا۔ اب میں گھر جاؤں گا۔"

"آؤ میرے ساتھ۔" وقاص نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"تم میرے گھر گئے تھے؟"

وقاص نے سر ہلایا۔ "ہاں، شرمین نے بتایا کہ تم صبح سے بتائے بغیر نکلے ہوئے ہو۔"

"مجھے پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے۔" حامد پشیمانی سے بولا۔ "اللہ نے سب دیا ہوا ہے، گھر بار، بیوی بچے... لیکن ماضی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

"ماضی کبھی آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔" وقاص نے ... لہجے میں کہتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔

حامد نے سرد آہ بھری۔ "تم نے ٹھیک کہا۔ ماضی کبھی آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

وہ حامد کے علاقے کے پاس ہی تھے اور وقاص نے گاڑی بھی اسی طرف بڑھائی تھی۔ اس لیے حامد کا خیال تھا کہ وہ اس کے گھر کی طرف جا رہا ہے، اسے ڈراپ کرنے لیکن جب پارک والی سڑک آ گئی اور وقاص اس کے پاس سے رفتار کم کیے بغیر گزر گیا تو حامد نے توجہ دی۔ "میرے گھر کی طرف جانے والی سڑک تو گزر گئی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"اگر تم کہیں اور جا رہے ہو تو مجھے یہیں اتار دو۔ میں گھر جاؤں گا۔"

"نہیں، ابھی تم میرے ساتھ جاؤ گے۔" وقاص نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بھوکے ہو۔"

"ہاں، میں نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا ہے۔"

وقاص نے ایک بیکری کے سامنے گاڑی روک دی اور حامد سے کہا۔ "تم بیٹھو، میں کچھ کھانے کے لیے لاتا ہوں۔"

بیکری میں آتے ہوئے وقاص نے موبائل نکالا اور شاہ جی کو کال کی۔ "جمیل کے ساتھ آ جاؤ... بیک پوائنٹ دیکھا ہے نا؟ ان دنوں وہاں کوئی نہیں ہوتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا... کوئی خاص بات؟"

"ہاں، میں حامد کو لا رہا ہوں۔" وقاص نے آہستہ سے کہا۔ "تم لوگ پہلے سے وہاں موجود ہو گے۔"

"ٹھیک ہے، میں باؤ کو لے کر پہنچتا ہوں۔"

وقاص کھانے کی کچھ تیار چیزیں اور کولڈ ڈرنک کے ٹن لیے... باہر آیا تو حامد گاڑی کے دروازے سے سر لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیلے رنگ کی ٹینس بال تھی۔ ایک دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے یہ بال نظر آئی تھی۔ وہ پرس گھر بھول آیا تھا لیکن جیکٹ ٹٹولی تو اس میں سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکل آیا۔ حالانکہ وہ سخت بھوکا تھا لیکن پھر بھی اس نے گیند لے لی۔ بڑھے ہوئے شیو اور تھکے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ قابلِ رحم لگ رہا تھا۔ وقاص نے دروازہ کھولا تو وہ چونک گیا۔ وقاص نے شاپر اس کی طرف بڑھا دیا۔ "کھانا شروع کرو۔"

حامد ایک پیٹیس نکال کر کھانے لگا۔ "تم کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟... شرمین پریشان ہو رہی ہو گی۔"

وقاص آہستہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ "اس کی فکر مت کرو۔ میں اسے بتا دوں گا۔ آج میں عبید کے پاس بھی گیا تھا۔"

"ماریہ پر حملہ کرنے والے کا کچھ پتا چلا؟"

"تھوڑا بہت پتا چلا ہے لیکن عبید سے نہیں۔"

حامد نے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تم اپنے طور پر بھی کوشش کرتے رہے ہو؟"

"نہیں، پتا عبید کے توسط سے چلا ہے لیکن اس سے نہیں... اس نے تو مجھ سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔"

حامد حیران ہوا۔ ”عبید نے تم سے چھپانے کی کوشش کی لیکن کیوں؟... وہ حملہ آور کو کیوں بچانے لگا؟“

”کیونکہ قاتل سے اس کا قریبی تعلق ہے۔“ وقاص نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”بلکہ اس کا تو مجھ سے بھی تعلق ہے۔“

حامد نے شاپر رکھ دیا اور کولڈ ڈرنک کا ٹن کھول لیا۔

”عبید اور تم سے کیا تعلق ہے اس کا؟“

”وہی جو میرا اور عبید کا ہے۔“

حامد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے وقاص کے تاثرات بہت عجیب اور بہت ڈرانے والے محسوس ہوئے۔ اچانک اس کے اندر خوف کی لہر سی دوڑنے لگی۔

”وقاص! تم میرے گھر گئے تھے... شرمین نے تم سے کچھ کہا ہے؟“

”اگر اس نے کچھ کہا تو کیا غلط کہا ہے؟“

حامد خاموش رہا پھر اس نے ٹن ایک ہی سانس میں خالی کر کے اسے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ ”میں نہیں جانتا کہ اس نے کیا کہا ہے لیکن وہ ان دنوں بہت الجھی ہوئی ہے۔ اس نے میری زندگی بھی مشکل کر دی ہے۔ جبکہ اس وقت مجھے اس کے سہارے کی ضرورت ہے۔“

وقاص نے گاڑی جھیل کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دی تھی۔ ”کیسے سہارے کی؟... تم نے کیا کیا ہے؟“

”میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔“ حامد نے کسی قدر برہمی سے کہا۔ ”یہ تم جھیل کی طرف کیوں جا رہے ہو؟“

”ہم جھیل پہنچنے والے ہیں۔“ وقاص نے کہا۔ ذرا دیر میں جھیل نظر آنے لگی اور وقاص نے گاڑی کچے راستے کی طرف موڑ دی۔

”تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ کوئی بات کرنی تھی تو میرے گھر چل کر بھی کر سکتے تھے۔“

”وہ بات تمہارے یا میرے گھر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے یہی جگہ موزوں ہے۔“ وقاص نے کہتے ہوئے گاڑی کو جھیل کے نسبتاً بلند کنارے کی طرف گھمایا۔ یہاں جھیل کا کنارہ... توتے ورجے کی ڈھلان کی صورت میں کوئی پندرہ فٹ نیچے تھا اور یہاں کنارے پر پانی خاصا گہرا تھا۔ حامد چونکا کیونکہ وہاں گاڑی اور اس کے ساتھ کھڑے وقاص کے دونوں دوست شاہ جی اور باؤ پہلے سے موجود تھے۔ وقاص نے گاڑی روک دی اور حامد سے کہا۔ ”نیچے اترو۔“

حامد نیچے اتر آیا۔ دوسری طرف سے وقاص بھی اتر آیا تھا۔ شاہ جی اور باؤ نے حامد کو دائیں بائیں سے اپنے نرغے میں لے لیا اور وقاص اس کے سامنے کھڑا تھا۔ حامد اب ہراساں اور فکرمند تھا۔ اس نے پھر وقاص سے پوچھا۔ ”مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“

”ایک سوال کا جواب لینے کے لیے۔“ اس نے لہجے میں کہا۔

”کیسا سوال؟“

”تم نے ماریہ پر کیوں گولی چلائی؟“

حامد یوں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا جیسے اسے وقاص کے پتھر کی طرح لگے ہوں۔

☆☆☆

ماہر کی رپورٹ آدھ گھنٹے بعد عبید کے سامنے تھی اور اس کا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ اتفاق ہے؟ اگر اتفاق ہے تو بہت خوفناک ہے۔ اس نے فون اٹھا کر نفری کے انچارج کو چار افراد کی چھاپا مار پارٹی تیار کرنے کا حکم دیا۔ دس منٹ بعد پارٹی ایک پولیس موبائل کے ساتھ تیار تھی۔ عبید ڈرائیور کے ساتھ آیا اور اسے عدنان کے گھر کا پتا بتا کر چلنے کا حکم دیا۔ چاروں سپاہی پیچھے کھلی جگہ مستعد بیٹھے تھے۔ وہ خود ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ابھی وہ راستے میں تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجی، اس نے اسکرین دیکھی۔ حامد کے نمبر سے کال آرہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی تو شرمین کی ہذیانی آواز آئی۔

”عبید بھائی! شرمین بات کر رہی ہوں۔ ابھی وقاص بھائی آئے تھے۔“

عبید دہل کر رہ گیا۔ ”بھابی! کیا ہوا ہے؟ حامد کہاں ہے؟“

”ان کا پتا نہیں ہے۔“ شرمین رونے لگی۔ ”لیکن وقاص بھائی نے میری اور آپ کی بات سن لی تھی، وہ پوچھ رہے تھے۔ عبید بھائی! پلیز کچھ کریں۔ ان کے تاثرات بہت خوفناک ہو رہے تھے۔“

عبید خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ وہ وقاص کو جانتا تھا۔ اب بہت ضروری تھا کہ اس سے پہلے کہ وقاص کوئی غلط قدم اٹھائے، وہ اصل قاتل تک پہنچ جائے۔ اس نے شرمین سے کہا۔ ”غور سے سنیں... حامد گھر آجائے تو اسے میری طرف بھیج دیں یا فون کرے تو اسے کہیں میرے دفتر آجائے۔ اب وقاص آئے یا اس کی طرف سے کوئی آئے تو اسے گھر میں نہ گھسنے دیں۔ میں مقامی پولیس اسٹیشن سے آپ کے گھر کی حفاظت کا بندوبست کرتا ہوں۔“

کال منقطع کر کے عبید نے مقامی تھانے فون کیا اور وہاں سے چند سپاہی حامد کی رہائش گاہ بھیجنے کو کہا۔ اس کی



...تی تھی۔ حامد غائب تھا اور وقاص کو اس کے ...میں ملوث ہونے کا ... ایک بار اصل قاتل اس کے ہاتھ ... تو وہ مطمئن ہو سکتا تھا۔ اب وہ عدنان کے گھر پہنچنے کے لیے زیادہ بے تاب تھا۔ اس نے ڈرائیور کو رفتار ...ھانے کا حکم دیا۔ ... بیس منٹ بعد پولیس موبائل عدنان ... کے سامنے رکی۔ بیل کے جواب میں گیٹ عدنان نے ... عبید اور اس کے تاثرات دیکھ کر چونکا۔

”خیریت ڈی ایس پی صاحب؟“

”نہیں۔“ عبید نے سنگین لہجے میں کہا۔ ”مجھے تم سے ...ت کرنی ہے۔“

”آجائیے۔“ عدنان نے کہا تو عبید نے اے ایس ...ئی کو اشارہ کیا۔ وہ بھی اس کے ساتھ آگیا اور باقی پارٹی باہر رہ گئی۔ عدنان انہیں نشست گاہ میں لے آیا۔ عبید نے ...ٹھتے ہی کہا۔

”تم جانتے ہو تمہارے باپ حیات شفیع نے جس شخص پر گولی چلائی تھی وہ اس گولی سے ہلاک ہو گیا تھا اور پولیس کو جو گولی اس کے جسم سے ملی تھی وہ پولیس ریکارڈ میں محفوظ ہے؟“

”نہیں جناب! مجھے اس کا علم نہیں ہے۔“

”جو گولی ماریہ کے جسم سے نکلی، وہ بھی پولیس ریکارڈ میں محفوظ ہے۔“

”جی۔“ عدنان نے اتنا ہی کہا۔

”جب میں نے ان دونوں گولیوں کا موازنہ کرایا تو حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ دونوں گولیاں ایک ہی پستول سے چلائی گئی ہیں۔“

عدنان دہل گیا۔ ”نہیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ایسا ہوا ہے اور اسی وجہ سے ہم تمہارے گھر میں موجود ہیں۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ عدنان پریشانی میں خود سے کہہ رہا تھا۔ ”میں تو اسے...“

”کیا اسے...؟“

”جناب۔“ عدنان عاجزی سے بولا۔ ”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کا امکان نہیں ہے۔“

”پولیس کے اسلحے کے ماہر نے ثابت کیا ہے۔ اسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔ اور جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ یہ کس ... ہوا تو یہ تم بتاؤ گے۔“

سعدیہ وہاں چلی آئی اور پولیس کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ ”ڈی ایس پی صاحب! کیا ہوا ہے؟“

عبید نے کہا۔ ”ماریہ پر قاتلانہ حملہ اس پستول کی گولی سے ہوا جس سے حیات شفیع نے خالق داد کو قتل کیا تھا۔ دونوں گولیاں پولیس کے پاس ہیں اور تجزیے سے ثابت ہو گیا ہے کہ یہ ایک ہی پستول سے چلائی گئی تھیں۔“

سعدیہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے عدنان کی طرف دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”یہ بالکل ممکن ہے۔ وہ پستول کہاں ہے؟“ عبید نے ہاتھ آگے کیا۔ ”میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔ پستول میرے حوالے کرو۔ اب تمہارے پاس اعتراف جرم کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔“

عدنان نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”جناب! میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ ابو کا پستول میرے پاس ہے۔ جب ابو آخری بار گھر آئے تو اسے یہیں بھول گئے تھے۔ میں نے پستول شاپر میں لپیٹ کر مکان کے صحن میں دفن کر دیا تھا۔ اس وجہ سے تلاشی لینے والے اسے حاصل نہیں کر سکے تھے۔ میں نے اسے امی سے بھی چھپا کر رکھا تھا۔ پھر ایک بار امی نے دیکھ لیا۔ امی نے اسے کہیں پھینکنے کو بھی کہا تھا لیکن میں نے اسے ابو کی نشانی سمجھ کر رکھا تھا۔ جب نعمان بڑا ہوا تو میں اسے چھپا کر رکھنے لگا۔“

”پستول لوڈ ہے؟“

عدنان نے سر ہلایا۔ ”ہاں لیکن میں نے نہ تو کبھی اسے چلایا ہے اور نہ اسے اندر سے چھیڑا ہے۔ ہاں، اوپر سے اس کی صفائی کی ہے۔“

عبید نے اچانک اپنا پستول نکال لیا۔ ”وہ کہاں ہے؟ مجھے لے کر چلو اور کوئی غلط حرکت مت کرنا۔“

عبید کی دیکھا دیکھی اے ایس آئی نے بھی اپنی رائفل سنبھال لی تھی۔ سعدیہ خوف سے سفید پڑ گئی۔ نعمان وہاں نہیں تھا لیکن جب عدنان، عبید کو اپنے کمرے کی طرف لے جا رہا تھا تو وہ اوپر سے آگیا۔ عبید کو دیکھ کر اس نے بے قراری سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ عدنان نے اشارے میں اس سے کہا۔ ”کوئی بات نہیں ہے۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

مگر نعمان جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دو پولیس والوں کو اپنے بھائی پر ہتھیار تانے دیکھ کر اس کے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ بپھرا ہوا تھا۔ مجبوراً سعدیہ نے اسے پکڑ لیا اور کھینچ کر پیچھے لے گئی۔ عدنان، عبید کے ساتھ کمرے میں آیا۔ اس نے الماری کھولی تو عبید نے ذرا پیچھے ہو کر پستول سیدھا کر لیا۔ ”ہاتھ آرام سے نکالنا اور پستول نکال کر نیچے رکھ کر پیچھے ہٹ جاؤ۔“

عدنان نے سر ہلایا۔ اس نے الماری کے اندر نمبروں

سے کھلنے والا لاکر کھولا اور اس کے اندر ہاتھ ڈالا پھر چونک گیا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ عبید کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ مزید محتاط ہو گیا اور سخت لہجے میں بولا۔ ”کیا بات ہے؟ پستول نکالو۔“

عدنان نے پستول نکالا اور اسے ہدایت کے مطابق فرش پر رکھ دیا۔

”اب پیچھے ہٹ جاؤ۔“ عبید نے پھر کہا۔ عدنان پیچھے ہوا تو عبید نے رومال ہاتھ میں لے کر پستول اٹھایا اور اس کی نال سونگھی۔ ”اس سے حال ہی میں گولی چلائی گئی ہے۔“

”میں اپنی امی اور ماریہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے پستول یہیں رکھا تھا۔ یہ کئی سال سے یہیں ہے۔“ عدنان نے پریشانی سے کہا۔

”مجھے افسوس ہے، میں تمہیں گرفتار کرنے پر مجبور ہوں۔ تم پر ماریہ پر قاتلانہ حملہ کرنے کا الزام ہے۔“

اشارے پر اے ایس آئی نے بیلٹ سے ہتھکڑی نکالی اور عدنان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔ اس دوران میں عبید نے واکی ٹاکی پر سپاہیوں کو اندر آنے کا حکم دیا۔ ایک منٹ میں سپاہی اندر آچکے تھے۔ انہوں نے سعدیہ، عدنان اور نعمان کو لاؤنج میں بٹھا دیا۔ عبید کے پاس پستول دیکھ کر نعمان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ عدنان خوف زدہ ہونے سے زیادہ حیران دکھائی دے رہا تھا۔ سعدیہ نے عدنان کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں دیکھیں تو تڑپ گئی۔

”یہ کیا، میرے بچے...؟“

”میں نہیں جانتا امی۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”ڈی ایس پی صاحب کہہ رہے ہیں کہ اس پستول سے وہ گولی چلی ہے جو ماریہ کے جسم سے نکلی ہے۔“

”یہ حقیقت ہے۔“ عبید بولا۔ ”مزید ٹیسٹ سے یہ بات ثابت بھی ہو جائے گی۔ اس پستول سے دوسری گولی حال ہی میں چلی ہے۔“

سپاہی گھر کی تلاشی لے رہے تھے لیکن وہاں سے مزید کچھ برآمد نہیں ہوا۔ اس دوران میں سعدیہ گڑگڑا رہی تھی کہ عدنان بے قصور ہے۔ عبید کا دل بھی اس معاملے میں ڈانواں ڈول تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ نوجوان اس لڑکی پر گولی چلا سکتا ہے جس سے بقول اس کے وہ پیار کرتا ہے۔ مگر حالات بتا رہے تھے کہ حملہ آور وہی ہے۔ پستول اس کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔ عبید نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے عدنان لیکن میں تمہیں ماریہ پر قاتلانہ حملے کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔“

سعدیہ رونے لگی۔ نعمان یہ سب حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سعدیہ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو اس نے بتایا، پولیس عدنان کو ماریہ پر قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں گرفتار کر رہی ہے۔ نعمان کی آنکھیں پھیل گئیں پھر اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا اور اشاروں میں کچھ کہنے لگا۔ اس پر سعدیہ اور عدنان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اچانک عدنان نے بندھے ہاتھوں کے ساتھ کچھ اشارے کیے تو نعمان نفی میں سر ہلانے لگا۔ عبید دیکھ رہا تھا۔ ”یہ کیا اشارے ہو رہے ہیں؟“

نعمان نے اس کی طرف دیکھا اور وہی اشارے کیے۔ عبید گونگے بہرے افراد کی اس مخصوص زبان سے بے خبر تھا۔ لیکن اسے احساس ہوا کہ نعمان کچھ خاص بتا رہا ہے، شاید ماریہ کیس کے بارے میں خاص۔ اس نے عدنان کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا کہہ رہا ہے؟“

”کچھ نہیں ڈی ایس پی صاحب! مجھ سے محبت کرتا ہے تو آپ سے التجا کر رہا ہے کہ مجھے گرفتار نہ کریں۔ لیکن آپ قانونی تقاضے پورے کریں۔ مجھے لے چلیں۔“ عدنان نے کسی قدر بے چینی کے ساتھ کہا۔

عبید نے ایک نظر نعمان کی طرف دیکھا اور پھر جیب سے نوٹ بک نکال کر اس پر لکھا۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

اس نے نوٹ بک نعمان کے سامنے کی تو عدنان چلایا۔ ”ڈی ایس پی صاحب! مجھے لے چلیں۔ اس پاگل کی باتوں پر توجہ نہ دیں۔“

مگر نعمان نے جھپٹ کر عبید سے نوٹ بک اور پین لیا۔ اس نے کچھ لکھا۔ عبید جھک کر دیکھ رہا تھا۔ نعمان نے لکھا تھا۔ ”ماریہ کو میں نے گولی ماری تھی۔“

☆☆☆

نعمان نے جب ہوش سنبھالا تو دو ہستیوں کو اپنے آس پاس دیکھا۔ جب حیات شفیع غائب ہوا تو وہ صرف دو تین سال کا تھا اور اسے باپ کی صورت بھی یاد نہیں تھی۔ باپ جیسی شفقت اس نے اپنے بڑے بھائی سے پائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کا دیوانہ تھا۔ یہ دیوانگی اس حد تک تھی کہ کبھی سعدیہ عدنان سے زیادہ پیار کرتی تو نعمان کو عدنان سے نہیں، سعدیہ سے حسد محسوس ہوتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس سے زیادہ اس کے بھائی سے محبت کرے۔ عدنان اور سعدیہ اس کی دیوانگی پر ہنستے تھے۔ بڑے ہونے کے بعد بھی اس کی دیوانگی برقرار رہی بلکہ شاید بڑھ گئی تھی۔ سعدیہ کبھی مذاق میں نعمان سے کہتی کہ جب عدنان کی شادی ہو جائے گی تب وہ کیا کرے گا؟ اس کا بھائی کسی اور کا ہو جائے گا تو نعمان اس مذاق پر بھی خفا ہو جاتا۔ مگر جب ماریہ عدنان کی زندگی میں آئی تو





نعمان کو احساس ہوا کہ یہ مذاق اب سچ بننے والا ہے۔ عدنان ماریہ سے محبت کرتا تھا اور شادی کے بعد وہ اس کا ہو جاتا۔

بدقسمتی سے نعمان کا زور نہیں چلا کہ وہ اسے ماریہ سے محبت کرنے سے روکے۔ ردعمل میں وہ ماریہ سے نفرت کرنے لگا۔ دل ہی دل میں اس بارے میں سوچتا اور اس کی خواہش تھی کہ ماریہ کسی طرح عدنان کے راستے سے ہٹ جائے یا اس سے دور چلی جائے۔ رفتہ رفتہ ماریہ کے لیے اس کی نفرت اتنی بڑھ گئی کہ وہ اس کے خلاف منصوبے بنانے لگا۔ نعمان کو پتا تھا کہ عدنان کے پاس ایک پستول ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ پستول کہاں سے آیا لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ عدنان کی الماری کے لاکر میں ہے اور اسے لاکر کا نمبر بھی معلوم تھا۔ عدنان نے کئی بار اس کے سامنے کمبی نیشن ملایا تھا اور نعمان کو نمبر یاد ہو گیا۔ عدنان کی عدم موجودگی میں اس نے کئی بار سعدیہ سے چھپ کر اس پستول کا معائنہ کیا۔

نعمان کا واحد دوست شفیق، ماریہ کے لیے اس کی نفرت سے واقف تھا اور اس نے نعمان کو تجویز پیش کی کہ ماریہ کو کسی طرح دھمکایا جائے کہ وہ ڈر کر عدنان سے دور چلی جائے۔ نعمان کو یہ تجویز اچھی لگی۔ دونوں دوستوں نے مل کر منصوبہ بنایا کہ ماریہ جب اپنی دوست سمیرا کے گھر سے واپس جائے گی تو وہ اسے پستول سے ڈرائیں گے۔ نعمان جانتا تھا کہ ماریہ عدنان سے ملنے آتی ہے اور پھر اپنی دوست سمیرا کے گھر چلی جاتی ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ماریہ کو لینے اس کا باپ آتا تھا۔ مگر نعمان کو یقین تھا کہ کبھی اس کا باپ نہیں آسکے گا اور ماریہ کو خود جانا پڑے گا اور تب وہ اپنے منصوبے پر عمل کر سکیں گے۔ اتفاق سے انہیں اس کا موقع جلد مل گیا۔

اس دن عدنان گھر واپس آیا تو نعمان کو یقین ہو گیا کہ وہ ماریہ سے مل کر آیا ہے۔ جیسے ہی عدنان اندر گیا، اس نے شفیق کو بھیجا کہ وہ تصدیق کر کے آئے کہ ماریہ سمیرا کے گھر میں ہے۔ شفیق کی سمیرا کے چھوٹے بھائی سے بھی دوستی تھی اور وہ اس کے گھر جاتا تھا۔ اس نے تصدیق کر لی۔ اب نعمان عدنان کے ہوٹل جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ذرا تاخیر سے گھر سے نکلا اور اس کے جاتے ہی نعمان نے لاکر سے پستول نکالا اور اپنے اپر میں چھپا کر پارک میں آگیا جہاں شفیق موجود تھا اور سڑک کی نگرانی کر رہا تھا۔ اگر ماریہ کا باپ اسے لینے آجاتا تو وہ واپس آکر نعمان کو بتا دیتا اور وہ کسی اور دن اپنے منصوبے پر عمل کرتے۔ شفیق نے بتایا کہ ماریہ کے باپ کی گاڑی نہیں آئی ہے اور اسی لمحے انہیں ماریہ گلی سے نکل کر پارک والی سڑک کے ساتھ جاتی دکھائی دی۔ وہ پارک میں رہتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑے۔

ماریہ ڈری ہوئی تھی۔ وہاں سناٹا اور ویرانی تھی۔ دور تک کوئی بندہ نظر نہیں آرہا تھا۔ نعمان اور شفیق اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ جان بوجھ کر آہٹ پیدا کر کے چلنے لگے۔ ماریہ سہم کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ جب وہ سڑک کے وسط میں پہنچی تو نعمان اور شفیق نے خوفناک قسم کے ماسک نکال کر چہروں پر لگا لیے اور پارک کی دیوار پھلانگ کر سڑک پر آئے۔ ماریہ انہیں دیکھ کر اتنی ڈری کہ بے اختیار جنگل کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں خوفناک آوازیں نکالتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑے۔ ماریہ بھاگتے ہوئے چیخیں مار رہی تھی لیکن وہاں کوئی اس کی چیخیں سننے والا نہیں تھا۔ نعمان اور شفیق اس کھیل سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ بول نہیں سکتے تھے لیکن اپنے گلے سے مختلف آوازیں ضرور نکال سکتے تھے۔

پھر ایک جگہ انہوں نے ماریہ کو گھیر لیا۔ اس کی حالت بُری تھی۔ وہ رو رہی تھی اور التجا کر رہی تھی کہ اسے جانے دیا جائے۔ اب نعمان اسے پستول سے دھمکانے لگا۔ وہ بار بار پستول یوں اس کی طرف کرتا جیسے ابھی گولی چلا دے گا۔ ماریہ سہم کر منہ چھپاتی یا روتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔ ایک بار اس نے پستول ماریہ کی طرف کیا تو نہ جانے کیسے گولی چل گئی۔ نعمان کو فائر کی آواز نہیں آئی تھی لیکن ہاتھ کو جھٹکا لگا اور پھر ماریہ پیٹ پکڑتے ہوئے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف کے ساتھ حیرت کے تاثرات بھی نظر آئے۔ پھر وہ پلٹی اور اندھادھند جنگل کے اندر والے حصے کی طرف بھاگ نکلی۔ اس کا...... بیگ وہیں گر گیا تھا۔

نعمان اور شفیق کا مقصد ماریہ کو ڈرانا تھا، اسے مارنا یا نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ اس لیے جب گولی چلی تو دونوں ہی دہشت زدہ ہو گئے۔ کم روشنی کے باوجود انہوں نے ماریہ کے جسم سے پھوٹتا خون دیکھ لیا تھا۔ جب وہ اندھیرے میں کہیں غائب ہو گئی تو انہیں بھی ہوش آیا اور وہ پلٹ کر بھاگے اور سیدھے...... گھر آگئے۔ سعدیہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ اسے پتا نہیں چلا۔ نعمان نے خاموشی سے پستول واپس عدنان کے لاکر میں رکھ دیا۔ شفیق اوپر اس کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اب دونوں ڈرے ہوئے تھے کہ بات کھلے گی اور پولیس انہیں پکڑ لے گی۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ اس بارے میں اپنی زبان بند رکھیں گے۔ کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔

☆☆☆

سعدیہ کا بُرا حال تھا اور اس سے زیادہ بُرا حال عدنان کا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کا بھائی ماریہ پر حملہ کر سکتا ہے۔ عبید نے تحریری صورت میں نعمان سے سارا واقعہ لکھوا لیا تھا اور عدنان کے ہاتھوں سے ہتھکڑی کھول دی گئی۔ وہ نعمان پر جھپٹا، اسے تھپڑ مارے اور پھر گلے سے لگا کر رونے لگا۔ جب عبید نعمان کو بغیر ہتھکڑی لگائے وہاں سے لے جانے لگا تو سعدیہ اس سے لپٹ گئی۔ بڑی مشکل سے عدنان نے اسے الگ کیا۔ عبید نعمان کو باہر لایا، اور گاڑی میں بٹھانے کے بعد اس نے عدنان سے کہا۔ ”نعمان نے جو کیا ہے، وہ غلطی سے کیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس پر ہلکی دفعہ لگائی جائے پھر اسے کم عمری کا فائدہ بھی ملے گا۔ مجھے امید ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ تین سال کی سزا ہوگی، اور وہ بھی دو سال میں ختم ہوجائے گی۔“

”شاید لیکن اس کی ذات پر مجرم ہونے کا دھبا تو آجائے گا۔“ عدنان نے افسردگی سے کہا۔ ”مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا ہے۔“

عبید نے اس کا شانہ تھپکا اور گاڑی میں بیٹھ گیا اور جیسے ہی گاڑی چلی اس نے موبائل نکال کر وقاص کا نمبر ملایا۔

☆☆☆

”تم... تم پاگل ہوگئے ہو۔“ حامد نے دنگ لہجے میں کہا۔ ”مجھ پر ماریہ کو قتل کرنے کی کوشش کا الزام لگا رہے ہو۔“

”ہاں، میں پاگل ہوگیا ہوں۔“ وقاص چلایا۔ ”تم جانتے ہو ماریہ میرے لیے کیا ہے۔ تم نے اس کی حالت دیکھی ہے۔ وہ کس طرح بے بسی سے اسپتال کے بیڈ پر پڑی ہے۔ میں ماریہ کو اس حال تک پہنچانے والے کو اپنے ہاتھ سے مارنے کی قسم کھا چکا ہوں۔“

حامد اس کے لہجے سے خوف زدہ ہوگیا۔ ”لیکن میں نے ماریہ کو گولی نہیں ماری ہے۔“

”تب شرمین کو تم پر شک کیوں ہے؟“

”وہ پاگل ہورہی ہے۔ میں بائک کی ٹکر سے زخمی ہوا اور وہ نہ جانے کیا سمجھنے لگی۔“

وقاص نے آگے آکر اس کی جیکٹ کھولی اور پھر جھٹکے سے شرٹ اوپر کردی۔ نیچے پٹی بندھی تھی۔ اس نے بے رحمی سے پٹی بھی کھینچ لی۔ حامد کراہا۔ زخم ابھی بھرا نہیں تھا۔ اسے تکلیف ہورہی تھی۔ وقاص نے جھک کر زخم دیکھا اور بولا۔ ”یہ بائک سے ٹکرانے سے نہیں بن سکتا۔“

”لیکن یہ سچ ہے۔ میں بائک سے ٹکرا گیا تھا۔ میں اس وقت سوچوں میں گم تھا اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ٹکر کیسے ہوئی اور مجھے کیا لگا تھا۔ لیکن مجھے لگا جیسے بائک میرے پیٹ میں لگا ہو۔“

وقاص نے حامد کا زخم انگلی سے دبایا۔ وہ چیخا لیکن شاہ جی اور باؤ نے اسے بازوؤں سے جکڑ لیا اور کھڑا رہنے پر مجبور کیا۔ وقاص نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم مسلسل جھوٹ بول رہے ہو۔ تم جیسے سے پہلے ساڑھے سات بجے زخمی حالت میں واپس آئے۔ کیا کسی نے یہ حادثہ ہوتے دیکھا؟“

”نہیں، اس وقت وہاں سناٹا تھا، اور پھر بائک والا فوراً بھاگ گیا تھا۔“

”گویا کوئی گواہ نہیں ہے۔“ وقاص نے طنزیہ کہا۔

حامد دکھی ہورہا تھا۔ ”ہاں، میرا سوائے خدا کے گواہ نہیں ہے۔“

”حامد! تمہارے باپ کے پاس ایک پستول تھا، وہ کہاں ہے؟“

”ہاں، وہ اب بھی میرے پاس ہے۔“ حامد نے جواب دیا۔

”گویا تمہارے پاس پستول بھی ہے اور ماریہ کو پستول کی گولی لگی ہے۔ پھر بھی تم کہتے ہو تم نے گولی نہیں چلائی؟“ وقاص نے کہتے ہوئے پستول نکال لیا۔ حامد خوف زدہ ہوگیا۔

”میں قسم کھاتا ہوں اپنے بچے احمد کی۔“ حامد نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے ماریہ پر گولی نہیں چلائی۔“

”جھوٹ بولتے ہو، تم مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا ذمے دار مجھے سمجھتے تھے۔ مجھ سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ اس دن تم نے ماریہ کو اکیلے دیکھا تو صرف مجھ سے بدلہ لینے کے لیے اسے گولی مار دی۔“ وقاص نے کہا اور پستول کا رخ حامد کی طرف کردیا۔ ”افسوس حامد! تم میرے دوست تھے۔ مجھے تم سے ہمدردی تھی لیکن تم نے سب گنوا دیا۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ تمہارا کیا خیال ہے کیا میں پستول ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہوں؟“ حامد بولا۔ اب وہ پُرسکون تھا، شاید اس نے تقدیر کے لکھے کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ”تم شاید اپنے طور پر فیصلہ کر چکے ہو لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے۔“

وقاص کا ہاتھ کانپ گیا۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ حامد کے سکون نے





اسے ڈانواں ڈول کر دیا تھا حالانکہ اس کا یقین کمزور نہیں ہوا تھا مگر اسے یہ خیال آیا کہ حامد اس کا بچپن کا دوست ہے۔ پستول کی لبلبی پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھ رہا تھا لیکن یہ دباؤ اتنا نہیں تھا کہ گولی چل جاتی۔ حامد خاموش کھڑا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ باؤ نے وقاص کے کان میں کہا۔ ”استاد! جو کرنا ہے جلدی کرو۔ یہاں دیر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔“

وقاص کا چہرہ وحشت زدہ ہورہا تھا اور اس کے ماتھے پر پسینا نمودار ہونے لگا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی وحشت کم ہونے لگی اور بالآخر اس نے ہاتھ نیچے کرلیا۔ ”میں ایسا نہیں کرسکتا۔“

باؤ اور شاہ جی نے بھی گویا سکون کا سانس لیا۔ وہ حامد کے ساتھ اس سلوک کے حق میں نہیں تھے لیکن وہ وقاص کے سامنے دم نہیں مار سکتے تھے۔ وقاص یک دم پلٹا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اندر بیٹھتے ہی گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔ اسی لمحے اس کے موبائل کی بیل بجی۔ عبید اسے کال کر رہا تھا۔ عبید جو اسے بے وقوف بنانا چاہتا تھا، اس کی ساری ہمدردیاں حامد اور شرمین کے ساتھ تھیں۔ اس نے نفرت سے کال منقطع کردی۔ یہ اس کے دوست نہیں دشمن تھے۔ ایک نے اس کی بیٹی چھیننا چاہی اور دوسرا اسے تحفظ دے رہا تھا۔ عبید نے پھر کال کی تو اس نے پھر کاٹ دی۔

☆☆☆

عبید مسلسل وقاص کو کال کر رہا تھا اور وہ ہر بار اس کی کال کاٹ رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عبید کے خدشات بھی بڑھ رہے تھے۔ اس نے اب وقاص کے گھر پر کال کی۔ فاریہ نے کال ریسیو کی۔ ”بھابی! وقاص کہاں ہے؟ وہ میری کال ریسیو نہیں کر رہا۔“

”مجھے نہیں معلوم عبید بھائی... کوئی خاص بات ہے؟“

”ہاں، میں نے ماریہ پر حملہ کرنے والے کو گرفتار کرلیا ہے۔ اس نے اقرار بھی کرلیا ہے۔ آپ وقاص سے رابطہ کرلیں۔ اسے کہیں کہ فوراً مجھ سے دفتر میں ملے۔ بھابی! آپ فوراً رابطہ کریں۔“

فاریہ بے قرار ہوگئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی عبید نے کال منقطع کردی تھی۔ وہ فوراً وقاص کا نمبر ملانے لگی۔

☆☆☆

حامد اب وہاں اکیلا کھڑا تھا۔ باؤ اور شاہ جی بھی جا چکے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وقاص نے اسے معاف نہیں کیا ہے۔ صرف بچپن کا دوست ہونے کی وجہ سے وہ اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس جگہ اس کی لاش پڑی ہوتی۔ جب وقاص نے اس پر پستول اٹھایا تو اس نے خود کو تیار کرلیا تھا۔ اس کی جیب میں وہ بال تھی جو اس نے احمد کے لیے خریدی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ یہ بال احمد کو نہیں دے سکے گا۔ اس نے جیب سے بال نکالی اور تھکے تھکے قدموں سے سڑک کی طرف چل پڑا۔ خوش قسمتی سے سڑک پر آتے ہی اسے ایک خالی ٹیکسی مل گئی اس نے گھر کا پتا بتایا اور پیچھے بیٹھ گیا۔ وہ سوچوں میں اتنا گم تھا کہ اسے گھر آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ٹیکسی والے نے پلٹ کر کہا۔ ”صاحب! پارک آگیا ہے۔ اب بتائیں کہاں جانا ہے؟“

اگر حامد کے پاس رقم ہوتی تو وہ اسے یہیں فارغ کر دیتا لیکن اب گھر تک جانا ضروری تھا۔ ٹیکسی دروازے کے سامنے رکوا کر اس نے کہا۔ ”ایک منٹ رکو، میں تمہیں کرایہ دیتا ہوں۔“

حامد مکان کے سامنے دو پولیس والوں کو دیکھ کر حیران ہوا اور انہوں نے اس سے پوچھا۔ ”کون ہو... کس سے ملنا ہے؟“

”یہ مکان میرا ہے۔“ حامد نے جواب دیا۔ ”میرا نام حامد ہے۔“

کال بیل کے جواب میں بے چین شرمین نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھتے ہی بے ساختہ لپٹ کر رو دی۔ ”آپ ٹھیک تو ہیں... اللہ کا شکر ہے آپ ٹھیک ہیں۔“

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔ یہ پولیس والے یہاں کیوں ہیں؟“ حامد نے پوچھا۔

”انہیں عبید بھائی نے ہماری حفاظت کے لیے بھیجا ہے۔“ شرمین نے کہا اور جب تک وہ پرس نکال کر باہر آیا شرمین نے اسے تقریباً سب بتا دیا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی عبید کو کال کی۔ اس کی آواز سن کر وہ پُرجوش ہوگیا۔

”یار! فوراً میرے دفتر آجاؤ۔ میں نے ماریہ پر حملہ کرنے والے کو گرفتار کرلیا ہے۔“

حامد نے پوچھا۔ ”وہ کون ہے؟“

”عدنان کا چھوٹا بھائی نعمان... وہ ماریہ کو ڈرا رہا تھا کہ غلطی سے گولی چل گئی۔“

”میں ابھی آرہا ہوں۔“ حامد نے کہا پھر اسے خیال آیا۔ ”تمہارا وقاص سے رابطہ ہوا ہے؟“

”ہاں، میری اس سے بات ہوئی ہے۔ وہ بھی یہاں آنے والا ہے۔“

حامد نے عجلت میں کال منقطع کر کے وقاص کا نمبر ملا

یا اور کال ملتے ہی بولا۔ ”وقاص! جھیل کنارے ہم دونوں کے درمیان جو ہوا، وہ ہم تک محدود رہے گا۔ تم کسی اور کو یہ بات نہیں بتاؤ گے۔“

☆☆☆

سعدیہ رو رہی تھی اور عدنان بھی پریشان تھا۔ وہ سوچ رہا تھا پھر اس نے سعدیہ سے کہا۔ ”امی، صرف ایک ہستی ہے جو ہمیں اس مشکل سے نکال سکتی ہے۔“

”وہ کون ہے؟“

”ماریہ۔“ عدنان نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔ آپ دعا کریں کہ وہ ہوش میں آجائے۔“

عدنان گھر سے نکلا اور اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسپتال میں داخل ہوتے ہی اس نے عقبی حصے کا رخ کیا۔ خوش قسمتی سے آج بھی دروازہ کھلا ہوا تھا جو شاید سروس والوں کے لیے مخصوص تھا۔ اسے ماریہ کے کمرے تک رسائی میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اندر آکر اس نے شیشے کے سامنے پردہ کر دیا۔ ماریہ بدستور ساکت لیٹی تھی۔ عدنان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔ ”ماریہ... پلیز جاگ جاؤ... ماریہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں... میں اپنے بھائی سے بھی محبت کرتا ہوں... میں تم دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

عدنان بستر کے کنارے سر رکھ کر رونے لگا۔ وہ ایک ایسے دوراہے پر آکھڑا ہوا تھا جہاں ایک طرف اس کی محبت تھی اور دوسری طرف اس کا بھائی... اور وہ ان دونوں میں سے کسی کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب دروازہ کھلا اور وقاص اندر آیا۔ حامد اور عبید بھی اس کے پیچھے تھے۔ عدنان کو ماریہ کے پاس دیکھ کر وقاص اس کی طرف جھپٹا اور جب اس کی جیکٹ کا کالر پکڑا تو وہ چونکا۔ وقاص خونی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بے قابو لہجے میں کہا۔ ”کمینے شخص... تمہاری جرأت کیسے ہوئی میری بیٹی کے پاس آنے کی؟“

وقاص نے ہاتھ اٹھایا لیکن ایک کمزور سی آواز نے اس کا ہاتھ روک دیا۔ ”پاپا...“

وقاص نے جھٹکے سے گردن موڑ کر ماریہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وقاص اس لمحے ساری دنیا بھول گیا تھا اسے عدنان کہاں یاد رہتا۔ وہ جھپٹ کر ماریہ کے پاس آیا۔ ”ماریہ! میری بچی... میری جان۔“

”پاپا!“ ماریہ نے آہستہ سے کہا۔ ”عدنان کو کچھ نہ کہیں۔“

عدنان پیچھے کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں پھر چمکنے لگے تھے۔ اس کے دل کی تڑپ ماریہ تک پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

عبید کے دفتر میں وقاص اور حامد کے ساتھ عدنان نعمان بھی موجود تھے۔ نعمان سہما ہوا تھا اور عدنان نے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وقاص کا چہرہ سخت ہو رہا تھا۔ حامد، عبید سنجیدہ تھے۔ عبید نے ایک کاغذ وقاص کی طرف بڑھایا۔ ”یہ حلف نامہ ہے۔ تم اپنی مرضی سے ماریہ پر حملے کی درج کی گئی ایف آئی آر واپس لے رہے ہو۔“

وقاص نے کاغذ دیکھا اور ہونٹ کاٹنے لگا۔ پھر اس نے پین نکال کر اس پر سائن کر دیے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت مجبور ہے۔ یہ کام کرتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں چلتا ہوں۔ مجھے ماریہ کے پاس جانا ہے۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔“ حامد بھی کھڑا ہو گیا۔

باہر جب وہ گاڑی میں بیٹھے تو وقاص نے آہستہ سے کہا۔ ”حامد! میں ساری عمر...“

حامد نے اس کی بات کاٹی۔ ”نہیں... دوستوں میں کوئی چیز ہمیشہ نہیں رہتی... سوائے دوستی کے۔“

تشکر وقاص کی آنکھوں میں آنسو بن کر چمکنے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

اندر دفتر میں عبید نے عدنان کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ”نعمان اب آزاد ہے۔ اس کی خوش قسمتی کہ میں نے ایف آئی آر نہیں کاٹی۔ ورنہ اسے عدالت کا سامنا کرنا پڑتا۔“

عدنان نے سر ہلایا۔ ”میں آپ کا اور وقاص صاحب کا شکر گزار ہوں۔“

عبید مسکرایا۔ ”اصل میں تمہیں ماریہ کا شکریہ ادا کرنا ہے کیونکہ اسی کے کہنے پر وقاص مجبور ہوا ہے۔“

ماریہ کے نام پر عدنان کا چہرہ چمک اٹھا۔ ”وہ اب ٹھیک ہو جائے گی۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ ایک دو دن میں اسے چھٹی دے دی جائے گی۔“

نعمان کو پولیس ہیڈ کوارٹر سے لے کر روانہ ہوتے ہوئے عدنان سوچ رہا تھا کہ اس نے ماریہ کی مدد سے اپنے بھائی کو بچا لیا تھا اور اب اسے اپنی محبت حاصل کرنی تھی۔ اسے یقین تھا کہ خدا کی مہربانی سے اسے ماریہ بھی مل جائے گی۔



# دیوانے

آصف ملک

دوسرں کی نگاہ میں کسی بھی شخص کا لہو کتنا ہی ارزاں کیوں نہ ہو، اپنی ذات، اپنے چاہنے والوں کے لیے نہایت قیمتی ہوتا ہے... اسے بھی... کی تلاش سرگرداں اور بے کل کیے ہوئے تھی... جو اس کی نظر سے اوجھل مگر دل کے قریب تھا...!
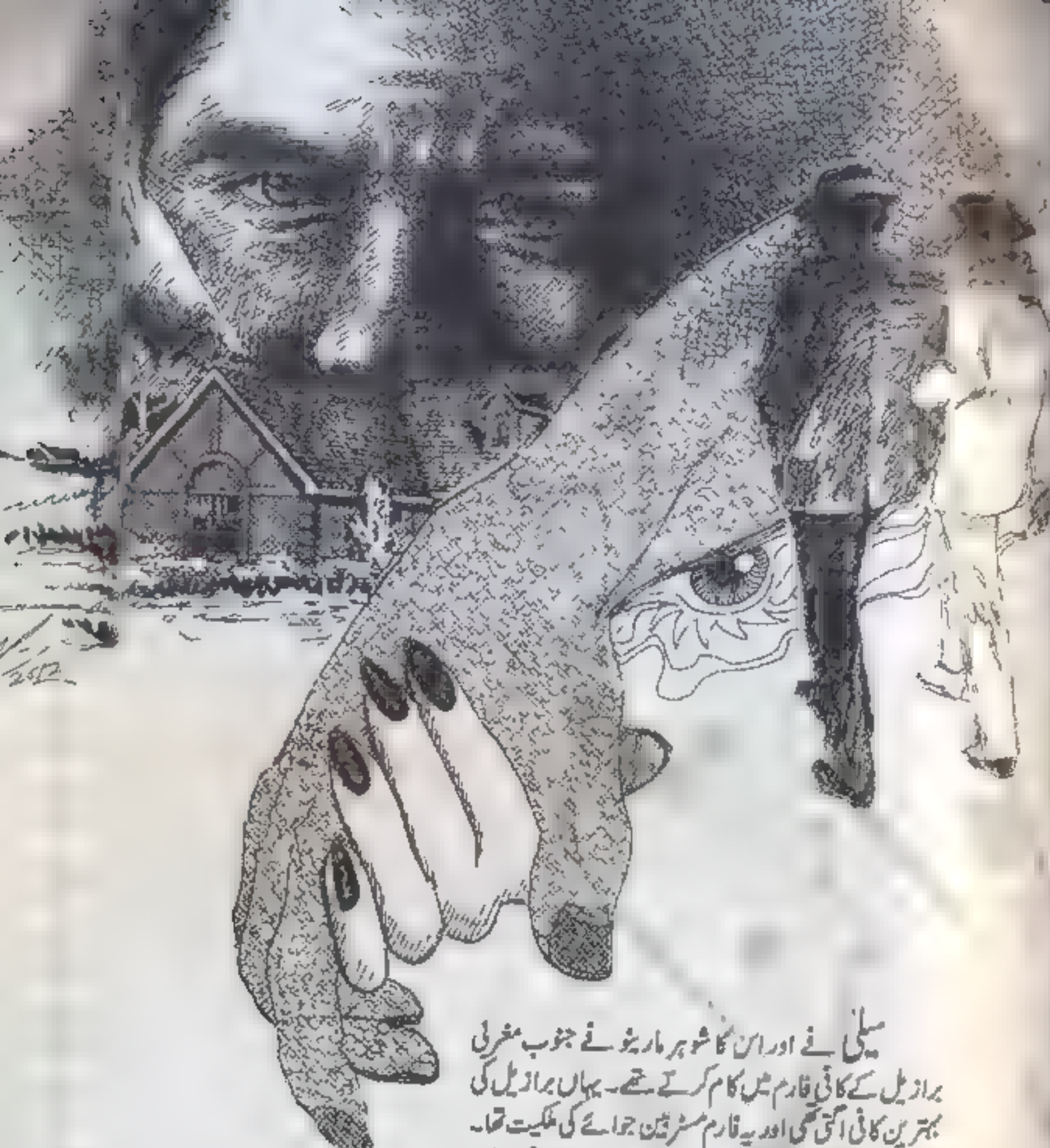
سیلی نے اور اس کا شوہر ماریو نے جنوب مغربی برازیل کے کافی فارم میں کام کرتے تھے۔ یہاں برازیل کی بہترین کافی اگتی تھی اور یہ فارم مسٹر بین جوائے کی ملکیت تھا۔ بین جوائے کا شمار برازیل کے چند دولت مند ترین افراد میں ہوتا تھا۔ یوں تو اس کے بے شمار کاروبار تھے جن میں بینکوں سے لے کر ائر لائن تک شامل تھیں لیکن وہ کافی کنگ کے نام سے مشہور تھا۔ بین جوائے نسلاً اطالوی تھا۔ وہ دس سال پہلے برازیل آکر آباد ہوا تھا۔ وہ یہاں خاصا مقبول تھا کیونکہ اس

نے اپنی دولت سے برازیل میں بے شمار کاروبار شروع کیے اور کئی ہزار افراد کو روزگار مہیا کیا تھا۔ اس کے علاوہ فلاحی کاموں میں بھی پیش پیش رہتا تھا اس نے عورتوں، بچوں اور منشیات کے عادی افراد کی بحالی اور بہتری کے لیے کئی اداروں کو بھاری عطیات سے بھی نوازا تھا۔

پچاس سالہ بین نے دس سال پہلے برازیل کی مہنگی ترین سپر ماڈل نوری سے شادی کی تھی۔ نوری کے حسن و جمال میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس کے بے شمار پرستار تھے لیکن ان میں کوئی بین جوائے جیسا دولت مند نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بین نے اسے منتخب کیا تو اس نے اقرار کرنے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ نوری جانتی تھی کہ اس کی کامیابی کا دور بہت مختصر ہے اور چند سال بعد وہ سابقہ سپر ماڈل بن جائے گی۔ دوسرے وہ اس مشینی زندگی سے اکتا چکی تھی۔ اس نے کامیابی، شہرت اور دولت سب حاصل کر لی تھی۔ اب وہ سکون سے ایسی پرتعیش زندگی گزارنا چاہتی تھی جس کے لیے اسے خود کوئی تگ و دو نہ کرنی پڑے۔ بین جوائے اسے یہ زندگی دے سکتا تھا۔ اس کے انتخاب کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ وہ عورتوں کے پیچھے بھاگنے والا شخص نہیں تھا، اس نے نوری کو پسند کیا اور اس کا اظہار بھی کیا۔ اس نے شادی سے پہلے اسے حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس نے نوری پر کام کرنے کی پابندی بھی نہیں لگائی۔ یعنی وہ شادی کے بعد بھی ماڈلنگ کر سکتی تھی۔

شادی کے بعد ان کے درمیان بہت اچھی گزر رہی تھی۔ نوری کام کرتی لیکن اس نے اسے کم کر دیا تھا۔ خاص طور سے جب بین گھر آتا تو اس کی کوشش ہوتی کہ وہ بھی گھر میں ہو۔ اس طرح اس نے کام بھی مخصوص کر لیا اور اب ایسی ماڈلنگ کرنے سے گریز کرتی جس میں اسے مکمل عریاں ہونا پڑے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے شوہر کی معاشرے میں عزت ہے اور نوری کی عریاں ماڈلنگ سے اسے شرمندگی ہو سکتی ہے۔ نوری نے بین سے صرف ایک شرط منوائی تھی کہ بین اسے ماں بننے پر مجبور نہیں کرے گا۔ اس نے بین سے صاف کہہ دیا۔

”میں ماں نہیں بننا چاہتی۔“

”تمہیں بچے پسند نہیں ہیں؟“

”بچے تو پسند ہیں لیکن میں ماں بننے کی تکلیف نہیں برداشت کر سکتی۔“

نوری کا تعلق بہت غریب گھرانے سے تھا اور اس نے اپنے چار بہن بھائیوں کو گھر میں پیدا ہوتے دیکھا تھا۔ اس کی ماں پر اس دوران جو گزرتی وہ ہمیشہ کے لیے نوری کے ذہن پر نقش ہو گیا اور وہ کسی صورت ماں بننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس معاملے میں وہ اتنی سنجیدہ تھی کہ اس نے اس کو باقاعدہ تحریر کروایا تھا۔ یہ بات ان کے شادی کے معاہدے میں شامل تھی لیکن اسے خفیہ رکھا گیا۔

بین نے اس وقت تو نوری کی یہ شرط مان لی لیکن اب اسے دھیرے دھیرے اولاد کی کمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ پچپن برس کا ہو چکا تھا اور اس کے پاس زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ اگر اب اس کا بچہ ہوتا تو وہ کوئی بیس برس بعد جا کر اس قابل ہوتا کہ اس کا وسیع کاروبار اور دولت سنبھال سکے۔ دوسری طرف وہ جانتا تھا کہ نوری کسی صورت ماں بننے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ جب بھی ان کے درمیان بچے کے موضوع پر بات ہوتی تو نوری اپنا عزم ضرور دہراتی۔ ایک موقع پر جب بین نے بچے کو اپنی خواہش قرار دیا تو نوری نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میں اس پر تم سے الگ ہونے کو ترجیح دوں گی پھر تم چاہو تو کسی اور سے شادی کر کے اپنی خواہش پوری کر سکتے ہو۔“

لیکن بین، نوری سے محبت کرتا تھا اور اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اس لیے بات وہیں رہ جاتی۔ بین نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ اولاد اس کے مقدر میں نہیں ہے۔

سیلی اور ماریو کا تعلق برازیل کے پڑوسی ملک بولیویا کے ایک پسماندہ سرحدی علاقے ٹرینیڈاڈ سے تھا۔ یہ جگہ برازیل کی سرحد سے کوئی پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ ماریو ایک مزدور تھا اور جب سیلی نے اس سے شادی کی تو انہیں احساس ہوا کہ ان کے پاس نہ تو اپنا مکان ہے اور نہ اپنی زمین۔ کیا ان کے بچے بھی اسی طرح غربت اور محرومی کی زندگی گزاریں گے؟ سیلی اور ماریو کا تعلق بہت غریب گھرانوں سے تھا جہاں ایک وقت کھانا بنتا تو دوسرے وقت کا پتا نہیں ہوتا تھا۔ سیلی کو اس کے ماں باپ نے بڑی مشکل سے ہائی اسکول تک پڑھایا تھا اور اس کے بعد اسے صاف کہہ دیا کہ اگر اسے آگے پڑھنا ہے تو اپنے سارے اخراجات خود برداشت کرنے ہوں گے۔ سیلی جانتی تھی کہ اس کے ماں باپ خود غرض نہیں ہیں لیکن وہ کیا کرتے، ان کے پانچ بچے اور بھی تھے، ان کو پڑھانا اور پالنا تھا۔ سیلی سب سے بڑی تھی۔

مجبوراً صرف سترہ سال کی عمر میں اس نے کام شروع کر دیا۔ ان کے علاقے میں کام محدود تھا۔ مرد کان کن بن جاتے اور عورتیں کھیتوں میں کام کرتی تھیں۔ سیلی بھی ایک کھیت میں کام کرنے لگی جہاں سارا دن جان توڑ محنت کے بعد بس اتنا ملتا کہ وہ بس اپنے اخراجات پورے کر سکتی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا کیونکہ اتنی آمدنی میں وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتی تھی اور اگر کالج میں داخلہ لے لیتی تو اتنا کام بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں زمین زیادہ تر زمینداروں کے قبضے میں تھی اور اکثر لوگ ان کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ بولیویا ویسے بھی ایک پسماندہ ملک تھا۔ اب بھی اس کی حالت اچھی نہیں ہے لیکن اس وقت تو غربت بہت زیادہ تھی۔

سیلی کی ماریو سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی کھیت میں کام کرنے والا مزدور تھا۔ اس کی تعلیم معمولی تھی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ عام سا نوجوان تھا اس کے مقابلے میں سیلی غیر معمولی حد تک خوب صورت اور صحت مند لڑکی تھی۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور جلد انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ہسپانوی نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یہاں کے لوگ عشق و محبت کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی پسند کی شادی کو دونوں خاندانوں نے سراہا۔ سیلی کو پسند کرنے والے کئی نوجوان اور بھی تھے لیکن ان میں سے کوئی رقیب بننے کو تیار نہیں تھا، اس لیے سیلی اور ماریو پُرامن طریقے سے ایک دوسرے کے ہو گئے۔ ورنہ ایسا بھی ہوتا کہ ایک لڑکی کے دو امیدوار ہوتے تو نوبت لڑائی جھگڑے اور بعض اوقات قتل تک آ جاتی لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

شادی کے بعد انہیں صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ زندگی کس قدر دشوار ہے۔ خاص طور سے جب آدمی کے پاس بنیادی ضرورتوں کے لیے بھی رقم نہ ہو۔ بولیویا میں خراب اقتصادی حالات کی وجہ سے پورے ملک کی ایک جیسی حالت تھی اگر وہ کہیں اور چلے جاتے، تب بھی ان کا معیار زندگی بہتر نہ ہوتا۔ ابھی ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز تھا اور وہ جدوجہد کر سکتے تھے۔ جب ان کے بچے ہو جاتے تو وہ جدوجہد کرنے کے قابل بھی نہیں رہتے اور پھر ان کو جیسے تیسے گزارہ کرنا پڑتا جیسے ان کے ماں باپ کرتے آئے تھے۔ سیلی اس معاملے میں بہت حساس تھی اور وہ چاہتی تھی جو مشکلیں انہوں نے برداشت کی ہیں، وہ ان کے بچوں کو نہ برداشت کرنی پڑیں۔ وہ باقاعدگی سے اخبار دیکھتی کہ شاید روشنی کی کوئی کرن نظر آ جائے۔ پھر اسے یہ کرن نظر آ گئی۔ ایک دن ماریو کام سے آیا تو سیلی بہت خوش تھی۔ ماریو نے پوچھا۔

”کیا بات ہے تم بہت خوش نظر آ رہی ہو؟“

سیلی نے اخبار اس کے سامنے رکھ دیا اور ایک خبر پر انگلی رکھی۔ اس کے مطابق برازیل میں بولیویا کی سرحد پر کافی کی وسیع پیمانے پر کاشت کی جا رہی تھی اور کافی کے باغات میں کام کرنے کے لیے سستے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ اس لیے بولیویا کے سرحدی علاقے سے لوگ برازیل جا رہے تھے اور وہاں ان کو مزدوریاں مل رہی تھیں۔ آمدنی تین سے چار گنا زیادہ تھی اس لیے لوگ برازیل جانے کو ترجیح دے رہے تھے، اور برازیل کو بھی کارکنوں کی ضرورت تھی اس لیے وہ آسانی سے بولیویا کے لوگوں کو ورک ویزا دے رہے تھے۔ ماریو نے خبر پڑھ کر سوالیہ نظروں سے سیلی کی طرف دیکھا تو اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”ہم بھی برازیل جا سکتے ہیں اور وہاں کام حاصل کر سکتے ہیں۔“

ماریو ہچکچایا۔ ”لیکن اپنا ملک چھوڑ کر...“

”ہم کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں۔“ سیلی نے اس کی بات کاٹی۔ ”ہم وہاں جا کر رقم جمع کریں گے اور جب ہمارے پاس اتنی رقم ہو جائے گی کہ ہم اپنی زمین اور مکان خرید سکیں تو ہم واپس آ جائیں گے۔“

ٹرینیڈاڈ میں زمین زرخیز اور سستی تھی لیکن لوگ اتنے غریب تھے اور آمدنی اتنی محدود تھی کہ وہ یہ سستی زمین بھی نہیں خرید سکتے تھے۔ سیلی اور ماریو یہاں دونوں کما رہے تھے لیکن شادی کے بعد ان کی بچت سو بولیوین ڈالرز تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ ماریو ہچکچا رہا تھا لیکن سیلی نے اسے راضی کر لیا۔ ماریو کو ڈر تھا کہ یہاں روزگار ویسے ہی مشکل سے ملتا ہے اور وہ ملازمت چھوڑ کر چلے گئے اور ان کو برازیل میں بھی کام نہیں ملا تو ان کو واپس آ کر بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے برعکس سیلی یہ خطرہ مول لینے کو تیار تھی۔ اس کا کہنا تھا۔ ”خطرے کا سامنا کیے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوتا وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو خطروں کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔“

بولیویا کے شہریوں کو ویزا سرحد پر مل رہا تھا۔ برازیلی حکام صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ کام کے لیے آنے والے جوان اور مضبوط ہیں۔ وہ کسی کم عمر یا بوڑھے آدمی کو ورک ویزا نہیں دے رہے تھے۔ سیلی اور ماریو ایک خستہ حال بس اور پھر کوئی چار میل کا پیدل سفر کر کے سرحدی چوکی تک پہنچے جہاں ان کو آسانی سے ویزا مل گیا۔ یہ عارضی ویزا تھا ان کو مستقل ویزا اس وقت ملتا جب انہیں کہیں ملازمت مل جاتی۔

دوسری صورت میں ان کو ایک ہفتے کے اندر واپس آنا پڑتا اور وہ نہیں آتے تو برازیلین پولیس ان کی تلاش شروع کر دیتی۔ سلی نے سنا تھا کہ برازیل میں سب سے زیادہ مواقع پورتو ویلہو میں تھے۔ یہ علاقہ خاص طور سے کافی کے باغات کے لیے مشہور ہو رہا تھا۔ وہ پورتو ویلہو کی طرف روانہ ہو گئے۔ بس کا ٹکٹ خریدنے کے بعد ان کے پاس اتنی رقم بچی تھی کہ وہ اس سے دو دن گزارہ کر سکتے تھے اور اس کے بعد فاقے شروع ہو جاتے۔ دو گھنٹے بعد وہ پورتو ویلہو میں تھے۔

سلی نے بس سے اترتے ہی ایک ڈسٹ بن میں نظر آنے والا تازہ اخبار اٹھایا اور اس میں ملازمت کے اشتہار دیکھنے لگی۔ سرحد کے دونوں جانب ہسپانوی زبان بولی اور لکھی جاتی ہے اس لیے زبان کا مسئلہ نہیں تھا۔ سلی نے ایک بڑا اشتہار دیکھا۔ یہ جوائے فارمز کی طرف سے تھا اور یہاں کافی کے باغات میں کام کرنے کے لیے مزدور درکار تھے۔ کھانے اور رہائش کے ساتھ معقول تنخواہ بھی دی جا رہی تھی۔ یہ ان کی سابق آمدنی سے تین گنا زیادہ تھی۔ سلی نے خوش ہو کر ماریئو سے کہا۔

”اگر یہاں ملازمت مل گئی تو ہم تین چار سال میں بہت ساری رقم جمع کر سکتے ہیں۔“

”اگر ملازمت مل جائے تو۔“ ماریئو نے جواب دیا۔ وہ ابھی تک شک میں تھا کہ ان کو یہاں کام مل سکتا ہے۔ حالانکہ اس کے ہزاروں ہم وطن یہاں کام کر رہے تھے۔ وہ جوائے فارمز پہنچے، اس وقت وہ بین جوائے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ فارمز کے ایک نائب منیجر نے ان کا انٹرویو لیا اور ان کی عمر، صحت اور کھیتوں میں کام کرنے کا تجربہ جان کر ان کو فوراً ملازمت دے دی۔ جوائے فارمز کے باغات میلوں کے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے اور یہاں کام کرنے والے افراد کی تعداد سیکڑوں میں تھی۔ ان مزدوروں کے لیے باغات کے درمیان میں ہی جا بہ جا چھوٹے چھوٹے ہٹ بنائے گئے تھے۔ سستے اور سادہ تعمیراتی سامان سے بنے ہوئے ان ہٹس میں سہولتیں موجود تھیں۔ ان کو بجلی اور پانی دیا گیا تھا لیکن وہ یہاں کچھ پکا کر نہیں کھا سکتے تھے۔ کچن کی سہولت نہیں تھی۔ ایک بڑا سا میس تھا جہاں کارکنوں کو تین وقت کھانا دیا جاتا۔ اس کے علاوہ مشروبات بھی دستیاب تھے۔ رہائش اور کھانے کے عوض ان کی تنخواہوں سے معمولی سی رقم کاٹی جاتی۔ سلی اور ماریئو میاں بیوی تھے اس لیے ان کو ڈبل بیڈ والا ہٹ دیا گیا۔ ہٹ ایک کمرے اور ساتھ میں چھوٹے سے باتھ روم پر مشتمل تھا۔ کمرے میں ایک بیڈ، ایک الماری اور دو کرسیاں تھیں۔ یہ سلی اور ماریئو کے بولیویا کے اس گھر سے چھوٹا تھا جہاں وہ کرائے پر رہتے تھے لیکن یہاں ساری ضروری سہولتیں تھیں۔ سلی اور ماریئو نے جتنا سوچ کر آئے تھے ان کو اس سے زیادہ ہی ملا تھا۔ بس کام ذرا سخت تھا۔ صبح سات سے دوپہر بارہ بجے تک کام کرنا ہوتا اس کے بعد دو گھنٹے کا وقفہ ملتا۔ پھر دو سے سات بجے تک کام ہوتا۔ رات نو بجے تک میس میں کھانا ملتا اور صبح چھ بجے اٹھنا پڑتا۔ سات بجے تک ناشتا کر کے وہ کام پر پہنچ جاتے تھے۔ بہرحال وہ محنت مشقت کے عادی تھے۔ ان کی درخواست پر ان کو ایک ہی جگہ لگایا گیا۔

جوائے فارمز کے میلوں پھیلی زمین کے وسط میں بین جوائے کا عالی شان محل نما مکان تھا۔ اگرچہ وہ کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر ریوڈی جنیرو میں رہتا تھا لیکن اس کی اصل رہائش گاہ یہی تھی۔ وہ جب یہاں آتا تو اپنے فارم کا دورہ ضرور کرتا اور اس کے ایک ایک حصے میں آتا۔ سلی اور ماریئو اسے مہینے میں ایک بار تو ضرور دیکھتے۔ وہ اپنے کسی کاروبار کو اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا جتنا جوائے فارمز کو۔ اس کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے فارمز کی انتظامیہ اور سپروائزر بھی مستعد رہتے اور کارکنوں پر مکمل نظر رکھتے۔ یہی وجہ تھی کہ سلی اور ماریئو کو کام کے اوقات میں سکون کے مواقع بہت کم ملتے اور شام کو جب چھٹی ہوتی تو وہ تھک چکے ہوتے تھے۔

اس کے باوجود وہ خوش تھے۔ یہاں کوئی پریشان کرنے والی چیز نہیں تھی۔ وہ محنت کرتے ان کو اس کا پورا معاوضہ دیا جاتا۔ پھر رہائش اور کھانا پینا بھی بہترین تھا اس لیے وہ کام میں پوری دلچسپی لیتے۔ پہلے کے مقابلے میں ان کی صحت بھی بہتر ہو گئی۔ ایک سال بعد جب وہ دو ہفتے کی چھٹی پر واپس گئے تو ان کے گھر والے انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے ایک سال میں جو کمایا تھا اس سے انہوں نے اپنے گاؤں کے قریب ایک چھوٹی سی وادی میں کچھ زمین خرید لی۔ اس وادی میں ایک چشمہ بھی تھا اور وہاں کسان بہت اچھی فصل حاصل کرتے۔ یہ زمین تھوڑی تھی لیکن انہیں امید تھی کہ وہ چند سال میں مزید زمین حاصل کر لیں گے اور اس پر گھر بھی بنا لیں گے۔

بین جوائے عام طور سے مہینے کی آخری تاریخوں میں گھر آتا اور اس کے بعد یہاں ایک ہفتہ یا دس دن ٹھہرتا۔ جب وہ آتا تو اس سے اگلے دن وہ جوائے فارمز کا دورہ شروع کرتا۔ اپنی واپسی تک وہ روزانہ صبح سے شام تک جوائے فارمز کے مختلف حصے دیکھتا۔ اگر اس دن مصروفیت کی وجہ سے کوئی حصہ معائنے سے رہ جاتا تو وہ اگلی بار اپنے معائنے کا آغاز اسی حصے سے کرتا۔ اس نے جوائے فارمز میں دنیا کی بہترین کافی کاشت کرائی تھی اور یہ کافی ایک معاہدے کے تحت کافی تیار کرنے والی بہترین کمپنیوں کو فراہم کی جاتی تھی۔ بین اپنے فارمز میں کوئی کیمیائی کھاد یا جراثیم کش دوا استعمال نہیں کرتا تھا، اس کے بجائے وہ حیاتیاتی کھاد اور کیڑے مکوڑے مارنے کے قدرتی طریقے استعمال کرتا جو اسے کسی قدر مہنگے پڑتے لیکن اس کے نتیجے میں جو کافی پیدا ہوتی اس کا معیار اور ذائقہ لاجواب ہوتا۔ بین جوائے جتنا اس فارم پر خرچ کرتا اس سے کہیں زیادہ کما لیتا تھا۔

سلی اور ماریئو نے اب تک کئی بار بین کو دیکھا لیکن اتفاق کہ ہر بار دور سے دیکھا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف ہوتے، اس لیے بین نے اب تک براہ راست اس جوڑے کو نہیں دیکھا تھا۔ ان دنوں بین جوائے محل میں آیا ہوا تھا اور وہ دوسرے دن سے فارم کے دورے پر نکلا۔ بین جوائے اس حصے میں داخل ہوا جہاں سلی اور ماریئو کام کر رہے تھے۔ وہ دونوں ایک درخت کے آس پاس زمین صاف کر رہے تھے۔ سلی کا شہابی رنگ مشقت کی بھٹی میں تپ کر دہک رہا تھا اور اس کے چہرے پر پسینا موتیوں کی طرح چمک رہا تھا۔ سادہ کام کے لباس میں بھی اس کا حسن جگمگا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بین جوائے ٹھٹک گیا اور اس نے اس حصے کے سپروائزر کو اشارے سے پاس بلایا۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور بولا۔

”جناب!“

”یہ لڑکی کون ہے؟“

”یہ شادی شدہ عورت ہے۔ اس کا نام سلی ہے اور اس کے شوہر کا نام ماریئو ہے۔ دونوں بولیوین ہیں۔ یہاں ایک سال سے زیادہ عرصے سے کام کر رہے ہیں۔ دونوں محنتی اور اچھے کارکن ہیں۔“ سپروائزر نے مستعدی سے جواب دیا۔

بین جوائے کو حیرت ہوئی کیونکہ سلی دیکھنے میں بالکل لڑکی لگ رہی تھی۔ اس نے سپروائزر سے پوچھا۔ ”یہ کہاں مقیم ہیں؟“

”سیکٹر فائیو میں ان کو ایک ہٹ الاٹ کیا گیا ہے۔“

اس وقت سلی اور ماریئو، بین جوائے کو سامنے دیکھ کر مؤدب کھڑے ہو گئے تھے۔ جب وہ سپروائزر سے بات کر رہا تھا تو سلی نے محسوس کیا کہ وہ ان کے بارے میں ہی بات



کر رہا ہے۔ کیونکہ گفتگو کے دوران بین کی نظریں مستقل ان پر مرکوز تھیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سلی پر مرکوز تھیں۔ سلی ان نظروں کو محسوس کر رہی تھی، اسے بے چینی ہونے لگی۔ بین کچھ دیر سپروائزر کے ساتھ بات کرتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ اس نے کچھ اور کارکنوں سے بات کی لیکن سلی اور ماریئو کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس کے جانے کے بعد کام معمول کے مطابق ہونے لگا تو سلی نے آہستہ سے ماریئو سے کہا۔

”مجھے لگ رہا ہے بین جوائے ہمارے بارے میں بات کر رہا تھا۔“

ماریتو نے بے یقینی سے کہا۔ ’’اسے ہمارے بارے میں بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟... ہم معمولی درجے کے ملازمین ہیں۔‘‘

’’پتا نہیں لیکن مجھے ایسا ہی لگا۔‘‘ سیلی بولی۔

’’تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی بین جوئے کو ہم جیسے معمولی کارکنوں کے بارے میں بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟‘‘

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔‘‘ سیلی نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا اور کام میں لگ گئی۔ وہ ایک مہینا پہلے ہی واپس آئے تھے اور ان کو چھٹیوں کے پندرہ دنوں کی تنخواہ نہیں ملی تھی۔ زمین خریدنے اور آنے جانے کے اخراجات کے بعد ان کے پاس کچھ نہیں بچا تھا اس لیے وہ بے تابی سے تنخواہ والے دن کے منتظر تھے۔ ان کو دو دن بعد آنے والی پہلی کو تنخواہ مل جاتی۔ سیلی کو کچھ نئے کپڑوں کی ضرورت تھی اس لیے وہ زیادہ بے تابی سے تنخواہ والے دن کی منتظر تھی۔

دو دن بعد وہ جب تنخواہ لینے اکاؤنٹنٹ کے دفتر پہنچے اور اسے اپنا نام بتایا تو اس نے کہا۔ ’’تم دونوں کی تنخواہ روک لی گئی ہے اور تمہیں محل میں مسٹر کرون کو رپورٹ کرنے کو کہا گیا ہے۔‘‘

’’تنخواہ روک لی ہے... لیکن کیوں؟‘‘ سیلی پریشان ہو گئی۔

’’اس بارے میں بھی تمہیں مسٹر کرون ہی بتا سکتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا ہے۔‘‘

’’ہم مسٹر کرون سے کب ملیں؟‘‘ ماریتو نے پوچھا۔

’’آج اور اسی وقت... تم محل چلے جاؤ اور یہ کاغذ دکھا دینا۔ تمہیں مسٹر کرون کے دفتر پہنچا دیا جائے گا۔‘‘ اکاؤنٹنٹ نے اسے ایک کاغذ تھما دیا۔

دونوں میاں بیوی اس طلبی پر پریشان ہو گئے۔ ان کے دل میں خدشہ آیا کہ شاید ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی پاداش میں ان کی تنخواہ روک لی گئی ہے اور طلبی ہو رہی ہے۔ ان کو یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر ان کو ملازمت سے نکال دیا جاتا تو اتنی اچھی ملازمت دوبارہ نہیں ملتی۔ کام تو مل جاتا لیکن اس میں نہ تو اتنی اچھی تنخواہ ہوتی اور نہ ان کو رہائش اور کھانے کی سہولت ملتی۔ خدشات کے ساتھ وہ محل کے دروازے پر پہنچے اور وہاں موجود عملے کو کاغذ دکھایا۔ ایک آدمی کاغذ لے کر اندر چلا گیا اور کوئی دس منٹ بعد آیا۔

’’مسٹر اور مسز... میرے ساتھ آؤ۔‘‘

وہ ان کو مسٹر کرون کے دفتر میں لے آیا۔ مسٹر کرون بین جوئے کے محل کا منتظم تھا۔ سیلی اور ماریتو سہمے ہوئے اس کے سامنے آئے لیکن اس نے خلاف توقع نرمی سے انہیں اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ ماریتو نے ہمت کر کے کہا۔ ’’جناب! ہماری تنخواہ روک لی گئی ہے اور ہمیں آپ کے سامنے پیش ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟‘‘

’’ہم پوری محنت سے کام کرتے ہیں۔‘‘ سیلی بھی بول اٹھی۔ کرون مسکرایا۔

’’تم دونوں سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے اور نہ تمہاری تنخواہ اس وجہ سے روکی گئی ہے... بلکہ فارم سے تمہاری ملازمت ختم کر دی گئی ہے۔‘‘

’’ملازمت ختم کر دی گئی ہے... لیکن کیوں؟‘‘ ماریتو ڈوبتے لہجے میں بولا۔

’’ہمارا کیا قصور ہے جناب؟‘‘ سیلی نے احتجاج کیا۔

’’قصور تو کوئی نہیں ہے۔‘‘ کرون ان کی حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔

’’پھر ہماری ملازمت کیوں ختم کی گئی ہے؟‘‘

’’اصل میں تمہیں اب محل میں ملازمت کرنی ہے۔‘‘ کرون نے کہا۔ ’’یہاں باغ کے لیے ایک مالی کی ضرورت ہے اور محل میں ایک خادمہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ کام کرنے والے میاں بیوی ہوں۔ تم اس شرط پر پورے اترتے ہو اس لیے تمہیں یہاں منتقل کر دیا گیا ہے۔ تنخواہ دگنی کر دی گئی ہے اور رہائشی سہولت اور کھانا بھی پہلے سے بہتر مہیا کیا جائے گا۔ اب بتاؤ، تمہیں یہ تبدیلی منظور ہے؟ اگر نہیں تو تم واپس جا سکتے ہو اور کل فارم اکاؤنٹنٹ سے اپنی تنخواہ لے لینا۔‘‘

سیلی اور ماریتو کو لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ تو سزا کا سوچ کر آئے تھے اور یہاں ترقی ان کی منتظر تھی۔ وہ احمق نہیں تھے جو کفرانِ نعمت کرتے اس لیے انہوں نے اس پیش کش کو فوراً قبول کر لیا۔ سیلی بے تابی سے بولی۔ ’’ہمیں منظور ہے جناب... اور اس ترقی کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔‘‘

مسٹر کرون نے ان کے کاغذات بنوائے۔ ان کی تصویریں لی گئیں اور ان کے بیج بنائے گئے جو کام کے دوران ان کو پہن کر رکھنے تھے۔ ماریتو کو مالی کا کام سونپا گیا اور سیلی کو محل میں خادمہ کے طور پر کام کرنا تھا۔ اس کے لیے انہیں ایک مہینے تک تربیت حاصل کرنی تھی، تب کہیں جا کر ان کی اصل ڈیوٹی شروع ہوتی۔ البتہ ان کی تنخواہ میں اسی



مہینے سے اضافہ کر دیا گیا اور مسٹر کرون کے دفتر سے ان کو تنخواہ دی جاتی۔ محل کے ملازمین کی رہائش محل کے احاطے کے اندر ایک عمارت میں تھی۔ یہاں سیلی اور ماریتو کو بھی ایک چھوٹا سا دو کمروں کا فلیٹ دے دیا گیا۔ ان کا کھانا پینا پہلے کی طرح میس سے تھا۔ وہ دونوں اس ترقی سے بہت خوش تھے۔ یہ ان کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔

سیلی اب تک جسمانی محنت مشقت کا کام کرتی آئی تھی اس لیے اسے خود پر توجہ دینے کا موقع کم ملتا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں کسی قدر کھردرے تھے۔ دھوپ میں کام کرنے سے اس کے سرخی مائل سنہری بال روکھے ہو گئے تھے۔ البتہ اس کی جلد حیرت انگیز طور پر تر و تازہ تھی۔ ہلکی سرمئی رنگ کی آنکھوں میں چمک تھی۔ محنت کرنے سے اس کا جسم بے حد متناسب تھا لیکن جب محل میں خادموں کے انچارج مسٹر سٹیفنس نے اسے دیکھا تو اس نے کہا۔ ’’تمہاری شخصیت محل کے ملازم کے لحاظ سے نہیں ہے۔‘‘

سیلی یہ سوچ کر پریشان ہو گئی کہ وہ اسے مسترد کر رہا ہے۔ ’’کیا مجھے محل میں ملازمت نہیں ملے گی؟‘‘

’’نہیں، تمہیں ملازمت مل گئی ہے لیکن اس کے لیے تمہاری شخصیت کو پالش کرنا ہو گا۔‘‘

یہ بات سیلی کی سمجھ میں اس وقت آئی جب اسے اگلے دن ملازموں کے لیے مخصوص فٹنس سینٹر بھیج دیا گیا۔ یہاں جسم کے ہر حصے کی تھراپی اور بہتری کے لیے ہر سہولت تھی۔ ایک ماہر نے اس کا معائنہ کیا اور سب سے پہلے اس کے بالوں اور ہاتھ پیروں کے لیے تھراپی تجویز کی تاکہ ان کا کھردرا پن اور روکھا پن دور ہو۔ اس کا جسم متناسب تھا لیکن اسے مزید موزوں بنانے کے لیے کچھ ایکسر سائز بھی تجویز ہوئیں اور اسے اسی دن سے ان پر عمل کرنا پڑا۔ ایک ہفتے میں اس کا حیرت انگیز نتیجہ نکلا۔ سیلی کے بالوں میں ریشم جیسی نرمی اور چمک آ گئی۔ اس کے ہاتھ اور پیروں کا کھردرا پن مخمل جیسی نرمی میں بدل گیا۔ مخصوص ورزشوں نے اس کی جسامت کو مزید نکھار دیا۔ سیلی سمجھ رہی تھی کہ اس کی شخصیت بن گئی ہے لیکن جلد اسے پتا چلا کہ یہ تو آغاز ہے۔ اب اسے چلنے پھرنے، نشست و برخاست، بول چال اور محل کے لیے دوسرے ادب و آداب کی تربیت دی جانے لگی۔ یہ تربیت تمام خادموں کو دی جاتی جو محل میں کام کرتے تھے۔

سیلی نے دیکھا کہ محل کے تمام ملازم چاہے وہ مرد ہوں یا عورت، دونوں بہت نک سک سے رہتے تھے۔ وہ اپنی صحت اور ظاہری شخصیت کا پورا خیال رکھتے تھے۔ ان کو چن



## کاش

ایک پٹواری اپنی زمین کا معائنہ کرنے گیا... راستے میں اسے کتوں نے گھیر لیا... وہ کچھ دور جا کر نہایت غصے سے بولا۔

’’کاش تمہاری ایک ایکڑ بھی زمین ہوتی تو میں سبق سکھا دیتا۔‘‘

(پنجاب سے ماہا ایمان کی عنایت)

کر رکھا جاتا تھا۔ یہ سب جاذب نظر اور دلکش تھے۔ سوائے ان لوگوں کے جن کو ان کے فن کی وجہ سے رکھا جاتا تھا۔ باقی ملازمین کی ظاہری شخصیت پہلی ترجیح ہوتی۔ اس کے بعد ان کے بولنے، چلنے پھرنے اور دوسری چیزوں کی تربیت دی جاتی۔ سیلی پڑھی لکھی تھی اس لیے اسے یہ سب سیکھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ فٹنس سینٹر نے اس کے جسمانی حسن کو نکھار دیا تھا۔ تربیت نے اس کی زبان اور چال ڈھال کو بدل کر رکھ دیا۔ اسے ایک مہینے سے زیادہ لگا لیکن جب وہ محل میں آئی تو اس نے سب کو متوجہ کر لیا۔ اگرچہ محل میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین عورت موجود تھی لیکن سیلی نے ان سب کو یوں گہنا دیا جیسے چودھویں کا چاند ستاروں کی روشنی ماند کر دیتا ہے۔ خادماؤں کے لیے مخصوص یونیفارم سیاہ اسکرٹ اور سفید بلاؤز بھی اس پر جچ گیا۔

نوری جب محل آئی اور اس نے پہلی بار سیلی کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ سپر ماڈل تھی اور اب بھی حسن و جمال میں کم نہیں تھی لیکن اسے لگا جیسے سیلی کے سامنے وہ ہلکی پڑ گئی ہو۔ پھر بھی اسے سیلی سے حسد محسوس نہیں ہوا اور اس نے اسے اپنے حصے کے لیے مخصوص کر لیا۔ صرف دوسرے مہینے میں نوری کی ذاتی ملازمہ بن جانا سیلی کے لیے اعزاز کی بات تھی جس پر دوسری ملازمائیں ضرور حسد کرنے لگیں۔ سیلی خوش تھی کہ اسے براہ راست مالکن کی قربت حاصل ہو گئی ہے۔ نوری کی ملازمہ کی حیثیت سے اسے خصوصی الاؤنس بھی ملنے لگا جو اس کی تنخواہ کے تقریباً برابر تھا۔ سیلی خوش تھی۔ اگر وہ یہاں دو تین سال بھی کام کر لیتی تو اتنی رقم جمع کر سکتی تھی کہ اپنے وطن میں وہ اچھی زمین خرید سکتی تھی۔ اس کے بعد اسے اور ماریتو کو کسی کی ملازمت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

سیلی نے بین جوائے کو آخری بار فارم پر کام کرنے کے دوران میں دیکھا تھا اور وہ اس کے بعد دوبارہ محل میں

نہیں آیا تھا۔ نوری کی آمد کے دو ہفتے بعد اس کی آمد کی اطلاع ملی اور نوری سمیت پورا محل اس کے استقبال کی تیاری کرنے لگا۔ یہ خصوصی استقبال ہمیشہ ہوتا تھا۔ بے شک بین جوائے کہیں دو دن کے لیے جائے اور واپس آئے، تب بھی محل میں اس کا اسی طرح استقبال کیا جاتا۔ پورا محل نئے سرے سے صاف کیا جاتا اور تمام اسٹاف نئی وردی پہنتا۔

بین جوائے آیا اور شام سے پہلے محل کے عمومی حصے تک محدود رہا۔ شام کے وقت وہ نوری کی رہائش والے حصے میں آیا۔ اس حصے میں صرف مخصوص لوگوں کو آنے کی اجازت تھی۔ نوری کی ہدایت پر سیلی ان کے لیے شام کا جام لے کر آئی۔ اس نے ٹرے میں رکھے جام بین جوائے اور نوری کے سامنے رکھے، تب بین جوائے نے اسے دوسری بار دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ نوری نے تعارف کرایا۔

"یہ سیلی فے ہے۔ محل میں نئی آئی ہے لیکن مجھے اچھی لگی اس لیے میں نے اسے اپنے حصے کے لیے مخصوص کرلیا ہے۔"

بین جوائے چونکا۔ "اچھا کیا تم نے۔"

سیلی نے سر جھکا کر تعظیم دی اور وہاں سے جانے لگی۔ دروازے کے قریب اس نے نوری کو کہتے سنا۔ "خوب صورت ہے نا؟"

"تم سے زیادہ نہیں۔" بین جوائے نے جواب دیا۔ اس وقت بھی سیلی اس کی نظریں خود پر محسوس کر رہی تھی۔ آج اس نے قریب سے بین جوائے کی نظروں میں وہ چمک دیکھی تھی جو اسے دیکھ کر تقریباً ہر مرد کی نظروں میں آجاتی تھی۔ بین جوائے دو ہفتے یہاں رکا اور اس دوران میں سیلی کا اس سے کم ہی سامنا ہوا کیونکہ وہ اکثر صبح سے شام تک محل میں اپنے دفتر میں ہوتا اور عام طور سے رات کے وقت نوری والے حصے میں آتا تھا۔ سیلی کی ڈیوٹی کے اوقات صبح آٹھ سے رات آٹھ بجے تک تھے اور اسے دوپہر میں صرف آدھ گھنٹا کھانے کا وقفہ ملتا۔ ہفتے میں ایک دن چھٹی ہوتی لیکن اس دن بھی اسے فٹنس سینٹر جانا پڑتا تھا۔ تمام ملازمین جب ان کی چھٹی کا دن ہوتا تو وہ لازمی فٹنس سینٹر جاتے۔

اس مدت میں سیلی کا جتنی بار بھی بین جوائے سے سامنا ہوا، سیلی نے اس کی نظروں سے الجھن محسوس کی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت حسین ہے اور مرد اسے دیکھنے پر مجبور ہیں۔ وہ جوانی سے ان نظروں کی عادی ہوگئی تھی اور اب مرد اسے گھورتے تو اسے پروا نہیں ہوتی تھی۔ لیکن بین جوائے کی نظروں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ سہم جاتی۔ وہ اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس دوران میں اس نے براہِ راست ایک بار بھی سیلی کو مخاطب نہیں کیا تھا لیکن اس کی نظریں سیلی سے بہت کچھ کہہ جاتی تھیں۔

سیلی فکر مند ہوگئی۔ اسے ڈر تھا کہ نوری بھی اس بات کو محسوس کرسکتی ہے۔ وہ عورت ہے اور مرد کی نظر خوب پہچانتی ہے۔ خاص طور سے اپنے مرد کی نظر۔ اگر وہ محسوس کرتی کہ بین جوائے سیلی کو کسی اور نظر سے دیکھ رہا ہے تو وہ اسے تو کچھ نہیں کہتی لیکن سیلی کی چھٹی ضرور ہوجاتی۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ اسے سرے سے ملازمت سے ہی نکال دیا جاتا۔ اسی خوف سے اس نے یہ بات مارینو کو نہیں بتائی۔ اس کے معاملے میں وہ بہت حساس تھا اور کئی بار دوسرے لوگوں سے اس کی لڑائی ہوچکی تھی کیونکہ انہوں نے سیلی کے بارے میں بات کی تھی۔ اگر سیلی اسے یہ بات بتادیتی تو عین ممکن تھا کہ وہ اسے لے کر یہاں سے چلا جاتا۔ سیلی اس ملازمت کو نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کہیں اور ان کو اتنی اچھی تنخواہ اور بونس ملے گا اور نہ ہی دوسری سہولیات ملیں گی۔ وہ خود پر جبر کرکے یہاں دو تین سال گزار لیتی تو پھر انہیں کہیں ملازمت کی ضرورت نہیں پڑتی۔

مارینو کی ڈیوٹی اتنی سخت نہیں تھی۔ وہ شام چھ بجے فارغ ہوجاتا تھا اور اس کے بعد گھر آجاتا کہ ملازموں کے لیے مخصوص تفریح گاہ چلا جاتا۔ وہاں دو گھنٹے گزار کر گھر آجاتا۔ آٹھ بجے سیلی آجاتی تھی۔ تب وہ کھانا کھانے میس جاتے اور وہاں سے واپسی پر سیلی سونے کے لیے لیٹ جاتی۔ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی اسے تھکا دیتی تھی کیونکہ مستقل الرٹ رہنا پڑتا تھا۔ مارینو اس سے بات کرنا چاہتا اور وہ ہوں ہاں کرتی اور کچھ دیر میں نیند کی وادیوں میں کھو جاتی۔ چھٹی والے دن بھی مصروفیت ہوتی تھی اور دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع کم ملتا۔ اس پر کبھی کبھی مارینو جھنجلا جاتا تھا۔ ایک رات وہ سونے کے لیے لیٹے تو مارینو نے کہا۔ "اس سے اچھے تو اس وقت تھے جب ہم فارم پر کام کرتے تھے۔ اس وقت ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ گزارنے کے لیے وقت تو ملتا تھا۔"

"مجبوری ہے جان۔" سیلی نے اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔ "یہاں مجھے بہت وقت کام کرنا پڑتا ہے اور جب میں آتی ہوں تو تھک جاتی ہوں۔ لیکن یہاں ہمیں معاوضہ کتنا اچھا مل رہا ہے۔ چند سال میں ہم اتنی رقم جمع کرلیں گے کہ واپس جاکر بڑی زمین خرید سکیں۔"

"یہی سوچ کر میں صبر کرلیتا ہوں۔" مارینو نے اسے محبت سے دیکھا۔ "میں جانتا ہوں تم بھی صبر کر رہی ہو۔"

"اب اتنا صبر بھی نہیں کر رہی۔" سیلی نے شوخی سے کہا اور اس کے مزید پاس ہوگئی۔ "تم بھول رہے ہو، کل ہم دونوں کی چھٹی ہے۔"

☆☆☆

مارینو پہلے گھر آتا، اور کچھ دیر آرام کرکے اور نہا دھو کر تفریح کے لیے باہر نکل جاتا لیکن اس روز جب وہ گھر آیا تو سیلی پہلے سے موجود تھی اور بستر پر بے سدھ پڑی تھی۔ مارینو نے پریشان ہوکر اسے آواز دی پھر ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔ اس کی کیفیت مدہوشوں کی سی تھی۔ وہ اس کی بات سن رہی تھی لیکن جواب نہیں دے پا رہی تھی۔ محل میں ایک چھوٹا سا اسپتال بھی تھا جہاں ہمہ وقت ڈاکٹر میسر ہوتا تھا۔ مارینو سیلی کو وہاں لے گیا۔ ڈاکٹر نے اس کا علاج تو کیا لیکن ساتھ ہی مارینو سے کہا کہ وہ اس کا خیال رکھے کیونکہ اس کی یہ کیفیت کسی ذہنی صدمے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ مارینو حیران تھا۔ ان دونوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جس سے سیلی کو صدمہ ہوتا۔ بلکہ دو دن سے وہ خوش تھی کیونکہ بہت عرصے بعد ان کو ایک دوسرے کے پاس آنے کا موقع ملا تھا۔ ڈاکٹر نے سیلی کو انجکشن دے دیا تھا۔ اس کا بخار اتر گیا تھا اور وہ سو رہی تھی۔ مارینو اسے گھر لے آیا۔

جب سیلی کو ہوش آیا تو مارینو نے اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ سیلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مارینو نے اصرار کیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مارینو اسے گلے لگا کر پیار کرنے لگا، اس کے آنسو پونچھتا رہا۔ اس نے دوبارہ سیلی سے نہیں پوچھا، اسے ڈر تھا کہ اس کی طبیعت پھر خراب نہ ہو جائے۔ سیلی روتی رہی۔ مارینو نے اسے دوا دی تو وہ سو گئی۔ ڈاکٹر نے یہ دوا اسی لیے دی تھی کہ اس کی طبیعت پھر خراب ہو تو وہ اسے یہ دوا دے دے۔ دو دن تک سیلی بستر پر رہی۔ اس دوران اس نے بہت کم بات کی۔ زیادہ تر آنکھیں بند کرکے پڑی رہتی یا کچھ سوچتی رہتی۔ تیسرے دن اس نے مارینو کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"میں یہاں نہیں رہنا چاہتی... مجھے یہاں سے لے چلو۔"

"لیکن کیوں؟" مارینو حیران ہوا۔ "ہماری یہاں اتنی اچھی نوکری ہے، سکون ہے۔"

"اس کے باوجود میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔" سیلی نے کہا۔

"اس کی وجہ؟"

"کوئی وجہ نہیں ہے۔" سیلی چیخ پڑی۔ "میں نے کہا نا میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتی۔"

مارینو پریشان ہوگیا۔ انہیں محل میں کام کرتے ہوئے چھ مہینے ہونے کو آئے تھے اور اس دوران میں انہوں نے پہلے سے زیادہ رقم جمع کرلی تھی مگر یہ اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنے سوچے ہوئے منصوبے پر عمل کرسکتے۔ اس سے پہلے سیلی چند سال یہاں کام کرکے رقم جمع کرنا چاہتی تھی اور اب وہ اصرار کر رہی تھی کہ انہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ مارینو نے کہا۔ "دیکھو، اتنی اچھی ملازمت کہیں اور نہیں ملے گی اور ہمیں تو خوش قسمتی سے محل میں ملازمت ملی ہے۔"

"میں یہ سب جانتی ہوں لیکن میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتی۔"

مارینو زچ ہونے لگا۔ "آخر اس کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟"

"کوئی وجہ نہیں ہے۔" سیلی نے اس سے نظریں چرا کر کہا۔ "بس اب میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔"

"لیکن ہم اس طرح سے یہ ملازمت چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔" مارینو نے انکار کردیا۔ "یہ ہمارے لیے بہترین موقع ہے۔"

سیلی چپ ہوگئی پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "جیسے تمہاری مرضی۔"

سیلی چوتھے دن سے محل میں اپنے کام پر آگئی تھی۔ ان تین دنوں میں اس کی تازگی جیسے گہنا گئی تھی۔ نوری ایک دن پہلے ریو ڈی جینرو سے آئی تھی۔ اس نے سیلی کو دیکھا۔ "سیلی! کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"میری طبیعت خراب تھی مادام۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن اب بہتر ہے۔"

"اب بھی بہتر نہیں ہے۔" نوری نے ہمدردی سے کہا۔ "ایسا کرو، تم دو تین دن مزید چھٹی لے کر آرام کرو۔ اس سے تمہاری طبیعت مزید بہتر ہوجائے گی۔"

"نہیں، میں آرام کرکے تھک گئی ہوں۔ کام کروں گی تو جلدی ٹھیک ہوجاؤں گی۔" سیلی نے انکار کردیا۔

"ٹھیک ہے لیکن تم شام کو چھ بجے آف کرلینا۔" نوری نے اسے حکم دیا۔ پھر وہ بین جوائے کو کال کرنے لگی جو اس وقت امریکا میں تھا۔ وہ وہاں کوئی بزنس ڈیل کرنے گیا تھا۔ سیلی کمرے سے نکل گئی۔ شام کو وہ گھر آئی تو اس کی چپ

برقرار تھی۔ مارینو اس سے بات کرتا تو جواب دیتی ورنہ خود سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ مارینو اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ وہ اس سے ناراض تھی کیونکہ مارینو نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا۔ عام حالات میں مارینو نے کبھی اس کی کسی ضد سے انکار نہیں کیا تھا لیکن اس کی یہ بات ماننا اس کے بس میں نہیں تھا... جبکہ یہ صرف ضد برائے ضد تھی۔ اس کا خیال تھا کہ رفتہ رفتہ سیلی مان جائے گی اور اپنی ضد ترک کر دے گی۔

مگر دن گزرتے گئے اور سیلی کا رویّہ برقرار رہا۔ دو دن وہ شام کو جلدی آ گئی لیکن اس کے بعد وہ اپنے معمول کے مطابق آٹھ بجے آنے لگی۔ آکر وہ کپڑے بدلتی، دونوں کھانا کھانے میس جاتے اور وہاں سے واپسی پر وہ اس کے برابر میں کروٹ لے کر خاموشی سے سو جاتی اور صبح اسی کروٹ سے اٹھ کر اور تیار ہو کر ناشتے کے لیے میس جاتی اور... وہیں سے اپنی ڈیوٹی پر چلی جاتی۔ جب دو ہفتے گزرنے پر بھی سیلی کا یہی رویّہ برقرار رہا تو مارینو کو فکر لاحق ہو گئی۔ اس سے پہلے بھی ان میں لڑائیاں ہوئی تھیں اور بات بند ہو جاتی لیکن اتنی طویل لڑائی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک رات سیلی واپس آئی تو مارینو نے اس سے پوچھ لیا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔" سیلی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"سیلی! تمہیں کوئی فکر نہیں ہے کہ یہاں سے ملازمت چھوڑ کر جانے کی صورت میں ہمیں کہیں اور اتنی تنخواہ والی ملازمت نہیں ملے گی اور ہم پیٹ کاٹ کر بچت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"میں اس کے لیے تیار ہوں۔ میں تم سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔"

مارینو نے گہری سانس لی اور بولا۔ "ٹھیک ہے، ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔"

"سچ۔" اتنے دنوں بعد سیلی کے چہرے پر پہلی بار خوشی کی جھلک نظر آئی۔

مارینو نے سر ہلایا۔ "ہاں، تمہاری خاطر۔"

سیلی اس کے گلے لگ گئی۔

لیکن اگلے دن جب سیلی اور مارینو نے مسز کردن سے ملازمت چھوڑنے کی بات کی تو اس نے کہا۔ "اس کے لیے تمہیں ایک مہینے کا نوٹس دینا ہوگا۔"

"لیکن ہم ابھی چھوڑنا چاہتے ہیں۔" سیلی بولی۔

مسز کردن نے کہا۔ "محل میں ملازمت کرنے والے ملازمین پر لازم ہے کہ وہ ایک مہینے پہلے نوٹس دیں ورنہ ان کی تنخواہ روک لی جاتی ہے اور میگزین کو بھی ان کی شکایت کر دی جائے گی۔ غیر ملکی ہونے کی صورت میں انہیں ڈی پورٹ کر دیا جائے گا۔"

سیلی اور مارینو مجبور ہو گئے کہ مزید ایک مہینا یہاں کام کریں۔ دوسری صورت میں ان کو برازیل سے نکال دیا جاتا۔ نوری کو پتا چلا تو اس نے سیلی سے کہا۔ "تم کیوں جاب چھوڑ رہی ہو... کیا یہاں کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں مادام۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ نوری نے اسے راضی کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس کا انکار برقرار رہا تو وہ مایوس ہو گئی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔ بہرحال، میں تمہارے کام سے خوش ہوں۔ میں تمہیں سرٹیفکیٹ اور ایک مہینے کی تنخواہ اپنے پاس سے دوں گی۔"

"میں آپ کی شکرگزار ہوں۔" سیلی نے آہستہ سے کہا۔

دو دن بعد سیلی اور مارینو کام پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ سیلی کی طبیعت صبح سے ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ تیار ہو گئی اور جب وہ ناشتے کے لیے میس کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں سیلی لڑکھڑا کر مارینو کی بانہوں میں جھول گئی۔ اسے چکر آ گیا تھا۔ مارینو پریشان ہوا کہ کہیں پھر سیلی کو ڈپریشن والا دورہ نہ پڑا ہو۔ وہ نیم بے ہوش ہو رہی تھی۔ مارینو جلدی سے اسے اسپتال لے گیا جہاں ڈاکٹر نے اس کا چیک اپ کیا اور شبہ ظاہر کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس نے سیلی کا ایک ٹیسٹ لیا اور ایک گھنٹے کے اندر تصدیق کر دی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

مارینو کو بچوں کی خواہش تھی۔ شادی کے فوراً بعد اس نے سیلی سے کہا تھا کہ وہ اپنی غربت کے باوجود جلد از جلد باپ بننا چاہے گا۔ سیلی کا خیال تھا کہ پہلے انہیں اپنے حالات بہتر بنانے چاہئیں تاکہ ان کے بچوں کو وہ سختیاں برداشت نہ کرنا پڑیں جو انہوں نے سہی ہیں۔ اس کے باوجود اسے جلدی ماں بننے والی بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر وہ قدرت کی طرف سے محروم رہے۔ اب کئی سال بعد جا کر انہیں ماں باپ بننے کی خوشخبری سنائی گئی تھی۔ سیلی کی طبیعت سنبھل گئی۔ ڈاکٹر نے اسے چند دن مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ مارینو اس کے پاس آیا تو اس کا خیال تھا کہ سیلی بھی اس کی طرح خوش ہوگی لیکن اس کے بجائے وہ خاصی کسی قدر





ہراساں نظر آئی۔ اس نے مارینو سے کہا۔

"کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں، یہ سچ ہے۔ ہم ماں باپ بننے والے ہیں۔"

"لیکن میں ابھی ماں نہیں بننا چاہتی۔" سیلی نے کہا تو مارینو ہکا بکا رہ گیا۔

"مگر کیوں؟"

"ابھی ہم اپنی زندگی بہتر بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہم بچے کیسے برداشت کریں گے؟"

"تمہیں بہت جلد خیال آ گیا کہ ہم ابھی جدوجہد کر رہے ہیں۔" مارینو نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ خیال تمہیں اس وقت نہیں آیا جب تم یہاں سے جانے کی ضد کر رہی تھیں۔"

"وہ تو..." سیلی نے کہنا چاہا تو مارینو نے اس کی بات کاٹی۔

"سیلی، ہم یہ بچہ پیدا کریں گے۔"

مارینو کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ سیلی خاموش ہو گئی اور اس نے دوبارہ بچے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ ڈاکٹر نے اسے آرام کرنے کو کہا اس لیے سیلی نے محل میں چھٹی کی درخواست بھیج دی جو نوری نے خود منظور کی۔ اس نے اسے امید سے ہونے پر مبارک کا پیغام بھی بھیجا تھا۔ ایک مہینا مزید یہاں گزار کر مارینو اور سیلی اپنے واجبات لے کر رخصت ہو گئے۔ نوری نے حسبِ وعدہ سیلی کو ایک مہینے کی اضافی تنخواہ دی۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ اس دوران میں ہین جوائے ایک بار بھی محل میں نہیں آیا اور جب وہ آیا تو مارینو اور سیلی کو یہاں سے گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

سیلی اپنے گھر کے سامنے بڑے سے صحن میں دھلے کپڑے سوکھنے کے لیے لٹکا رہی تھی۔ سامنے میدان میں کچھ لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک سنہری بالوں اور گوری رنگت والا نوجوان بھی تھا۔ وہ بڑی مہارت سے فٹ بال کو دونوں پیروں سے باری باری اچھال رہا تھا اور اسے زمین پر گرنے سے روک رہا تھا۔ جب تک سیلی کپڑے لٹکاتی رہی نوجوان نے فٹ بال کو گرنے نہیں دیا۔ سیلی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر مسکرائی اور خالی ٹوکرا لے کر اندر جانے کے لیے مڑی کہ اس کے گھر کے سامنے ایک چھوٹی کار آ کر رکی۔ سیلی نے توجہ نہیں دی لیکن جب اس سے ایک سفید بالوں والا بوڑھا آدمی اترا تو وہ ساکت رہ گئی۔ اس نے پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی۔

براہِ راست سیلی نے اسے بیس برس پہلے دیکھا تھا لیکن ویسے وہ مہینے میں ایک دو بار کسی نہ کسی ٹی وی چینل پر نظر آتا تھا۔ شروع میں وہ اس کے لیے ایک ڈراؤنا خواب تھا جو راتوں میں آ کر اسے جگا دیتا۔ اس کے اندر ایک خوف سالوں موجود رہا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ خوف کم ہوتا گیا اور بالآخر بالکل ختم ہو گیا۔ مارینو اس کے خوف سے واقف تھا لیکن وہ اس کی وجہ سے واقف نہیں تھا۔ راتوں کو جب وہ چیخ مار کر اٹھتی تو مارینو اسے بازوؤں میں لے کر تسلی دیتا۔ مارینو کا خیال تھا کہ وہ پہلی بار ماں بننے جا رہی ہے اس وجہ سے ڈرتی ہے۔ مگر برازیل سے واپس آنے کے سات مہینے بعد جب جوزینو پیدا ہوا، تب بھی سیلی کا خوف برقرار رہا۔ اس وقت مارینو زمین خرید کر اس پر محنت کر رہا تھا۔ انہوں نے اچھی خاصی زمین لے لی تھی اور کچھ جانور بھی پال لیے تھے۔ یہاں ان کو ہین جوائے کے محل کے مقابلے میں کہیں زیادہ محنت کرنا پڑتی۔ سیلی کو اس حالت میں بھی بہت سارے کام کرنا پڑتے لیکن وہ خوش تھی۔ جوزینو کی پیدائش تک مارینو نے زمین کی حالت بہت بہتر کر لی اور اس سے آمدنی آنا شروع ہو گئی تھی۔

جب جوزینو تین سال کا ہوا تو سیلی پھر امید سے ہو گئی۔ اس بار مارینو کے ساتھ سیلی بھی بہت خوش تھی۔ ان کی مالی حالت اچھی ہو گئی تھی۔ مارینو نے اپنے چھوٹے سے مکان کو بڑا، مضبوط اور خوب صورت کر لیا تھا۔ اس کے چاروں طرف لکڑی کی باڑھ لگائی جس کے اندر لگے درخت اب خاصے بڑے ہو گئے تھے۔ دوسری بار بھی بیٹا ہوا۔ یہ بھی جوزینو کی طرح سرخ و سفید تھا لیکن اس کے بال مارینو کی طرح سیاہ تھے۔ جوزینو کے بال سنہری مائل تھے۔ پھر سیلی نے دو بیٹیوں کو جنم دیا۔ رنگ و روپ کے لحاظ سے وہ سیلی اور مارینو سے ملتی جلتی ہوئی تھیں۔ صرف جوزینو کچھ الگ لگتا مگر یہ تعجب کی بات نہیں تھی۔ ہر گھر میں ایک آدھ بچہ اپنے ماں باپ سے مختلف ہوتا ہے۔

مارینو نے سخت محنت کر کے کچھ اور زمین لے لی اور اب وہ بہت خوشحال تو نہیں تھے لیکن ایک مناسب زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے سارے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ ان کے پاس گاڑی تھی، اور گھر میں تمام سہولتیں تھیں۔ سیلی بہت خوش تھی۔ جو اس نے چاہا تھا اور بھی سوچا تھا بالآخر وہ ان کو مل گیا تھا۔ اس خوش باش زندگی میں بس ایک ہی خوف تھا اور وہ ہین جوائے کا خوف تھا۔ یہ خوف صرف سیلی کو تھا اور اس نے

ماریئو کو بھی اس خوف کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس نے بارہا جاننے کی کوشش کی لیکن سیلی نے اس بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ پھر یہ خوف اس کے دل کے نہاں خانوں میں کہیں جا چھپا اور پھر اسے بین جوائے کا خیال تو آتا لیکن اس سے خوف نہیں آتا تھا۔

اتنے سالوں بعد بین جوائے کو سامنے دیکھ کر سیلی کے اندر موجود خوف باہر آ گیا۔ بین جوائے نے کار سے اترتے ہی اسے دیکھا اور اس کی نظریں کچھ دیر سیلی پر جمی رہیں۔ بیس سالوں نے اس پر زیادہ اثر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ پہلے کی طرح دل کش و حسین تھی۔ اس کا جسم آج بھی خوب صورت تھا۔ سیلی کا چہرہ جوانی جیسا تر و تازہ نہیں رہا تھا لیکن اس پر جھریاں بھی نمودار نہیں ہوئی تھیں۔ بین جوائے نے لکڑی کا دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔

”ہیلو سیلی... کیسی ہو تم؟“

”بین جوائے... تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”کیا مجھے نہیں آنا چاہیے تھا؟“

”نہیں کیونکہ اس بات کو بیس سال گزر چکے ہیں۔“

”جیسے ہی مجھے علم ہوا تو میں سمجھ گیا کہ تم دونوں اچانک ملازمت چھوڑ کر کیوں گئے ہو؟“

”تم نے ہماری تلاش شروع کر دی؟“

”اس وقت نہیں لیکن کچھ عرصے پہلے مجھے محسوس ہوا کہ مجھے تم لوگوں کو تلاش کرنا چاہیے۔“

”کیوں؟“ سیلی بولی۔ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے اندر بیک وقت خوف اور غصہ بڑھ رہا تھا۔

”تم جانتی ہو میں کیوں یہاں آیا ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے اور بہت بڑی رقم خرچ کر کے تم لوگوں کو تلاش کیا ہے۔“

سیلی اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ ماریئو کام پر گیا ہوا تھا اور جوزینو کے علاوہ تمام بچے اسکول گئے تھے۔ جوزینو کالج میں پڑھ رہا تھا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا اور اب سیلی کو ہی حالات اور بین جوائے کا سامنا کرنا تھا۔ اس نے اپنے ابتدائی خوف پر قابو پا لیا اور تن کر بین جوائے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ اسکرٹ کے پاس رکھا تھا۔ ”ٹھیک ہے تم نے ہمیں تلاش کر لیا ہے لیکن تم کیا چاہتے ہو؟“

”تم جانتی ہو میں کیا چاہتا ہوں۔“ بین جوائے بولا۔ ”میں اپنا وہ بچہ لینے آیا ہوں جو تمہارے پیٹ میں تھا جب تم اور ماریئو فرار ہوئے۔“

غم و غصے سے سیلی کی رنگت انگارے کی طرح دہکنے لگی۔ اس نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بکواس مت کرو، وہ بچہ تمہارا نہیں ہے۔ اسے میں نے جنم دیا ہے، وہ میرا بیٹا ہے۔“

سیلی کے اندر ابال سا اٹھ رہا تھا اور اس کا ہاتھ اپنے اسکرٹ سے کچھ دور تھا۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جب وہ محل میں تھی۔ نورمی شہر گئی ہوئی تھی۔ بین جوائے بھی نہیں تھا لیکن وہ اچانک ہی محل آ گیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ بین جوائے محل میں نورمی کے بغیر آیا ہو۔ نورمی اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں موجود ہوتی تھی۔ سیلی اپنے کاموں میں مصروف تھی اور اس نے بین جوائے کی آمد کو اہمیت نہیں دی کیونکہ وہ نورمی کی خادمہ تھی۔ پس جب بین جوائے نے اسے طلب کیا تو وہ ہچکچائی۔ اسے بین جوائے سے اس وقت بھی خوف آتا تھا جب وہ نورمی کی موجودگی میں اس کے سامنے جاتی۔ آج وہ اکیلا تھا۔ اس لحاظ سے سیلی کا خوف بھی بڑھ گیا۔

وہ اس کے پاس آئی تو وہ وہسکی کے لوازمات سجائے بیٹھا تھا۔ اس نے سیلی کو حکم دیا۔ ”میرے لیے پیگ تیار کرو۔“

سیلی جانتی تھی کہ وہ وہسکی کس طرح پیتا ہے۔ اس نے بین جوائے کے لیے گلاس میں سوڈا ملانا چاہا تو بین جوائے نے منع کر دیا۔ ”نہیں، آج میں خالص پینا چاہتا ہوں۔“

سیلی نے ایسے ہی پیش کیا۔ بین جوائے نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ اس نے گلاس سامنے رکھا اور بوجھل لہجے میں دوسرا پیگ بنانے کا حکم دیا۔ سیلی نے حکم کی تعمیل کی اور جب گلاس اس کی طرف بڑھایا تو اس نے کہا۔ ”اس گلاس میں بھی ڈالو۔“

تب سیلی نے توجہ دی۔ میز پر ایک گلاس اور تھا جبکہ بین جوائے وہاں اکیلا تھا۔ بہر حال، اس کی مرضی تھی وہ دو گلاس رکھے یا اس سے بھی زیادہ رکھے۔ سیلی نے دوسرے گلاس میں بھی ڈالی اور گلاس بین جوائے کے سامنے کرنا چاہا تو اس نے کہا۔ ”یہ تمہارے لیے ہے۔“

سیلی خوف زدہ ہو گئی۔ اس نے انکار کیا۔ ”جناب! میں ملازمہ ہوں اور آپ کے سامنے نہیں پی سکتی۔“

”یہ میرا حکم ہے۔“

”میں ڈیوٹی کے دوران نہیں پیتی۔“ سیلی کا انکار جاری رہا۔

”یہ میرا حکم ہے۔“ بین جوائے نے گرجتی آواز میں کہا۔ ”پیو۔“

با دلِ ناخواستہ اس نے گلاس اٹھا لیا اور صرف چکھنے کی حد تک پیا۔ پھر گلاس رکھ دیا۔ ”میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی ہے جناب۔“

”اسے پورا خالی کرو۔“

سیلی نے بے بسی سے اسے دیکھا اور بڑی مشکل سے گلاس خالی کیا۔ وہ سچ مچ بہت کم پیتی تھی۔ شراب اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔ یہ صرف ایک پیگ تھا اور اس سے معمولی سا نشہ ہوتا، یہی سوچ کر اس نے گلاس ختم کر دیا لیکن گلاس ختم کرتے ہی اس کا سر گھومنے لگا اور ایسا لگا جیسے وہ ہوا میں اڑ رہی ہو۔ اس کے حواس بالکل گم ہو گئے اور جب اسے ہوش آیا تو وہ بین جوائے کے بیڈ روم میں تھی۔ بین جوائے وہاں نہیں تھا مگر اپنی حالت دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس پر کیا گزری ہے۔ اس کی جسمانی اور دماغی حالت خراب ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو سمیٹا، اپنا حلیہ درست کیا اور گھر آ گئی۔ اس کے کچھ عرصے بعد اسے ماں بننے کی خوش خبری ملی لیکن وہ اس خبر سے خوف زدہ ہو گئی۔ اسے شبہ تھا کہ یہ بچہ بین جوائے کا ہے۔ اس نے ماریئو کو اس واقعے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ سیلی جانتی تھی کہ وہ پاگل ہو کر بین جوائے کو قتل کرنے کی کوشش کرے گا یا اس کوشش میں خود مارا جائے گا۔ اگر وہ بین جوائے کو مار دیتا، تب بھی سیلی اس سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتی۔ اس نے اپنی اور ماریئو کی بہتری کے لیے زبان بند رکھی۔ پھر جوزینو پیدا ہوا تو سیلی کے خدشے کی تصدیق ہو گئی، وہ دیکھنے میں بین جوائے سے مشابہ تھا۔ ماریئو نے اس پر توجہ نہیں دی، وہ جوزینو کو اپنی ہی اولاد سمجھ رہا تھا۔ سیلی کو شروع میں جوزینو سے نفرت محسوس ہوئی لیکن رفتہ رفتہ اس کی ممتا غالب آ گئی اور اب جوزینو میں اس کی جان تھی۔

☆☆☆

”وہ میری اولاد ہے۔“ بین جوائے نے کہا۔

”اولاد اس کی ہوتی ہے جو اسے پیدا کرتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس کی ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے، میں اس کی ماں ہوں۔“

”ٹھیک ہے، تم اس کی ماں ہو لیکن وہ اولاد تو میری ہے۔“

”تمہاری اولاد۔“ سیلی نے نفرت سے کہا۔ ”تم نے صرف اپنی ہوس پوری کی تھی۔ تمہیں اولاد کی خواہش نہیں تھی۔ اس لیے جوزینو صرف میری اولاد ہے۔“



”ایک معمولی سا ٹیسٹ ثابت کر دے گا کہ وہ میرا بیٹا ہے۔“ بین جوائے لڑکے کا سن کر خوش نظر آنے لگا۔

”ہاں لیکن کیا تم اس بات کا اعلان کر سکتے ہو؟“ سیلی نے اسے چیلنج دیا۔ ”کیا تم سب کو بتا سکتے ہو کہ تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟“

بین جوائے چپ ہو گیا لیکن پھر اس کے تاثرات سخت ہونے لگے۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، اس میں میری بدنامی ہو گی اور ممکن ہے مجھے مجرم بھی قرار دیا جائے لیکن اپنی اولاد کو حاصل کرنے کے لیے میں سب برداشت کرنے کو تیار ہوں۔“

”تم نے مجھے بے آبرو کیا۔“ سیلی جذباتی ہو گئی۔ ”اور اب تم چاہتے ہو کہ تمہارے جرم کی سزا کے بجائے انعام دیا جائے؟“

”جو ہوا میں اس پر شرمندہ ہوں۔“ بین جوائے نے کہا۔ ”تم جس طرح چاہو میں اس کی تلافی کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے سیلی کا معمولی سا گھر دیکھا۔ اس کے لیے یہ معمولی سا تھا۔ پھر اس نے کپڑے اور ان کا سائز دیکھا۔ اسے پتا چل گیا کہ سیلی کے اور بچے بھی تھے۔ ”جس طرح سے بھی تم چاہو۔“

”اگر تمہارا اشارہ دولت کی طرف ہے تو میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تمہاری دولت پر۔“

”تم ایک فیملی ہو اور تمہیں اپنے بچوں کے لیے بہتر زندگی کی ضرورت ہو گی۔“ بین جوائے کا لہجہ ترغیب دینے والا تھا۔

”ہم اپنی بساط کے مطابق ان کو بہتر زندگی دے رہے ہیں۔ میرا شوہر اس کے لیے روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔“

بین جوائے نے محسوس کیا کہ سیلی کسی صورت نہیں مانے گی اور اس مسئلے کا کوئی ایسا حل نہیں نکلے گا جو دونوں فریقوں کے حق میں ہو۔ لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتا، سنہری بالوں اور دمکتی سفید رنگت والا نوجوان اندر آیا۔ اس نے ہاتھ میں ایک بہترین اور نئی فٹ بال اٹھا رکھی تھی اور اس کا لباس بھی بہترین تھا۔ اس نے اندر آ کر سیلی کا گال چوما اور بین جوائے کی طرف دیکھا۔ ”یہ کون ہے مام؟“ اس کی نظروں میں اجنبیت تھی۔ اس نے ٹی وی پر بین جوائے کو دیکھا تھا لیکن یہ اس کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ مشہورِ زمانہ بین جوائے ان کے گھر آ سکتا ہے۔ بین جوائے کو لگا جیسے اس کے سامنے اس کی جوانی کی تصویر آ گئی ہو۔ وہ یقیناً اس کا بیٹا

تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ جوزینو سے تعارف کراتا، سیلی نے اس کا ماتھا چوما اور بولی۔
''ایک پرانا واقف کار ہے۔ تم اندر جا کر نہا لو۔ آج میں نے تمہارا پسندیدہ کھانا بنایا ہے۔''
''دنیا کی سب سے گریٹ مام۔'' جوزینو خوش ہو گیا اس نے پھر سیلی کو پیار کیا اور فٹ بال اچھالتا ہوا اندر چلا گیا۔
''یہ... میرا...''
''تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' سیلی پھر تن کر کھڑی ہو گئی۔ ''جوزینو... صرف میرا بیٹا ہے۔ اگر تم نے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تو یقین کرو ہم آخر تک لڑیں گے اور عدالت میں جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ دنیا کی کوئی عدالت ایک ماں سے اس کا وہ بچہ نہیں چھین سکتی جسے اس نے جنم دیا ہو۔ میں تمہارے سارے کرتوت دنیا والوں کے سامنے لے آؤں گی۔''
بین جوائے سیلی کی باتیں سن رہا تھا اور اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس پر زیادہ اثر نہیں ہوا ہے اور وہ بہر صورت اپنی مرضی کر کے رہے گا۔ یک دم سیلی کا حوصلہ ٹوٹنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ جوائے طاقت ور آدمی ہے، اس نے پہلے بھی اسے مجبور کیا اور اب بھی کر سکتا تھا۔ وہ اس سے جوزینو کو چھین کر لے جا سکتا تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ بات کھل جاتی۔ سیلی کو دنیا کی پروا نہیں تھی لیکن ماریو اس کا شوہر تھا۔ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا؟ اس کا اعتبار ٹوٹ جاتا۔ جوزینو کو معلوم ہوتا تو اس کے دل پر کیا گزرتی اس کے دوسرے بچے کیا سوچتے؟ اس کا ہنستا بستا گھرانا بکھر جاتا۔
یہ سب سوچ کر سیلی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس کا سر جھک گیا وہ کہنے لگی۔ ''جوزینو بہت اچھا فٹ بالر ہے۔ ابھی اس نے مقامی لیگ سے معاہدہ کیا ہے۔ اس کا کھیل دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں ملک کی ٹیم میں بھی شامل ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ عالمی شہرت یافتہ فٹ بالر بن جائے۔ وہ اچھا طالب علم ہے، وہ ہم سے بہت محبت کرتا ہے۔ یہ گھر اور خاندان اس کا فخر ہے۔'' سیلی نے کہتے ہوئے سر اٹھایا۔ ''کیا تم صرف اس لیے اس سے اس کا فخر اور اس کا سب کچھ چھین لو گے کہ تمہیں اپنے کاروبار کے لیے ایک چیف ایگزیکٹو درکار ہے؟ شاید تمہیں چیف ایگزیکٹو مل جائے لیکن جوزینو سے اس کا سب چھن جائے گا۔ ٹھیک ہے، میں مانتی ہوں وہ تمہاری اولاد ہے لیکن کیا تم صرف اس لیے اسے تباہ کر دو گے کہ وہ تمہاری اولاد ہے؟''
یہ سب سنتے ہوئے بین جوائے کا چہرہ کسی پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس پتھر تلے کہیں نرمی نہیں ہے۔ وہ بہت کوشش اور تلاش کے بعد یہاں تک پہنچا تھا اور اس لیے نہیں آیا تھا کہ خالی ہاتھ واپس جا سکے۔ مگر کچھ دیر گزرنے کے بعد اس پتھر میں دراڑیں نمودار ہونے لگیں۔ پتھر کے نیچے سے نرمی نمودار ہو رہی تھی۔ بین جوائے نے ایک گہری اور شکست خوردہ سانس لی۔ ''سیلی! تم ٹھیک کہہ رہی ہو جوزینو کو صرف اس لیے تباہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ میری اولاد ہے۔ لیکن میری تم سے ایک التجا ہے۔ کیا میں کبھی کبھی اسے دیکھنے آ سکتا ہوں؟ تم لوگوں سے میرا اتنا حق بھی تو ہے۔ بس دس پندرہ منٹ کے لیے؟''
سیلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بہتر ہو گا تم اس باب کو یہیں بند کر جاؤ کیونکہ تم بار بار آؤ گے تو اس سے کوئی خرابی ہو سکتی ہے۔''
بین جوائے نے ایک اور گہری سانس لی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن وہ میری دولت کا وارث ہو گا۔''
''بات تو اس صورت میں بھی کھل جائے گی اور یقین کرو اسے تمہاری دولت کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ بین! تم نے میرے ساتھ جو کیا، اس سے قطع نظر تم ایک اچھے آدمی ہو اور لوگوں کے کام آتے ہو اس لیے بہتر ہو گا کہ تم اپنی دولت ایسے کاموں میں لگا جاؤ کہ لوگ تمہیں ہمیشہ یاد رکھیں۔'' سیلی نے تجویز دے کر بات ختم کر دی اور بین جوائے کے پاس وہاں سے رخصت ہونے کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔ اس نے سر ہلایا۔
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ جوزینو کو میری دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے پاس وہ سب ہے جو میرے پاس دنیا جہان کی دولت ہوتے ہوئے بھی نہیں ہے۔'' بین نے کہا اور مڑ کر احاطے سے باہر نکل گیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا اور اس کی گاڑی ماضی کے واقعات پر دھول اڑاتی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد جوزینو اندر سے نکل آیا۔ اس نے نہا کر لباس بدل لیا تھا۔
''مام! وہ بوڑھا کیوں آیا تھا؟''
''وہ کسی کا پتا پوچھتا ہوا آیا تھا لیکن اس کا بتایا ہوا شخص یہاں نہیں رہتا۔ وہ غلطی سے آیا تھا اور اب کبھی نہیں آئے گا۔'' سیلی نے یقین سے کہا اور اپنے بیٹے کا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔
✱



# الٹ پھیر

بابر نعیم

خوابوں اور خواہشوں کے تابع ہونا اہم اور ضروری بات نہیں... ملک اہم ترین خود پر بھروسا کرنا ہے... دو ایسے ہی دوستوں کی کتھا جو اپنی مہم کو سر کرنے کے لیے یکدم بے تاب ہو گئے... اور ہوش آیا تو اس وقت جب ناکامی کے دروازے سے ناکام لوٹنا پڑ...!

''ٹونی، یہ دیکھو!'' پرکنز نے اس اخبار کی ایک خبر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اسے اپنے اسٹول پر رکھا ہوا ملا تھا۔ وہ چند منٹ قبل ہی اس ریسٹورنٹ میں پہنچے تھے۔
ٹونی نے حقارت بھری نظروں سے اپنے پارٹنر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں اپنی کافی پینے کی کوشش کر رہا ہوں۔''
پرکنز نے ٹونی کی نگاہوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ابھی اور اسی

وقت اسے دیکھنا ہوگا۔" ساتھ ہی اس نے وہ اخبار اپنے ساتھی کے چہرے کے سامنے کر دیا۔

وہ دونوں اس وقت ریسٹورنٹ کے کاؤنٹر پر بیٹھے وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ ایک اور دھوکے بازی کے بارے میں سوچنے کی کوشش کر رہے تھے جو ان کی گزراوقات کا ذریعہ بن سکے۔ وہ سب کچھ کر گزرنے کے لیے رضامند تھے بشرطیکہ اس... میں ایمان داری کا عنصر شامل نہ ہو۔

ٹونی نے اخبار کو جھٹکتے ہوئے اپنے چہرے سے دور کر دیا۔ "مجھے تنہا چھوڑ دو! سمجھے؟ اور تھوڑا سا پُرسکون رہنے دو تاکہ میں کچھ سوچ سکوں۔"

"میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ یہ ایک ایسی خبر ہے جسے دیکھنا تمہارے لیے بے حد ضروری ہے۔ جلدی کرو، میں نہیں چاہتا کہ یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے۔" پرکنز نے ایک بار پھر اصرار کرتے ہوئے کہا۔

ٹونی نے وہ اخبار پرکنز کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور اخبار کے اوپری حصے میں چھپی ہوئی تاریخ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ اخبار ایک دن پرانا ہو چکا ہے۔ کل جو کچھ ہے، مجھے آج اسے جاننے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اسے ایک نظر پڑھ تو لو۔" پرکنز نے اخبار کے ایک حصے پر انگلی رکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا۔

ٹونی نے ہار مان لی اور ایک آہ بھرنے کے بعد بلند آواز سے وہ خبر پڑھنا شروع کر دیا جس کی جانب پرکنز اشارہ کر رہا تھا۔ "مقامی پولیس وومن نے پولیس آفیسر آف دی ایئر کا خطاب جیت لیا! تو پھر مجھے کیا؟ میں اس لیڈی کے بارے میں فکرمند کیوں ہوں؟ یاد رہے کہ ہم عیار مجرم ہیں۔ جب تک وہ اس لیڈی پولیس افسر کو نقد انعام سے نہیں نوازتے، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔"

— تب پرکنز نے اپنی انگلی اس خبر کے برابر میں چھپی ہوئی خبر پر رکھ دی اور بولا۔ "وہ نہیں، یہ خبر پڑھو۔"

ٹونی نے خبر پڑھنا شروع کیا۔ "پاور بال لاٹری کا سب سے بڑا انعام ایک خاتون نے جیت لیا۔" پھر اس نے اخبار پر سے نگاہ اٹھا کر غصے سے پرکنز کی طرف دیکھا اور تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو بڑا انعام کسی اور نے جیت لیا اور میرے چالیس ڈالرز کے داؤ کے عوض میرے حصے میں یہ ردی اخبار آیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے شرمندہ کرنے پر تلے ہوئے ہو؟"

"اپنی آواز دھیمی رکھو۔" پرکنز نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "اب ذرا غور سے اس عورت کو دیکھو جو کاؤنٹر سے آگے کونے میں میز پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی ہے۔"

"وہ جو اکیلی بیٹھی ہوئی ہے؟" ٹونی نے نظر پر گھماتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" پرکنز نے سر ہلایا۔ "کیا وہ تمہیں شناسا دکھائی دے رہی ہے؟"

ٹونی نے غور سے اس عورت کی طرف دیکھا۔ پھر اخبار میں چھپی ہوئی تصویر پر نظریں جما دیں۔ پھر دوبارہ اس عورت کی طرف دیکھا۔ "میں یقین نہیں کر سکتا۔" وہ بڑبڑایا۔

"ہاں، یہ بالکل وہی ہے۔" پرکنز نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ یہی عورت ہے۔" ٹونی نے اخبار میں چھپی ہوئی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

اتنے میں اس عورت نے ویٹرس کو بل لانے کا اشارہ کیا۔

پرکنز نے اس عورت کے اشارہ کرنے پر تیزی سے سرگوشی کی۔ "آؤ، اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ اسے راستے میں گھیر لیں گے اور اس کے پاس جو کچھ ہوگا، وہ لوٹ لیں گے۔"

ٹونی نے پرکنز کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ایک سیکنڈ رک جاؤ۔ میرے ذہن میں ایک اور بہتر آئیڈیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم ہمیشہ کی طرح طاقت کے بل بوتے پر کوئی کارروائی کریں، کیوں نہ ہم اس لیڈی کا اس کے اپارٹمنٹ تک پیچھا کریں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس نے اپنے گھر میں انعام کی جیتی ہوئی کتنی رقم رکھی ہوئی ہوگی۔"

تب پرکنز نے ایک بار پھر اخبار کی خبر پڑھنا شروع کر دی۔ "اس میں لکھا ہے کہ انعامی رقم کا پہلا چیک اسے کل ادا کر دیا گیا ہے۔ ٹیکس منہا کرنے کے بعد ایک سال کی رقم ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار ڈالرز بنتی ہے اور یہ رقم اسے ہر سال آئندہ بیس برس تک ملتی رہے گی۔"

"میں مستقبل کے بارے میں فکرمند نہیں ہوں۔ میں اس رقم پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں جو کچھ فی الوقت اس کے پاس موجود ہے۔" ٹونی نے کہا۔ "اور اس جیسے علاقے میں وہ کوئی بڑی رقم ساتھ لے کر گھومنے کا خطرہ کبھی مول نہیں لے



گی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن میں گارنٹی سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے اس انعامی رقم کے بڑے حصے میں سے نقد رقم کہیں نہ کہیں اپنے پاس رکھی ہوئی ہوگی۔ میری چھٹی حس بتا رہی ہے۔" پرکنز نے خوش کن لہجے میں کہا۔

ٹونی نے اپنے کافی کپ سے آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا اور بل کی رقم طشتری کے نیچے دباتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آؤ، اس کا گھر تک پیچھا کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے کیا ہاتھ آتا ہے۔"

"میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔"

وہ ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ یہ ایک خوش گوار صبح تھی اور فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔

وہ عورت خراماں خراماں چلتی ہوئی فٹ پاتھ پر بنے ہوئے ایک اخبار فروش کے کھوکھے پر پہنچی اور ایک اخبار خرید کر اس میں کسی خبر کو تلاش کرنے لگی۔ اس نے مختصر وقت میں اخبار کا جائزہ لینے کے بعد اسے لپیٹ کر اپنی بغل میں دبایا اور اپنے آپ میں مگن مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

وہ اپنی سوچ میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ اسے احساس تک نہیں ہوا کہ دو آدمی اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔

پھر وہ قریب میں ہی ایک چھوٹی سی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں داخل ہو گئی۔

"ارے، یہ اس عمارت میں رہتی ہے۔" پرکنز نے حیرت کا اظہار کیا۔ "لیکن اب جبکہ یہ لکھ پتی ہو چکی ہے تو میں سوچ رہا ہوں کہ وہ اس پسماندہ علاقے میں کب تک قیام پذیر رہے گی۔"

"اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ ہم ابھی اور اسی وقت اسے گھیر لیں۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک ہفتے کے اندر اندر یہاں سے چلی جائے گی اور ہم اس کے پاس موجود جو بھی رقم ہے، اسے ہتھیانے کا موقع گنوا دیں گے۔" ٹونی نے کہا۔

ٹونی نے اس عورت کے عمارت میں داخل ہونے کے بعد چند سیکنڈ کے لیے توقف کیا، پھر خود بھی اس کے پیچھے پیچھے عمارت کے دروازے سے اندر چلا گیا۔ پرکنز بھی اس کے عقب میں تھا۔

عمارت کے اندر قدم رکھنے کے بعد ٹونی نے پرکنز کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ "تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

پرکنز وہیں رک گیا اور اپنے پارٹنر کی واپسی کا انتظار



## بچے
## ہمارے عہد کے

باپ بیٹے سے: "بیٹے آئندہ کوئی شرارت مت کرنا۔"

بیٹا: "کیوں ابا جان؟"

باپ: "اس لیے بیٹے کہ جب کوئی بیٹا شرارت کرتا ہے تو اس کے باپ کا ایک بال سفید ہو جاتا ہے۔"

بیٹا: "اس لیے دادا ابو کے سارے بال سفید ہو چکے ہیں۔"

☆☆☆

ایک عامل کا دعویٰ تھا کہ وہ روحوں سے ملاقات کرا دیتا ہے۔ یہ سن کر ایک چالاک بچہ اس کے پاس گیا اور اس کی فیس ادا کی اور کہا۔ "میں اپنے دادا کی روح سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

عامل اسے ایک تاریک کمرے میں لے گیا۔ وہاں پر ایک آدمی کی گونج دار آواز گونجی۔ "کیا بات ہے میرے پوتے؟"

بچے نے جواب دیا: "دادا جان آپ کی روح یہاں کیا کر رہی ہے؟ آپ کا تو ابھی انتقال بھی نہیں ہوا ہے؟"

(پشاور سے بلقیس خان ہو کی سوغات)

کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ٹونی واپس آ گیا۔

"قسمت ہمارے ساتھ ہے۔" ٹونی نے کہا۔ "وہ پہلے فلور پر رہتی ہے۔ میں نے وہ اپارٹمنٹ دیکھ لیا ہے جس میں وہ داخل ہوئی ہے۔ اب ہم اسے آسانی سے بے بس کر دیں گے۔ آؤ، اب اوپر چلتے ہیں۔"

وہ اوپر پہلی منزل پر اس دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئے جس پر 'ون سی' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

"اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟" پرکنز نے پوچھا۔ "کیا زبردستی اندر داخل ہوں گے؟" ساتھ ہی وہ دروازے کے قبضوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران ٹونی خاموش کھڑا کچھ

سوچ رہا تھا۔

"میں اس دروازے کو لات مار کر توڑ سکتا ہوں۔" پرکنز نے قدرے گھمنڈی لہجے میں کہا۔

"میرے ذہن میں ایک اور بہتر آئیڈیا ہے جس سے کسی کی بھی توجہ ہم پر مبذول نہیں ہوگی۔ ہم یہ کام ہنرمندی اور چالاکی سے سرانجام دیں گے۔ تم دروازے پر دھیان رکھو، میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

"کہاں جارہے ہو؟" پرکنز نے قدرے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"میں نے سڑک پار ایک دکان دیکھی ہے۔" ٹونی نے جواب دیا۔ "میں بس یوں گیا اور یوں آیا۔"

ٹونی یہ کہہ کر تیزی سے پلٹ گیا۔

پانچ منٹ بعد جب ٹونی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تازہ پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ تھا۔

"تم ان پھولوں کا کیا کرو گے؟" پرکنز نے حیرت سے پوچھا۔

"تم بس ایک استاد کو اپنی کارکردگی سرانجام دیتے ہوئے دیکھو۔ جب میں اپنی چال چلوں تو میں چاہتا ہوں کہ تم ایک جانب آڑ میں کھڑے رہنا۔ البتہ جب میں دروازے کے اندر قدم رکھ لوں تو تب تم بھی میرے پیچھے اندر آجانا۔ سمجھ گئے؟"

پرکنز نے قدرے ہچکچاتے ہوئے رضامندی ظاہر کر دی اور پیچھے ہٹ کر اس طرح آڑ میں کھڑا ہوگیا کہ دروازہ کھلنے پر نظر نہ آسکے۔

ٹونی نے ڈوربیل بجائی اور گلدستے کو اس طرح اپنے سامنے تھام لیا کہ پیپ ہول سے دیکھنے والے کو اس کا چہرہ نظر نہ آسکے۔

اندر سے ایک عورت کی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"ہارلیز فلاورز، میڈم۔ آپ کے لیے ایک ڈلیوری ہے۔" ٹونی نے بلند آواز سے کہا۔

"میں نے کوئی پھولوں کا آرڈر نہیں دیا۔"

"سنیے، آپ کو پھول چاہیے یا نہیں؟ اس کے کارڈ پر صرف اتنا لکھا ہوا ہے، مبارک باد۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"بہت خوب! میں ابھی آئی۔"

ٹونی دروازہ کھلنے کے انتظار میں تن کر کھڑا ہوگیا۔

جب اس کے کانوں میں لاک کی زنجیر ہٹائے جانے کی آواز سنائی دی اور پھر اس نے دروازہ کھلتے ہوئے دیکھا تو اس نے فوراً ہی اپنی گن ادھ کھلے دروازے میں اٹکا دی اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "دروازے سے پیچھے ہٹ جاؤ لیڈی۔ یہ ایک ڈکیتی کی واردات ہے۔"

اتنے میں پرکنز بھی اس کے عقب میں آگیا۔

جب ٹونی نے اپنی گن سمیت دروازے کے اندر قدم رکھا تو پرکنز بھی اپنی گن نکال چکا تھا۔ وہ دونوں آگے پیچھے اندر کمرے میں داخل ہوگئے۔

لیکن ٹونی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ عورت ہتھیار تھامے ان کا استقبال کرے گی۔ اس عورت کے ہاتھ میں ایک شاٹ گن دبی ہوئی تھی جس کی نال ٹونی کے سینے کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسے زاویے پر کھڑی ہوئی تھی کہ ٹونی اور پرکنز دونوں ہی اس کے نشانے کی زد میں تھے۔

ٹونی نے بھانپ لیا کہ اس کے پاس عورت کو زخمی کرنے یا اس پر پہلے فائر کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ یہی کیفیت پرکنز کی بھی تھی۔

"اپنے ہتھیار پھینک دو۔" عورت نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

دونوں نے اپنے ہتھیار نیچے پھینک دیے۔

ٹونی نے ناقابلِ یقین انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ "میں یقین نہیں کرسکتا۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم نے یہ شاٹ گن اپنی لاٹری کی انعامی رقم سے کل ہی خریدی ہوگی۔ ایسا ہی ہے نا؟"

تب اس عورت کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ ابھر آئی۔ "تمہاری اس بات سے یہ وضاحت ہو گئی کہ تم دونوں نے میرا گھر تک پیچھا کیوں کیا۔ میں سمجھ تو گئی تھی کہ تم لوگوں کے ارادے نیک نہیں ہیں لیکن وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔" یہ کہہ کر اس عورت نے قدرے توقف کیا پھر بولی۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے اس اخبار کا شام کا ایڈیشن نہیں دیکھا ہے نا؟"

پھر اس عورت نے قریب میں رکھا ہوا وہ اخبار اٹھایا اور اس کے ایک کونے میں حاشیے میں چھپی ہوئی خبر کی جانب اشارہ کردیا۔ ساتھ ہی اخبار ٹونی کی جانب اچھال دیا۔ حاشیہ بردار خبر یہ تھی:

"تصحیح"

آج صبح کے ایڈیشن میں پولیس آفیسر آف دی ایئر گلینڈا ریمن کی تصویر اور پاور بال لاٹری ڈرا کی ونر اسٹیلا اسمتھ کی تصویر نادانستہ طور پر ایک دوسرے کی جگہ شائع ہو گئی تھی۔ اس غلطی پر ادارہ متعلقین سے معذرت خواہ ہے۔



# دانا دشمن

مختار آزاد

کہتے ہیں کہ زندگی میں چاشنی تغیر کی بدولت ہے... ورنہ لگے بندھے معمولات اور یکسانیت ہر لمحات اسے بے رنگ و بے کیف بنادیتے ہیں... مگر عشق و محبت اور دوستی کے رشتوں میں تغیر کی گنجائش نہیں... استحکام اور مستقل مزاجی اسے دیرپا اور اثر پزیر بناتے ہیں... وہ بھی اپنے عشق میں یکتا تھا... اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی تبدیلی کے مراحل سے گزر سکتا ہے...

چارلس میر لیے ویسے تو رومانی طبیعت کا بندہ نہیں تھا لیکن جب اسے کا سابلانکا بھیجا گیا تو اس کی طبیعت میں ذرا سی تبدیلی ہوئی۔ اس کی وجہ شاید ایک یہ بھی رہی ہو کہ جس سے وہ ملنے والا تھا، وہ برسوں دور رہنے کے باوجود اس کے دل کے نہایت قریب رہی تھی۔

ویسے تو وہ بار جانے کا کبھی عادی نہیں رہا تھا مگر نہ جانے کیوں یہاں اسے شدت سے کسی بار میں جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، وہ بھی ایسا بار جو امریکی وضع قطع کا

ہو۔ اس وقت وہ کسی امریکی طرز کے بار کی تلاش میں ہی ہوٹل سے نکلا تھا۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے ایک بار تو مل گیا مگر وہ ایسا شان دار نہیں تھا کہ جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ ایک ہوٹل کی نچلی منزل پر واقع واجبی سا بار تھا۔ ذرا ہی دیر میں اس نے بار سے متعلق معلومات بھی حاصل کر لیں۔ وہ نیویارک سے آئے دو بھائیوں کی ملکیت تھا، جنھوں نے اپنا تمام سرمایہ اسے بنانے پر لگا ڈالا تھا۔ روفو کلاڈ کے قریب جس مقام پر واقع ہوٹل میں یہ بار تھا، وہ جگہ اُن بھائیوں نے کرائے پر لی تھی۔

چارلس نے جب اُس شام ڈھلے شہر کو دیکھا تو وہ نیم خوابیدہ تھا۔ حالانکہ وہ پہلے بھی کئی بار اس شہر میں آ چکا تھا مگر اس روز پہلی بار اسے کاسابلانکا کی خاموشی میں رومان محسوس ہوا۔ شاید اسی لیے وہ۔۔۔ چاہتا تھا کہ کسی شان دار سے بار میں بیٹھ کر ان حسین لمحات سے تھوڑا لطف اندوز ہو لے مگر اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ وہ اپنی اس معمولی خواہش کو پورا نہیں کر سکے گا۔

جب وہ کاسابلانکا پہنچا، تب مراکش کی معیشت بُرے دور سے گزر رہی تھی اور اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر نظر آ رہا تھا۔ ملکی کرنسی خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ برآمدات بند تھیں اور دارالحکومت میں موجود بار والے ان دونوں بھائیوں کا بزنس اُن پر کمبل کی طرح لپٹ چکا تھا۔ وہ سب کچھ بیچ باچ کر یہاں آئے تھے اور جو کچھ تھا، وہ بار پر خرچ ہو چکا۔ اگر مندی سے تنگ آ کر وہ کاروبار ختم کر کے واپس نیویارک جانا بھی چاہتے تو اُن کے پاس کچھ نہ بچتا۔ وہ تو بار کا کمبل اتارنا چاہتے تھے مگر کمبل انھیں چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

"اب تو صرف بیس جون کی تاریخ ہی یاد رہ گئی ہے۔" چارلس سے باتیں کرتے ہوئے خالی بار کے چھوٹے مالک نے کہا۔ "اس منحوس تاریخ کو ہی ہم اس شہر میں پہنچے تھے۔" یہ کہہ کر اس نے چارلس کی طرف دیکھا اور استفساریہ لہجے میں پوچھا۔ "تم نیویارک سے آئے ہو؟"

"نہیں۔" چارلس نے نفی میں سر ہلایا۔ "پیرس سے آ رہا ہوں۔" اس نے فرنچ لب و لہجے کی انگریزی میں صاف جھوٹ بولا۔

اگرچہ وہ امریکا سے ہی تھا لیکن فرنچ پر بھی اسے عبور تھا اور سچ تو یہ ہے کہ جھوٹ تو اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ وہ بچپن سے ہی جھوٹا مشہور تھا۔ دوسروں کے خیال میں یہ بُری عادت تھی مگر جب اس نے 1961ء میں انٹیلی جنس سروس جوائن کی، تب جھوٹ بولنا اس کی خاصیتوں میں شمار ہوا۔ اس وقت بھی وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ کہیں اس کی زبان سے کچھ سچ نہ پھسل جائے۔

اسی دوران میں ایک اور شخص کاؤنٹر پر آیا۔ وہ بار کا مالک تھا۔ "ڈینس ہائیڈ۔" اس نے چارلس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے داہنا ہاتھ آگے بڑھا کر اپنا تعارف کرایا۔

"خوشی ہوئی تم سے بھی مل کر۔"

"مجھے بھی۔۔۔" ڈینس نے جواب دیا۔ "نئے لگتے ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" چارلس نے سر ہلایا۔ "ذرا گھومنے پھرنے نکلا ہوں۔"

"تو میرا مشورہ گرہ سے باندھ لو۔" ڈینس نے مسکرا کر کہا۔

چارلس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کاسابلانکا شمالی افریقہ کا پیرس ہے۔" نہایت سنجیدگی سے یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا۔ چارلس اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "اگر یہ بات تم سے کوئی کہے تو اس پر ہرگز یقین نہیں کرنا۔" یہ کہہ کر وہ طنزیہ انداز میں ہنس دیا۔

"بالکل بھی نہیں کروں گا۔" چارلس نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا اور زوردار قہقہہ لگایا۔

اگرچہ شہر کے تجارتی حصے کا تعمیراتی انداز فرنچ تھا لیکن وہ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ گرد و غبار اور دیکھ بھال نہ ہونے سے شہر کا فرنچ طرزِ تعمیر اپنی کشش کب کا کھو چکا تھا۔ بار بھی شہر کے تجارتی حصے میں تھا جس کے سامنے کی بیس فٹ چوڑی سڑک ٹوٹی پھوٹی اور گرد آلود تھی۔

چند گھنٹوں پہلے جب چارلس مراکش میں داخل ہوتے وقت کسٹم کی چیکنگ سے گزر رہا تھا، تبھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس شہر کو پہلے کی طرح ہرگز پسند نہیں کرے گا۔ بیس گھنٹے پہلے کی بات ہے وہ قاہرہ میں تھا اور اب شام ڈھلے کاسابلانکا کے ان امریکیوں کے مفلوک الحال بار میں بیٹھا تھا۔ اگر وہ ٹیلی گرام اسے نہ ملتا تو وہ امریکا واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر اس کے ملنے کے بعد یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ مراکش نہ آتا۔

"تم چہرے مہرے سے فرنچ کے بجائے امریکی زیادہ لگتے ہو۔" کچھ توقف کے بعد ڈینس نے خاموشی توڑی۔ وہ اسے کافی دیر سے بدستور غور سے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔" چارلس نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"تم سڑک پر نکلے تو یہ لوگ تمھیں امریکی سمجھ کر چیزیں بیچنے کی کوشش کریں گے ڈالر کے لیے۔" ڈینس کا لہجہ ایسا تھا جیسے انکشاف کر رہا ہو۔ یہ وہ دور تھا ہپیوں کا، جن کے لیے چرس ایسی ہی لازمی چیز تھی جیسے کہ زندہ رہنے کے لیے سانس لینا



پانی پینا۔

"چرس۔۔۔" چارلس کا لہجہ استفساریہ تھا۔

"کچھ اور بھی جو تم چاہو گے اپنے امریکی ڈالر کے عوض۔" اس نے ایک آنکھ دبا کر فحش اشارہ کیا اور پھر ہنس دیا۔

چارلس نے ڈینس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ پچاس سال سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا پھر بھی اس کے چہرے پر جھریاں پڑنے لگی تھیں۔ آنکھیں نیلی اور بال گھنگھریالے تھے۔ بار کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر مکھیاں آ رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ ہلا کر گلاس پر بھنبھناتی مکھیاں اڑائیں۔ اسے مکھیاں سخت ناپسند تھیں۔ دوپہر کو اس نے تنگ پر منڈلاتی مکھیوں کو ہاتھ سے بھگا بھگا کر پریشانی کے عالم میں لنچ کیا تھا اور اب بار میں بیٹھ کر بھی وہ یہی کام کیے جا رہا تھا۔

"ایک اور بیئر دینا۔" چارلس نے بڑا سا گھونٹ لے کر گلاس خالی کیا اور ناک پہ بیٹھی مکھی کو ہاتھ سے اڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا یہاں پر قلپ کے اقتدار کا خاتمہ ہو سکتا ہے؟" ڈینس نے گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھایا اور اس انداز میں سوال کیا جیسے وہ مراکش کے حالات سدھارنے کے لیے حکومت بدلنے آیا ہو۔

"تم قلپ کو جانتے ہو؟" چارلس نے الٹا سوال کر دیا۔

"جانتا ہوں۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "لو بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ حکمرانوں کو کون نہیں جانتا۔"

"وہ قلپ نہیں۔" چارلس نے یہ سنتے ہی نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب اس قلپ سے ہے جسے بہت سارے لوگ فل کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ آوارہ گرد ہے، شوقین مزاج سا۔۔۔" اس بار چارلس نے بھی ایک آنکھ دبا کر معنی خیز اشارہ کیا۔

"فل۔۔۔" ڈینس نے جواباً نام دہرا دیا۔ لمحہ بھر کے لیے چارلس کو غور سے دیکھا اور پھر کہا۔ "ارے ہاں، کیوں نہیں، بالکل جانتا ہوں۔"

"یہاں آتا جاتا ہے وہ؟" چارلس نے پوچھا۔

"اکثر۔۔۔" ڈینس نے جواب دیا۔

"کہاں مل سکتا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کہ کم از کم اس وقت تو تم اس کی تلاش میں نہیں آئے ہو۔"

"کہاں مل سکے گا وہ؟" چارلس کا لہجہ نرم مگر ٹھوس تھا۔

"تم اسی فل کے بارے میں پوچھ رہے ہو نا، وہ سرخ بالوں اور داڑھی والا۔" ڈینس کا لہجہ وضاحت طلب تھا۔

"شاید۔۔۔"

"سڑکوں پہ گھومتے رہو کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔" ڈینس نے سر جھٹک کر جواب دیا۔ "ویسے بھی وہ صرف لڑکیوں کے چکر میں ہی کاسابلانکا آتا ہے۔"

"اوہ۔۔۔" چارلس نے آہستہ سے کہا۔ ڈینس کی بات سے وہ سمجھ گیا تھا کہ فل کو کس وقت، کس جگہ پر تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اسے لگا کہ فل کی تلاش کے لیے یہ وقت غیر مناسب نہیں ہے۔

☆☆☆

وہ تینوں اُس وقت نیم دائرے میں کھڑے تھے۔ دو لڑکیاں اور ایک مرد۔ وہ مرد فل تھا۔ پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے وہ ٹوٹی پھوٹی فرنچ میں اُن سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے چارلس کو دیکھا تو اشارے سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ فل کے سامنے کھڑی لڑکی اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کا قد پانچ فٹ سے ذرا نکلتا ہی ہوگا۔ گھنگھریالے سیاہ بال، پتلا چہرہ اور رنگت گندمی تھی۔

"یہ دس سال کی تھی، جب اس کی ماں اسے بھی دھندے میں لے آئی۔" چارلس گہری نظروں سے لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا کہ فل نے مسکراتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ "میں دو سال پہلے ایک ریجنل میٹنگ کے لیے یہاں آیا، تب اس سے ملا تھا۔"

لڑکی نے چارلس کی طرف دیکھا اور والہانہ انداز سے مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں خودسپردگی کی خواہش تھی، شاید اس کے امریکی اور ڈالر پاس ہونے کی امید میں۔

چارلس لڑکی کی مسکراہٹ سے اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ بھی مسکرا دیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس درہم نہیں ہیں۔"

"درہم نہیں تو کوئی بات نہیں، ڈالر تو ضرور ہوں گے۔" لڑکی نے جواب دیا۔ اس کے ہونٹوں پر بدستور مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

لڑکی کی بات سن کر چارلس بھی شرمندہ انداز میں ایسے مسکرایا جیسے اس کی بات سن کر اپنی خفت دور کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چارلس کی عمر چھتیس سال تھی۔ اس نے خود کو ہمیشہ بازاری عورتوں سے دور رکھا تھا۔ یہ اور بات کہ وہ جاسوسی کے پیشے میں تھا اور اکثر و بیشتر اسے حسین عورتوں سے فلرٹ کرنے کے مواقع ملتے تھے مگر وہ اس کی پیشہ ورانہ ضرورت تھی۔ جہاں تک دل کا معاملہ ہے تو اس میں ایک صورت بسی ہوئی تھی کئی برسوں سے۔

ان لڑکیوں کے لیے کسی مرد میں کشش کی سب سے بڑی وجہ اس کی جیب میں درہم ہونا تھے۔ انہیں یقین تو نہیں تھا کہ کوئی غیر ملکی ڈالر سے خالی جیب لیے کاسابلانکا کی سڑکوں پر پھر سکتا ہے لیکن جب چارلس نے بڑی ڈھٹائی سے خالی جیب کا اعلان کیا اور شرمندہ مسکراہٹ لبوں پر سجائی تو انہیں بھی یقین کرنا پڑا کہ سامنے کنگلا کھڑا ہے اور کنگلے میں انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

وہ تینوں لڑکیاں اس پر سے توجہ ہٹا کر دوبارہ فل سے باتیں کرنے لگیں۔ فل شاہانہ انداز میں سگار کے کش لے کر دھواں اُن لڑکیوں کے چہروں پر چھوڑ رہا تھا۔

جس سے چارلس کی بات ہوئی، وہی ایک اُن میں کم عمر تھی۔ دوسری اُس سے خاصی بڑی لگ رہی تھی۔ کتنی بڑی، یہ وہ ٹھیک سے نہیں بتا سکتا تھا۔ اگرچہ اس نے سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے عمر گزار دی تھی مگر وہ ٹھیک سے یہ ہرگز نہیں بتا سکتا تھا کہ میک اپ کی دبیز تہ اور باریک نقاب کے پیچھے پوشیدہ چہرہ عمر میں کتنا بڑا ہوگا۔

اسی دوران میں چھوٹے قد اور گھنے بھورے بالوں ایک اور لڑکی وہاں آ گئی۔ حلیے سے وہ خاصی فیشن زدہ مگر پُروقار نظر آ رہی تھی۔ وہ کسی فلمی اداکارہ کی طرح نظر آ رہی تھی۔ ویسے بھی اس کے بقول وہ فلم سازی کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ وہ ڈھلتی سہ پہر تھی۔ چارلس کو محسوس ہوا کہ اس کی گردن دھوپ سے تپ رہی ہے۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کر کے کھولیں تو فل اُس لڑکی کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے چارلس کو دیکھا تو کہنے لگا۔

”میں نے اسے چار مہینے پہلے رقم دی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک آنکھ میچ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

”تم اس کے لیے کوئی فلم کیوں نہیں پروڈیوس کرتے؟“ چارلس نے لمحہ بھر توقف کیا اور فل کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم ان سب کا خیال رکھو، مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے گردن موڑی اور سڑک کنارے واقع دکانوں کی طرف دیکھا جیسے کسی ریستوران کی تلاش میں ہو جہاں وہ کچھ کھا پی سکے۔

”سنو... تم میرے لیے فلم پروڈیوس کر سکتے ہو۔“ چارلس کی بات سن کر کچھ دیر سوچنے کے بعد اس لڑکی نے سگار کا دھواں منہ اور ناک سے باہر نکالنے والے فل کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”تم ان باتوں کی فکر کرو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ چارلس نے یہ سن کر فل کو مخاطب کر کے کہا۔

”میں ان سب کا خیال رکھ سکتا ہوں۔“ فل نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ لڑکی چارلس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تم بھی اپنی ان ساتھیوں کی طرح سڑک پر پناہ تلاش کر سکتی ہو مگر تم تو بڑے بڑے سپنے دیکھتی ہو۔“ چارلس نے اس لڑکی کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ وہ خاموشی سے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی بات سن رہی تھی۔

”خیر چھوڑو یہ بات...“ کچھ توقف کے بعد چارلس نے کہا۔ ”ویسے میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی نظریں لڑکی پر گاڑ دیں۔ وہ بھی اسے مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں گھورے جا رہی تھی۔

”تم نے اپنے ٹیلی گرام میں کہا تھا کہ تمہارے پاس کچھ خاص اور قیمتی شے ہے۔“ چارلس نے فل کی طرف منہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”اور تم ٹیلی گرام ملتے ہی قاہرہ سے دوڑے دوڑے یہاں چلے آئے۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ تم نے سچ ہی لکھا ہوگا۔“ چارلس بھی مسکرا دیا۔ ”ویسے وہ کیا ہے؟“

”ایک لاش ہے۔“

”ایک لاش...“ چارلس نے زیرِ لب کہا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ ”مگر میں کیوں ایک لاش دیکھنا چاہوں گا؟“

”اس کا نام جان لیرکن ہے۔“ فل نے مسکرا کر جواب دیا اور کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔ ”اب مجھے یقین ہے کہ اسے دیکھنے میں تمہاری دلچسپی پیدا ہوگی۔“

”شاید... ایسا ہو سکتا ہے۔“ چارلس نے سامنے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

فل چار جیس بلاک فائیو کے ایک کمرے کے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس وقت چارلس اس کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ باہر رات کی تاریکی پھیلنا شروع ہو چکی تھی۔ فل نے چائے بنائی اور مگ چارلس کے سامنے رکھ کر کھڑکی کے پٹ بند کیے۔ وہ آتش دان کے قریب، چارلس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جان لیرکن چند روز پہلے کھلے سمندر میں سفر کے دوران انتقال کر گیا ہے۔“ کچھ توقف کے بعد فل نے سنجیدگی سے بات شروع کی۔ ”اس کی بیوی کا کہنا ہے کہ ہوانا کی بندرگاہ سے روانگی کے چند روز بعد ہی اس کی موت ہو گئی تھی۔“ یہ کہہ کر اس نے چارلس کی طرف دیکھا۔ وہ خاموشی سے چائے پیتا



ہوا اس کی بات سن رہا تھا۔

”تمہیں اس کی بیوی تو یاد ہوگی۔ وہی جرمن رقاصہ...“ چارلس نے یہ سن کر چائے کا گھونٹ لیا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

”اس کا نام یاد ہے جولیا ہیمسن...“ فل نے کہا۔

اس بار چارلس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے یاد تھا کہ کچھ برس پہلے جب جولیا کی جان سے ملاقات ہوئی تھی تب وہ ایک جرمن ڈانس کمپنی کے ساتھ منسلک تھی۔ اس کے چند ماہ بعد ہی جان کو سی آئی اے سے علیحدہ کر کے شمالی امریکا میں واقع ایک اڈے پر بھیج دیا گیا تھا مگر وہاں اس نے اپنے راز فاش کرنا شروع کر دیے۔ چارلس کو حیرانی تھی کہ اگر وہ جان بوجھ کر یہ سب کچھ کر رہا تھا تو کس مقصد کے لیے۔ کیا اس کے پیچھے جان کا کوئی بڑا مقصد تھا۔ یہ بات اسے سمجھ نہیں آ سکی تھی یا پھر اس نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر اسے یقین تھا کہ جان کے بُرے دن شروع ہو چکے ہیں۔ اس سے زیادہ وہ کچھ اور سوچنا سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

”گو کہ اس کی موت کھلے سمندر میں ہوئی تھی مگر پھر بھی اس کی لاش کو سمندر برد نہیں کیا گیا۔“ اسے خاموش دیکھ کر کچھ توقف کے بعد فل نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”اس بات کا علم جولیا کو بھی نہیں تھا کہ اس کی حالت ایسی تھی کہ یوں اچانک دنیا چھوڑ جائے گا۔“

”یہ سب کچھ تمہارے علم میں کس طرح آیا؟“ چارلس نے تشنج کلامی کی۔

”جولیا نے مجھے وائرلیس پر پیغام بھیجا تھا۔ ہم اب تک اچھے دوست ہیں۔“ فل نے جواب دیا۔

جب جان کو سی آئی اے سے نکالا گیا، تب فل ایک امریکی خبر رساں ادارے کے لیے بطور رپورٹر کام کر رہا تھا، البتہ وہ معاوضے پر سی آئی اے کے لیے بھی چھوٹی موٹی خدمات سرانجام دیا کرتا تھا۔ اس نے جان سے رابطہ کر کے اس کا ایک انٹرویو بھی کیا تھا۔ وہ جان کے نظریات سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اپنے ان نظریات کی بدولت وہ سی آئی اے کے مخالف حلقوں میں خاصی پسندیدگی اور اہمیت اختیار کر سکتا ہے۔

”کیا تمہیں جولیا نے کہا تھا کہ ہمیں یہ اطلاع فروخت کر دو؟“ چارلس نے فل کی طرف دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

فل نے جواب دینے کے بجائے برابر کی میز پر رکھا سگار اٹھایا اور اسے بے فکری سے سلگا کر گہرا کش لیا اور پھر دھواں خارج کرتے ہوئے چارلس کو غور سے دیکھا۔ ”یہ بات صرف تمہارے اور میرے درمیان رہے گی... ٹھیک ہے؟“ اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

”یقیناً...“

”مجھے یقین ہے کہ اب تم اس سے ملنا چاہو گے خاص کر جان کی موت کے بعد۔“

چارلس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں تمہیں اس سے ملوا سکتا ہوں اور وہ بھی بہت جلد۔“

”واقعی...“ چارلس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”وہ تمہیں نہیں جانتی۔ اس لیے اب تم بھی میری طرح کے ایک صحافی ہو۔“ فل نے کہا۔

”اگر تم بُرا نہ مانو تو کیا میں کھڑکی کھول دوں؟“ چارلس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ فل کے سگار پینے کے باعث کمرے میں کافی دھواں بھر چکا تھا۔

”بالکل... کیوں نہیں، تم کھڑکی کھول سکتے ہو۔“ فل نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔

چارلس نے آگے بڑھ کر بالکونی میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھول دیے اور وہیں کھڑا ہو کر گہری سانسیں لینے لگا۔

وہ پتھر پر تراشیدہ نقوش والی بہت خوبصورت بالکونی تھی۔ اس کا اندازِ تعمیر قدیم فرنچ عمارتوں جیسا تھا۔ یہاں سے پرانے شہر کی مرکزی سڑک بھی صاف نظر آ رہی تھی، جہاں شام کے اس وقت ہجوم کم تھا اور دھول مٹی بیٹھ چکی تھی۔ باہر کی ہوا کمرے کے اندر کے درجۂ حرارت کی نسبت زیادہ بہتر تھی مگر فل کے سگار کے دھوئیں سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ ایسے میں اسے اپنے پھیپھڑوں کو تر و تازہ کرنے کے لیے اسی ہلکی سی خنک ہوا کا سہارا لینا غنیمت لگا تھا۔

فل طوائفوں کا دلدادہ اور سگار کا رسیا تھا۔ گو کہ چارلس بھی دودھ کا دھلا نہیں تھا مگر وہ اس کی طرح اتنا زیادہ وحشی بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ سوچ رہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ دونوں آخر ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

☆☆☆

جان لیرکن سے متعلق لوگوں کی رائے مختلف تھی۔ خاص کر اُن لوگوں کی جو اس کے ساتھ فیلڈ میں کام کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بہت زیادہ جذباتی اور تنک مزاج شخص تھا۔ ایجنسی میں وہ دوسرے نام سے جانا جاتا تھا اس لیے لوگوں کی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

بات یہ ہے کہ جب اس نے ایجنسی سے علیحدگی کے بعد پہلی بار سینٹرل امریکا میں مارچ کے حوالے سے انٹرویو دیا تھا،

تب اس نے جان لیرکن نام استعمال کیا۔ اس کے بعد لوگ اُسے اسی نام سے پہچاننے لگے۔ وہ لوگوں میں سابق امریکی میرین اور سی آئی اے کے ایسے سابق افسر کے طور پر مشہور ہو گیا تھا جو کسی بات پر اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لوگوں کو اس کے سابق ادارے کی غیر انسانی حرکتوں کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے۔

سی آئی اے چاہتی تو ایسا کر سکتی تھی مگر اس نے اس کے خلاف کوئی خاص کارروائی نہیں کی البتہ اس پر کڑی نظر ضرور رکھی جا رہی تھی، وہ بھی چارلس کی بھیجی جانے والی رپورٹوں کے سبب، ورنہ ایجنسی کو اس کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ تقریباً دو سالوں تک یورپی ممالک میں در بدر پھرنے کے بعد آخر جان نے کیوبا میں خود کو حکام کے حوالے کر دیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ خود حوالگی سے بھی بہت پہلے سے، وہیں رہ رہا تھا۔ ویسے بھی امریکا مخالف کیوبا میں اسے سہولتیں ملنے کا زیادہ روشن امکان تھا۔ اس سے سی آئی اے کی بھی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ وہ بھی جان کے حوالے سے چارلس کے پیش کردہ خطرات اور اندیشوں کو درست سمجھنے لگے تھے۔

چارلس کو اس بات پر یقین نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے بعض دعوے حقیقت پر مبنی نہیں تھے۔ لاطینی امریکا کے فوجی آمروں کو ٹارچر کے طریقے سی آئی اے سے سیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح کا کام ان کے بغیر نہیں کیا جا سکتا مگر ساتھ ہی وہ سوچتا کہ ایسا تو ان کی مدد کے بغیر بھی کیا جا چکا ہے۔

جہاں تک کیوبا کے کامریڈوں کا تعلق تھا تو وہ سوچتا تھا کہ کیا واقعی ٹارچر کے معاملے میں ان کے ہاتھ صاف تھے یا پھر وہ صرف یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ کسی ترقی پسندانہ مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔

"ہم چاہتے ہیں کہ ایمسٹرڈیم میں کچھ لوگوں کو تعینات کیا جائے۔" فل نے کہا۔ "تم تو جانتے ہو کہ اس معاملے میں حلیہ کتنا اہمیت رکھتا ہے۔ جولیا چاہتی ہے کہ یہ کام میں کروں۔ ہم دونوں وہاں دوست تھے اور لوگوں میں بھی بہت آزاد خیال کے طور پر مشہور تھے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" چارلس نے جواب دیا۔ وہاں اسے روک ٹوک کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہاں ایسا کوئی نہیں تھا جو اس کی حیثیت کو نقصان پہنچا سکتا۔ "مجھے یہ بتاؤ آخر یہ کس کی خواہش پر کیا جا رہا ہے؟" اس نے تقریباً گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ڈونی سمسن، وہ جان کے بہت قریب تھا۔" چارلس کی بات سن کر فل نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "شاید اسی لیے اس کی میت کو امریکا میں دفن کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔"

"کیا تمہیں اس پر یقین بھی ہے یا بس یہ تمہارا اندازہ ہے۔" چارلس نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ جواب میں خاموشی تھی۔ اس وقت فل، چارلس کے ساتھ ہوٹل کے سامنے سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔ اس... چارلس کی نظر زینے پر چلی گئی۔ ایک بہت موٹا آدمی سیڑھیاں چڑھتا ہوا ہوٹل میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بچہ تھا جس کی عمر بمشکل دس برس ہو گی۔ اس نے مراکشی مردوں کا روایتی جبہ پہن رکھا تھا۔

چارلس اس وقت خاصا تھکا ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ سڑک پر چہل قدمی کر کے خود کو تھوڑا سا پُرسکون کر لے اور جو باتیں جاننا چاہتا تھا، وہ بھی فل سے پوچھ لے۔ اسی لیے وہ فل کے فلیٹ پر چائے پینے کے بعد اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا تھا۔

سڑک پر گھوم پھر کر خود کو تر و تازہ کر لینا ناممکن تھا۔ گرد آلود سڑک کے کنارے گھومتے پھرتے خاکی سوٹ اور چمکدار جوتوں میں ملبوس چارلس کو دیکھ کر وہاں منڈلاتے آوارہ لڑکوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ امریکی نہیں تو تب بھی غیر ملکی ضرور ہے۔ وہ بار بار اس کے آگے ڈالر کی بھیک کے لیے ہاتھ پھیلا رہے تھے۔ اس کے اوپر یہ عذاب کہ ان لڑکیوں کے دلالوں کی بڑی تعداد بھی اس کے ارد گرد شکار پر جھپٹنے والے عقابوں کی طرح گھوم رہی تھی، جن کا شوقین فل تھا۔

آخر ایک شخص نے چارلس کے قریب پہنچ کر پہل کر دی۔ "کیا تم امریکا سے آئے ہو؟" اس نے قریب پہنچ کر اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر ہی بتانے لگا۔ "میرا ایک کزن بھی امریکا میں رہتا ہے۔ وہ نیویارک میں کام کرتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک آنکھ دبا کر فحش اشارہ کیا۔ "تمہیں کچھ چاہیے؟"

اس وقت فل اور وہ جس علاقے میں تھے، وہ نئے شہر کا ایک تجارتی حصہ تھا۔ چارلس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ قریب سے جاتی ایک ٹیکسی روکی اور اسے ساتھ لے کر بندرگاہ کے قریب واقع اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔ وہ مراکش انٹیلی جنس کا ایک افسر تھا۔

انٹیلی جنس کے اس افسر کے ساتھ چارلس کی ملاقات رات آٹھ بجے تک ختم نہیں ہو پائی تھی۔ وہ اسے ایک اچھے ہوٹل میں ڈنر کرانے کا خواہشمند تھا۔ وہ چارلس کو جس ہوٹل میں لے جانا چاہتا تھا، اس کی وجۂ شہرت اس کے بقول شان دار





ڈنر تھی۔ یہ ذکر اس نے جتنی بار کیا، اتنی ہی بار زبان اپنے ہونٹوں پر پھیری تھی۔

وہ بھاری جسم اور لمبے قد کا نہایت شاطر بندہ لگ رہا ہے۔ یہی کوئی پچاس کے قریب اس کی عمر تھی۔ اگرچہ اس وقت وہ وردی میں نہیں تھا مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سے پھرتی اور ہر...تھی۔ ...کی آنکھیں نہایت محتاط انداز میں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ اس کے طور طریقوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ فوج سے تعلق رکھتا ہے۔ شاید وہ چارلس کو بطور امریکی یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ جس سے وہ مل رہا ہے، وہ بھی کچھ کم حیثیت والا نہیں۔ ...طرح تو یہی نظر آ رہا تھا کہ جیسے یہ اس کی توقع ہو کہ مراکشی ہونے کے باوجود وہ امریکی پر اپنی بالادستی ثابت کرنے کا خواہاں تھا۔

اس وقت وہ چارلس سے اس طرح محوِ گفتگو تھا جیسے دونوں بہت پرانے دوست ہوں اور ایک دوسرے کو نہایت قریب سے جانتے ہیں۔ یہ اور بات کہ اس سے پہلے شاید اس نے اپنی زندگی میں اس کا نام بھی نہیں سنا ہو گا۔ وہ اس طرح گفتگو کر رہا تھا کہ کوئی دوسرا سنے تو یہی سمجھے کہ دونوں کمیونزم کے خلاف لڑائی کے دنوں میں ساتھ رہے ہوں گے۔

چارلس جانتا تھا کہ مراکش امریکا کے سرمایہ دار نظام میں رہنا چاہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی شاہ حسن دوم ماسکو کے ساتھ کمیونزم فلرٹ میں بھی جتا تھا مگر اس کے باوجود دونوں اچھی طرح یہ بات جانتے تھے کہ کس کے مفادات کس کے ساتھ ہیں۔ چارلس بھی جانتا تھا کہ سی آئی اے ہی ہے جو اندرونی مسائل سے نمٹنے کے لیے انہیں سیکورٹی تربیت دے سکتی ہے۔ خود شاہ کو بھی اپنے اس مفادات کا اچھی طرح علم تھا۔

"تو جان لیرکن اِن لوگوں سے متعلق کیا کہتا تھا؟" اس نے کافی دیر تک ادھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بعد سرسری لہجے میں سوال کیا مگر اس کا جواب سن کر وہ حیران رہ گیا۔

"وہ چاہتا تھا کہ ہمیں بدو قبائلیوں کی بغاوت سے نمٹنے کے لیے تشدد کے طریقوں کی تربیت دے، اور اسی مقصد کے سپ میٹنگ کی غرض سے وہ یہاں پہنچنے والا تھا کہ مگر..."

اس سے پہلے کہ چارلس اس موضوع پر کچھ اور بات کرتا، کھانا آ گیا۔ کھانا دیکھ کر تو چارلس بھی سب کچھ بھول گیا۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔

وہ شخص بڑے انہماک سے کھانا کھانے اور مشروب پینے میں مشغول رہا۔ اس وقت اس کا منہ باتوں کے لیے بند اور صرف کھانے کے لیے کھل رہا اور چل رہا تھا۔ ویسے بھی چارلس اب تک مطلب کی تقریباً تمام باتیں سن چکا تھا۔ ڈھلتی رات میں اس کی کوئی اور مصروفیت منتظر نہیں تھی ماسوائے ڈنر کے، سو دونوں پوری دلچسپی سے اپنا کام کرتے رہے۔

"فی الحال تو میں تمہیں ایک نام دے رہا ہوں، اس سے رابطہ کر لینا۔" کھانے سے فراغت کے بعد ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے چارلس نے اس کی طرف ایک چٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ضرورت پڑی تو مزید لوگوں کا بھی بتا دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف ایسے نظر دوڑائی جیسے ٹیکسی یا کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو مگر وہاں ان سے لاتعلق، اور کافی فاصلے پر صرف دو چار ہی لوگ کھڑے یا آ جا رہے تھے۔ اس نے پھر مراکشی کی طرف دیکھا۔ "اگر ایمسٹرڈیم سے جان کے کچھ دوست آئیں تو انہیں اگلے پلان تک روکے رکھنا ہو گا۔"

اس نے سرگوشی میں یہ بات کہہ کر قدم آگے بڑھا دیے۔ مراکشی افسر وہیں کھڑا چوکنی نظروں سے، آنکھیں گھما گھما کر چاروں طرف مشکوک انداز سے دیکھنے لگا۔

☆☆☆

ہوانا سے مراکش کی بندرگاہ پہنچنے والا بحری جہاز مسافروں کو پہنچانے کے ساتھ ساتھ مال برداری کا کام بھی کرتا تھا۔ جہاز اندھیرا ہونے پر کاسابلانکا پہنچا تھا۔ سب سے پہلے مقامی کسٹم کے اہلکار جہاز پر پہنچے اور ضابطے کی کارروائی کے بعد مسافر اترنا شروع ہوئے۔ اس کے بعد ہی اس پر لدا سامان باہر نکالنے کا سلسلہ شروع ہوا جو آدھی رات تک جاری رہا۔

بندرگاہ سے باہر نکلنے والے راستے پر اندھیرے میں ایک سیڈان کار کھڑی تھی۔ جس میں چارلس اور فل بیٹھے سامان نکلنے کا سلسلہ ختم ہونے کے منتظر تھے۔ جیسے ہی آخری ٹرک باہر نکلا، اس کے بعد سناٹا مزید گہرا ہو گیا۔ اُن دونوں کے لیے یہی درست وقت تھا جہاز پر پہنچنے کا۔ وہ دونوں کار سے اترے اور آگے بڑھنے لگے۔

جولیا جہاز کے مسافروں والے حصے میں بنے لاؤنج میں ان کی منتظر تھی۔ جب وہ پہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر مسکرا دی۔ فل آگے بڑھا اور وہ دونوں پرانے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ "ڈونی تو اب تک ائرپورٹ پر پھنسا تمہیں ڈھونڈ رہا ہو گا، تم یہاں پہنچ گئیں۔"

"چھوڑو یہ بات، تم سناؤ، کیسے ہو؟" جولیا نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔"

"مجھے تو خود کو سنبھالنے میں ہی نو دن لگ گئے۔" اس نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"جان تو فرشتوں کے ساتھ گزارا کر رہا ہوگا۔" فل نے کہا۔ "آخر ہوا کیا تھا اسے؟" یہ کہتے ہوئے اس کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"اس کا دل..." جولیا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

یہ سن کر فل نے چارلس کی طرف دیکھا جو اس سے ایک قدم کے فاصلے پر خاموش کھڑا ان دونوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے پھر چہرہ گھما کر جولیا کو دیکھا اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد کہنے لگا۔ "یہاں تو سب یہ بات کہہ رہے ہیں کہ وہ ایمسٹرڈیم میں ہے، جہاں اسے مشتبہ شخص کے طور پر دیکھا جا رہا ہے، کیا یہ ایجنسی کا کوئی چکر چل رہا ہے؟" یہ کہہ کر پھر وہ خاموش ہوا اور کچھ دیر بعد کہنے لگا۔ "افسوس کہ وہ مرتے دم تک معاملات ٹھیک نہیں کر سکا تھا۔"

"نہیں فل..." جولیا نے تڑپ کر کہا۔ "یہ تو اس کا دل ہے جو..." ایک بار پھر جولیا نے مبہم جواب دیا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ "وہ وقت سے آگے نکل گیا ہے۔ شاید وہ یہ بات جان چکا تھا کہ یہ بہت سخت کام ہے اور وہ اسے نہیں کر سکتا۔"

"ہم میں ایسے بہت سارے ہیں جو جان کی طرح چھوڑ کر جانے کو تیار ہیں مگر..." یہ کہتے ہوئے فل کا چہرہ ہلکا سا سرخ ہو... اس کی آواز میں بھی لرزش نمایاں تھی۔ "کیا عمر تھی اس کی ابھی۔" اس نے نہایت افسردگی سے کہا۔

چارلس یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ اسے نہ جانتا ہوتا تو شاید یہی خیال کرتا کہ اس وقت وہ اندرونی طور پر کسی جذباتی صدمے کو سہنے کی کوشش کر رہا ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ جولیا کے درد کو اپنا درد ظاہر کرنے کی کوشش کر کے اس کے دل میں مزید جگہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ اس نے لاؤنج پر چھائی ہوئی خاموشی کو توڑا اور چارلس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے جولیا سے کہنے لگا۔ "ان سے ملو یہ ہیں مسٹر جم..." یہ سن کر چارلس اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس کے پاسپورٹ پر یہی نام لکھا تھا۔ "جم روزنامہ مانیٹر کے لیے پارٹ ٹائم رپورٹر ہیں۔ یہ تمہارے شوہر کی کتاب پر کام کے لیے تیار ہیں۔"

یہ سن کر جولیا نے ایک چھوٹا قدم آگے بڑھایا اور چارلس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ "تو کیا تم جم ہو..." اس کے لہجے سے یہ بات ظاہر نہیں ہو رہی تھی کہ وہ تصدیق کرنا چاہ رہی تھی،

حیرت کا اظہار تھا یا پھر واقعی وہ اس سے مل کر خوش ہوئی تھی۔

"جی ہاں... بالکل، میں وہی ہوں جیسا کہ آپ نے سنا۔" چارلس نے مہذب انداز میں خوش دلی سے جواب دیا۔ "ویسے میں سمجھتا ہوں کہ ان کے لیے سی آئی اے کے ان ایجنٹوں کو ایکسپوز کرنا بہت مشکل کام رہا ہوگا، جن کے ساتھ وہ ملازمت کے دوران کام کرتے رہے یا پھر دوران ان سے متعارف ہوئے تھے۔"

یہ سن کر جولیا نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ "ٹھیک کہہ رہے ہو مگر یہ ضروری تھا۔"

"لیکن کس کام کے لیے اس گروہ چاہیے، کیا ان میں اتنی ہمت تھی؟" چارلس نے ہمدردانہ لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں... وہ بہت ہمت والا شخص تھا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی اور غور سے چارلس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس وقت لاؤنج نیم تاریک تھا مگر چارلس اس کے دل و دماغ میں چلنے والی فلم کو اپنے تخیل کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس وقت جولیا کیا سوچ رہی ہوگی۔

"تم نہیں سمجھ سکتے کہ اس معاملے میں پڑنے کی وجہ سے ہماری زندگی کتنی مشکلات کا شکار رہی ہے۔" اس نے لاؤنج کی کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم اور افسردہ لہجے میں کہا۔ یہ کہنے کے بعد وہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہی اور پھر فل کی طرف مڑی۔ "میں نے جہاز کے چیف پرسر سے بات کی ہے۔ امید ہے کہ آج رات کسی وقت وہ تم سے مل کر تفصیل سے بات چیت کر لے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سارے انتظامات کو اچھی طرح دیکھ بھال کے فائنل کر لو۔ جان امریکا میں ہی دفن ہونا پسند کرے گا۔ ہم اس کے ساتھ ہی واپس جائیں گے۔"

یہ سن کر فل نے منہ کھولا۔ "میں اس سے خود ہی جا کر مل لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے تھوڑا سا توقف کیا۔ "اب تم کیا کرو گی؟ کیا ایک بار پھر تم ڈالسنگ کی طرف پلٹ جاؤ گی؟"

"شاید نہیں... اس سے پہلے مجھے جان کے ادھورے مشن کو پورا کرنا ہے۔" اس نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "ایک مرتبہ ذرا یہ معاملات ٹھیک ہو جائیں تو میں ایمسٹرڈیم واپس جاؤں گی۔ پھر دیکھوں گی کہ آیا اب بھی ادارے میں میرے لیے کوئی جگہ باقی بچی ہے یا نہیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ تمہارے لیے اب بھی وہاں کوئی نہ کوئی جگہ ضرور ہوگی، نہیں تو جگہ بنائی بھی جا سکتی ہے۔" فل نے امید بھرے لہجے میں اس کی ہمت بڑھانے کے لیے کہا۔



بہو در بچہ۔" اس نے فل کی طرف دیکھ کر استفسار یہ لہجے میں کہا۔ اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ جولیا کی بات سنتے ہی فل نے جلدی سے سرگوشی میں کہا۔ "تم تو اپنے شوہر کے کام کو جانتی ہی ہو، دوسروں سے بہت کام کرتا تھا۔ بس... وہ تو نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا۔ "مجھے یقین ہے کہ اگر تم دوبارہ وہاں گئیں تو وہ دونی تمہیں اسٹیشن انچارج بنا دے گا۔"

"یہ ہو تو میں بھی اپنی ساری صلاحیتیں استعمال کروں گی اچھا کام دکھانے کے لیے۔" یہ کہہ کر وہ اداس انداز میں مسکرائی۔

☆☆☆

کچھ دیر تک لاؤنج میں وہ ساتھ ہی رہے مگر پھر فل چیف پرسر سے ملاقات کا کہہ کر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد جولیا صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں پر سوجن تھی جیسے کہ وہ زیادہ تر جاگتی رہی ہو۔ "ہاں تو چارلس تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

چارلس اس کے سامنے والے صوفے پر خاموش بیٹھا تھا۔ جولیا کا لہجہ شکستہ تھا اور جس انداز میں اس نے یہ بات کی، اس سے تو یہی لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی کام کہنے سے پہلے جاننا چاہتی ہو کہ وہ اس کی ذات کے لیے کس حد تک آگے جا سکتا ہے۔

چارلس نے کوئی جواب نہیں۔ اسے خاموش دیکھ کر ایک بار پھر اس نے بات شروع کی۔ "ویسے چارلس... کیا تمہارے پاس میرے لیے کچھ ہے۔"

یہ سن کر وہ حسب عادت خاموش رہا اور پھر گمبھیر لہجے میں کہنے لگا۔ "اگر یہی بات میں تم سے کہوں تو کیا جواب ہوگا تمہارا۔"

"ہاں میں۔" وہ مسکرا دی۔

"تو وہ کیا ہے؟" چارلس نے پوچھا۔

"راستے میں ہماری ملاقات دو روسیوں سے ہوئی تھی۔ جنہوں نے یورپ میں جان کی روپوشی کے دوران مدد کی تھی۔ مجھے ان دونوں کے نام بھی معلوم ہیں۔"

"شاباش اچھی لڑکی..." یہ سنتے ہی چارلس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم نے ان سے مدد کا نہیں پوچھا۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں تمہاری مدد کی ضرورت ہو۔ ممکن ہے کہ اب وہ سی آئی اے سے نکلنا چاہتے ہوں؟"

"کیسا ہوگی انہیں ہماری مدد کی ضرورت۔" اس نے جواب دیا۔ "ویسے بھی انہیں کیا پتا ہوگا کہ ہم دونوں یوں مل سکتے ہیں۔ ان سے تو جان بھی آٹھ سال پہلے ہی ملا تھا۔"

"واقعی..." چارلس نے سر ہلایا۔ "اتنے ہی سال پہلے ہم بھی ملے تھے۔ بہت وقت گزر چکا۔ اس دوران پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔" ایسا لگا کہ جیسے ماضی اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا ہو۔

"تم جان کو نہیں جانتے تھے۔" وہ مسکرائی۔ "تمام تر باتوں کے باوجود میں اس سے بے انتہا پیار کرتی تھی۔"

اگرچہ وہاں ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں تھا مگر پھر بھی وہ سرگوشیوں میں نہایت رازدارانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ جولیا سے چارلس کا تعارف کرانے والا فل اگر انہیں گفتگو کرتا دیکھ بھی لے، تب بھی کم از کم یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ دونوں پہلے سے ہی ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

"میں تمہیں بحری راستے سے یہاں تک تو نہایت آرام سے لے آیا ہوں۔ کل تم اور میں نیویارک میں ہوں گے۔ وہ تمہارے لیے محفوظ جگہ ہوگی۔" چارلس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

یہ سن کر اس نے نہایت غور سے اسے دیکھا۔ "مجھے یہاں سے ریسکیو کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس کا لہجہ سخت تھا۔ "میں وہیں ہوں جہاں پر میں ہونا چاہتی تھی۔"

یہ سن کر چارلس کے چہرے کے تاثرات یک لخت بدل گئے۔ اس کے چہرے پر ناگواری چھا چکی تھی اور پیشانی پر بل پڑ رہے تھے۔ جولیا نے بھی یہ بات بھانپ لی۔ اگلے ہی لمحے اس کے لہجے کی سختی نرمی میں بدل چکی تھی۔ شاید اسے وقت کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔

"چارلس... میرے پیارے سمجھنے کی کوشش کرو۔" وہ اس کے مزید قریب ہوتے ہوئے لگاوٹ بھرے لہجے میں بولی۔ "میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں وہیں پر ہوں جہاں پر تم مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ ہوانا اور ایمسٹرڈیم، دونوں تک میری یکساں رسائی ہے۔ وہاں پر تمہارے لیے بہت اچھے اور موافق حالات ہیں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی اور پھر کہنے لگی۔ "تم ان مواقعوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔" اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس کی بہت بڑی خیرخواہ ہو۔

وہ خاموش ہوئی تو چارلس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ دراصل اس وقت وہ اپنی خفت مٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں سمجھ سکتا ہوں تم کیا کہنے کی کوشش کر رہی ہو۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے جولیا کی طرف دیکھے بنا کہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ گزشتہ دو دن میں وہ دو

مرتبہ بے وقوف بنایا جا چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شکر ہے کہ اس سے فل کی تلاش کے دوران سڑک پر ملنے والی لڑکی سے علیک سلیک نہیں بڑھ گئی ورنہ دو دن میں تیسری بار بے وقوف بن چکا ہوتا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ لڑکی بھی اسے احمق سمجھ چکی تھی، تبھی اس کے گلے پڑی جا رہی تھی۔

اس نے گہرا سانس لیا اور خاموشی سے اٹھ کر لاؤنج کی کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ جولیا خاموشی سے بیٹھی نیم تاریک ماحول میں اسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس وقت اس کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے۔

☆☆☆

اس وقت چارلس بحری جہاز پر جولیا سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ تابوت کے قریب اداس کھڑی تھی۔ اسی دوران فل بھی پہنچ گیا۔ اس نے دو تھیلے اٹھائے ہوئے تھے۔ اس کی بغل میں کاغذات کا ایک پلندہ تھا۔

چارلس جانتا تھا کہ وہ بھی جولیا پر فریفتہ تھا اور اس وقت بھی وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح اسے گپ شپ لگانے کا موقع مل جاتا۔ وہ اپنے ساتھ تھیلے میں بیئر کی کچھ بوتلیں لے کر آیا تھا۔ اس نے جولیا کو بازو سے پکڑا اور قریب رکھی میز کی طرف بڑھا۔ اس نے سامان میز پر رکھا اور تھیلا کھول کر بوتلیں نکالیں۔ اگرچہ وہ دور سے اس کی حرکتیں تاڑ رہا تھا مگر اب اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ بے پروائی سے اپنے آپ میں مگن کھڑا رہا۔ فل نے اسے بھی رسماً ایک بار ہی قریب آنے کا اشارہ کیا تھا مگر اس نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ ہلا کر منع کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ دونوں مشروب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ فل کی آواز تھوڑی بلند تھی مگر جولیا بدستور مغموم دکھائی دے رہی تھی۔ وہ نہایت دھیمے لہجے میں بول رہی تھی۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر ہی جان کا تابوت رکھا تھا۔

کچھ دیر بعد انہیں ائرپورٹ پہنچنے کے لیے ایمبولینس اور پرائیویٹ کار بھی پہنچ گئی۔ جولیا فل کے ساتھ ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوگئی۔ انہوں نے چارلس کو بھی ساتھ چلنے کو کہا مگر اس نے منع کر دیا۔ ویسے اس نے تمام انتظامات کر دیے تھے۔ ائرپورٹ پر اپنی پہچان والے سیکورٹی حکام کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ جولیا کو باحفاظت اور احترام کے ساتھ جہاز تک بھیجا جائے۔ ساتھ ہی تابوت کو بھی کھولنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اسے یقین تھا کہ کم از کم جہاز پر سوار ہونے تک تو اسے کوئی مسئلہ درپیش نہیں آئے گا۔ تابوت اور ان دونوں کی روانگی کے بعد وہ بھی جہاز سے اتر کر بندرگاہ پہنچا اور ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کو چل دیا۔

جولیا کو گئے دو دن گزر چکے تھے۔ چارلس اس وقت بلانکا کی نہایت گرد آلود سڑک کے کنارے موجود بھائیوں کے گھٹیا سے بار میں بیٹھا مے نوشی میں مشغول تھا۔ فل بھی وہاں پہنچ گیا۔ اسے وہاں دیکھ کر فل کو بہت حیرت ہوئی۔ اس نے کاؤنٹر سے ایک بیئر لی اور چارلس کی میز پر آ گیا۔ فل نے کرسی کھینچی، تب چارلس نے پوچھا۔ "تم کہاں ... دنوں تک۔"

فل کرسی پر بیٹھ چکا تھا مگر کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ یہ بات اس کے چہرے سے عیاں نہ ہونے پائے۔ اس نے چارلس کی بات کا اب تک کوئی جواب بھی نہیں دیا تھا مگر وہ بھانپ چکا تھا کہ فل اسے دیکھ کر پریشان ہوا ہے اور کچھ چھپانے کی بھی کوشش کر رہا ہے۔

"کیا بات ہے؟" جب کافی دیر تک وہ کچھ نہ بولا تو چارلس نے نرم لہجے میں آہستہ سے پوچھا۔

"مجھ سے ایک غلطی ہوئی ہے۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "اس وقت تک ہم جہاز پر ہی تھے کہ میں نے چیف پرسر سے کہہ دیا کہ میت کو دیکھنا چاہتا ہوں؟"

"اور وہ لاش جان لیرکن کی نہیں تھی۔" چارلس نے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے لقمہ دیا۔

ایک لمحے کے لیے فل نے اسے غور سے دیکھا۔ اور لکڑی سے بنی کرسی کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ "وہ جہاز کے عملے کا رکن تھا، جس کا دورانِ سفر دل کے دورے سے اس وقت انتقال ہوا، جب جہاز کو ہونا کی بندرگاہ چھوڑے دو دن ہو چکے تھے۔ خوش قسمتی سے اس بے چارے کے آخری سفر میں اس کی فیملی بھی ساتھ تھی۔ وہ چھٹیاں منانے کے لیے سفر کر رہے تھے۔ جان نے اس کی بیوہ سے معاملہ طے کیا۔ دس ہزار ڈالر میں بات طے ہوگی۔ رقم ملنے کے بعد انہیں اس کی پروا نہیں تھی کہ اسے کھلے سمندر میں پھینکا جائے یا جلا دیا جائے۔ کیپٹن کے علم میں بھی یہ بات تھی مگر جب اس نے مرحوم کی بیوہ کو ملنے والی خطیر رقم کا سنا تو وہ بھی کان اور منہ بند کر کے بیٹھ گیا۔"

"مجھے تو اسی وقت شک ہو گیا تھا، جب اس نے مجھے ٹالا تھا۔" چارلس بڑبڑایا اور پھر اس نے فل کی طرف دیکھا۔ "وہ اپنے ساتھ نیویارک کیا لے کر گئی ہے؟"

"انسانی جسم کے وزن کے برابر گندم سے بھرا ہوا تابوت، جسے کل نیویارک میں تدفین کی جا چکی۔"

چارلس چونک کر اپنی جگہ سے اٹھا۔

"بیٹھ جاؤ، کوئی فائدہ نہیں۔" فل نے ہمدرد لہجے میں کہا۔ "وہ نیویارک سے بھی پرواز کر چکی، مجھے اس کا ٹیلی گرام مل چکا ہے۔" فل نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

چارلس لرزتے قدموں کو قابو میں کرتا ہوا دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اس نے ایسا کیوں کیا؟" اس کے لہجے سے بے بسی ٹپک رہی تھی۔

"محبت... اسے ڈیوٹی نبھاتے نبھاتے اس سے محبت ہو گئی تھی۔" فل نے کہنا شروع کیا۔ "جس سہ پہر وہ یہاں سے روانہ ہوئی اسی صبح اس نے مجھے فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ جس لاش کو جان کے نام سے لے کر یہاں پہنچی تھی، اسے صبح سویرے جان کے نام کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ لینے کے بعد جلا دیا گیا۔"

"جان کہاں ہے؟"

"قبرستان میں۔" فل نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "سی آئی اے کی نظر میں ان کا منحرف اور راز افشا کرنے والا ایجنٹ آخرکار اپنی موت آپ مر گیا۔ رہی جولیا تو وہ اسے دفن کر کے نکل گئی۔ اب وہ کسی دوسرے ملک میں ملیں گے اور وہیں خاموشی کی زندگی بسر کریں گے ہنسی خوشی۔"

"اس نے تم سے کچھ اور بھی کہا تھا۔" چارلس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ اور پھر لمحہ بھر توقف کے بعد ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا۔ "میرا مطلب ہے کہ اس نے تم سے میرے بارے میں بھی کچھ کہا تھا؟"

"ہاں...." فل نے ہنکارا بھر کر کہا۔

"کیا؟"

"سب کچھ، میرا مطلب ہے کہ جان سے تمہاری دشمنی، عشق اور پھر جولیا کو اس کے پیچھے لگانے تک کی ہر وہ بات جو کبھی صرف تم ہی جانتے تھے اور اب میں بھی جان چکا ہوں۔"

"اوہ.... تو یہ بات بھی ہے۔"

"وہ آئندہ کے لیے کیا منصوبے بنا رہی تھی۔"

"یہی کہ ایک تو اب وہ جان سے ملنے سے پہلے ایجنسی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دے گی اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خود اور جان کا ماضی بھلا کر کہیں دور دراز جگہ پر پرسکون زندگی بسر کرے گی۔"

"تو کیا جان جانتا تھا کہ وہ میرے لیے، میرا مطلب ہے کہ سی آئی اے کے لیے کام کر رہی تھی؟"

"پہلے تو نہیں مگر دو سال پہلے وہ سب کچھ جان گیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ اس کی طرف جھکا۔ "سارا راز خود جولیا نے اسے بتایا تھا اور پھر دونوں نے ہی تم سے چوہے بلی کا کھیل کھیلنا شروع کیا تھا۔"

"مجھ سے کھیلنے کا منصوبہ...." چارلس نے استفساریہ لہجے میں کہا۔

"ہاں... تم ہی تو وہ ایجنٹ تھے جو جان کی کامیابی سے جلتے ہی نہیں بلکہ اسے دربدری کی زندگی گزارنے پر بھی تم نے ہی مجبور کیا تھا، جھوٹی رپورٹیں ہیڈکوارٹرز بھیج کر۔"

یہ سنتے ہی چارلس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا اپنے دفاع میں مگر اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی سچ کے سامنے سفید جھوٹ بولنے کی۔ پہلی بار جھوٹ بولتے ہوئے اس کی زبان، اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔

"تمہیں تو یقین تھا کہ ایک دن زچ ہو کر وہ ویسا ہی کرے گا جیسا الزام اس پر لگایا جاتا رہا ہے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ آخر وہ منحرف ہو کر ادارے کی نظر میں معتوب ہو گیا۔" فل نے جھوٹ کی جلتی چتا پر سچ کا تیل چھڑکا۔

"وہ انجا کا معاملہ تھا۔" چارلس نے یہ سننے کے بعد تڑپ کر کہا۔ "اگر جان خوامخواہ انجا اور خاموشی سے ہمارے بیچ سے نکل جاتا تو پھر بات کبھی بھی یہاں تک نہیں پہنچتی۔" چارلس نے افسردگی سے کہا۔ "مگر جولیا تو...."

"وہ بھی تمہاری محبوبہ تھی، جیسے تم نے جان کی انجا کو پھانسا، ویسے ہی اس نے تمہاری جولیا کو ہتھیا لیا۔ حساب برابر، قصہ پاک...." فل نے لقمہ دیا۔ "سچ پوچھو تو اس نے تمہیں شہ مات دے دی۔ تم نے اس سے محبوبہ چھینی اور وہ آٹھ برس تک اس عورت کے ساتھ مزے کی زندگی بسر کرتا رہا جسے تم بدستور اپنی محبوبہ سمجھنے کا دھوکا خوشی خوشی کھا رہے تھے۔ اور پھر جب وہ بازی سے اکتا گیا تو شہ مات دیتے دیتے اس نے اپنی موت کی شکل میں زندگی کی ضمانت حاصل کی اور تمہاری محبوبہ کو ساتھ لے گیا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

چارلس سر پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ تربیت یافتہ شاطر ایجنٹ اور بچپن سے جھوٹا مشہور تھا لیکن تقدیر نے آٹھ برس تک اس سے جو جھوٹ بولا اور جان نے جولیا کے ساتھ مل کر اسے جو شہ مات دی تھی، اس کے بعد اس میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی بھی سکت نہیں تھی۔ "واقعی.... اگر جان سی آئی اے میں رہ جاتا تو چیف تک پہنچ جاتا۔" وہ بڑبڑایا۔ پہلی بار اس نے اپنے بدترین دشمن کی قابلیت کا نہایت سچائی اور کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔

□

# للکار

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے... سرپھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمعِ نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر... ایک للکار ہے۔

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے... واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والد کی جان لی بلکہ اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی... میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج مال کوٹھیوں میں رہنے والی دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم... ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے میں اوجھل ہو گیا۔... اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں... دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے ہماچل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زنگاں اور ل پڑی۔ میں... بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہم جوڈو کراٹے کے نامور چیمپئن جیکی کو اپنے ساتھ... ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زنگاں میں تین ہندو... پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک...

ی بستی میں جا پہنچے۔ پھر میں نے جارج گورا کو سہرا کا شخص کر ڈالا۔ میں نے جارج کو جہنم واصل کر دیا۔ ہم خیریت سے مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ وہ اور آفتاب ایک گاؤں کے شفاخانے میں گھس گئے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنایا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب ایک ایک کر کے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آفتاب، ہاشم دری کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ دری کو سخت سخت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ عمران نے ہاشم پر گولی چلا دی۔ ہاشم مارا گیا تاہم عمران آفتاب سے بات کرنے کے لیے مذاکرات کرنے میں ہو گیا۔ سعدیہ بھی چھوٹی سی رائفل کے ساتھ موجود تھی۔ اچانک آفتاب پر فائر ہوا۔ آفتاب کو گولی لگی۔ آفتاب نے بھی فائر کھول دیا اور مار دیا۔ آفتاب اور سعدیہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ ہم وہاں سے فرار ہو کر پرانے قلعے میں آ گئے۔ ہم نے پانڈے کو ہلاک کر دیا۔ پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم جنگ جیت گئے۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے زرگاں سے نکل آباد پہنچ گئے مگر وہاں ہمیں پکڑ کر اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ ہمیں لاہور لے آئے۔ بعدازاں ہم فرخ اور عاطف سے ملے۔ پھر میں نصرت سے۔ نصرت نے مجھے ثروت کے حالات سے آگاہ کیا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ میں نے ثروت سے ملاقات کی۔ اس کی زبانی نصرت کی بیماری کا چلا۔ ہم نے اس کے علاج کا بندوبست بیرون ملک کر دیا۔ پھر ہمیں ریان ولیم کی جانب سے ایک کام کی آفر ہوئی۔ ہمیں سہراب جلالی نامی عمر رسیدہ شخص پاس کسی خاص شے کے موجود ہونے کا پتا لگانا تھا۔ میں اور عمران، ڈاکٹر کے روپ میں سہراب جلالی کے ہاں پہنچ گئے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے صورت ڈاکٹرز بھی موجود تھیں۔ میں نے ڈاکٹر مہناز کو کریدنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی سے خفیہ نکاح کر رکھا تھا۔ پھر ایک دن میں نے فتح محمد کو کسی سے رازداری سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور ایک کوٹھی میں گھس گیا لیکن وہاں کئی لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے آدمیوں کو شدید زخمی کر دیا مگر انہوں نے مجھے قابو کر لیا اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ فتح محمد بھی زخمی حالت میں وہیں پڑا تھا بعدازاں ان لوگوں نے فتح ڈالا۔ جلالی کے سیکریٹری ندیم کو وہاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ جاوا گروپ سے ملا ہوا ہے۔ پھر وہاں میں نے جاوا کو دیکھا۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا اور عمران تک پہنچ گیا۔ عمران اور راجا بہت تپاک سے ملے۔ راجا کو ہوٹل میں چھوڑ کر میں اور عمران فارم ہاؤس آ گئے۔ ایک رات پتا چلا کہ مہناز فارم ہاؤس سے کسی کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ جلالی صاحب موت کے قریب تھے۔ انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا، وہ کوما میں چلے گئے تھے۔ جلالی صاحب کے کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ مجسمہ بھی غائب تھا۔ پولیس پہنچ گئی تھی اور تفتیش کر رہی تھی۔ میں اور عمران اسپتال میں داخل مہناز کی والدہ کو لینے گئے۔ ان کی جان کو خطرہ تھا۔ ہم مہناز کی والدہ کو لے کر ڈیفنس والی کوٹھی پر آ گئے۔ میری ملاقات ثروت کے شوہر یوسف سے ہوئی۔ اس نے ہمیں ثروت اور نصرت کے پاکستان آنے پارٹی میں مدعو کیا۔ اسی دوران میں ہمیں مہناز کے حوالے سے تھوڑا سا سراغ ملا۔ وہ جس جگہ ٹھہری تھی اور جس کے پاس ٹھہری تھی، وہ شخص پولیس کی تحویل میں تھا۔ ایک دل جینی کے ذریعے ہمیں پتا چلا کہ یوسف کسی چکر میں ہے۔ وہ باڑہ حسن میں ایک کوٹھے پر موجود تھا۔ مجھے نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا چکر ہے۔ ہم راجا کے ساتھ ہوٹل میں موجود تھے کہ ہمیں جاوا کے لوگوں نے گھیر لیا۔ ہم ہوٹل سے نکل کر باہر بھاگے اور ایک دو منزلہ عمارت میں گھس گئے۔ وہاں شدید فائرنگ ہوئی۔ عمران نے حمزہ صاحب کو فون کر کے ان سے مدد لی اور یوں ہم وہاں سے سلامت نکل پائے۔ ہم نے یوسف فاروقی کی ٹوہ لگائی۔ وہ ایک بنگلے میں کسی کے ساتھ رات گزار رہا تھا۔ وہاں سے واپسی میں اس کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے اس لیے مجھے مدد کے لیے پہنچنا پڑا تاہم اس دوران میں یوسف زخمی ہو چکا تھا، اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ پھر یوسف اسپتال سے غائب ہو گیا۔ ہم نے شبے میں شارہ بائی کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس سے پتا چلا کہ اسے جاوا کے لوگ اٹھا لے گئے ہیں۔ میں اور ثروت، یوسف کی تلاش کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور ہارون آباد پہنچ گئے۔ وہاں میں نے جیتو عرف کرشمہ کو رنگو کو دیکھا اور کا پیچھا کیا۔ میں ایک سرحدی گاؤں پہنچ گیا جہاں پیلی حویلی تھی۔ میں لطیف نامی شخص سے معلومات لے کر آ گیا۔ پھر میں اور ثروت دوبارہ گاؤں پہنچے۔ ثروت نے پیلی حویلی میں وقتی ملازمت کر لی۔ ادھر لطیف کی بیوی نے چودھری کو ہمارے بارے میں آگاہ کر دیا۔ ہمیں پکڑ لیا گیا تاہم راجا کی مدد سے ہم وہاں سے ہوئے۔ راجا نے جیتو کو بھی مار دیا تھا۔ راستے میں راجا کے گولیاں لگیں اور وہ مارا گیا۔ ہمیں چودھری کے کارندوں نے گھیر لیا تاہم میری جنونیت کے آگے وہ پسپا ہو گئے۔ ہم وہاں سے بھاگ کر ایک ٹیلے پر پہنچ گئے۔ یہاں پختہ اینٹوں سے بنا ایک پرانا کوٹھا سا تھا۔ ہم نے وہاں پناہ لے لی۔ اچانک کچھ لوگ انداز میں ٹیلے تک آنے لگے۔ آنے والوں میں سکھ بھی شامل تھے۔ ثروت نے ڈر کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ڈرے ہوئے سوال تھے۔

**اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے**

ہم خشک ٹہنیوں کے انبار کے پیچھے بالکل بے حرکت ہو گئے۔ آنے والوں کی آہٹیں سنائی دیتی رہیں۔ پتا نہیں کیوں وہ اس شکستہ کمرے کی طرف آنے کے بجائے اوپر چلے گئے۔ شاید وہ اس کھنڈر جگہ کو کلیئر قرار دے چکے تھے اور اب کسی اور مشتبہ جگہ پر تاک جھانک کرنا چاہتے تھے۔ ایل ایم جی میری گود میں تھی اور میری طرح ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار تھی۔ ثروت میرے کندھے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کا بخار میں پھنکتا ہوا جسم مجھے آنچ دے رہا تھا۔

"کون لوگ تھے یہ؟" اس نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔"

"مجھے یہ حویلی کے لوگ نہیں لگتے۔ کچھ اور طرح کی آوازیں تھیں ان کی۔" ثروت نے کہا۔

اس نے میرے خیال کی تصدیق کی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے بھی یہ شبہ ہو رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جو لوگ ہمارے سامنے سے گزرے ہیں، وہ پیلی حویلی کے ہرکارے نہیں تھے اور شاید... رات کو بھی جن لوگوں نے اس شکستہ کمرے میں جھانکا تھا، ان کا تعلق پیلی حویلی سے نہیں تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے مجھے ایک سکھ کی رنگین پگڑی بھی دکھائی دی تھی۔ اچانک میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ دماغ سنسنا اٹھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کل بادوباراں والی تاریک رات میں ہم دونوں بھاگتے بھاگتے بھارتی علاقے میں داخل ہو گئے ہوں؟

بڑا سنسنی خیز خیال تھا مگر ابھی میرے سامنے اس کا ثبوت نہیں تھا۔ جہاں تک پگڑی والے سکھ کی بات تھی، ویسے لوگ تو چودھری انور کی پیلی حویلی میں بھی آتے جاتے رہتے تھے...

"کیا سوچ رہے ہیں؟" ثروت کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"کچھ نہیں۔ مجھے بھی شک پڑتا ہے کہ یہ چودھری انور کے لوگ نہیں ہیں۔"

وہ سرسراتی سرگوشی میں بولی۔ "اور کل رات جب آپ ان لوگوں سے لڑ رہے تھے، مجھے درختوں میں دو تین دفعہ تیز روشنی بھی نظر آئی تھی۔ یہ بجلی کی چمک نہیں تھی۔ یہ... کچھ اور تھا۔ جیسے کوئی بڑی سرچ لائٹ ہو۔"

"سرچ لائٹس تو بارڈر پر ہوتی ہیں۔"

"...تو اس کا مطلب ہے کہ ہم بارڈر کے بالکل پاس آ گئے ہیں؟" ثروت بولی۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

اسی دوران میں ہمیں اپنے اردگرد پھر قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں... وہ لوگ جو اوپر گئے تھے، واپس آ رہے تھے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کا کوئی فقرہ ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا ہماری سماعتوں سے ٹکراتا۔

ایک شخص نے دوسرے کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ "اوئے بدبختاں! تیری آنکھیں ہیں کہ کول ڈوڈے۔ یہ پاؤں کا نشان نہیں ہے۔ یہ دیکھ، یہ بھی ایسا ہی نشان ہے۔ کوئی ڈنگر وچھا جناور بھی ہوتا ہے؟"

باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ کچھ آگے نکل گئے۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی... لیکن یہ اطمینان بالکل عارضی ثابت ہوا۔ ایک بار پھر دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ کوئی ہمارے بالکل قریب موجود تھا۔ اس کی عمر کوئی تیس بتیس سال ہو گی۔ اس نے خاکی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ گلے میں چادر لٹکا رکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے قمیص کے نیچے پستول وغیرہ لگا رکھا ہے۔ اس نے بڑے اطمینان سے شلوار کا ازار بند کھولا۔ قمیص تھوڑی اوپر اٹھائی اور پھر دیوار کی طرف منہ پھیر کر کھڑے کھڑے پیشاب کرنے لگا۔ زرد رنگ کا پیشاب اس کے قدموں کے پاس سے بہہ کر دروازے کی طرف جانے لگا۔ پیشاب کرنے کے بعد اس نے ازار بند باندھا اور ایک بار پھر کمرے میں طائرانہ نظر ڈالی۔ خشک ٹہنیوں کے انبار پر اس کی نگاہیں چند سیکنڈ کے لیے رک گئیں۔ میری انگلی ٹریگر پر تھی۔ اس جواں سال سکھ کا ایک قدم اسے موت کی وادی میں دھکیل سکتا تھا اور شاید ہمیں بھی۔

وہ کچھ دیر ٹہنیوں کو گھورتا رہا پھر باہر چلا گیا۔ اس وقت نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ مجھے لگا کہ یہ شخص یہاں ہماری موجودگی سے آگاہ ہو چکا ہے۔ وہ جان چکا ہے کہ اس نیم تاریک کمرے میں خشک ٹہنیوں کے انبار کے پیچھے کیا ہے۔

معلوم نہیں، میرا یہ احساس غلط تھا یا درست۔ مگر چند لمحوں کے اندر میرے جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹ نکلا... مجھے ایک بار پھر رات والی صورت حال یاد آئی۔ ٹارچ کا روشن دائرہ کمرے میں حرکت کرتا رہا تھا اور پھر ایک جگہ ڈھینگریوں (خشک ٹہنیوں) کے ڈھیر پر رک گیا تھا... کیا اس وقت بھی ٹارچ اسی شخص کے ہاتھ میں تھی؟ یہ کون تھا؟ اگر وہ واقعی یہاں ہماری موجودگی کے بارے میں شبہ کر رہا تھا تو اب تک خاموش کیوں تھا؟

وہ پورا دن عجیب تناؤ اور سخت ترین پریشانی کے عالم میں گزرا۔ ہم اس بارہ ضرب بارہ فٹ کے کمرے میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ یہاں سیلن تھی، گھٹن تھی اور حشرات الارض بھی تھے۔ ثروت کے بازو پر کوئی نامعلوم کیڑا رینگ گیا تھا اور جلد سرخ ہو گئی تھی۔ بخار نے بھی اس کی بُری حالت کر دی تھی۔ اوپر سے ٹخنے کا درد تھا۔ وہ بے مثال برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ بہرحال وہ عورت تھی۔ گاہے بگاہے اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک درد بھری آہ نکل جاتی تھی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں؟ ہمارے اردگرد جو لوگ ہیں وہ کون ہیں؟ اور کل شب جو خون ریز ہنگامہ ہوا ہے اس کے نتائج ہمارے لیے کیا نکلنے والے ہیں؟ پریشانی میں انسان کی بھوک تو دب جاتی ہے مگر پیاس کی شدت محسوس ہوتی رہتی ہے۔ بخار کی وجہ سے ثروت کو زیادہ پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے سے دس بارہ قدم کے فاصلے پر خودرو پودوں کے درمیان مجھے ایک چھوٹا سا گڑھا نظر آ رہا تھا۔ اس میں کل رات کی بارش کا پانی جمع تھا اور اب کافی ٹھہر چکا تھا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ وہاں تک جاؤں اور پانی لے آؤں۔ لیکن دو مسئلے تھے۔ ایک تو پانی کے لیے کوئی برتن نہیں تھا۔ دوسرے نگاہ میں آ جانے کا شدید خطرہ تھا۔ اس گڑھے تک جانے کے لیے

ضروری تھا کہ میں رات ہونے کا انتظار کروں۔

کچھ مناظر بار بار نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ تیتو عرف کرشمہ کپور کا سرد بے جان جسم، راجا کی شہ رگ سے اچھلنے والا خون، کیکر اور جنتر کے درختوں کے درمیان چودھری کے ہرکاروں سے میرا لہو رنگ معرکہ۔ یوں لگتا تھا جیسے کل رات جاگتی آنکھوں سے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ جیسے تیسے یہ پہاڑ جیسا بھاری بھرکم دن گزر گیا۔ اردگرد پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دی اور شام کے سائے اس ویرانے پر طویل ہونے لگے۔ اندھیرا ایک چادر تھا اور یہ چادر ہمارے بہت کام آسکتی تھی۔ سب سے پہلے مجھے پانی لانا تھا، اس کے لیے میں نے ایمونیشن والے تھیلے کے اندر سے ایک چھوٹا سا شاپر ڈھونڈ لیا تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ میں ڈھینگریوں کے پیچھے سے نکلتا اور پانی کی طرف بڑھتا، ایک اور واقعہ ہوا... ایک بار پھر ہمارے آس پاس قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس بار یہ آہٹ زیادہ قدموں کی نہیں تھی۔ کوئی شخص ہولے سے کھانسا اور پھر خستہ حال کمرے کے اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ وہی نیلی پگڑی والا سکھ تھا جو دن کے وقت بھی یہاں آچکا تھا۔ میں نے ایک بار پھر گن کے ٹریگر پر انگلی رکھ لی اور سانس روک کر تو وارد کے اگلے قدم کا انتظار کرنے لگا۔ ثروت میرے کندھے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کی سانس تیزی سے آجا رہی تھی۔ آنے والے کی آواز کمرے میں گونجی۔

"باہر نکل آؤ۔ میں جانتا ہوں تم یہاں ہو۔"

میں چند سیکنڈ تک ساکت و جامد رہا پھر شاخوں کو حرکت دیتا ہوا باہر نکل آیا۔ میرے ہاتھ میں گن تھی۔ آنے والا خالی ہاتھ تھا۔ تاہم مجھے معلوم تھا کہ اس کی خاکی قمیص کے نیچے ہتھیار موجود ہے۔ مجھے دیکھ کر بھی وہ اطمینان سے کھڑا رہا۔ اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ میرے چہرے پر ڈالا اور پھر ڈھینگریوں پر اس جگہ روشنی کی جہاں ثروت دبکی ہوئی تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "گن نیچے کرلو بھایا جی! میں دشمن نہیں سجن ہوں۔ تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"کون ہو تم؟" میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

"جگت سنگھ... پاس کے پنڈ جو پور کا رہنے والا ہوں۔"

"یہاں... پاکستانی علاقے میں کیا کررہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ "یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ تم یہاں ہندوستانی علاقے میں کیا کررہے ہو؟"

"ہندوستانی علاقہ؟"

"ہاں۔" وہ دیوار سے پشت لگا کر بولا۔ "تم ویلے (وقت) بارڈر پار کرچکے ہو اور ہندوستانی علاقے میں ہو... کسی بھی ویلے بی ایس ایف والے تم پر چھاپہ مار سکتے ہیں۔ بڑے زہریلے ہوتے ہیں یہ۔ تمہارے پاس ٹائم نہیں ہے یہاں سے نکلنے کے لیے۔"

میں سناٹے میں تھا۔ میرا بدترین اندیشہ درست ثابت ہو چکا تھا۔ کم از کم ابھی تو یہی لگ رہا تھا۔

اس نے ٹارچ نیچے جھکائی اور پھر بجھا دی۔ میں نے دھیان سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ شکل سے سیدھا سادہ پینڈو لگتا تھا مگر آنکھوں میں ہوشیاری کی چمک تھی۔ اس کے رویے میں مجھے ہمدردی کی لہر محسوس ہوئی۔

میں نے کہا۔ "مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ میں انڈین علاقے میں ہوں۔"

وہ بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔"

"لیکن تم ہو کون؟"

"یارا! ابھی تو اتنا جانو کہ میں جگت سنگھ ہوں اور تمہیں بڑے سخت خطرے میں سے نکالنا چاہتا ہوں۔"

"پر کیوں؟"

"بس سمجھ لو کہ دل آگیا ہے تم پر۔" وہ میرے خون آلود کپڑوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

ان لمحوں میں نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ کل رات یہاں سے کچھ فاصلے پر میرے اور چودھری انور کے ہرکاروں کے درمیان جو خون ریز جھڑپ ہوئی تھی، وہ اس شخص نے کسی طور دیکھی ہے۔ میرے کہنے پر ثروت بھی شاخوں کے پیچھے سے نکل آئی۔ جگت سنگھ نے اسے بس ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی۔ اگلے پانچ دس منٹ میں مجھے یقین ہوگیا کہ یہ جگت نامی شخص جو کہہ رہا ہے، درست ہے۔ ہم پر واقعی کسی بھی وقت بی ایس ایف کا چھاپا پڑ سکتا ہے۔ جگت سنگھ کے لب و لہجے میں بہت اعتماد تھا۔ لگتا تھا کہ وہ علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے اور ہمیں بہ آسانی اس جگہ سے نکال سکتا ہے۔ لیکن وہ ہمیں انڈین علاقے کی طرف نکالنا چاہ رہا تھا جبکہ ہمارے لیے ضروری تھا کہ اپنا رخ پاکستان کی طرف رکھیں۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اگر تم واقعی ہماری مدد کرنا چاہتے ہو تو پھر ہمیں پاکستانی علاقے کی طرف نکالو۔ تمہارے علاقے کی طرف جا کر تو ہم مزید پھنس جائیں گے۔"

وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔ "بھولے بادشاہ! کافی آگے آگئے ہو تم۔ اب پاکستانی علاقے کی طرف جاؤ گے تو رینجرز والے بھون کر رکھ دیں گے۔ کل رات تو زور کی بارش تھی۔ تمہاری قسمت نے بھی ساتھ دیا اور تم گولی کھائے بغیر نکل آئے۔ اب بہت مشکل ہے اور پھر دوسری گل یہ ہے کہ تم کیوں بھول رہے ہو۔ تم نے وہاں پانچ چھ بندے پھڑکائے ہیں۔ ان کے وارث جنگلی کتوں کی طرح تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ پولیس اور رینجرز والے بھی ان کے ساتھ مل کر تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں۔"

وہ بات تو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کل رات جو کچھ ہوا، وہ میری توقع اور نیت سے بہت زیادہ تھا۔ ثروت میرے ساتھ تھی اور اس کی حفاظت کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ کچھ دیر کے لیے میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ جب جارج کا چاقو میرے ہاتھ میں آیا تو مجھ پر وہی کیفیت طاری ہوگئی جو بھانڈیل اسٹیٹ میں "زرگاں قلعے" کی خونی لڑائی میں ہوئی تھی۔

کمرے کی تاریکی میں میرے اور جگت سنگھ کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ فی الحال ہمیں وہی کرنا پڑے گا جو یہ جگت نامی شخص کہہ رہا ہے۔ ہم وہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگئے۔ ثروت پیاس کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ سب سے پہلے ہم نے بارشی گڑھے میں سے کچھ پانی لیا اور ثروت کو چند گھونٹ پلائے...

ثروت کے لیے چلنا محال تھا۔ میں نے اس کا بازو کندھے کے قریب سے تھاما اور اسے چلنے میں مدد دی۔ وہ بمشکل اپنے قدم آگے بڑھانے لگی۔ چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ یہ احساس بڑا مختلف تھا کہ ہم پاکستان کے بجائے انڈیا کی سرزمین پر چل رہے ہیں۔ یکایک میں چونک گیا۔ درختوں کے اندر سے تیز روشنی کا ایک ترچھا ستون سا ابھر آیا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے نیم دائرے کی شکل میں حرکت کرنے لگا۔ اس کی زد میں آنے والی ہر چیز روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی تھی۔ یہ وہ طاقتور سرچ لائٹ تھی جو کل رات بھی متعدد بار چمکی تھی اور جس کا ذکر ثروت نے کیا تھا۔

کچھ دیر بعد لائٹ اوجھل ہوگئی اور ایک بار پھر ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی۔ ہمارا راہنما جگت سنگھ بڑے اعتماد سے قدم بڑھا رہا تھا۔ وہ بار بار سرگوشی کررہا تھا۔ "گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ بس میرے پیچھے پیچھے چلتے رہو۔"

تھوڑی دیر بعد ثروت کے لیے قدم اٹھانا مشکل ہوگیا تو جگت سنگھ نے بڑی ہمدردی کے ساتھ اور پُرخلوص انداز میں ثروت کو دوسری طرف سے سہارا دینے کی پیشکش کی۔ اس پیشکش کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

اب ایک طرف سے جگت نے اور دوسری طرف سے میں نے ثروت کو تھاما ہوا تھا۔ وہ ہم دونوں کے کندھوں پر پورا بوجھ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر جگت سنگھ رک گیا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "لائٹ پھر جلنے والی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ گھومتی ہوئی ان سامنے والے کیکروں کے اوپر سے گزرے گی۔ جب وہ وہاں سے گزر جائے تو ہم کو فوراً یہاں سے اٹھنا ہوگا اور ان دائیں طرف والے جنتروں تک پہنچنا ہوگا۔ بس ایک منٹ کے اندر اندر۔"

"لیکن اس سے تو چلا نہیں جارہا۔" میرا اشارہ ثروت کی طرف تھا۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ اگر نکلنے میں دیر کردی تو پھر "لائٹ" پکڑ لے گی۔"

میں نے دیکھا، بائیں طرف اندھیرے میں ایک اونچا مینار سا نظر آرہا تھا جیسے سرو کا کوئی بلند و بالا درخت ہو۔ جگت میری الجھن بھانپ کر بولا۔ "یہ لکڑی کا ٹاور ہے۔ اس پر بی ایس ایف والے ہیں۔ مشین گن بھی ہوتی ہے اوپر۔ پر ڈرنے کی لوڑ نہیں ہے۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بس جیسا کہتا ہوں، ویسا کرتے رہو۔"

"لیکن..."

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "اپنا ہاتھ ادھر لاؤ۔"

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میری کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور بولا۔ "یہ دیکھو، یہ ہمارے ہاتھوں سے ایک طرح کی کرسی بن گئی ہے۔ میری بھین (بہن) اس پر بیٹھ جائے گی۔ ہم دونوں طرف سے اس کا بازو پکڑ لیں گے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

مشکل سے جگت کے الفاظ مکمل ہوئے تھے کہ طاقتور سرچ لائٹ کا ترچھا ستون پھر روشن ہوگیا۔ وہ آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ میرے سینے میں دھڑکن کی رفتار بڑھ گئی۔ روشن ستون حرکت کرتا ہوا ہمارے سامنے کیکر کے درختوں کے اوپر سے گزر گیا تو جگت سنگھ نے تیز سرگوشی کی۔ "چلو آؤ۔"

ہم نے ثروت کو اپنے بازوؤں کی کرسی پر بٹھایا۔ دونوں طرف سے اس کے کندھے تھامے اور تیزی سے آگے بڑھے۔ ثروت نے اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیا تھا۔

واقعی جگت ان راستوں کا گہرا شناور تھا۔ تاریکی کے باوجود ہم کہیں ٹھوکر کھائے بغیر آگے بڑھ رہے تھے۔ ”یہاں ایک کھالا ہے۔ دھیان سے۔“ جگت نے تیز سرگوشی کی۔

کھالے کی مختصر گہرائی سے گزرنے کے فوراً بعد ہم جنتر کی محفوظ جھاڑیوں میں پہنچ گئے۔ جگت بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ تھوڑی بہت سانس مجھے بھی چڑھی تھی۔ ہمیں جنتروں میں پہنچے مشکل سے چند سیکنڈ ہوئے تھے کہ سرچ لائٹ کا خطرناک روشن دائرہ اس مقام سے گزرا جہاں سے ہم ابھی گزر کر آئے تھے۔

کچھ دیر تک سانسیں درست کرنے کے بعد جگت نے کہا۔ ”ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ آگے بڑھنا ہوگا۔“

ہم نے ایک بار پھر ثروت کو دونوں طرف سے سہارا دیا اور وہ اپنے ایک پاؤں پر زور دیتے ہوئے ہمارے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ ایک جگہ پھر ہمیں تھوڑی دیر کے لیے رکنا پڑا۔ کسی سیکیورٹی اہلکار کی ٹارچ کی روشنی دکھائی دی تھی۔ روشنی فاصلے پر چلی گئی تو ہم پھر اٹھے اور محتاط انداز میں چلتے ہوئے ایک گدھا گاڑی تک پہنچ گئے۔ گاڑی پر دودھ کے تین چار بڑے برتن رکھے تھے اور ایک طرف سبز چارے کا گٹھا پڑا تھا۔ جگت سنگھ نے ہمیں گاڑی پر بٹھایا اور گدھے کو ہانکنا شروع کر دیا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ثروت پیچھے تھی۔ وہ ثروت سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”چھوٹی بہن! اگر کوئی تجھ سے کسی طرح کی کوئی بات پوچھے تو گونگی بن جانا۔ آپاں (ہم) کہیں گے کہ یہ بول نہیں سکتی... ٹھیک ہے؟“ ثروت نے میری طرف دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

تب جگت مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تمہارا نام صادق محمد ہے۔ یہ تمہاری پتنی ہے۔ تم میرے بیلی ہو اور مجھ سے ملنے گنڈوت پورہ سے آئے ہو۔ گنڈوت پورہ ڈیک نالے کے پار سکھوں اور مسلمانوں کا پنڈ ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

میں نے کہا۔ ”سمجھ تو رہا ہوں۔ پر اس گن کو اور گولیوں والے تھیلے کو کہاں چھپانا ہے اور میرے کپڑوں پر یہ خون کے بڑے بڑے داغ؟“

”اوہ، میری بھی مت ماری گئی ہے۔“ جگت نے کہا پھر جلدی سے اپنے گلے کی چادر اتار کر میری طرف بڑھائی۔ ”لے یارا! اس کی بکل مارلے اور بندوق کو گھسا دے اس چارے کے نیچے۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ چادر لپیٹ لی اور گن کے ساتھ ساتھ کینوس کا بیگ بھی چارے میں چھپا دیا۔ جس راستے پر ہم جا رہے تھے وہ کچا لیکن ہموار تھا۔ قریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر کچھ روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ ایک سرحدی گاؤں تھا۔ جگت نے بتایا کہ ہم وہیں جا رہے ہیں۔ راستے میں ایک جگہ، اس وقت ہماری دھڑکن بُری طرح زیر و زبر ہوئی جب اندھیرے میں کسی نے فوجی انداز میں پکار کر پوچھا۔ ”کون ہے؟“

جگت نے فوراً سنگین آواز میں کہا۔ ”میں ہوں جگتا۔ دودھ دے کر آیا ہوں۔“

”یہ ساتھ کون ہے تیرے؟“

”میری بھین ہے جی اور اس کا بندہ صادق۔ گنڈوت پورہ سے آئے ہیں، ملنے کے لیے۔“

چند لمحے خاموشی رہی۔ یہ سنگین خاموشی تھی۔ ہماری تلاشی ہو جاتی تو قیامت آ جاتی۔ بہرحال، خیریت گزری۔ چند سیکنڈ بعد آواز آئی۔ ”ٹھیک ہے... ٹھیک ہے، نکلو... ٹائم زیادہ ہو گیا ہے۔“

جگت نے ٹخ ٹخ کر کے گدھے کی پشت پر چھڑی لگائی تو اس کی رفتار بڑھ گئی۔ قریباً دس منٹ بعد ہم اس سرحدی گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ ابھی رات کے آٹھ ہی بجے تھے مگر گاؤں کی گلیاں سنسان تھیں۔ کسی کسی گھر سے ٹی وی چلنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ چند راہ گیر ملے لیکن کسی نے بھی ہم پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ ثروت نے اپنی اوڑھنی کو گھونگھٹ کی سی شکل دے دی تھی۔ ایک گلی میں ہینڈ پمپ نظر آیا۔ میں نے ابھی تک پانی نہیں پیا تھا۔ جی چاہا کہ اتر کر پی لوں مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ بھوک پیاس برداشت کرنا میری عادت ثانیہ بنتی جا رہی تھی۔ خود کو تکلیف دینا، اسے سہنا اور سہنے کی اس حد کو بڑھانا مجھے اچھا لگتا تھا۔ ثروت نے لطیف کے گھر میں مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں اپنے آپ سے انتقام لے رہا ہوں لیکن یہ انتقام نہیں تھا، یہ اس سے جدا کوئی کیفیت تھی۔

جگت سنگھ ہمیں جس گھر میں لے کر گیا، وہ کچا تھا اور اس کا صحن خاصا کشادہ تھا۔ صحن کے آخر میں ایک برآمدہ تھا اور تین کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ برآمدے میں ایک میلا سا بلب روشن تھا۔ صحن کی ایک طرف دو چھپر تھے جن کے نیچے چار پانچ بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔

گھر میں صرف ایک عورت تھی۔ وہ پچیس چھبیس سال کی خاصی تگڑی دیہاتن تھی، شکل بھی اچھی تھی۔ جگت نے بے تکلفی سے عورت کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ آشا ہے۔ میری دھرم پتنی۔ بڑی چنگی زنانی ہے۔ اتنی چنگی ہے کہ جی کرتا ہے، اس جیسی ایک اور ہو۔“





”تو بے آشا۔ میں نے منع کیا ہے؟ مجھ سے تو تیرا کچھ ہوتا نہیں۔ شاید کسی اور سے تیری نسل آگے چل جائے۔“

”بے لے پھڑ۔ پھر وہی گل لے کر بیٹھ گئی ہے۔ وئے بال بچے نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ بندہ دوسرا ویاہ کر لے۔ ابھی دیر ہی کتنی ہوئی ہے... تین چار سال۔ اوئے جیسی تگڑی زنانیاں تو پچاس سال کی ہو کر بھی خوش خبری سنا دیتی ہیں۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

آشا نے آگے بڑھ کر ثروت سے ہاتھ ملایا اور اسے نیچے سے اوپر تک غور سے دیکھنے لگی۔ جگت نے کہا۔ ”آشا... یہ بے چارے دو دن سے بھوکے ہیں۔ ایک مرغی بھون لے اور دو چار پراٹھے پکا لے فٹافٹ۔“

میں منع کرتا رہ گیا لیکن آشا گھر کے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ جگت اس کے پیچھے گیا۔ یقیناً اسے ہمارے بارے میں تفصیل بتانے گیا تھا۔ میں اور ثروت برآمدے میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ میرے کہنے پر ثروت نے اپنا مضروب پاؤں بھی چارپائی پر رکھ لیا۔ میری گن ابھی تک چارے کے نیچے پڑی تھی۔ میں اسے جلد از جلد نکال کر اپنی تحویل میں لینا چاہتا تھا۔ جگت بظاہر کھرا بندہ لگتا تھا پھر بھی اتنی جلدی اس پر مکمل اعتماد کرنا ٹھیک نہیں تھا... جگت نے مجھے ایک صاف شلوار قمیص لا دی۔ میں نے کمرے میں جا کر اپنے خون آلود کپڑے تبدیل کر دیے۔ جگت نے خون آلود کپڑے لے جا کر غسل خانے میں رکھ دیے اور غسل خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہم جگت اور اس کے گھر کے بارے میں کافی کچھ جان چکے تھے۔ جگت سنگھ اپنی بیوی اور چھوٹے بھائی کے ساتھ اس گھر میں رہتا تھا۔ اس کی تھوڑی سی زمین تھی اور وہ دودھ بھی بیچتا تھا۔ آج کل وہ بی ایس ایف والوں کی سرحدی پوسٹ پر بھی دودھ دے کر آتا تھا۔ جگت کا ایک ماموں فوج میں نائب صوبیدار تھا اور اسی علاقے میں تعینات تھا۔ جگت سنگھ خود بھی ایک جی دار شخص تھا اور لڑائی بھڑائی کے کاموں میں کسی سے پیچھے نہیں رہتا تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ چند سال پہلے وہ آشا کو بھی اپنے سسرالیوں سے بزور بازو چھین کر لایا تھا۔ جگت سنگھ کا چھوٹا بھائی گوبند سنگھ قریبی شہر ”بیکانیر“ میں پڑھتا تھا اور بہت اچھا کھلاڑی بھی تھا۔ وہ یہاں گاؤں میں آتا جاتا رہتا تھا۔ اس گاؤں کا نام جوپور معلوم ہوا۔

جگت نے مجھے اپنے بارے میں صاف صاف تو کچھ نہیں بتایا، تاہم مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بی ایس ایف والوں کا ”مخبری“ یعنی مخبر ہو سکتا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ سرحدی علاقوں میں اکثر دیہات کے اندر ایسے مخبری موجود رہتے ہیں۔ گاؤں کے لوگوں کو بھی پتا نہیں ہوتا کہ ان کے اندر کی خبریں وردی والوں تک کون پہنچاتا ہے۔ لیکن اگر وہ واقعی مخبری تھا تو پھر اس نے ہماری مدد کیوں کی تھی؟ کیوں ہمیں سیکیورٹی فورس کے خطرناک گھیرے میں سے نکال کر یہاں اپنے گھر لایا تھا اور اب ہماری خاطر مدارات کر رہا تھا؟ وہاں کھنڈر کمرے میں، میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تھا تو اس نے بے تکلفی سے کہا تھا، بس تم پر دل آ گیا ہے...

میں نے ایک بار پھر یہی سوال اس سے کیا تو وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگا... اس نے یہ بات تسلیم کی کہ پرسوں رات بارش کے دوران میں وہ پاکستانی علاقے میں موجود تھا... اس نے درختوں کے اندر سے وہ خون ریز جھڑپ دیکھی تھی جو میرے اور چودھری کے کارندوں کے درمیان ہوئی۔ وہ میری ہمت اور سخت جانی سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ جس وقت میں لڑ رہا تھا، وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ اگر میں یہاں سے بچ نکلا تو وہ میری اور میری ساتھی کی مدد ضرور کرے گا۔

اس نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”صادق محمد! میرا مطلب ہے تابش محمد! میں نے اب تک کے جیون میں بڑی لڑائی بھڑائی اور مار دھاڑ دیکھی ہے لیکن... واہگرو کی سوگند، پرسوں رات جو کچھ دیکھا اس نے دو بوتل کا نشہ کر دیا۔ یہ مت سمجھو کہ منہ پر تمہاری تعریف کر کے تم سے کوئی فائدہ لینا چاہتا ہوں۔ آپاں (ہم) تو یاروں کے یار ہیں بادشاہ زادے! دلیری اور جواں مردی جہاں نظر آئے وہیں پر سیس جھکا دیتے ہیں۔ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا پارسی... جو دلیر ہے، وہ سجن ہے، جو بھگوڑا ہے، وہ ویری دشمن ہے۔“

اس گفتگو کے دوران میں آشا باورچی خانے میں مصروف تھی۔ بھنی ہوئی دیسی مرغی کی خوشبو آ رہی تھی۔ جگت سنگھ نے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔ ”پرسوں رات تم نے جو مارا ماری کی ہے، اس کا آشا کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ خوامخواہ میں ڈر جائے گی۔ اس کو میں نے بس یہی بتایا ہے کہ چوکی کے پاس کوئی جھگڑا ہو گیا تھا، جس میں ایک دو بندے زخمی ہوئے اور تم کو بھی چوٹیں لگیں۔ تمہاری بندوق اور گولیاں میں نے وہ سامنے چھپر میں بھینسوں کی کھرلی کے پیچھے رکھ دی ہیں۔ وہاں انہیں کوئی نہیں چھیڑے گا۔ ٹھیک ہے نا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ مجھ سے پوچھنا شروع ہو گیا کہ ہمارے پیچھے کون

لگ تھے اور وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ ابھی میں اس شخص پر پوری طرح اعتماد نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ ایک مقامی زمیندار سے میری پرانی دشمنی تھی۔ اس نے ہم میاں بیوی کو یہاں دیکھا اور اپنے بندے ہمارے پیچھے لگا دیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم ان کے ہاتھ نہیں آئے ورنہ انہوں نے ہمیں بہت اذیت دے کر قتل کر دینا تھا۔

جگت سنگھ نے کہا۔ ”شاید ابھی تم پوری بات بتانا نہیں چاہتے۔ چلو ٹھیک ہے، میں آشا کو بھی یہی کچھ بتادوں گا جو تم نے بتایا ہے۔ پر جو قتل ہوئے ہیں ان کی گل نہیں کروں گا۔“

پھر جگت سنگھ کی نگاہ میرے ہاتھوں پر مرکوز ہوگئی۔ وہ میرے ہاتھوں کی جلد کو غور سے دیکھنے لگا اور مسکرا کر بولا۔ ”لگتا ہے کہ میرے یار نے لڑائی مارکٹائی کی بڑی سخت ٹریننگ لی ہوئی ہے۔ لڑائی کا اسٹائل دیکھ کر ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ کراٹے شراٹے کا ماسٹر بندہ ہے۔ اب تمہارے ہاتھ دیکھ کر شواس ہو رہا ہے کہ تم نے ریت کے تھیلے کے ساتھ بڑی زبردست مار اماری کی ہوئی ہے۔“

”تم کیا جانتے ہو ریت کے تھیلے کے بارے میں؟“

”بہت کچھ۔“ وہ مسکرایا۔ ”میرا چھوٹا بھرا گو بندر چیمپئن ہے یارا۔“

”کس چیز کا؟“

”یہی کراٹے وغیرہ کا۔ بڑے مقابلے کیے ہوئے ہیں اس نے۔ وہ سامنے والے کمرے میں کئی ٹرافیاں اور کپ پڑے ہوئے ہیں اس کے۔“

”۔۔۔وہ خود کہاں ہے؟“

”شہر میں۔ لیکن کل یا پرسوں اس کو آنا ہے۔ تم سے ملاقات کراؤں گا۔ بڑا خوش ہوگا تم سے مل کر۔۔۔ وہ ذرا غصے والا ہے، پر من کا بُرا نہیں ہے۔ میرے آگے تو بالکل چوں چرا نہیں کرتا۔ سچی گل ہے، پہلے میں بھی اس جوڈو کراٹے وغیرہ کو بیکار کا پنگا سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جو دلیر ہوتا ہے، وہ دلیر ہی ہوتا ہے۔ اس کراٹے شراٹے سے کوئی ”لڑاکا“ نہیں بن سکتا۔ پر اب پتا چلا ہے کہ اسکی ٹریننگ چاندی کو سونا اور سونے کو ہیرا بنا دیتی ہے۔ پر تم نے میری گل کا جواب نہیں دیا۔ کیا تم نے بھی یہ ٹریننگ لی ہوئی ہے؟“

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، آشا ہاتھوں میں ٹرے لیے چھم چھم کرتی نمودار ہوگئی۔ وہ کھانے سے پہلے ہمارے لیے دودھ پتی لے آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کھانا تیار ہونے میں کچھ دیر ہے۔ اندازہ ہوا کہ وہ چاول وغیرہ پکانے لگی ہے۔ وہ جاتے ہوئے ثروت کو بھی اپنے ساتھ باورچی خانے میں لے گئی۔ ہم دودھ پتی کے گھونٹ بھرتے اور باتیں کرتے رہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم بارڈر کے آر پار آتے جاتے رہتے ہو۔ کیا کسی طرح وہیں پاکستان نہیں بھیج سکتے؟“

اس نے کہا۔ ”پھر وہی گل کر رہے ہو بادشاہو! واہگرو کا لکھ لکھ شکر کرو کہ تم دونوں وردی والوں سے بچ آئے ہو۔ میں نہ ملتا تمہیں تو اب تک ملٹری پچھواڑے تمہاری لاشوں کی چیر پھاڑ بھی ہو چکی ہوتی۔ ابھی [illegible] طرف جانے کی گل نہ کرو۔ ابھی دو چار دن یہاں چھپ کر گزارو۔ پھر دیکھتے ہیں تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ ویسے سارا کام اتنی جلدی ہونے والا نہیں۔“

کھانا مزے دار تھا لیکن ہماری اندرونی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ اس سے لطف اٹھا سکتے۔ ثروت نے اپنے گھٹنے پر تیل کی مالش کی اور گرم پٹی باندھ لی۔ ہمیں سونے کے لیے گھر کا ایک پچھلا کمرا دیا گیا۔ ہم دونوں دیر تک جاگتے رہے اور اپنے اپنے خیالوں میں گم رہے۔ حالات کی آندھی ہمیں اڑا کر کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ ہم یوسف کو ڈھونڈنے نکلے تھے اور شاید یوسف سے پہلے ہی خود نشانے پر پہنچ گئے تھے اور اس دوران میں کئی بندوں کا قتل بھی میرے کھاتے میں آ گیا تھا۔ راجا کی شکل رہ رہ کر نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ نہیں کہ وہ مر چکا تھا یا زندگی کی کوئی رمق اس میں باقی تھی۔ نیتو عرف کرشمہ کپور کے بارے میں تو مجھے سو فیصد یقین تھا۔ وہ زندگی کی سرحد پار کر چکی ہے۔ میں عمران کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔ پتا نہیں کہ وہ کہاں تھا اور اسے میرے حالات کی کہاں تک خبر ہوسکی تھی۔ ثروت بھی اپنے گھر والوں سے بس دو تین روز کی مہلت لے کر ہی نکلی تھی۔ یقیناً اب تک انہوں نے بھی اس کے بارے میں پریشان ہونا شروع کر دیا ہوگا۔ میں جانتا تھا، مجھے اور ثروت کو فون کر کر کے وہ بدحال ہو چکی ہوگی۔ بظاہر تو یہ سارا کام لطیف کریانے والے کی بیوی کی وجہ سے خراب ہوا تھا لیکن تقدیر کے ”کردار“ کو اس حوالے سے کیسے نظرانداز کیا جاسکتا تھا۔

اگلے روز سویرے جگت نے بڑا تگڑا ناشتا ہمارے سامنے رکھا۔ مکئی کے میٹھے پراٹھے جن میں گھی کی جگہ دودھ، مدنی استعمال کی گئی تھی۔ گاڑھی میٹھی لسی، ساگ اور چائے۔ آخر میں دودھ پتی۔ رات کی طرح اب بھی ہم اس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔ ثروت تو بس چند نوالے لے ہی کر رہ گئی۔ اس کے ٹخنے پر ایک بڑا سا پتا بندھا ہوا تھا۔ یہ پٹی آشا نے آج صبح کی تھی۔ کوئی گھریلو ٹوٹکا تھا۔ اس میں ہلدی، نمک اور آٹا وغیرہ استعمال ہوا تھا۔ آشا نے ثروت کو گولی اور جوشاندے سے بنی ہوئی کوئی دوا بھی کھلائی تھی اور اسے یقین تھا کہ ایک آدھ دن میں ثروت کا بخار رفوچکر ہو جائے گا۔

جگت نے مجھے اور ثروت کو گھر کا پچھلا کمرا دیا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ ہم ابھی برآمدے یا صحن میں نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ یقیناً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر میں ہماری موجودگی دوسروں پر ظاہر ہو۔

ناشتے کے بعد ثروت دوسرے کمرے میں آشا کے پاس چلی گئی۔ میں اور جگت ادھر ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جگت نے مجھے گھر کے پچھواڑے ایک طویل نیم پختہ کمرا بھی دکھایا۔ اسے وہ ڈھارا کہہ رہا تھا۔ میں دیکھ کر حیران ہوا کہ ڈھارے میں ورزش کا بہت سا سامان پڑا تھا۔ ویٹ لفٹنگ اور باڈی بلڈنگ کا انتظام بھی تھا۔ ایک طرف سینڈ بیگ لٹکا ہوا تھا۔ جگت نے بتایا کہ یہ اس کے چھوٹے بھائی گوبندر کا کراٹے کا اکھاڑا ہے۔ باتوں کے دوران میں جگت نے ایک بار پھر رات والا موضوع چھیڑ دیا۔ وہ مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا جنہوں نے اس بارشی رات میں میرا خونی تعاقب کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک زمیندار کے بندے تھے، وہ زمیندار کا نام پوچھنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”سرحد پار کا ایک گاؤں ہے روحی وال۔۔۔ وہاں کا چودھری ہے۔ انور نام ہے اس کا۔۔۔“

جگت سنگھ کے چہرے پر خون کی سرخی دوڑی۔ وہ میری ران پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”اوئے سیدھی طرح بتانا کہ حویلی کا چودھری گنجا انور۔۔۔“

”تم اسے جانتے ہو؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس کی سات پشتوں کو جانتا ہوں۔ کئی بار واسطہ پڑ چکا ہے اس خانہ خراب سے۔ اب تو وہ بڑا اچھے خان بن گیا ہے۔ کچھ سال پہلے اس پر پاؤڈر اسمگل کرنے کا پرچہ ہوا تھا۔ نانیوں کی طرح چھپتا پھرتا تھا پولیس والوں سے۔ میں اس کی ساری ہسٹری جانتا ہوں۔ ایک دفعہ ہور کالج کی کسی کڑی سے عشق چڑھایا تھا اس نے۔ ون وے ٹکٹ کی طرح وہ ون وے عشق تھا۔ لڑکی کے بھائیوں نے اسے بڑا مارا تھا۔ یہ اس کڑی کا تو کچھ نہ کر سکا، پر کسی اور شہری کڑی سے ویاہ کر کے اسے اپنے پنڈ لے آیا۔ وہ کیا کہتے ہیں یارا! ڈنگا کھوتے تو سانے غصہ کمہار تے۔ اب سنا ہے وہ بہت بڑا ”چودھری“ بنا ہوا ہے۔ وحشت ڈال رکھی ہے اس نے علاقے میں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔۔۔ ہے تو کچھ ایسا ہی۔“

”پر یارا! تیرے ساتھ چودھری انور کا پھڈا کیسے ہو گیا؟ ویسے جھگڑے تو بس تین ہی ہوتے ہیں۔ زنانی، زمین اور زر۔ تیرے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟“

”کیا یہ بتانا ضروری ہے؟“ میں نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں یارا نہیں۔ تو ایویں غصہ نہ کر۔ تو تو اپنا جگر پارہ ہے۔ سچ بڑا مزہ آیا ہے تجھ سے مل کر۔ بس یوں سمجھ کہ اندر سے آتما خوش ہوگئی ہے۔“

اتنے میں باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ جگت نے ثروت کو آواز دی۔ ”چھوٹی بہن! تو ادھر آجا کمرے میں۔“

ثروت میرے پاس آگئی۔ جگت نے ہمیں اندر ہی رہنے کی ہدایت کی اور خود باہر چلا گیا۔

اس کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد ہوئی۔ ”خیریت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، وہ ایک بھینس کچھ بیمار ہے۔ ڈنگر ڈاکٹر آیا تھا اسے ٹیکا لگانے کے لیے۔“

”باہر کے کیا حالات ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”باہر جاتا ہوں تو پتا کرتا ہوں۔ یہاں بی ایس ایف والے پنڈ کے اندر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہر نئے آنے والے بندے کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تلاشیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ تم کو ابھی باہر بالکل نہیں نکلنا۔ میں چوکی کی طرف جا رہا ہوں دودھ دینے۔ شاید تھوڑی دیر ہو جائے۔ پر شام سے پہلے آجاؤں گا۔“

”میرا خیال ہے کہ میں اپنی گن یہاں کمرے میں لے آؤں۔ ذرا اطمینان رہے گا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہیں خود ہی لا دیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایل ایم جی کو ایک چنگی میں لپیٹ کر اندر لے آیا۔ گولیوں والا تھیلا بھی ساتھ ہی تھا۔ میں نے لوڈ گن ایک الماری کے پیچھے رکھ دی۔

جگت کے جانے کے بعد ہمارے ساتھ بس آشا ہی رہ گئی۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھ رہی تھی۔ اس نے دوپہر کا کھانا کھلایا اور دو تین بار دودھ پتی بھی پلائی۔ جگت نے کہا تھا کہ وہ شام تک واپس آجائے گا مگر وہ نہیں آیا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ رات گہری ہوگئی۔ ذہن میں کئی طرح کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ میں نے اس بارے میں آشا سے پوچھا تو اس نے تسلی دی۔ وہ بولی۔ ”بیرا جی! پریشانی کی کوئی گل نہیں۔ وہ کئی دفعہ دیر سے آتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو رات بھی وہیں گزار دیتے ہیں۔ کئی وردی والوں سے ان کی یاری دوستی

ہے۔ وہاں شکار کا گوشت پکاتے ہیں اور بیچتے پلاتے ہیں۔“ آخری الفاظ اس نے ذرا مسکراتے ہوئے کہے۔

وہ بظاہر گھریلو عورت نظر آتی تھی۔ اپنے مرد کی ہاں میں ہاں ملانے والی اور اس کی خامیوں کو نظرانداز کرنے والی۔ وہ ہمیں سارا دن کام کرتی ہوئی ہی نظر آئی۔ کبھی بھینسوں کا دودھ دھو رہی ہے، کبھی ”تندوری“ پر روٹیاں پکا رہی ہے، کبھی مکھن سے گھی نکال رہی ہے یا دودھ کو جاگ لگا رہی ہے۔ رات دس بجے کے قریب آشا نے اعلان کیا کہ اگر جگت اب تک نہیں آیا تو اب سویرے ہی آئے گا۔ شاید دودھ دھونے کے وقت پہنچ جائے۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم آرام تسلی سے سو جائیں۔

مگر تسلی کہاں تھی۔ میرے ذہن میں مسلسل اندیشے سر ابھار رہے تھے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوگئی ہو۔ بی ایس ایف یا پھر پاکستانی رینجرز نے اسے پکڑ نہ لیا ہو۔ انہیں رات والی کارروائی کا شک نہ ہوگیا ہو۔ ثروت بھی بالکل گم صم تھی۔ اس کا بخار ہلکا ضرور ہوا تھا مگر اس نے مکمل جان نہیں چھوڑی تھی۔ میں آٹھ دس فقرے بولتا تھا تو وہ اس کے جواب میں بس ایک فقرہ بولتی تھی۔ تین روز پہلے جو خونی واقعہ ہوا تھا، اس کے اثرات بھی اس کے دل و دماغ کو چھو کے لگا رہے تھے۔ اس کے ذہن میں جو سب سے تکلیف دہ سوال تھا اور جو وہ کئی بار مجھ سے پوچھ بھی چکی تھی، یہ تھا کہ ہم واپس کیسے جائیں گے؟

میں اسے تسلی دے رہا تھا لیکن ٹھوس جواب میرے پاس بھی نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا اتنا اچانک تھا کہ ہم اس کی مزاحمت ہی نہیں کر سکے تھے اور اب یہاں انڈین علاقے میں موجود تھے۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ ثروت کو نیند آگئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد میں بھی سو گیا۔ پتا نہیں کتنی دیر بعد میں کسی تیز آواز کی وجہ سے جاگا۔ شاید کسی نے زور سے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے سوچا، کہیں جگت واپس تو نہیں آگیا۔

بستر سے اتر کر میں نے ہولے سے دروازہ کھولا اور برآمدے میں جھانکا۔ بلب کی مدھم روشنی میں برآمدے کے اندر ایک موٹر سائیکل کھڑی نظر آئی۔ قریب ہی ہیلمٹ بھی دھرا تھا۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ جگت نے بتایا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی شہر سے آنے والا ہے۔ لگتا تھا کہ وہ آگیا ہے۔ مجھے کسی کمرے سے ایک قہقہے کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ یہ مردانہ آواز تھی اور جگت کی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر تک تذبذب میں کھڑا رہا۔ پھر دوبارہ بستر پر آگیا۔ چند فٹ دور دوسرے بستر پر ثروت سو رہی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی ہوئی تھی اور شانوں تک چادر کھینچ رکھی تھی۔ سوتے میں بھی اوڑھنی اس نے سر پر رکھی تھی۔ میں کھڑکی سے آنے والی مدھم روشنی میں محویت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالوں اور اوڑھنی نے اس کا نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا جیسے پوری شب کا چاند آدھا بادلوں میں چھپا ہوا ہو۔ وہ میرے پاس بھی تھی اور بہت دور بھی۔

کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ کسی کمرے سے دبی دبی آوازیں آرہی ہیں۔ شاید آشا اور جگت کا چھوٹا بھائی گوبندر ایک ہی کمرے میں بیٹھے تھے۔ لیکن ابھی میں نے دیکھا تھا، صرف برآمدے میں روشنی تھی۔ تینوں کمرے مکمل طور پر تاریک تھے۔ تو کیا آشا اور جگت کا بھائی ایک ہی تاریک کمرے میں تھے؟

یہ کافی سنگین سوال تھا۔ میرے اندر تجسس جاگا اور میں ایک بار پھر اپنے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر جھانکا۔ باورچی خانے کی طرف سے کھٹ پٹ کی آواز آرہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے ایک صحت مند نوجوان کو دیکھا۔ وہ ہاتھ میں مٹھائی کا ادھ کھلا ڈبا لیے باورچی خانے کی طرف سے آرہا تھا۔ اس نے نیلی جینز اور دھاری دار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ ماتھے پر چوٹوں کے دو تین پرانے داغ تھے۔ میں نے دیکھا، اس کی قمیص کے سارے بٹن کھلے ہیں۔ میں اسے ایک سیکنڈ میں پہچان گیا۔ یہ جگت سنگھ کا چھوٹا بھائی گوبندر ہی تھا۔ ٹرافیوں اور ایوارڈز وغیرہ والے کمرے میں، میں نے اس کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ مٹھائی لیے وہ ایک کمرے کے اندر اوجھل ہوگیا۔ باتوں کی آواز اسی کمرے سے آرہی تھی اور یہ کمرا تاریک تھا۔

میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ آج رات جگت سنگھ گھر میں موجود نہیں تھا۔ میں اور ثروت پچھواڑے والے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ جگت کا چھوٹا بھائی شہر سے آیا تھا اور اب جگت کی پتنی کے ساتھ کمرے میں تھا۔ کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ میں نے میز سے ایک خالی گلاس اٹھایا۔ چند سیکنڈ بعد میں ننگے پاؤں اپنے کمرے سے نکلا اور اس بند کمرے کے قریب پہنچ گیا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو واٹر کولر سے پانی پینے کا بہانہ نہایت معقول ثابت ہو سکتا تھا۔ میں ایک بند کھڑکی کے قریب پہنچا تو اندر سے ابھرنے والی آوازیں واضح سنائی دینے لگیں۔ شاید اندر وہ پلنگ، کھڑکی کے بالکل پاس تھا جہاں آشا اور جگت موجود تھے۔ میں نے دلیری کی اور کھڑکی سے کان لگا دیے۔ اندر ہونے والی مدھم گفتگو ہیجان خیز تھی۔ جگت اور آشا ناگفتہ بہ حالت میں تھے۔ غالباً وہ اکٹھے ہی





لیٹے تھے اور کھلی ڈلی گفتگو کر رہے تھے۔

آشا نے بے تکلف لہجے میں کہا۔ ”کچھ خیال کر گوبندے! وہ تیرے وڈے بھرا کے پروہنے (مہمان) ہیں۔ وہ کیا سوچے گا؟“

گوبندر بولا۔ ”اوئے چھڈ اس بات کو۔ وڈے بھرا کے جس طرح کے پروہنے یہاں آتے ہیں، ان سب کا ہمیں پتا ہے۔ کوئی پوڈر فروش ہوتا ہے۔ کسی کے پیچھے پولیس لگی ہوتی ہے۔ کوئی رنانی کو بھگا کر لایا ہوتا ہے۔ کسی کو زنانی بھگا کر لائی ہوتی ہے۔ مجھے بھی یہ دونوں ایسے ہی بھگوڑے لگتے ہیں۔ ویسے یہ دونوں پینڈو ہیں کہ شہری؟“

آشا کی آواز آئی۔ ”کپڑوں اور گل بات سے تو کسی پنڈ کے ہی لگتے ہیں۔ پر یہ جو کڑی ثروت ہے نا، یہ کچھ پڑھی لکھی بھی لگتی ہے۔“

”پڑھی لکھی ہوتی تو اس طرح کے کام کرتی؟ یہ ساری دونمبریاں ہیں۔ تجھے نہیں پتا۔“

”کچھ بھی ہے گوبندے! میں تجھ کو یہ غلط کام نہیں کرنے دوں گی۔ تو نے جو ٹھرک جھاڑنا ہے مجھ سے جھاڑ لے۔ میں ہوں نا تیرے پاس۔“

”اوئے میں کب کہتا ہوں کہ تو نہیں ہے میرے پاس۔ پر کبھی کبھی منہ کا سواد بدلنے کو بھی تو من کرتا ہے نا... کڑی سوہنی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ بندہ بھی کچھ زیادہ آکڑ شاکڑ نہیں دکھائے گا۔“

”کیوں نہیں دکھائے گا؟“ آشا نے پوچھا۔

”بس نہیں دکھائے گا۔ چور کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اور اس طرح بارڈر پار کرنے والے چور ہی تو ہوتے ہیں۔ تو دیکھنا، میں کس طرح ان دونوں کو اپنے کینڈے میں لاتا ہوں۔ جو کہوں گا، وہی کریں گے اور دیکھنا ساتھ منت ترلا بھی کریں گے۔“ گوبندر کی آواز میں پکے غنڈوں جیسی کرختگی تھی۔

”نہیں گوبندے! یہ ٹھیک نہیں ہے اور... اور اس کڑی کا پاؤں بھی زخمی ہے۔ اتنا بڑا پٹا باندھا ہوا ہے میں نے اس پر... بخار بھی ہے اسے۔“

”اوئے ہوئے، تو میں نے کون سا اس کو سیر سپاٹے کے لیے آگرے لے کر جانا ہے۔ ادھے پونے گھنٹے کی دل پشوری ہی تو کرنی ہے، کچھ نہیں ہوگا اسے۔“

”اور اگر وہ بندہ تیرے اندازے سے زیادہ ڈھاڈا (سخت) نکلا تو پھر؟“

”نہیں نکلے گا۔ اور اگر نکلے گا تو اس کا علاج بھی میرے پاس ہے... تو بے فکر رہ... بس شانتی سے لیٹ

یہاں۔“ گوبندر نے کہا اور اس کے ساتھ ہی گلاس اور بوتل ٹکرانے کی مدھم آواز بھی آئی۔ گوبندر شاید تھوڑی بہت پی بھی رہا تھا۔ بہرحال، اس کی آواز میں شرابیوں جیسی لڑکھڑاہٹ بالکل نہیں تھی۔

میں نے چار پانچ منٹ مزید ان کی گفتگو سنی۔ یہ کافی معلوماتی گفتگو تھی۔ اس گفتگو سے میں نے یہ انکشاف انگیز نتیجہ نکالا کہ آشا، جگت سنگھ کی دھرم پتنی نہیں بلکہ محبوبہ ہے۔ وہ دو تین سال سے بغیر شادی کے ہی اس کے ساتھ اس سرحدی گاؤں میں رہ رہی ہے۔ جگت سنگھ کی اصل بیوی کہیں سورت نگر کے آس پاس رہتی تھی۔ جگت سنگھ، آشا کو بیاہ کر نہیں بلکہ کہیں سے بھگا کر لایا ہوا تھا۔ اب وہ جگت کے ساتھ ساتھ گوبندر کی راتیں بھی چمکا رہی تھی۔ معلوم نہیں کہ جگت کو اس کی خبر تھی... یا وہ بے خبر تھا... یا پھر باخبر ہو کر بھی بے خبر بنا ہوا تھا۔

جب مجھے اندازہ ہوا کہ گوبندر سنگھ کمرے سے نکلنے کی تیاری کر رہا ہے تو میں جلدی سے واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ثروت حالات کی سنگینی سے بےخبر سو رہی تھی۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور گن الماری کے پیچھے سے نکال کر اپنی چارپائی کے نیچے اس طرح رکھ لی کہ نظر نہ آئے اور بہ آسانی پکڑی بھی جا سکے۔ تب میں دوبارہ بستر پر دراز ہوگیا۔

دو تین منٹ بعد دروازے سے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ثروت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ میں تو پہلے ہی جاگ رہا تھا۔

”کون؟“ میں نے پوچھا۔

”دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔“ گوبندر نے تیز لیکن دبی آواز میں کہا۔

ثروت ہراساں نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ”تابش! دروازہ نہ کھولیں۔“ وہ بولی۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے تسلی دی اور بلب آن کر کے دروازہ کھول دیا۔ گوبندر تیزی سے اندر آیا اور کرخت آواز میں بولا۔ ”خود مرو گے اور ہمیں بھی مرواؤ گے۔ بند کرو یہ بلب۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر بلب کا سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں ایک بار پھر کھڑکی سے آنے والی مدھم روشنی ہی رہ گئی۔

”کون ہیں آپ؟“ میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

”مالک ہوں اس گھر کا... جگت سنگھ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ پنڈ میں بی ایس ایف والے آئے ہیں۔ گھر گھر تلاشی

لے رہے ہیں۔ انہیں کوئی شک ہے او۔۔۔ اور مجھے لگتا ہے کہ تمہارا ہی شک ہے۔'' وہ خوف زدہ کرنے والے انداز میں بولا۔

تب اس نے سرتاپا ثروت کو گھورا۔ وہ اوڑھنی لپیٹے سہمی سمٹی کھڑی تھی۔ بالوں کی چند لٹیں رخساروں پر جھول رہی تھیں۔ ''یہ کیا لگتی ہے تیری؟'' اس نے پوچھا۔

''بیوی ہے۔''

''منہ بولی لگتی ہے۔ بھاگ کر آئے ہو بارڈر پار سے؟'' اس نے پولیس والوں کے انداز میں پوچھا۔

''جگت سنگھ جانتا ہے سب کچھ۔'' میں نے جواب دیا۔

''بھائی جانتا ہوتا سب کچھ تو اس طرح کا بکھیڑا پنگا ہی نہ لیتا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے اسے بھی اُلو بنایا ہے۔ اچھا اب آواز شواز نہ نکالنا۔ دروازہ اندر سے بند کرو اور چپ چاپ پڑے رہو یہاں۔ ورنہ تمہارے ساتھ ساتھ ہماری چمڑی بھی ادھڑ جائے گی۔ وہ لوگ گلی میں ہی کھڑے ہیں۔ میں جا کر بات کرتا ہوں ان سے۔''

وہ ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ یہ بات تو ٹھیک تھی کہ بارڈر سیکیورٹی والے گاؤں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ لوگوں کو جمع کر کے باقاعدہ شناخت پریڈ اور گنتی وغیرہ بھی ہوتی تھی مگر فی الوقت گوبندر سراسر ڈراما کر رہا تھا۔

ثروت ہراساں تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ آرام سے بیٹھ جائے۔ اگر یہ بندہ واپس آئے اور کوئی الٹی سیدھی بات کرے تو تحمل سے سن لے۔

حسب توقع آٹھ دس منٹ بعد گوبندر پھر دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور غصیلے لہجے میں بولا۔ ''گرو نے کرپا کی ہے تم پر۔ سمجھو بال بال بچے ہو۔ لیکن ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ ان کی جیپ گلی میں ہی کھڑی ہے۔ وہ خود نمبردار کی بیٹھک میں چائے وغیرہ پی رہے ہیں۔ ان کو شک ہے کہ تم دونوں اس گلی کے ہی کسی گھر میں موجود ہو۔''

''ان کو شک کیسے ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ میں نے اپنا لب ولہجہ دیہاتی ہی رکھا تھا۔

''تمہاری وڈی پھوپی نے جا کر بتایا ہے ان کو۔'' وہ سخت طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اوئے بے وقوفا! یہ لوگ تو اڑتی چڑیا کے پر گنتے ہیں۔ بندہ سامنے سے گزرے تو اس کی سات پشتوں کا ایکسرے اتار لیتے ہیں۔''

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ جگت کی اطلاع کے مطابق وہ واقعی غصیلا اور آتش پا شخص تھا۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ اس کی ہڈی بڑی سخت ہے اور لڑائی کٹائی اس کا پیشہ ہے۔ اس کی حرکات و سکنات میں چیتے کی سی تیزی تھی۔ وہ اپنی چمکیلی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر بولا۔ ''وہ لوگ ایک پاکستانی جوڑے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس لیے تم دونوں کا ایک کمرے میں رہنا بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ کڑی کو وہاں بھیج دو بھابو کے پاس۔ اگر تمہیں لگے کہ کوئی کمرے کی طرف آ رہا ہے تو یہ پچھلی والی کھڑکی کھول کر باہر چھلانگ مار دینا۔ ساتھ ہی پرالی والی کوٹھڑی ہے۔ پرالی میں تجھے چھپ جانا۔ لیکن پہلے اس کمرے میں سے اپنی نشانیاں ختم کرو۔ کوئی ایسی ویسی چیز نظر نہیں آنی چاہیے۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہیں جیسے ثروت کا اسکین کر رہی تھیں۔ وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''چلو، آجاؤ۔ تمہیں بھابو کے پاس لے چلتا ہوں۔''

ثروت نے ڈری ہوئی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ ہرگز جانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''بھائی صاحب! یہ ویسے شاید نہ مرے لیکن ڈر ڈر کر ضرور مر جائے گی۔ اسے میرے پاس ہی رہنے دیں یا پھر ہم دونوں کو لے چلیں۔''

''تیرے کھوپڑے میں دماغ ہے یا گوبر؟ سمجھ میں نہیں آ رہی میری بات۔ وہ چیر کر رکھ دیں گے تم دونوں کو۔ تمہارے ساتھ ساتھ ہمارا بھی حشر نشر ہو جائے گا۔ کرپا کرو ہمارے حال پر۔'' پھر وہ ثروت سے مخاطب ہوا۔ ''چل کڑیئے، مجھے پتا ہے یہ سارا پواڑا تیری وجہ سے ہی پڑا ہے۔''

''مجھے نہیں جانا۔'' ثروت نے لرزاں آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ بیٹھی رہ یہاں اپنے اس یار کی گود میں۔۔۔ بیٹھی رہ۔۔۔ میں جاتا ہوں۔''

''کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''سیکیورٹی والوں کے پاس۔ وہ خود تمہیں پکڑیں گے تو ساتھ میں ہمارے بھی کڑاکے نکال دیں گے۔ بہتر ہے کہ میں خود ہی ان کو انفارم کر دوں۔''

میں نے اس کا بازو تھاما۔ ''نہیں یار! ہم پروہنے (مہمان) ہیں تمہارے وڈے بھائی کے۔ ایسا نہ کرو ہمارے ساتھ۔''

''تو پھر ویسا کرو جیسا کہہ رہا ہوں۔ اس کو بھیج دو میرے ساتھ۔ اس کے تنگنے نہیں اتر جائیں گے۔ اور نہ ہی چرچی نہیں ہے جتنی بن رہی ہے۔ تیرے ساتھ بھی گی بھاگی پھر رہی ہے۔ راتیں گزار رہی ہے۔ ایسی کڑیاں بڑی کھوچل ہوتی ہیں۔'' گوبندر کا لہجہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ غالباً اسے

یقین ہوگیا تھا کہ ہم دونوں مفرور ہیں... اور ایک بھاگی ہوئی مفرور لڑکی سے مستفید ہونے کا اسے بھی اتنا ہی حق ہے جتنا مجھے ہے۔

میری خاموشی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ بہت ہوشیار ہونے کے باوجود میرے بارے میں قطعی غلط اندازہ لگا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے اپنا ہاتھ ثروت کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”چلو۔“

میں نے اس کا راستہ روکا اور مستحکم انداز میں کہا۔ ”نہیں گوبندر! یہ یہاں سے نہیں جائے گی۔“

”اگر یہ میرے ساتھ نہیں جائے گی تو پھر بی ایس ایف والوں کے ساتھ جائے گی۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔“ وہ آگے بڑھا۔

”چھوڑ دو۔“ میں نے کہا۔

”اگر نہ چھوڑوں تو؟“ وہ سرتاپا آتش تھا۔

میری نگاہوں میں کچھ بھولے بسرے منظر گھوم گئے۔ مجھے لگا کہ آج پھر میرے کالج کے زمانے کا غنڈا واجی ایک نئی صورت میں میرے سامنے کھڑا ہے۔ وہ پھر ثروت کو مجھ سے دور لے جانا چاہ رہا ہے... لیکن آج میں بے بس نہیں تھا۔ میں آگے بڑھنے والے کا راستہ روک سکتا تھا اور مارنے والے کے ہاتھ توڑ سکتا تھا۔ میں نے گوبندر کی توانا کلائی پر ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے اس کی گرفت ثروت پر سے ختم کردی۔ اس کی آنکھوں میں برق لہرا گئی۔ اس نے الٹے ہاتھ کی زوردار ضرب میرے چہرے پر لگانی چاہی۔ میں نے اس کی دوسری کلائی بھی تھام لی۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت چمکی۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ میں اتنی تیزی دکھاؤں گا اور میری گرفت بھی اتنی سخت ہوگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر لڑنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے ”جم“ میں چلے چلو۔ وہیں دو دو ہاتھ کر لیتے ہیں۔“

وہ سنبھل کر پھنکارا۔ ”جانتے ہو میں کون ہوں؟“

”نہیں جانتا... اور تم بھی نہیں جانتے۔“

”میں لڑنے والے کی کم از کم ایک ہڈی ضرور توڑتا ہوں۔“

”چلو دیکھ لیتے ہیں۔“ میں نے اس کی کلائیاں چھوڑتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک بار پھر دھیان سے مجھے سرتاپا دیکھا۔ غالباً پہلی بار اس کی نظر میرے ہاتھ پاؤں کی غیر معمولی جلد پر بھی پڑی۔ وہ میرے حوالے سے الجھن میں نظر آنے لگا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ میں جس حیثیت سے نظر آ رہا ہوں، وہ میری اصل حیثیت ہے یا نہیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

”کوئی بھیس شیس بدلا ہوا ہے تم نے؟“

”اس دنیا میں تو ہر کوئی بہروپیا ہے۔ تم کام کی بات کرو۔ ہماری جان چھوڑنی ہے یا لڑ کر چھوڑنی ہے؟“

اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ پھر لمبی سانس لے کر بولا۔ ”لگتا ہے کہ اپنی فیلڈ کے ہی بندے ہو لیکن استادے ہو۔ کہاں ٹریننگ کرتے رہے ہو؟“

”گلیوں میں اور سڑکوں پر اور ہر اس جگہ جہاں تم جیسے منہ زور دولتیاں جھاڑتے پھرتے ہیں۔“

”چلو آجاؤ... آجاؤ پھر۔“ اس نے فرطِ طیش میں میرا بازو پکڑا اور تقریباً کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کردیا جیسے اسے ڈر ہو کہ ثروت موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ جائے گی۔ اس کا رخ اپنے جم نما ڈھارے کی طرف تھا۔ وہ نا یا مجھے جان بوجھ کر اس کمرے کے اندر سے لایا جہاں اس کی ٹرافیاں اور بے تعداد کپ سجے ہوئے تھے۔ مار ماری کی تصویریں بھی تھیں۔ اس نے جیسے بے زبان خاموشی مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

دو منٹ بعد ہم ڈھارے کے کچے فرش پر ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ گوبندر نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور بلب آن کرلیا تھا۔ اس نے بڑے گھمنڈی انداز میں اپنی دھاری دار شرٹ اتار کر ایک طرف رکھی۔ وہ مجھے نگاہوں میں تول رہا تھا۔ غالباً یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ میں اتنے اعتماد سے اس کے مدِمقابل کیوں آگیا ہوں... حالانکہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکا ہوں۔

جب اس نے دیکھا کہ میں واقعی اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار ہوں تو اس نے جارحانہ انداز میں اپنی دونوں مٹھیاں بھینچیں اور میرے روبرو ہوگیا۔ میرے ہاتھ پر بھی جیسے کھجلی ہو رہی تھی اور میں فائٹنگ کے موڈ میں تھا۔ میں نے باقاعدہ کھلاڑیوں کے انداز میں اسے ”بو“ کیا، تاہم اس نے میرے سامنے جھکنے کی زحمت نہیں کی۔

پہلا وار اسی نے کیا۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے ٹانگ چلائی۔ کراٹے کی زبان میں اسے ”اپر پام“ کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً مدِمقابل کی پسلیوں یا کنپٹی کو نشانہ بناتی ہے۔ گوبندر نے میری کنپٹی کو نشانہ بنایا تھا۔ میں نے اطمینان سے یہ وار روکا۔ اس کے فوراً بعد گوبندر نے گھوم کر بڑی مہارت سے بیک کک لگائی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر یہ وار بچایا۔ اس وار نے مجھے سمجھا دیا کہ گوبندر واقعی ایک ماہر ”لڑاکا“ ہے۔





میں اسے کسی صورت ”ایزی“ نہیں لے سکتا۔ اس کے اس وار کے بعد ہم دونوں میں گھمسان کا رن پڑ گیا۔ شروع میں، میں بچتا رہا لیکن پھر گوبندر کو کچھ کاری ضربیں لگائیں۔ اسے میرے معیار اور ”کیلیبر“ کا اندازہ ہوا اور اس کی حرکات میں جارحیت کے بجائے دفاعی انداز نمودار ہوگیا۔ اس کے چہرے پر کچھ حیرت بھی تھی۔ وہ ذرا ہانپا ہوا نظر آیا تو میں نے حملہ کی۔ پھر ایک زوردار لات کھا کر وہ سینڈ بیگ سے ٹکرایا اور گھومتا ہوا رننگ مشین پر گرا۔ میں نے اسے اٹھنے کا موقع دیا اور ایک بار پھر سخت حملہ کیا۔

اس مرتبہ گوبندر کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا اور اس کی پشت کا دیوار سے شدید تصادم ہوا۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا۔ اس کے بال عقب سے گرد آلود تھے۔ میں نے پھر اسے اٹھنے کی وافر مہلت دی۔ وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر آیا۔ اس کا ایک پنچ یقیناً مہلک ثابت ہوتا لیکن میں خود کو بچا گیا۔ سزا کے طور پر میں نے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ضرب لگائی۔ وہ سہہ نہ سکا اور چوٹ کھا کر گرا اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے تیسری بار اسے اٹھنے کی مہلت دی لیکن اس بار گوبندر نے لیٹے رہنا ہی مناسب سمجھا۔

میں نے کہا۔ ”کپ اور ٹرافیاں ہر کسی کو ناک آؤٹ نہیں کرسکتیں۔ بعض لوگوں کے ساتھ لڑنا بھی پڑتا ہے۔“

وہ کراہتا رہا۔ میں نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور ایک کرسی پر بٹھایا۔ پھر ایک تولیہ دیا جس سے اس نے اپنا خون آلود منہ پونچھا۔ وہ ایک دم ٹھنڈا ٹھار نظر آ رہا تھا۔ باہر سے آشا نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کردیا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا کر رہے ہو تم دونوں؟“

گوبندر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں۔“

وہ واپس چلی گئی۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور گوبندر گھر کی بیٹھک میں بیٹھے تھے اور چینی کے پیالے میں دودھ پتی پینے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے۔ گوبندر کی ایک آنکھ کے نیچے کافی بڑا نیل تھا۔ وہ جیسا بھی تھا لیکن اس نے اسپورٹس مین شپ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ہار تسلیم کی تھی اور باقاعدہ اپنے رویے کی معذرت بھی چاہی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ گاؤں میں بی ایس ایف والے نہیں آئے اور اس حوالے سے خیریت ہی ہے۔ وہ نہ صرف ذہنی طور پر مجھ سے مرعوب ہوچکا تھا بلکہ جسمانی طور پر میری برتری بھی تسلیم کرچکا تھا۔

میرے ساتھ فائٹ شروع ہوتے ہی اسے یقین ہوگیا تھا کہ میں باقاعدہ تربیت یافتہ ہوں اور اس شعبے میں اس سے کہیں آگے ہوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ ہم نے دیہاتیوں کا بھیس بدل رکھا ہے ورنہ ہم دونوں پڑھے لکھے شہری ہیں۔ میں بھی اب اس سے بات کرتے ہوئے دیہاتی لب و لہجے کا اہتمام نہیں کر رہا تھا۔

اب وہ مارشل آرٹ کے حوالے سے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر رہا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ میں نے اس فیلڈ میں کب قدم رکھا اور کیسے یہاں تک پہنچا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے موقع محل کے لحاظ سے ان سوالوں کے جواب دیے اور اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

اب وہ مجھے احترام کے انداز میں صادق صاحب اور صادق بھائی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کے بڑے بھائی جگت کو اس بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ بس نشے کی حالت میں اس سے غلطی ہوئی جس کے لیے وہ بہت شرمندہ ہے۔ میں نے وعدہ کیا کہ اس بارے میں، میں جگت کو بے خبر رکھوں گا۔ گوبندر نے اپنے بارے میں بھی کچھ باتیں بتائیں۔ اس نے امید ظاہر کی کہ وہ شاید اگلے ماہ انڈیا کے نیشنل کھیلوں میں حصہ لینے کے لیے نئی دہلی جائے گا۔ وہ اب جان چکا تھا کہ میں اور ثروت کسی خاص مقصد کے تحت یہاں اس سرحدی گاؤں میں موجود ہیں مگر اس نے مجھے اس بارے میں زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

جگت سنگھ کی واپسی اگلے روز دس بجے کے قریب ہوئی۔ اس کی جگہ آشا نے گوبندر کے ساتھ مل کر بھینسوں کا دودھ دوہا۔ جگت سنگھ نے چھوٹتے ساتھ ہی چھوٹے بھائی کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس سے پوچھا کہ اس کے تھوبڑے پر نیل کیوں پڑے ہیں؟ اس نے کس کے ساتھ مار دھاڑ کی ہے۔ گوبندر نے معقول بہانہ بتایا کہ یہ کسی مار دھاڑ یا اسٹریٹ فائٹ کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک ٹریننگ باؤٹ یعنی تربیتی مقابلے کے دوران میں ہوا ہے۔ پتا نہیں کہ جگت کو یقین آیا یا نہیں۔ بہرحال اس کے سوال جواب کا سلسلہ ضرور رک گیا۔ آشا نے بھی گوبندر کی چوٹوں کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یقیناً وہ اور گوبندر ایک دوسرے کے ”رازدار“ بھی تھے۔

جگت سنگھ کے چہرے پر مجھے دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ مجھے کچھ بتانا چاہتا ہے۔ میرا اندازہ اس وقت درست ثابت ہوا جب بھینسوں کو چارا وغیرہ ڈالنے کے بعد جگت سنگھ میرے ساتھ علیحدہ کمرے میں آ بیٹھا۔ وہ دروازہ بند کرکے بولا۔ ”اس رات چودھری انور کا کافی ستیاناس کیا ہے تم نے... پانچ بندوں کے ساتھ دو گھوڑیوں

کے پاس بھی گئے ہیں۔ وہاں بندے سخت پھنس بھی ہیں۔
میں نے سب پتا کر لیا ہے۔"
میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تم... بارڈر پار گئے تھے؟"

"او نہیں یارا! ہم پار نہ بھی جائیں تو وہاں کی خبریں از رہمارے پاس آ جاتی ہیں۔ مجھے جانکاری مل گئی ہے کہ چودھری انور کے ساتھ تمہارا کیا پنگا ہوا ہے اور کیسے؟"
میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
وہ بولا۔ "یہ جو کڑی تیرے ساتھ ہے نا، اس کا پتی یوسف غائب ہوا ہے۔ تم دونوں اسے لبھتے لبھتے (ڈھونڈتے ڈھونڈتے) چودھری انور گنجے کی حویلی تک پہنچے ہو۔ وہاں تم پکڑے گئے ہو اور پھر بھاگے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"
"نہیں۔" میں نے اپنے تعجب کو چھپاتے ہوئے کہا۔
"ایک ور اطلاع ہے اور مجھے وشواس ہے کہ اسے سن کر تمہیں ضرور پانچ ہزار وولٹ کا جھٹکا محسوس ہوگا۔ اور وہ یہ کہ... اس کڑی کا پتی یوسف دو اور کڑیوں کے ساتھ بارڈر پار کر کے انڈیا پہنچ چکا ہے۔ اسے پہنچانے والے چودھری انور گنجے کے لوگ ہی ہیں۔"
مجھے اپنے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔
"تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔
"جیسے دوسری ساری باتیں کہہ سکتا ہوں۔" اس نے ترت جواب دیا۔ "اور اس بات کا وشواس رکھ، میں جو کہوں گا واہگرو کی کرپا سے ٹھیک ہی کہوں گا۔"
"تمہیں یہ باتیں کس کے ذریعے معلوم ہوئی ہیں؟"
"سب باتیں، کسی کو کسی ذریعے سے ہی معلوم ہوتی ہیں یارا... تم یہ بتاؤ، میں نے جو کچھ کہا ہے غلط تو نہیں ہے؟"
میں اثباتی انداز میں خاموش رہا۔ پھر میرا دھیان راجا کی طرف چلا گیا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا، اس لڑائی میں ایک بندہ پیلی حویلی کے قریب بھی زخمی ہوا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے تمہیں؟"
جگت نے معاملہ فہم نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "وہ تمہارا ساتھی تھا؟"
"یہی سمجھو۔"
"ٹھیک ہے، پتا کرا لیتے ہیں اس کا بھی۔ کیا نام تھا اس کا؟"
"راجا۔" میں نے کہا۔
"وہ تمہارے ساتھ ہی پیلی حویلی گیا تھا؟"
"نہیں، بعد میں آیا تھا۔"

"اس یوسف نامی بندے کے سلسلے میں ہی؟"
"ہاں۔" میں نے کہا پھر ذرا توقف سے پوچھا۔ "یوسف کے بارے میں اور کیا پتا چلا ہے تمہیں؟"
اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تو سب کچھ ایسے ہی ایک دم پوچھ لوگے۔ تمہیں بادشاہ زادے! یہ تو رک رک کر بتانے والا زمانہ ہے۔ اب دیکھ لو اخباروں، رسالوں میں جو کہانیاں آتی ہیں یا پھر ٹی وی پر ڈرامے آتے ہیں۔ سب رک رک کر بتاتے ہیں۔ اور تو اور اب تو فلمیں بھی ٹوٹوں میں آنے لگی ہیں۔ پارٹ دو اور پارٹ تین وغیرہ وغیرہ۔"
"لیکن یہ کوئی فلم تو نہیں ہے یار! ایک بندے کی زندگی موت کا سوال ہے۔"
"ہاں، یہ گل تو ٹھیک ہے۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے تہ بندکی ڈب میں سے شراب کا پوا نکالا۔ ڈھکن کھول کر دو تین گھونٹ لیے اور اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی سے قطرے پونچھ کر بولا۔ "پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یوسف نام کا بندہ اصل میں ہے کون اور تمہارے ساتھ اس کا کیا سمبندھ ہے؟"
"سمجھ لو کہ میرا عزیز ہے۔ اسے ڈھونڈنا میرے لیے بہت ضروری ہے۔"
وہ ہنسا اور اپنی گھنی مونچھیں سنوار کر بولا۔ "چنگا تماشا ہے۔ جس کو ڈھونڈا جاتا ہے وہ آگے ہوتا ہے، ڈھونڈنے والا پیچھے۔ پر یہاں تم پہلے ہمارے علاقے میں آ گئے ہو، جس کو ڈھونڈ رہے ہو وہ بعد میں آیا ہے۔"
"کہاں ہے وہ؟"
"ابھی پکا پتا تو نہیں چلا ہے مگر صرف یہ سنا ہے کہ وہ فاضلکا کے قریب کسی وڈے وڈیرے کے پاس پہنچایا گیا ہے۔"
"کس لیے؟"
"یہ بھی پتا نہیں۔ یہ باتیں تو وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی پتا چلا ہے کہ جو دو کڑیاں انڈیا آئی ہیں، ان کی شکلیں مشہور فلمی اداکاروں سے ملتی جلتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ یوسف نامی منڈا بھی کسی خاص بندے سے ملتا جلتا ہو اور اس سے ان لوگوں نے کوئی خاص کام لینا ہو۔ کسی کو چکر شکر میں ڈالنا ہو۔"
میں سوچ میں پڑ گیا۔ انڈیا میں پنجابی فلمیں بھی بہت بنتی ہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ یوسف کی شکل پنجابی فلموں کے کسی اداکار سے ملتی ہو جس کو ہم نہ جانتے ہوں یا پھر اس طرح کا





کوئی اور معاملہ ہو سکتا تھا۔
جگت سنگھ بولا۔ "مجھے ایک اور گل کا بھی پتا چلا ہے۔ یہ تمہارا رشتے دار یوسف چنگی بھلی طوائف بازی بھی کرتا ہے۔ اپنی اسی طوائف باری کی وجہ سے یہ ان لوگوں کے ہتھے بھی چڑھا ہے۔ سنا ہے کہ اس بندے نے لاہور میں کسی بڑی مہنگی طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں منائی تھیں اور جب..."
"جگت سنگھ۔" میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "آہستہ بول یار! اس کی بیوی بھی یہاں ہے۔"
"اچھا، وہ وچاری بے خبر ہے۔ ویسے یہ پتنیاں عام طور پر بے خبر ہی ہوتی ہیں۔" وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔ شاید اسے اپنی پتنی کا خیال آ گیا تھا جو سورت نگر کے آس پاس کہیں رہتی تھی۔
"چھا، یہ باتیں تجھے بتائی کس نے ہیں؟"
"یار! تو آم کھا درخت نہ گن... مجھے تو یہ پتا بھی چلا ہے کہ وہ طوائف کسی فلمی ہیروئن سے بہت ملتی جلتی ہے... اور سیدھی تیر کی طرح لگی ہے تیرے اس یار کے سینے میں۔ تیرے یار نے اس کو اپنے حق میں بٹھانے کی گل بھی کی ہے۔"
"حق میں بٹھانے کی؟"
"آہو یار! جب کسی بھی طوائف کو کام سے روکا جاتا ہے اور اپنے لیے سنبھال لیا جاتا ہے تو اسے حق میں بٹھانا کہتے ہیں۔ لیکن وہ کوئی معمولی طوائف نہیں ہے۔ اس نے کافی پیسا مانگا ہے پابند ہونے کا۔ شاید آدھے سال کا کوئی ڈیڑھ کروڑ روپیا۔ تیرے اس یار یوسف نے اس پر بھی تقریباً "ہاں" کر دی ہے۔ بازاری زنانی میں کرنٹ ہو تو بندہ ایسے ہی لوٹو پوٹو ہو جاتا ہے... اور یہ ساری پکی خبریں ہیں بادشاہ زادے۔"
میں سناٹے میں تھا، بہرحال ابھی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "جگت سنگھ! میں نہیں چاہتا کہ یوسف کی بیوی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک بھی پڑے۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ ہمیں اس کا دکھ کم کرنا ہے، بڑھانا نہیں۔"
جگت سنگھ نے مونچھیں مروڑ کر کہا۔ "آپاں (ہم) یاروں کے یار ہیں تاشیا! تو چنتا نہ کر۔ تو جو کہے گا، ویسا ہی ہو گا۔ میں ایک آدھے دن میں پتا کراتا ہوں چھوٹی بہن کے اس دکھڑے تک پہنچی کا۔ اگر مجھے خود فاضلکا جانا پڑا تو خود بھی چلا جاؤں گا۔ تو یہاں آرام کر اور کھا پی۔ چھوٹی کے پیر کو بھی مرہم پٹی کی لوڑ ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے تو پھر آگے کا سوچتے ہیں۔"

رات کو ثروت بہت خاموش اور اداس نظر آئی۔ اس نے کھانے میں بھی بس چند لقمے ہی لیے تھے۔ اس کا بخار تو اتر گیا تھا مگر کمزوری باقی تھی۔ میں نے بہت اصرار سے اسے تھوڑا سا دودھ پلایا۔ وہ چپ چاپ لیٹ گئی۔ وہ اپنے ساس سسر کے لیے بہت پریشان تھی۔ وہ انہیں بس یہ بتا کر آئی تھی کہ ایک دو روز کے لیے پیر تھوتی صاحب کے پاس ہارون آباد جا رہی ہے۔ سسر فاروقی کو پہلے ہی بیٹے کی گمشدگی نے ہلکان کر رکھا تھا، اب بہو بھی لاپتا ہو گئی تھی۔ یقیناً ان پر قیامت گزر رہی تھی۔ ثروت، یوسف کے لیے بھی ازحد پریشان تھی۔ میں اس کی پریشانی بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اسے یہ نہیں بتایا کہ جگت کی اطلاع کے مطابق یوسف کو بھی بارڈر پار کرا کے انڈیا پہنچا دیا گیا ہے۔

☆☆☆

مجھے طبیعت میں کسل مندی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید موسم میں تبدیلی کا اثر تھا۔ رات تک مجھے تیز بخار ہو گیا مگر میں ثروت کو بتا کر اس کی پریشانی میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسپرین کی گولیاں کھا کر سو گیا۔ رات کسی وقت اٹھا تو پورا جسم آگ کی طرح پھنک رہا تھا۔ گلا خشک تھا اور دماغ پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے کولر سے پانی پیا۔ دروازہ بند کر کے واپس بستر پر آیا تو نظر ثروت پر پڑی۔ نیند کی حالت میں اس کا ملیح چہرہ معصومیت اور پاکیزگی کی تصویر تھا۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ میں اٹھ کر اس کی چارپائی کے بازو پر جا بیٹھا۔ میں نے اس کے چہرے پر جھولنے والی دو ریشمی لٹیں پیچھے ہٹا دیں اور عجب والہانہ پن سے اس کے چہرے کو سہلانے لگا۔ ایکا ایکی اس کی پلکوں میں جنبش نظر آئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکی سے آنے والی مدھم روشنی میں اس نے مجھے دیکھا۔ حسین آنکھوں کے شبستان کچھ دیر خالی خالی رہے پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی اس کے چہرے پر۔ اس کی لمبی پلکوں کے نیچے سے دو موتی نکلے اور اس کے رخساروں پر رینگنے لگے۔ اس نے میرا جلتا ہوا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما پھر میرے ہاتھ پر اپنی پیشانی ٹکائی اور سسکنے لگی۔ جیسے وہ کوئی بچھڑی ہرن تھی اور اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہی تھی۔ بخار کی شدت میرے ہوش و حواس کو مختلف کر رہی تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے جھکا۔ ثروت کی گردن کے نیچے سے اپنا بازو گزارا اور ایک بے ساختہ حرکت کے ساتھ اس کا بالائی دھڑ اٹھا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ یہ ناقابلِ بیان صورتِ حال تھی۔ وہ بھی جیسے نیم غنودگی کی حالت میں تھی۔ وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے زخمی جذبوں کی شدت کے

ساتھ اسے بھینچ لیا۔ اس کے نرم ریشمی بالوں پر بوسے دینے لگا۔ وہ جیسے میرے سینے میں سما گئی لیکن جب میرے بے تاب ہونٹ اس کے بالوں سے اتر کر اس کے چہرے کی طرف بڑھنا شروع ہوئے تو اس میں گریز نمودار ہوا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ وہ مجھ سے علیحدہ ہوگئی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میں بھی جیسے اپنے حواس میں لوٹ آیا۔ اٹھ کر اپنے بستر پر دراز ہوگیا اور بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

رات کا باقی حصہ ہم نے جاگتے ہی گزارا۔ دھیرے دھیرے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ سے دوا کھلائی۔ ہم اپنے اپنے بستر پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے رہے پھر باتیں کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ”تابش! مجھے لگتا ہے کہ یہ سارا کچھ میری وجہ سے ہی ہورہا ہے۔ اللہ میری غلطیوں کو معاف کرے۔“

میں نے کہا۔ ”ثروت! ہمیں اپنی غلطیوں کی معافی تو ہر وقت مانگنی چاہیے لیکن تم جس انداز میں سوچ رہی ہو، وہ ٹھیک نہیں۔ تم زندگی میں آنے والی ہر مصیبت کو فوراً اپنی طرف منسوب کرلیتی ہو۔ اسے اپنے ہی کسی عمل کا نتیجہ قرار دینے لگتی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ جو کچھ ہورہا ہے، کسی اور کے عمل کا نتیجہ ہو۔“

”نہیں تابش! میں قصوروار ہوں۔ میں نے جب پہلی بار غلط سوچا تو بھائی ناصر ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئے۔ جب دوسری بار یوسف سے علیحدہ ہونے کا خیال میرے ذہن میں آیا تو نصرت بیمار ہوگئی اور جتنی بیمار وہ ہوئی ہے، آپ کو پتا ہی ہے۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان ہے۔ وہ ایک ہی صورت میں صحت یاب ہوسکتی ہے۔ قدرت مجھے میری غلط روی پر معاف کردے۔“

”تمہاری کوئی غلط روی نہیں ثروت۔ واہموں کے گھیرے سے نکلو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ بس اپنا دل مضبوط رکھو۔ دیکھنا، ایک ایک کرکے ہر مشکل کا حل نکل آئے گا۔“

”ابھی تو کوئی حل نہیں نکل رہا تابش۔ آپ دیکھ رہے ہیں، مشکلوں میں اضافہ ہی ہورہا ہے۔ جب سے میں آسٹریا سے واپس آئی ہوں، یوسف سے میرا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ مجھے... ایک بیوی کا حق دینا چاہتے تھے۔ مجھے اس گھر میں ایک مان تران دینے کی خواہش رکھتے تھے۔ جب میں نصرت کے ساتھ آسٹریا میں تھی، انہوں نے بے چینی سے میرا انتظار کیا، گھر کو سجایا بنایا۔ ہر طرح سے میرے آرام و آسائش کا بندوبست کیا۔ لیکن میں نے ان کا دل توڑا۔ یہ اسی کی سزا مجھے مل رہی ہے۔“

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ یہ اس کی بے رخی کی سزا نہیں ہے بلکہ یوسف کی اپنی بداعمالیوں کا خمیازہ ہے لیکن اگر میں خود یہ بات کہتا تو ثروت اسے بھی میری رقابت پر محمول کرتی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ حقیقت خود ہی اس کے سامنے آ جائے گی۔

میں نے صرف اتنا کہا۔ ”ثروت! توہمات سے نکل، حقیقت کی دنیا میں زندہ رہنا سیکھو۔ اور اگر میری وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی ہے تو میں بہت جلد تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا... بہت دور چلا جاؤں گا۔“

اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ ناک سرخ ہوگئی۔ وہ گمبھیر آواز میں بولی۔ ”تابش! مجھے اعتراف ہے کہ میں ماضی کو اپنے دل و دماغ سے کھرچ نہیں سکی۔ لیکن وہ جو کچھ بھی ہے، میرے دل میں ہے... اور شاید ہمیشہ رہے گا... لیکن... یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے راستے بدل چکے ہیں۔ میں... میں یوسف سے جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میرا اور ان کا رشتہ جیسے بھی بنا... جو بھی تھا مگر اب وہ میرے اندر رچ بس چکا ہے۔ مجھے ہر صورت اسے نبھانا ہے۔“

میرے سینے پر جیسے کوہ ہمالیہ آکر ٹھہر گیا۔ میں نے بے حد بوجھل دل کے ساتھ کہا۔ ”ثروت! میرا وعدہ ہے، یہ یوسف والا مسئلہ حل ہوجاتا ہے اور ہم پاکستانی علاقے میں واپس چلے جاتے ہیں تو میں چلا جاؤں گا۔ اور یہ بھی وعدہ ہے کہ آئندہ کبھی تم مجھے اپنے آس پاس نہیں دیکھو گی۔“

وہ چپ رہی۔ اس کے جسم میں بس اس کے آنسو ہی متحرک تھے جو رخساروں پر سرک رہے تھے۔

☆☆☆

گوبندر ایک دن کے لیے واپس بیکانیر جاچکا تھا۔ جگت کا بھی پچھلے چوبیس گھنٹوں سے کچھ پتا نہیں تھا۔ اس نے بتایا تو نہیں تھا لیکن میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ کہیں یوسف کی ٹوہ لگانے ہی گیا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں آشا نہ صرف بھینسوں کا دودھ دوہتی تھی بلکہ دیگر امور بھی سرانجام دیتی تھی۔ اس کے دودھ مکھن سے پلے جسم میں خاصی توانائی موجود تھی۔ جگت کی ہدایت کے مطابق میں اور ثروت زیادہ وقت پچھواڑے والے کمرے میں ہی گزار رہے تھے۔ اگر گھر میں کوئی ملاقاتی آتا تھا تو آشا وہ درمیانی دروازہ بند کردیتی تھی جو گھر کے سامنے والے حصے کو پچھواڑے سے ملاتا تھا۔ آشا ہمارے کھانے کا بھی خوب خیال رکھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بڑی ہمدردی سے ثروت کے پاؤں کی مرہم پٹی بھی کرتی تھی۔ اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ثروت اب بغیر سہارے کے چلنا شروع ہوگئی تھی۔ دیکھا جاتا تو اپنے ازدواجی معاملے کو چھوڑ کر آشا ایک بھلی عورت ہی تھی۔

بہت انتظار کے بعد جگت کی واپسی اگلے روز شام سے کچھ پہلے ہوئی۔ وہ آتے ساتھ ہی مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا اور بولا۔ ”بادشاہ زادے! تیرے بندے کا کھوج تو غریب کو لگ ہی گیا ہے۔“

”کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”فاضلکا سے پندرہ بیس میل فرید کوٹ کی طرف، ترشولا نام کا ایک پنڈ ہے... بلکہ سمجھو کہ تین چار پنڈوں کی ایک چھوٹی سی جاگیر ہی ہے۔ یوسف کو وہاں پہنچایا گیا ہے۔ سردار اوتار سنگھ وہاں کا کرتا دھرتا ہے۔ جہاں تک مجھے پتا چلا ہے، یوسف فی الوقت اوتار سنگھ کے گھر پر ہے۔“

”وہاں کس لیے؟“

”اس بارے میں کوئی جانکاری نہیں مل سکی۔“

”اور کیا پتا چلا ہے؟“

”سردار اوتار علاقے میں اپنی کچہری لگاتا ہے اور لوگوں کے فیصلے بھی کرتا ہے۔ لوگ اس کے فیصلے مانتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ پچھلی تین چار پیڑھیوں سے علاقے کے لوگوں کے جھگڑے سرداروں کی حویلی میں ہی نمٹائے جاتے ہیں۔ اوتار سنگھ کو تو خاص طور سے بڑا انصاف والا سمجھا جاتا ہے۔ پر اوتار سنگھ کا اپنا پتر کوئی چنگے کریکٹر کا مالک نہیں ہے۔ چار پانچ قتل اور دو تین اغوا بھی اس کے کھاتے میں ہیں۔ چار پانچ سال پہلے اس نے ایک پولیس سب انسپکٹر کو گولیوں سے چھاننی کردیا تھا۔ تب سے وہ مفرور ہے۔ پر سردار کا چھوٹا پتر چنگا ہے۔ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ سردار کے باپو کی عمر نوے سال کے قریب ہے۔ اس کی ماتا بھی ابھی زندہ ہے۔ پچھلے مہینے اس کی ماتا کو سکتہ ہوگیا تھا۔ لوگوں نے سمجھا وہ سورگ باشی ہوگئی ہے۔ اس کا سنسکار ہورہا تھا جب وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ علاقے میں یہ بات کافی مشہور ہے...“

میں نے کہا۔ ”جگت! تمہیں کتنے فیصد یقین ہے کہ یوسف سردار کی حویلی میں ہی ہے؟“

”ایک سو دس فیصد۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ مجھے جانکاریاں دینے والے میری ہی طرح اصلی ہیں۔ میں تمہیں جو کچھ بتاؤں گا، بالکل ٹھیک ہوگا۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جگت! سردار اوتار کی مصروفیات کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے؟“

جگت نے کہا۔ ”مصروفی... یات... کا کیا مطلب؟“

”بھئی، یہی کام کاج؟“

”سرداروں کا کیا کام کاج ہوتا ہے؟ بس وہی زمینوں کی دیکھ بھال اور تاریخیں، پیشیاں وغیرہ بھگتانا۔ پنڈ سے چھ سات میل دور پکی سڑک پر سردار کا فارم ہے۔ اس کو بیٹھک بھی کہتے ہیں۔ سردار دن میں ایک چکر وہاں کا ضرور لگاتا ہے۔ وہاں کوئی کام شام بھی کرا رہا ہے۔ پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

میں خاموش رہا۔ میرے اندر عجیب سی ہلچل تھی۔ ثروت سے جو بات چیت ہوئی تھی، وہ میرے اندر گہرائی میں اتری ہوئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ میں چلا جاؤں... تو مجھے چلے جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس وقت تو ہم منجدھار میں تھے۔ میں چاہتا تھا کہ جب میں جاؤں تو وہ کنارے پر ہو۔ میں اس اطمینان کے ساتھ اسے الوداع کہوں کہ وہ محفوظ ہے اور اپنے معاملات ٹھیک کرسکتی ہے۔

☆☆☆

اگلے روز میں اور جگت صبح سویرے ہی اٹھ گئے تھے۔ میں نے گوبندر کی ایک پتلون، شرٹ پہن رکھی تھی۔ ہم نے پہلے دیہاتی تانگے پر چار پانچ کلومیٹر سفر کیا پھر پکی سڑک پر پہنچے۔ وہاں سے بس پکڑی اور فاضلکا کی طرف روانہ ہوگئے۔ دوپہر بارہ بجے سے پہلے ہم فاضلکا کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ ایک بار پھر تانگے کا طویل سفر ہوا۔ سڑک تنگ لیکن پختہ تھی۔ دونوں طرف حد نگاہ تک چاول اور گنے کے کھیت تھے۔ چمکیلی دھوپ میں جوہڑوں کا پانی چمک رہا تھا اور ان میں مویشیوں کے غول نظر آتے تھے۔ پگڈنڈیاں، ٹیوب ویل، کنوئیں، کھیت مزدوروں کی ٹولیاں، سارے منظر وہی تھے جو پاکستانی پنجاب کے دیہات میں نظر آتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ کہیں کہیں سکھ حضرات کی پگڑیاں دکھائی دیتی تھیں یا گردواروں اور مندروں پر نگاہ پڑتی تھی۔

فارم سے قریباً دو فرلانگ پہلے ہی تانگوں کا اڈا تھا۔ پیپل کے تین چار گھنے درختوں کے نیچے کیچڑ میں لتھڑے دیہاتی تانگے اور ریڑھے وغیرہ کھڑے تھے۔ ایک طرف جانوروں کو پانی پلانے کے لیے اینٹوں کی حوضی بنی ہوئی تھی۔

دو کھوکھا نما دکانیں بھی یہاں تھیں۔ ایک ڈھارے کے پاس کیکر کے درخت کے ساتھ حجام نے اپنا چوکور آئینہ لٹکا رکھا تھا۔ ہم یہاں اتر گئے۔

جگت سنگھ نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ”یار! آخر تم بتاتے کیوں نہیں، تمہیں کرنا کیا ہے؟ اگر مجھے کوئی اتا پتا ہوگا تو چنگی طرح تمہارا ساتھ دے سکوں گا نا؟“

”میں تمہیں اپنا ساتھ دینے کے لیے یہاں نہیں لایا جگت! یہاں جو کچھ کرنا ہے، مجھے اکیلے ہی کرنا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”وہی جو تم نے سنا ہے۔ یہ میرا مسئلہ ہے اور اسے حل بھی میں خود ہی کروں گا۔ تم جتنا ساتھ دے رہے ہو، یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ میں تمہیں کسی بڑی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔“

جگت سنگھ نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے بسنتی رنگ کے کرتے کے نیچے بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ وہ گردن اکڑا کر بولا۔ ”آپاں یاروں کے یار ہیں بادشاہ زادے! جس کے موڈھے کے ساتھ موڈھا ملاتے ہیں، اسے کبھی اکیلا نہیں چھوڑتے، بادشاہ زادے! تو ہمارا مہمان بھی ہے۔ تو نے یہ کیسے سوچ لیا؟“

ٹاہلی کے اس درخت کے نیچے میرے اور جگت کے درمیان طویل بحث ہوئی۔ اس نے بہت دلیلیں دیں لیکن میں نے کسی بھی صورت اسے اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ جب جگت نے دیکھا کہ میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا، تو وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے بس اتنا کیا کہ اس سے اس کا پستول لے کر اپنی قمیص کے نیچے لگا لیا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ اگر میں شام تک واپس نہ آؤں تو وہ واپس اپنے گاؤں جوپور چلا جائے۔

اس نے نکتہ اٹھایا کہ شام پانچ بجے کے بعد تو کوئی بس نہیں ملے گی۔

میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، پھر صبح چلے جانا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ اگر میرے ساتھ کوئی ایسا ویسا معاملہ ہو جائے تو ثروت اس کی ذمے داری ہے۔ وہ اسے کسی بھی طرح پاکستان پہنچائے گا۔

جگت کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ بہرحال، اس نے وعدہ کیا کہ گرو نہ کرے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ اپنی چھوٹی بہن کی پوری ذمے داری اٹھائے گا۔ ہم نے کچھ دیگر تفصیلات بھی طے کیں۔ میں نے احتیاطاً جگت سے موبائل فون نمبر بھی لے لیا۔ یہ نمبر اس کے چھوٹے بھائی گوبند کا تھا۔

بہرطور میں نے یہ نمبر کہیں لکھا نہیں بلکہ حافظے میں محفوظ کر لیا... جگت سنگھ سمجھ چکا تھا کہ میرے ارادے کچھ اچھے نہیں ہیں اور میں اپنے گمشدہ بندے کی بازیابی کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہوں۔

دوپہر ایک بجے کے لگ بھگ میں پیدل ہی سردار اوتار سنگھ کے زرعی فارم کی طرف روانہ ہوا۔ میرے ذہن میں کوئی واضح نقشہ تو نہیں تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے، بہرحال میں ہر طرح کی صورتِ حال کے لیے قطعی تیار تھا۔ اگر میں اپنے دل کی بات بتاؤں تو وہ یہ ہے کہ کچھ عرصے سے اس بات نے میری بہت ڈھارس بندھائی ہوئی تھی کہ میں نے بھانڈیل اسٹیٹ میں جارج گورا جیسے شخص کو زیر کیا ہوا ہے۔ جارج کی موت ایک ایسا تمغہ تھا جو میرے جسم پر نہیں، میری روح پر سجا ہوا تھا اور جس نے میرے اندر کے اعتماد میں بے پناہ اضافہ کیا تھا۔ اب یہی اعتماد مجھے کشاں کشاں اس سکھ جاگیردار کے ٹھکانے کی طرف بھی لے جا رہا تھا۔ اس فارم کو عرفِ عام میں ”بیٹھک“ بھی کہا جاتا تھا۔ بیٹھک کے آثار مجھے دور ہی سے نظر آ گئے۔ کھیتوں کے درمیان دور تک خاردار باڑ چلی گئی تھی۔ بائیں طرف سات آٹھ فٹ اونچی پکی چار دیواری تھی۔ سامنے کی طرف کچھ کمرے تھے جن کے سامنے دھول میں اٹی ہوئی چار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سے دو جیپیں تھیں۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی اور ایک کوئی لوڈر قسم کی شے۔ [illegible] کرتے والا ایک مسلح سکھ یہاں چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں سیدھا سردار اوتار کے پاس پہنچوں اور ہر اندیشے کو ایک طرف رکھ کر اس سے دوٹوک بات کروں۔ میرا صرف ایک ہی مقصد تھا، یوسف کی بازیابی۔ میں سیدھا چوکیدار کے پاس گیا۔ ”کس سے ملنا ہے؟“ چوکیدار نے مجھے سرتاپا گھور کر پوچھا۔ اس کا سر اس کے باقی جسم کے مقابلے میں چھوٹا لگتا تھا۔

”سردار جی سے۔“ میں نے ترت جواب دیا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“

”فرید کوٹ سے۔“

”اچھا... اچھا، اکبر علی ہو تم... پر تمہیں تو کل آنا تھا۔“ میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر سنبھل کر بولا۔

”سردار جی کہاں ہیں؟“

”وہ تو ابھی دس منٹ پہلے نکل گئے کسی کام سے... تم بڑے ٹائم پر آئے ہو۔ تمہاری بڑی لوڑ ہے حویلی میں۔ باپو جی کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہے۔“ اس سے پہلے کہ میں





کچھ کہتا یا وضاحت کرتا، قریب ہی ایک چوکیدار اپنی پاٹ دار آواز میں پکارنے لگا۔ ”اوئے کیدار ناتھ... اوئے کیدارے... آ بھئی... بندہ آ گیا ہے۔ جلدی آ، اسے لے جا اپنے ساتھ... آ جا بھئی۔“

میں نے دیکھا، کچی چار دیواری کے قریب سے ایک [illegible] تیز قدم، ٹھگنا ہماری طرف بڑھا۔ اس نے میلا سا [illegible] رکھا تھا۔ [illegible] ماتھے پر تلک تھا۔ وہ ہاتھ میں چابی گھماتا آ رہا تھا۔ اندازہ ہوا کہ وہ قریب کھڑی گاڑیوں میں سے کسی ایک کا ڈرائیور ہے... وہ غالباً مجھے حویلی لے جانے آ رہا تھا اور میں خود بھی حویلی جانا چاہتا تھا۔ چوکیدار نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تمہارے ساتھ تو تمہاری پتنی نے بھی آنا تھا؟“

اب میں اپنا لائحہ عمل بنا چکا تھا۔ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”میں آج آ گیا ہوں۔ وہ ابھی تیار نہیں تھی، تھوڑا سا کام بھی تھا اسے۔ کل یا پرسوں آ جائے گی۔“

چوکیدار بولا۔ ”تمہیں ہری جی نے بتایا ہی ہوگا جب باپو کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو ساتھ ہی ماتا جی کی بھی ہو جاتی ہے۔ ٹھیک ہوتے ہیں تو دونوں ہو جاتے ہیں۔ ان کا ہنسنا رونا، سونا جاگنا، کھانا پینا، سب ایک ساتھ ہے۔ دوسرے ٹائپ کی طبیعتیں ہیں دونوں کی۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

ڈرائیور کیدار ناتھ، سکھ چوکیدار سے بھی زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، مجھے ایک گرد آلود جیپ میں بٹھایا اور آناً فاناً روانہ ہو گیا۔ راستہ کچا تھا، جیپ بھی ایسی ہی [illegible] تھی۔ زبردست ہچکولے لگ رہے تھے۔ کیدار ناتھ قدرے باتونی شخص تھا اور یہ بات میرے حق میں جاتی تھی۔ [illegible] سے میرے بارے میں جاننے یا کچھ پوچھنے کا وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس نے بھی مجھ سے چوکیدار والا سوال ہی پوچھا۔ کہنے لگا۔ ”تمہارے ساتھ تو زنانہ نرس بھی آ رہی تھی۔ شاید پتنی تھی تمہاری؟“

”وہ نہیں آ سکی۔ کل یا پرسوں آ جائے گی۔“

”سردار صاحب ناراض ہوں گے۔ تم پہلے ہی کوئی بہانہ سوچ لو۔“

”نہیں، میرا خیال ہے کہ میں ان کو ناراض نہیں ہونے دوں گا۔“ میں نے غیر محسوس طور پر اپنی قمیص کے نیچے پستول ٹٹولتے ہوئے کہا۔

کیدار ناتھ کی باتوں سے پتا چلا کہ مجھے غلطی سے اکبر علی سمجھا جا رہا ہے جو بطور ملازم فرید کوٹ سے یہاں آنے والا تھا۔ اسے یہاں سردار اوتار کے نوے سالہ بیمار باپو کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ ساتھ میں اس کی بیوی ثریا بھی آ رہی تھی۔ ثریا بھی فرید کوٹ کے سول اسپتال میں بطور نرس کام کرتی تھی۔ اکبر علی بھی سول اسپتال میں بطور میل نرس ملازمت کرتا رہا تھا مگر اب ملازمت چھوڑ چکا تھا اور پرائیویٹ کام کرتا تھا... اکبر اور اس کی بیوی ثریا کو یہاں ترشولا میں سردار اوتار کی حویلی میں ایک مہینا گزارنا تھا اور اس کے بوڑھے والدین کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ اس کے لیے ثریا نے اسپتال سے ایک ماہ کی چھٹی لی تھی۔ ثریا کو اس کام کے لیے قریباً آٹھ ہزار اور اکبر کو دس ہزار معاوضہ ملنا تھا۔ یہ بھی امکان تھا کہ اکبر کو یہاں مستقل ملازمت مل جائے گی۔

یہ ساری معلومات میرے لیے مفید ثابت ہو سکتی تھیں، لہٰذا میں نے انہیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سارے متوقع سوالوں کے جواب بھی تیار کر لیے تاہم حیرت انگیز طور پر اگلے قریباً اڑتالیس گھنٹے تک مجھے ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں دینا پڑا۔

ترشولا قصبہ نما گاؤں تھا۔ کچے پکے دونوں طرح کے مکانات موجود تھے۔ گرودوارے کی عمارت اور اس پر لہراتے ہوئے جھنڈے دور ہی سے نظر آ جاتے تھے۔ جو دوسری چیز نظر آتی تھی، وہ سرداروں کی حویلی تھی۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک تو مکمل گارے مٹی کا تھا۔ دوسرا جو یقیناً بعد میں بنایا گیا تھا، اینٹوں کا تھا۔ اس کے پلاستر پر نقش و نگار بھی بنائے گئے تھے۔

حویلی کے سامنے رنگ برنگے تانگے اور تازہ دم گھوڑے کھڑے تھے۔ کئی تانگوں کی نشستوں کے اردگرد ریشمی پردے بھی تنے ہوئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ تانگے سرداروں کی باپردہ عورتوں کے آنے جانے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ حویلی کے پھاٹک سے باہر ایک بہت بڑی جہازی چارپائی پر چھ سات مسلح افراد بیٹھے آنے جانے والوں کو گھور رہے تھے اور حقے پھانک رہے تھے۔ یہ یہاں کے محافظ تھے۔

کیدار ناتھ کو دیکھ کر پھاٹک کھول دیا گیا۔ وہ مجھے ترت حویلی کے وسیع احاطے میں لے گیا۔ حویلی کے دو حصے تھے، ایک زنانہ دوسرا مردانہ۔ یہ مردانہ حصہ وہی تھا جو اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ کیدار ناتھ مجھے لے کر زنانہ حصے کی طرف گیا۔ تاہم میرے اندر جانے سے پہلے اس نے پردہ کروا دیا۔ ہم ایک طویل برآمدے میں سے گزر کر ایک کشادہ کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے میں فینائل اور اسپرٹ کی ہلکی سی بو تھی۔

ایک شاندار پلنگ پر ایک شاندار بوڑھا سردار چت لیٹا تھا۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ دیکھ کر ہی بتایا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی عمر کا سفر تقریباً مکمل کر چکا ہے اور اب صبح کے دیے کی طرح کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔ اس کا رنگ بے حد گورا چٹا اور آنکھیں سبزی مائل براؤن تھیں۔ اس کا قد کاٹھ دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کسی وقت بڑا دبنگ شخص رہا ہوگا۔ اس کے سرہانے ایک تپائی پر بہت سی انگریزی اور دیسی دوائیں پڑی تھیں۔ ایک طرف حاجت وغیرہ کے لیے خاص طرح کی کرسی پڑی ہوئی تھی۔

کیدار ناتھ نے کہا۔ ''باپو جی کے سرہانے گھنٹی کا بٹن ہے، اس گھنٹی کا بہت دھیان رکھنا ہے۔ باپو جی بہت دھیمی آواز میں بات کرتے ہیں۔ کان لگا کر سننا پڑتی ہے۔''

پھر کیدار ناتھ نے ایک چھوٹا سا دروازہ کھولا اور بولا۔ ''یہ تمہارے آرام کرنے کا کمرا ہے لیکن تمہیں رات کو دو ڈھائی بجے کے بعد سونا پڑے گا کیونکہ باپو جی بھی اسی وقت سوتے ہیں۔''

چند ضروری ہدایات دینے کے بعد اور قریب المرگ سردار کو میرے حوالے کرنے کے بعد کیدار ناتھ باہر چلا گیا۔ میں نے دھیان سے بزرگوار کو دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ ان کی بات سننے کے لیے مجھے اپنا کان ان کے ہونٹوں اور سفید براق داڑھی کے بالکل پاس کرنا پڑا۔ بیمار ضعیف افراد عموماً صاف نہیں ہوتے اور ان کے جسم سے بو وغیرہ بھی اٹھتی ہے لیکن باپو سردار ایک صاف ستھرا شخص تھا۔ انہوں نے تپائی پر رکھی ایک دوا کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک چمچ پلا دوں۔

میں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ دوا پینے کے بعد سردار نے اپنے ہونٹوں کی طرف اشارہ کیا۔ پاس ہی ایک صاف رومال رکھا تھا۔ میں نے رومال سے باپو سردار کے ہونٹ پونچھے۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا جیسے میری معاملہ فہمی کی تعریف کر رہے ہوں۔

دو تین گھنٹے کے اندر مجھے یہاں کے اکثر معمولات کا پتا چل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مجھے یہاں کیا کرنا ہے۔ مجھ سے پہلے راج سنگھ نامی ایک ڈسپنسر باپو سردار کی خدمت پر مامور تھا۔ اس کی کسی غفلت پر سردار اوتار نے اسے تین چار دن بھوکا پیاسا ایک کمرے میں بند رکھا تھا اور پھر مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد ہی فرید کوٹ سے اکبر نامی شخص اور اس کی نرس بیوی کو یہاں بلایا گیا تھا۔

ابھی تک سردار اوتار سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی، تاہم اس کے چھوٹے بیٹے ہری سنگھ کو میں نے دیکھ لیا اور اس سے تھوڑی سی بات چیت بھی کی تھی۔ اسے ابھی تک اندازہ نہیں ہوا کہ اس کے ملازموں سے کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے اور وہ اکبر علی کے بجائے کسی اور شخص کو حویلی میں لے آئے ہیں۔ ہری نے بھی بس اتنا ہی پوچھا۔ ''تمہاری بیوی ساتھ نہیں آئی؟''

میں اب تک اس کا جواب تیار کر چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''چھوٹے سردار! اسے چھٹی نہیں مل سکی لیکن دو دن میں وہ ہر صورت آ جائے گی۔ میں خود اسے لے کر آؤں گا۔''

''دو دن کا مطلب... دو دن ہی ہونا چاہیے۔ یعنی بدھ کے روز۔''

''انشاء اللہ جی۔ بدھ کو شام سے پہلے وہ یہاں ماتا جی کی سیوا پر ہوگی۔''

ہری سنگھ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ تیکھے نقوش اور چھریرے جسم والا اونچا لمبا نوجوان تھا۔ گورے چہرے پر بڑی نفیس مونچھیں تھیں۔

یہ خیال میرے لیے بڑا سنسنی خیز تھا کہ ثروت کا شوہر یوسف فاروقی یہاں انڈیا کے اس دور دراز گاؤں میں ایک نامی گرامی سردار کی حویلی میں ہے۔ وہ یہاں کیوں تھا؟ اسے یہاں پہنچائے جانے کا کیا مقصد تھا؟ جاوا اور اس کے لوگ اسے پاکستان سے یہاں لا کر کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟ یہ سارے سوال مسلسل میرے دماغ کو کچوکے لگا رہے تھے۔

شروع میں میرا اور عمران کا خیال تھا کہ شاید یہ بھی کوئی فلمی چکر ہو۔ جس طرح نیتو کی شکل کرشمہ کپور اور سوہنی کی شکل دوسری مشہور اداکارہ ایشوریا رائے سے ملتی تھی، شاید یوسف کی صورت بھی کسی فلمی بندے سے ملتی ہو اور اسے چودھری انور کے ذریعے کشاں کشاں ممبئی پہنچا دیا جائے۔ لیکن یہاں صورت حال مختلف نظر آ رہی تھی۔ یوسف اردو فلموں کے مرکز ممبئی میں تھا، نہ پنجابی فلموں کے کسی مرکز میں... وہ یہاں ایک خالص دیہاتی علاقے میں ایک جاگیردار نما شخص کے پاس تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میں اسے کیسے اور کب دیکھ پاؤں گا۔ لیکن جو کچھ ہوا، وہ بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔ ڈرائیور کیدار ناتھ میرے پاس آیا۔ وہ بڑی تیزی سے بات کرتا تھا۔ اس کی بات سمجھنے کے لیے خوب توجہ دینا پڑتی تھی۔ وہ بولا۔ ''اکبر بھائی! تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔ تمہارے پاس دھاگے نکالنے والی چمٹی تو ہوگی۔''

''دھاگے نکالنے والی چمٹی؟'' میں نے ذرا حیرت





سے پوچھا۔

''ہاں یار! وہی جس سے زخم کے ٹانکے کا دھاگا کھینچتے ہیں۔''

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ اس سے پہلے جو بندہ میری جگہ کام کر رہا تھا، وہ اپنا میڈیکل باکس یہیں چھوڑ گیا تھا یا شاید یہ باکس حویلی ہی کا تھا۔ اس میں بینڈیج وغیرہ کا سارا سامان موجود تھا۔ میں نے اسپرٹ، روئی اور چمٹی لی اور ڈرائیور کیدار ناتھ کے ساتھ چل پڑا۔ مجھے مرہم پٹی کا ایسا زیادہ تجربہ نہیں تھا لیکن جو کام کیدار بتا رہا تھا وہ تو میں کر ہی سکتا تھا۔ مندمل ہو جانے والے زخم میں سے بچا کھچا دھاگا کھینچنا بہت مشکل کام نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میں انجکشن وغیرہ بھی لگا لیتا تھا۔ گلوکوز کی ڈرپ اتارنے اور لگانے کا تجربہ بھی تھا۔

کیدار پندرہ بیس قدم چل کر ایک کمرے کے بند دروازے کے سامنے پہنچا اور رک گیا۔ وہاں سے اس نے ایک چابی لی اور مجھے لے کر حویلی کے مردانے حصے میں آ گیا۔ یہاں پختہ فرش تھا اور اس پر رنگوں سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کرپانوں اور رائفلوں والے مسلح سکھ ملازم بھی نظر آ رہے تھے۔ کیدار مجھے لے کر ایک برآمدے میں سے گزرا اور ایک الگ تھلگ کمرے کے سامنے آ گیا۔ اس نے چابی لگا کر دروازے کا آہنی قفل کھولا۔ اندر داخل ہوا اور مجھے بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اندر گھسا اور دنگ رہ گیا۔ میرے سامنے ایک پلنگ پر یوسف ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی تاہم کپڑے صاف ستھرے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم چونکے۔ خاص طور سے یوسف تو بُری طرح چونکا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ خوش قسمتی سے یہ وہ لمحے تھے جب کیدار ناتھ گھوم کر دروازے کو اندر سے چٹخنی لگا رہا تھا۔ اس نے یوسف کے تاثرات نہیں دیکھے۔ میں نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر یوسف کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

یوسف نے بھی بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ لیکن اس کے چہرے کا رنگ ابھی تک بدلا ہوا تھا۔ کیدار ناتھ نے یوسف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سردار جی کے خاص مہمان ہیں۔ کچھ دن پہلے غسل خانے میں پاؤں پھسل گیا تھا۔ کہنی اور منہ پر چوٹ آئی ہے۔''

میں نے دیکھا، یوسف کے رخسار پر بائیں کنپٹی کے پاس انگریزی حرف ''سی'' کی طرح کا زخم تھا جس پر پانچ چھ ٹانکے لگائے گئے تھے۔ زخم مندمل ہو گیا تھا مگر ایک دو ٹانکوں کے دھاگے موجود تھے۔ چہرے پر زخم کا یہ نشان یوسف کی خوب رُوئی کو گہنا رہا تھا۔ میں نے دیکھا، یوسف کا یہ کمرا خوب سجا سنورا تھا۔ دیہات کی بڑی حویلیوں میں میسر آنے والی ساری آسائشیں یہاں موجود تھیں۔ ایک طرف ٹی وی بھی رکھا تھا۔ سائڈ کی میز پر مجھے ایک ایسا گلاس بھی نظر آیا جس کے پیندے میں بچی کھچی شراب موجود تھی۔

کیدار ناتھ کی ہدایت کے مطابق میں یوسف کے قریب بیٹھ گیا اور بڑی احتیاط سے اس کے مندمل زخم میں سے دھاگے کھینچنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ یوسف کے ہاتھوں میں ابھی تک لرزش موجود ہے۔ میری اچانک آمد نے اسے اعصابی طور پر ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اس بات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کیدار کی موجودگی میں ہم ایک دوسرے سے کچھ کہہ سکیں۔

میں دھاگے کھینچ چکا تو کیدار نے کہا۔ ''صاحب جی کی کہنی کی پٹی بھی بدل دو۔'' پھر وہ سوالیہ نظروں سے یوسف کی طرف دیکھنے لگا۔

یوسف نے کہا۔ ''ہاں، بدل ہی دو۔ تین دن تو ہو گئے ہیں۔''

میں نے یوسف کی کہنی کی پٹی کھولی۔ کھال بُری طرح چھلی ہوئی تھی۔ پٹی اتارنے سے خون رسنے لگا۔ ایک بات میں نے فوراً محسوس کی۔ چہرے کا زخم پرانا جبکہ کہنی کا تازہ تھا۔ شاید یہ زخم دو تین دن پہلے ہی آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کیدار نے جھوٹ بولا ہے۔ چہرے اور کہنی کی چوٹیں ایک ہی واقعے کا نتیجہ نہیں تھیں۔ بہرحال ابھی ان باریکیوں میں پڑنے کا موقع نہیں تھا۔ ایک دو دوائیں یوسف کے قریب ہی میز پر موجود تھیں۔ کاٹن کی پٹی بھی رکھی تھی۔ میں نے زخم کو روئی سے صاف کیا اور ''آئنٹ مینٹ'' لگا کر پٹی باندھ دی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم حویلی کے مردانے حصے سے نکل کر واپس زنان خانے میں بوڑھے بیمار باپو کے پاس پہنچ چکے تھے۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یوسف نہ صرف یہاں موجود تھا بلکہ زخمی بھی تھا۔ اسے ایک کمرے میں باقاعدہ تالا لگا کر رکھا گیا تھا اور اندازہ ہو رہا تھا کہ دو چار خاص ملازموں کے سوا کسی کو اس کی موجودگی کا علم بھی نہیں۔ اس کی چوٹوں سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس پر کسی طرح کا تشدد کیا گیا ہو یا پھر ہو سکتا تھا کہ اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہو اور یہ چوٹیں اسے اسی سلسلے میں لگی ہوں۔

میں جلد از جلد یوسف سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اس

کے لیے کوئی موقع نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ کل یا پرسوں پھر یوسف کی کشتی کی پٹی بدلنے کی ضرورت پیش آئے اور میں اس سے مل سکوں۔ لیکن یہ بات بھی یقینی تھی کہ کیدار ناتھ میرے سر پر کھڑا رہے گا اور مجھے اس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔

میرے لیے فی الوقت سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ کہیں میرا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ کل کسی وقت دوپہر کے بعد فرید کوٹ سے اصلی اکبر علی اور اس کی نرس بیوی ثریا یہاں ترشولا پہنچ رہے تھے۔ اگر میں یہاں رہنا چاہتا تھا تو ضروری تھا کہ انہیں یہاں پہنچنے سے روکوں۔ لیکن ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ شاید اکبر علی کا یہاں حویلی سے ٹیلی فونک رابطہ بھی ہو۔ ایسے میں وہ یہاں کسی کو فون کر سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں فوراً مشکوک قرار پاتا اور پکڑا جاتا۔ بہر حال، اس طرح کے سارے رسک تو میں نے پہلے ہی ذہن میں رکھے ہوئے تھے۔

میں نے کیدار ناتھ سے بات چیت جاری رکھی۔ معلوم ہوا کہ سردار اوتار موبائل فون استعمال نہیں کرتا۔ ہاں، حویلی میں ایک فون لائن موجود ہے لیکن وہ دو چار روز سے خراب پڑی ہے۔ میرے کریدنے پر یہ خوشگوار انکشاف ہوا کہ کیدار ناتھ کے پاس ایک موبائل فون موجود ہے۔ میں نے اس سے درخواست کی اور اس نے مجھے ایک کال کرنے کی اجازت دے دی۔

میں موبائل لے کر اس چھوٹے کمرے میں چلا گیا جو باپو کے کمرے کے ساتھ تھا اور میرے سونے کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے جگت سنگھ کے چھوٹے بھائی گوبندر کا نمبر ملایا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ بڑے بھائی کے گھر میں ہی ہوگا۔ وہاں اسے دل لگی کے لیے بہت کچھ مل رہا تھا۔ دوسری، تیسری بیل پر کال ریسیو ہو گئی۔ ”ہیلو کون؟“ گوبندر کی آواز ابھری۔ وہ قدرے ہانپا ہوا تھا۔

”ہیلو گوبندر! میں صادق بول رہا ہوں۔“ میں نے دبی آواز میں کہا۔

”صادق بھائی! کہاں ہو تم؟ ہم ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے۔“ وہ گرم جوشی سے بولا۔

”پہلے تم بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟“

”گاؤں میں ہی ہوں... گھر میں۔“ وہ بدستور ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

اس کے ہانپنے کی دو ہی وجوہ ہو سکتی تھیں۔ آشا اس کے آس پاس موجود تھی اور اپنے شباب سے اس کی تنہائی کو چکا رہی تھی یا پھر وہ ڈھارے کے اندر اپنے ”دیہاتی جم“ میں ورزش کر رہا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا کیونکہ جگت سنگھ بھی گھر ہی میں تھا۔ پس منظر میں جگت کی آواز سنائی دی۔ وہ گوبندر سے پوچھ رہا تھا کہ کس کا فون ہے۔ ”صادق بھائی کا ہے... پتا نہیں کہاں سے بول رہے ہیں۔“ گوبندر نے جگت کو جواب دیا۔

میں نے تیزی سے کہا۔ ”گوبندر! میرے پاس وقت نہیں۔ تم ذرا جگت بھائی کو فون دو۔“

چند سیکنڈ بعد موبائل فون پر جگت کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ میں نے کہا۔ ”جگت! میں سردار اوتار کی حویلی میں ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی فوری ضرورت ہے۔“

وہ بلاتوقف بولا۔ ”بادشاہ زادے! تجھے کہا تو ہے کہ آپاں یاروں کے یار ہیں... بتا کس دریا میں چھال مارنی ہے اور کس اوکھلی میں سر دینا ہے؟“

”نہیں یار! ابھی کوئی بڑی چھال تو نہیں مارنی بس ایک چھوٹی چھلانگ لگانی ہے اور مجھے امید ہے کہ تم لگا لو گے... کل دوپہر کے بعد فرید کوٹ سے ایک میاں بیوی بس پر بیٹھ کر آئیں گے، وہ ترشولا موڑ کے پاس نہر کے پل پر اتریں گے۔ تم نے کسی طرح انہیں ترشولا پہنچنے سے روکنا ہے۔“

جگت سنگھ دلیری سے بولا۔ ”لے بس اتنی سی گل ہے۔ میں سمجھا شاید کسی بندے کا منکا وغیرہ توڑنا ہے یا کوئی جنج (برات) لوٹنی ہے۔ تم بتاؤ وہ جی، جنی ہیں کون؟ اور کیا کرنا ہے ان کے ساتھ؟“

میں نے جگت کو تفصیل بتائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ بس وہ کچھ ایسا کرے کہ یہ میاں بیوی تین چار دن کے لیے ترشولا نہ آسکیں اور نہ کسی سے رابطہ کر سکیں۔

وہ ہنس کر بولا۔ ”یارا! تم کہو گے تو وہ قیامت تک ترشولا نہیں آسکیں گے۔ ایسی کون سی بات ہے۔ اپنے یار پرتاب سنگھ کے پاس پرانی فوجی جیپ ہے۔ اس پر جائیں گے اور ان دونوں مہمانوں کو بڑے عزت اور پریم سے یہاں لے آئیں گے۔ تو اس بارے میں کوئی فکر نہ کر۔ تو یہ بتا کہ وہاں تیرا کوئی کام بنا ہے یا نہیں؟“

”بس سمجھو کہ تھوڑا تھوڑا بن رہا ہے۔ تم یہ گوبندر والا فون دو تین دن اپنے پاس رکھ سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں یارا! تم جو کہو گے، ویسا ہی ہو گا۔“ اس گفتگو کے آخر میں، میں نے جگت سنگھ سے ایک بار پھر ... کے انجام کے بارے میں پوچھا۔ جگت نے بتایا کہ ... کوشش کے باوجود ابھی پتا نہیں چل سکا۔ بس اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ ایک بندہ حویلی سے باہر درختوں میں سخت زخمی ہوا تھا جو کل ... آباد کے اسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔ یہ بالکل ... جس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

جگت کو کال کرنے کے بعد میں نے کال کا ریکارڈ ختم کیا اور موبائل فون کیدار کو واپس دے دیا۔

... بارہ بجے تک میں بیمار باپو کی دیکھ بھال میں مصروف رہا۔ ... بڑھاپے کی کئی بیماریاں لاحق تھیں جن میں سب سے اہم جسم کے دائیں حصے کا فالج تھا۔ اس کے علاوہ شوگر، ہائی بلڈ پریشر اور دل کی تکلیف بھی اس ”بیماری پیکیج“ کا حصہ تھی۔ باپو کے سونے کے بعد میں بھی ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔ گھنٹی بالکل میرے سرہانے تھی۔ ایک بال پوائنٹ میں نے کل ہی حاصل کر لیا تھا۔ کاغذ بھی موجود تھا۔ بلب کی میلی سی روشنی میں، میں نے یوسف کے نام ایک مختصر رقعہ لکھا۔

”یوسف بھائی! بہت مشکلوں سے تمہارے پیچھے یہاں تک پہنچا ہوں۔ سمجھو کہ جان پر کھیلنا پڑا ہے۔ ابھی تک کچھ پتا نہیں کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے اور یہ لوگ تم سے کیا چاہتے ہیں۔ مجھے جوابی رقعے کے ذریعے اپنے حالات سے آگاہ کرو اور بتاؤ کہ میں تمہاری مدد کس طرح کر سکتا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے ان لوگوں کی تعداد بھی بتاؤ جو یہاں تمہاری پہرے داری کر رہے ہیں۔ ان کے پاس کس طرح کا اسلحہ ہے اور ان سے کیسے نمٹا جا سکتا ہے۔ میں یہ بال پوائنٹ تمہارے کمرے میں ہی چھوڑ آؤں گا۔ اگر تمہارے پاس کاغذ نہ ہو تو اسی رقعے کی پشت پر جواب لکھ دینا۔ امید ہے کہ کل کسی وقت ملاقات ہوگی۔“ رقعہ لکھ کر میں نے جیب میں رکھ لیا۔

اگلے کئی گھنٹے میں نے سخت سوچ بچار کی کیفیت میں گزارے۔ بالآخر میں نے یوسف کو ڈھونڈ لیا تھا۔ لیکن ابھی تک ثروت اور جگت سنگھ سمیت کسی کو خبر نہیں تھی کہ یوسف کا پتا چل گیا ہے۔ صرف میں جانتا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں اپنے دل کی کیفیت کھل کر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ... واردات کے سلسلے میں کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں رکھنا چاہتا۔ کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔ ایک انسان ہونے کے ناتے مجھ میں بھی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے میرا دل چاہا کہ ... کو، ان کی حویلی کو اور حویلی میں موجود یوسف فاروقی کو بھول کر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں۔ یوسف کے ساتھ جو بھی ہو رہا ہے، ہوتا رہے۔ اگر اس کی زندگی ہے تو اس نے بچ ہی جانا ہے۔ دوسری صورت میں کوئی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔

یہ سوچ اس تابش کی تھی جو لڑکپن سے ثروت کو چاہتا تھا، جس سے ملن کے لیے گھڑیاں اور پل گنا کرتا تھا اور اپنے دل کی گہرائیوں میں شاید اب بھی گنتا تھا۔ ہاں، یہ وہی تابش تھا جس کو آج ایک رقیب کا سامنا تھا۔ ایک ایسا رقیب جو کسی طور بھی ثروت کے قابل نہیں تھا لیکن حالات نے جسے ثروت کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا، آج وہ رقیب ایک بے بس شخص کی حیثیت سے یہاں اس حویلی میں موجود تھا۔

بہر حال میری اس سوچ کی عمر زیادہ طویل نہیں رہی۔ بہت جلد ایک دوسرا تابش میرے اندر ابھر آیا۔ یہ تابش ثروت کو چاہتا تو تھا لیکن اس کے حصول کے لیے کوئی غلط راہ اختیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کسی اخلاقی گراوٹ کا مظاہرہ، کوئی خود غرضی، کوئی چشم پوشی کچھ نہیں۔ یہ تابش... یوسف فاروقی کا مددگار بن کر یہاں پہنچا تھا اور اس نے ثروت سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ثروت کو اس کے شوہر سے ملانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ جیت اسی تابش کی ہوئی۔ میں اس فیصلے پر پہنچ گیا کہ جگت سنگھ اور ثروت کو یہاں یوسف کی موجودگی سے آگاہ کروں گا... اور اس کے بعد وہ سب کچھ بھی کروں گا جو کرنا میرا فرض ہے۔ اور اس کے لیے جان بھی خطرے میں ڈالنا پڑی تو ڈالوں گا۔

اگلے دن میں نے بہت بے چینی سے جگت سنگھ کو کال کی۔ یہ کال پھر کیدار ناتھ کے موبائل سے ہی ہوئی۔ وقت سہ پہر چار بجے کا تھا۔ کال ریسیو ہوئی تو جگت سنگھ کی جوشیلی آواز سنائی دی۔ ”تیرا کام ہو گیا بادشاہ زادے! اکبر علی اور اس کی تک چڑھی زنانی، دونوں اس ویلے میرے پاس ہیں۔ آلو والے پراٹھے کھا رہے ہیں نمک مرچ والے دہی کے ساتھ۔“

”کہاں ہو تم؟“ میں نے دریافت کیا۔

”اپنے یار پرتاب سنگھ کے پنڈ میں۔ زیادہ دور نہیں ہے ہمارے پنڈ سے۔ یہاں پر پرتاب سنگھ کا چھوٹا سا باغ ہے۔ باغ میں ایک ڈھارا ہے۔ دونوں ڈھارے میں ہیں۔ آٹھ دس دن شانتی سے یہاں گزار سکتے ہیں۔“

”کس طرح لائے ہو انہیں؟“

”بس یارا! لے آئے جیسے بھی ہوا۔ پر اپنا وچن نہیں توڑا میں نے۔ کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہوئی ہے دونوں کو۔“

میرے اصرار پر جگت سنگھ نے بتایا کہ جب وہ دونوں فرید کوٹ والی بس سے اترے تو پرتاب سنگھ اور وہ تانگے کے اڈے پر موجود تھے۔ انہوں نے فوراً دونوں کو پہچان

لیا۔ انہوں نے اکبر علی کو بتایا کہ وہ سردار اوتار کے ملازم ہیں اور ترشولا پنڈ سے ان دونوں کو لینے کے لیے آئے ہیں۔ وہ دونوں پرانی فوجی جیپ میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد جگت اور پرتاب کے لیے کوئی مسئلہ نہ رہا۔ جگت کے پاس اعشاریہ تین آٹھ کا پستول موجود تھا۔ اس نے میاں بیوی کو خاموش رہنے کی دھمکی دی اور بہ آسانی منزل پر پہنچ گئے۔

جگت سنگھ کی کارکردگی تسلی بخش تھی۔ مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ مجھے ایسی اجنبی جگہ پر ایسا بے لوث مددگار مل گیا ہے۔ کم از کم وہ ابھی تک تو بے لوث ہی تھا... میں نے جگت سے کہا۔ ”جگت پیارے! اب تجھے ایک اور کام کرنا ہے۔“

”اوئے بادشاہ زادے! تو پوچھا نہ کر، بس کام بتایا کر۔“ وہ حسبِ معمول گرم جوشی سے بولا۔

”ثروت کو کسی طرح یہاں پہنچانا ہے لیکن وہ ثروت کے طور پر نہیں ثریا کے طور پر آئے، یعنی اکبر علی کی نرس بیوی بن کر۔“

”میں سمجھ گیا۔ سب سمجھ گیا۔ کب آنا ہے چھوٹی بھین کو وہاں؟“

”کل شام سے پہلے پہلے آجائے تو زیادہ اچھا ہے۔“

”اچھا تو ایسا کر بادشاہ زادے! چھوٹی بھین کو اپنی زبانی ساری بات سمجھا دے۔ اس نے کون سے کپڑے پہننے ہیں، اپنے ساتھ کیا لانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ باقی اسے وہاں پہنچانا میرا کام ہے۔ پر ایک بات ہے۔ وہ عورت ذات فریدکوٹ سے اکیلی آتی ہوئی کچھ اوپری (عجیب) نہیں لگے گی؟“

”تم ایک بات بھول رہے ہو کہ وہ عام عورت نہیں پڑھی لکھی نرس کے طور پر آئے گی۔ وہ جب بس سے اترے گی تو میں تانگے کے اڈے سے اسے لے لوں گا۔ تم چاہو تو بس پر آگے چلے جانا۔ چاہو تو اتر کر واپسی کی بس پر بیٹھ جانا۔“

”ٹھیک ہے۔“ جگت نے کہا۔ ”تم ایسے کرو کہ ٹھیک دو گھنٹے بعد پھر کال کرو۔ میں اس ویلے گھر میں ہوں گا۔ تمہاری گل چھوٹی بھین سے کرادوں گا۔“

دو گھنٹے بعد فون پر میری بات پھر جگت سنگھ سے ہوئی۔ جگت سنگھ نے فوراً ثروت کو فون پر بلالیا۔ ”ہیلو ثروت!“ میں نے کہا۔

میری آواز پہچانتے ہی ثروت بے چین ہو گئی۔ ”تابش! آپ کہاں ہیں؟ میں بہت پریشان ہوں آپ کے لیے۔ اس اجنبی جگہ آپ کے سوا میرا کوئی سہارا نہیں۔ آپ اپنا بہت خیال رکھیں پلیز۔“

”گھبراؤ مت۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت خیال رکھیں گے۔ تم میرے پاس آنے کی تیاری کرلو۔“

ثروت کو تھوڑا بہت تو جگت نے بتا دیا تھا۔ باقی میں نے اس کے گوش گزار کر دیا۔ وہ بڑی معاملہ فہم تھی۔ چند منٹ کے اندر ساری بات سمجھ گئی اور تفصیل بھی جان گئی۔

جب میں نے اسے بتایا کہ یوسف یہاں حویلی میں موجود ہے اور میں اس سے مل چکا ہوں تو وہ حیران رہ گئی۔ اس کی آواز میں ایک مسرت آمیز لرزش نمودار ہوئی۔ وہ مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس وقت کم ہے اور میں کسی دوسرے کے فون سے بات کر رہا ہوں۔ میں نے ثروت سے بات کرنے کے بعد پھر جگت سے بات کی اور اس سے کہا کہ وہ میرے لیے ایک موبائل فون کا انتظام کرے اور جب ثروت یہاں آئے تو موبائل ساتھ لے آئے۔

اگلے روز دس بجے کے قریب ہی کیدار ناتھ نمودار ہو گیا۔ میں اس وقت ناشتے کے لیے باپو کا منہ ہاتھ دھلوا رہا تھا۔ بابا نانک چند کی بہت بڑی تصویر کمرے میں لگی تھی۔ بیمار باپو جب بھی اس تصویر کی طرف دیکھتے تھے، ان کی بجھی ہوئی آنکھوں میں عجیب سی روشنی ابھر آتی تھی۔ وہ بے ربط سے مجھ سے باتیں بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ ان کی کسی پوتی یعنی سردار اوتار کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے اور یہ شادی چند روز میں ہی انجام پا جائے گی۔ حویلی میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں نے خود بھی دیکھا تھا۔ حویلی کی ملازمائیں کمروں کی جھاڑ پونچھ اور آرائش میں معروف رہتی تھیں۔ مردانے کی طرف کی حویلی میں رنگ وغیرہ بھی ہو رہا تھا۔ گاہے بگاہے مہمانوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ کل رات مجھے ڈھولک کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

ایک بالٹی نما برتن میں باپو کے ہاتھ اور پاؤں دھو کر میں پانی گرانے غسل خانے کی طرف گیا تو کیدار نمودار ہوا اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں فارغ ہو کر سیدھا مردانے میں آؤں۔ مہمان کی پٹی بدلنی ہے۔ وہ یوسف کو مہمان کہتا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے یوسف کے نام کا پتا نہیں۔

اندھا کیا چاہے... دو آنکھیں۔ میں تو خود ہی کافی دیر سے اس بلاوے کے انتظار میں تھا۔ باپو کے ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے میڈیکل باکس اٹھایا اور کیدار ناتھ کے ساتھ یوسف فاروقی کی طرف روانہ ہو گیا۔ حسبِ سابق کیدار نے چابی کے ساتھ یوسف کے کمرے کا دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ یوسف نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ وہ پلنگ پر نیم دراز ٹی وی یعنی دوردرشن دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھا اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد سرہانے پر بیٹھا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ نے مجھے یاد دلایا کہ اس کی ٹانگ پر بھی زخم موجود ہے۔ یہی زخم تو تھا جس کے سبب اسے پہلے اسپتال میں اور پھر جاوا کے جال میں پھنسایا تھا۔ یہ زخم اسے روڈ ایکسیڈنٹ کے بعد ہونے والی لڑائی میں آیا تھا۔ بہرطور، اب اس کی ٹانگ کی حالت سے لگتا تھا کہ یہ زخم بہتر ہو چکا ہے۔ اصل مسئلہ اسے کنپٹی کی تازہ چوٹ کا تھا۔ میں نے ”ڈسٹل واٹر“ لگا لگا کر آرام سے اس کی پٹی کھولی اور زخم صاف کر کے دوبارہ دوا لگا دی۔ زخم سے ابھی تک خون کا رساؤ جاری تھا۔ میں نے پٹی ذرا زور سے باندھی اور اس سے کہا۔ ”جناب! میں نے پٹی تھوڑی سی ٹائٹ باندھی ہے تاکہ ’بلیڈنگ‘ رک جائے۔ اگر پٹی تنگ کرے تو مجھے بتا دیجیے گا، میں اس کو ڈھیلا کردوں گا۔“

مرہم پٹی کے دوران میں ہی میں نے کیدار کی نظر بچا کر رقعہ یوسف کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ ذرا سا چونکا لیکن پھر سنبھل گیا۔ جانے سے پہلے میں نے اپنا بال پوائنٹ بھی یوسف کی جھولی میں گرا دیا جس پر یوسف نے اخبار رکھ دیا۔

میں کیدار کے ساتھ دوبارہ زنان خانے میں بیمار باپو کے پاس آگیا۔ راستے میں مجھے چند ملازمائیں نظر آئیں جو پیتل اور تانبے کے بڑے بڑے تھالوں میں مٹھائی وغیرہ لے کر اندرونی کمروں کی طرف جا رہی تھیں۔

میں بے چینی سے یوسف کے ردِعمل کا انتظار کرنے لگا۔ آتے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا کہ پٹی کس کر باندھ رہا ہوں تاکہ خون کا رساؤ ختم ہو جائے۔ حالانکہ زخم میں خون کا رساؤ روکنے کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا۔ مجھے امید تھی کہ یوسف میرا اشارہ سمجھ جائے گا اور پٹی نرم کرانے کے بہانے مجھے پھر بلائے گا۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔ قریباً دو گھنٹے بعد کیدار پھر میرے پاس آیا اور بولا۔ ”یار! وہ تمہارے مریض صاحب تمہیں پھر یاد فرما رہے ہیں۔ ان کو تکلیف ہو رہی ہے۔“

میں دوبارہ اس کے ساتھ چل دیا۔ مجھے امید تھی کہ یوسف نے میرے رقعے کا جواب لکھ لیا ہوگا۔ ہم مسلح پہرے داروں کے درمیان سے گزر کر مقفل دروازے تک پہنچے۔ حسبِ سابق کیدار نے دروازہ کھولا۔ یوسف چہرے پر کرب سجائے پلنگ پر دراز تھا۔ ”او بھئی ڈسپنسر صاحب! تم نے تو بازو کو شکنجہ لگا دیا ہے۔“

”سوری جی، شاید کچھ زیادہ ہی ٹائٹ ہو گئی ہے پٹی۔“

میں نے پٹی کھولی۔ کچھ مزید آئنٹ مینٹ لگائی اور روئی رکھ کر پھر بینڈیج کر دی۔ اسی دوران میں یوسف نے تہہ شدہ رقعہ بھی میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ کام بالکل صفائی سے ہوا اور کیدار کو کسی طرح کا شک نہیں ہوا۔

میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا اور دروازہ بند کر کے رقعہ پڑھنے لگا۔ یوسف نے اپنا کاغذ استعمال کیا تھا۔ کاپی سائز کے ایک صفحے پر لکھا تھا۔

”تابش بھائی! السلام علیکم... تمہیں یہاں انڈیا کے اس گاؤں میں دیکھا تو اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ سچ پوچھو تو میں خودکشی کا سوچنے لگا تھا۔ تمہیں دیکھ کر پھر سے زندگی کی امید بندھ گئی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں اسپتال سے نکلنے کے کچھ دیر بعد ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب ہوش آیا تو میں ہارون آباد سے کافی آگے آچکا تھا اور یہاں بارڈر کے پاس ایک پنڈ میں تھا۔ پنڈ کے چودھری کا نام انور ہے اور اس کی پیلی حویلی پورے علاقے میں مشہور ہے۔ اس پیلی حویلی میں مجھے چار پانچ دن رکھا گیا۔ یہاں میں نے ایک دو ایسی لڑکیاں دیکھی ہیں جو انڈیا کی مشہور اداکاراؤں سے کافی مشابہت رکھتی تھیں۔

”یہاں چند دن پہلے میرے بازو کی نس میں پھر ایک انجکشن لگایا گیا جس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں مجھے اس دوسرے گاؤں پہنچا دیا گیا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ میں پاکستان میں ہی ہوں لیکن یہاں اتنی کثرت سے سکھ نظر آئے کہ میں سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ بارڈر پار کر کے انڈین علاقے میں آچکا ہوں... پتا نہیں کہ اب میرے ساتھ کیا ہونا ہے۔

”مجھے چودھری انور نے کچھ نہیں بتایا تھا، نہ یہ لوگ یہاں کچھ بتا رہے ہیں۔ چودھری انور کی حویلی میں ہی میرے چہرے پر یہ زخم بھی لگایا گیا جس کے ٹانکوں کے دودھاگے تم نے کل نکالے ہیں۔ زخم لگانے والی بات پر تم حیران ہوئے ہوگے... ہاں، ایسا ہی ہوا ہے۔ یہ زخم لگانے سے پہلے میری کھال کو سن کیا گیا اور پھر تیز چاقو کی نوک سے بڑی صفائی کے ساتھ کٹ لگایا گیا... کسی وقت تو لگتا ہے کہ شاید یہ لوگ مجھ پر کوئی جادو ٹونا کر رہے ہیں۔ دو دن پہلے میں نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی کی ہے۔ کیدار ناتھ کھانا دینے کے لیے اندر آیا تو میں اسے دھکا دے کر بھاگ نکلا۔

رات کا وقت تھا۔ لائٹ بھی گئی ہوئی تھی مگر میں برآمدے تک ہی پہنچا تھا کہ دو تین ٹارچیں روشن ہو گئیں اور ایک بندے نے میری طرف رائفل سیدھی کر لی۔ اسی کھینچا تانی میں میری کہنی پر کچھ چوٹ آئی ہے۔ تب سے میرے کمرے کو باہر سے تالا بھی لگایا جانے لگا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ میرے کمرے کے آس پاس ہر وقت تین چار بندے موجود رہتے ہیں۔ رات کو بارہ بجے کے بعد بھی کم از کم دو بندے تو سامنے والے برآمدے میں ضرور ہوتے ہیں۔ یہ بڑے سخت لوگ ہیں۔ ہر وقت جھگڑوں، مقدموں اور مارا ماری کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ حویلی اوتار سنگھ کی ہے۔ وہ علاقے میں لوگوں کے فیصلے کراتا ہے اور اس کی پنچایت کو پورے علاقے میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے لیکن وہ خود کوئی ایسا نیک پارسا نہیں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق کئی جرم اس کے کھاتے میں ہوں گے۔ اس کا ایک بیٹا بھی کافی بدنام ہے۔ اس پر سنگین مقدمے ہیں اور وہ کچھ عرصے سے روپوش بھی ہے۔ اس کا نام اشوک سنگھ ہے۔ چھوٹا بیٹا ہری سنگھ کسی حد تک اچھا ہے اور لوگ اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔ مگر حویلی کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی شراب، گانجے اور عورت کا رسیا ہے۔ کل ہری سنگھ میرے پاس آیا تھا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ''تمہارا کہنی اور ٹانگ کا زخم کچھ اور ٹھیک ہو جائے تو پھر تم سے ایک چھوٹا سا کام لینا ہے۔ اس کے بعد تم پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا کیا مطلب ہے؟ مجھے آزاد کر دیا جائے گا؟'' کہنے لگا۔ ''آزاد ہی نہیں کیا جائے گا، تمہیں پاکستان واپس بھی پہنچایا جائے گا... تم ہمارے مہمان ہو، دشمن نہیں ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اگر مہمان ہوں تو پھر مجھے کمرے میں بند کیوں رکھا ہوا ہے اور باہر پہرے دار ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''صرف اس ڈر سے کہ تم کہیں بھاگنے کی دوسری کوشش نہ کرو۔''

''میں بہت پوچھتا رہا کہ وہ کیا کام ہے جو انہوں نے مجھ سے لینا ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس بارے میں پریشان نہ ہوں۔ یہ بالکل معمولی سا ٹاسک ہے۔ بس میں یوں سمجھوں کہ ایک بندے سے ملاقات کرائی جانی ہے میری۔ میرے اس رقعے کا جواب جلد از جلد لکھو تاکہ مجھے حالات سے کچھ آگاہی ہو۔ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی یہاں آیا ہے؟ مجھے ثروت کی خیر خیریت سے بھی آگاہ کرو۔ اپنی رائے بھی مجھے بتاؤ کہ مجھے اس سچویشن میں کیا کرنا چاہیے۔ کیا ہری سنگھ کی بات پر اعتبار کر کے انتظار کرنا چاہیے یا پھر یہاں سے از خود نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ اگر نکلنے کی کوشش کرنی ہے تو کیا تمہارے ذہن میں کوئی پلان ہے؟ تمہارے جواب کا شدت سے انتظار کروں گا۔ خط کو پڑھنے کے بعد فوراً ضائع کر دینا۔''

یوسف کی اس تحریر میں ایک دو باتیں چونکا دینے والی تھیں۔ سردار اوتار کے چھوٹے بیٹے ہری سنگھ نے کہا تھا کہ یہ لوگ یوسف سے ایک چھوٹا سا کام لینا چاہتے ہیں لیکن اس کام کی نوعیت کے بارے میں یوسف کو کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ شاید وہ کسی سے یوسف کی ملاقات کرانا چاہتے تھے لیکن ملاقات کے بعد کیا صورتِ حال ہوگی، اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ ملاقات والی بات بھی ڈھکوسلا ہی ہوتی۔ ایک اور خاص بات جو یوسف بتا رہا تھا، یہ تھی کہ اس کے چہرے پر زخم لگایا گیا تھا۔ اس زخم کے حوالے سے کیا ڈراما رچایا جانے والا تھا، اس کا بھی کچھ اندازہ نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ یوسف کے چہرے کی مشابہت کسی دوسرے چہرے سے بنائی جا رہی ہو اور اس کے خدوخال کو کسی دوسرے کے خدوخال سے قریب تر کیا جا رہا ہو۔ لیکن یہ زخم لگائے جانے کا مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ مثلاً یوسف کو کسی جرم میں ملوث کرنا وغیرہ۔

یہ سارا معاملہ خاصا الجھا ہوا تھا۔ ایک بات تو صاف تھی کہ یہ کوئی معمولی چکر نہیں ہے۔ یوسف کو کہاں سے کہاں پہنچایا گیا تھا اور اس سلسلے میں کئی خطرات مول لیے گئے تھے۔ اب وہ یہاں ایک بڑے سکھ سردار اوتار سنگھ کی عظیم الشان حویلی میں موجود تھا۔ کاش عمران میرے ساتھ ہوتا۔ اس کی سحر انگیز شخصیت اس سارے حالات کا احاطہ کر لیتی۔ وہ اپنے ناخنِ تدبیر سے مشکل ترین گتھیاں سلجھاتا تھا اور بڑے بڑے مرحلے چٹکی بجاتے طے کر جاتا تھا۔ وہ خطروں کا کھلاڑی تھا۔ اس نے مجھے بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا سکھایا تھا لیکن میرے اور اس کے معیار میں ابھی بہت فرق تھا۔

پروگرام کے مطابق میں نے دو بجے کے قریب بجا سنگھ کو فون کیا۔ میری تیسری چوتھی کوشش کامیاب ہوئی اور اس سے رابطہ ہو گیا۔ آوازوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بس میں ہے اور ترشولا کی طرف آ رہا ہے۔ اس نے میری بات کی تصدیق کی اور بتایا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔ ثروت بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے ثروت سے میری بات کرائی۔ وہ کچھ ڈری ہوئی لگتی تھی۔ اس نے پوچھا ''بس اسٹاپ پر آپ اکیلے ہوں گے یا کوئی ساتھ ہوگا؟'' میں نے کہا۔ ''اکیلا ہوں گا۔ لیکن اگر تانگے کے بجائے گاڑی پر آیا تو پھر ہندو ڈرائیور میرے ساتھ ہوگا۔ کم از کم پندرہ منٹ میں حویلی پہنچ جائیں گے۔ باقی باتیں تو تمہیں پتا ہی ہیں۔ تمہارا نام ثریا ہے۔ تم فرید کوٹ کے سول اسپتال میں نرس کے طور پر کام کرتی ہو اور ایک مہینے کی چھٹی پر میرے ساتھ یہاں آئی ہو۔ ہم دونوں فرید کوٹ کے محلہ مندراں میں کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ ہمارا کوئی بچہ نہیں ہے۔''

ثروت نے ذرا توقف کے بعد پوچھا۔ ''اس سوال کا کیا جواب دینا ہے کہ میں آپ کے ساتھ کیوں نہیں آ سکی تھی؟''

''یہی کہ اسپتال میں ایمرجنسی ہو گئی تھی اور چھٹی نہیں مل سکی تھی۔''

چند مزید ہدایات دینے کے بعد میں نے فون بند کر دیا اور تانگا اڈے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ حسبِ توقع عین موقع پر کیدار ناتھ موت کے فرشتے کی طرح میرے سر پر آن کھڑا ہوا۔ اس نے کہا۔ ''بھابی کو لینے جا رہے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''تو ٹھیک ہے، گاڑی پر لے آتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ تم باپو کے پاس رہو گے۔''

وہ بولا۔ ''اس کا انتظام بھی ابھی ہو جاتا ہے۔''

پھر اس نے ایک اننت سنگھ نامی ملازم کو آوازیں دیں اور اسے ایک گھنٹے کے لیے باپو کی دیکھ بھال پر مامور کر دیا... باپو سو رہے تھے۔

آدھ پون گھنٹے کے اندر ہم ثروت کو حویلی لے آئے۔ وہ کچھ ڈری سہمی تھی مگر میری باتوں سے جلد ہی اس کی ڈھارس بندھ گئی۔ وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا چرمی بیگ لائی تھی... اس میں وہ سامان تھا جو نرسنگ کے حوالے سے مطلوب ہو سکتا تھا۔ ایک اٹیچی کیس میں اس کے اور میرے کپڑے وغیرہ تھے۔ ثروت نے جو لباس پہن رکھا تھا، وہ بھی اس کے کریکٹر کے عین مطابق تھا۔ میں نے اسے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ اسے کس انداز سے بات چیت کرنی ہے اور یہاں کیا کیا ڈیوٹیاں انجام دینی ہیں۔

حویلی میں پہنچ کر چند منٹ ہم نے تنہائی میں بھی بات چیت کی۔ یہ بات چیت اس چھوٹے کمرے میں ہوئی جو میرے زیرِ استعمال تھا۔ ''یوسف کہاں ہیں؟'' ثروت نے پہنچتے ہی پہلا سوال کیا۔

اس کے ایسے سوال میرے سینے میں دھواں سا بھر دیتے تھے۔ میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اسی حصے میں ہے۔ ایک کمرے میں بند ہے، وہاں کوئی آ جا نہیں سکتا۔ ہم نے جو کچھ کرنا ہے، بڑی احتیاط اور صبر و تحمل سے کرنا ہے۔''

''آپ نے انہیں میرے بارے میں بتا دیا ہے۔ یعنی انہیں پتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں؟''

''نہیں، ابھی تو نہیں بتایا... اور اس سلسلے میں تم سے مشورہ بھی کرنا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ وہ خواہ مخواہ کسی طرح کے شبہے میں پڑ جائے۔''

''کیسا شبہ تابش؟''

''ثروت! جہاں تک میرا اندازہ ہے، یوسف ہمارے ماضی کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو لگا چکا ہے۔ نصرت کے علاج میں، میں نے جو دلچسپی لی ہے، اس نے بھی اسے چونکایا ہے۔ اب اگر اسے پتا چلے گا کہ ہم کئی دنوں سے اکٹھے سفر کر رہے ہیں، کئی جگہ ہم نے ایک ہی چھت تلے رات گزاری ہے تو اس کے دل میں یقیناً وسوسے پیدا ہوں گے۔''

ثروت کے ملیح چہرے پر گہری سنجیدگی پھیل گئی۔ وہ بولی۔ ''تابش! سچ، سچ ہی ہوتا ہے اور اس میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یوسف کی سوچ ایسی پست نہیں ہو سکتی۔''

میں اس سلسلے میں مزید بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ثروت! اس بارے میں سوچ لیتے ہیں۔'' تھوڑے سے توقف کے بعد میں بولا۔ ''ثروت! اس رات کے لیے مجھے معاف کر دینا۔ میں تیز بخار میں تھا۔ بس اسی مدہوشی میں وہ بات ہوئی۔'' وہ جواب میں کچھ نہیں بولی۔ بس پلکیں جھکائے کھڑی رہی۔

کچھ ہی دیر بعد ثروت اپنی ڈیوٹی پر باپو کی چتی یعنی وڈی بے بے کے پاس پہنچ گئی۔ جانے سے پہلے اس نے اپنی اوڑھنی کے نیچے سے موبائل فون نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

کیدار ناتھ اب میرے ساتھ کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ فارغ وقت میں ہم دونوں اکثر حویلی کی چھت پر چڑھ جاتے۔ دور تک پھیلے کھیتوں کھلیانوں کا نظارہ کرتے اور اس کے ساتھ گفتگو بھی جاری رہتی۔ حویلی میں شادی کی تیاریاں زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ ڈھولک اور گیتوں کی آواز اکثر حویلی کے اندرونی حصوں سے ابھرتی رہتی تھی۔ پتا چلا کہ سردار اوتار کی بیٹی سرنوں کی شادی علاقے کے ایک ہم پلہ سردار کے بیٹے سے ہو رہی ہے اور اس میں بہت ہلا گلا ہونے والا ہے۔

یوسف کے خط کا جواب ابھی مجھے لکھنا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ کیا اور کوئی بھی میرے ساتھ یہاں آیا ہے یا میں

اکیلی ہوں؟ اس کا جواب ”ہاں“ میں تھا۔ میرے ساتھ ثروت یہاں آئی تھی لیکن ابھی تک میں حتمی فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ یوسف کو ثروت کی آمد کے بارے میں بتاؤں یا نہیں۔ یوسف نے یہ بھی پوچھا تھا کہ اسے ہری سنگھ کی بات کا اعتبار کر کے انتظار کرنا چاہیے یا یہاں سے فوری طور پر نکلنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ فی الوقت تو مجھے یہی بہتر لگ رہا تھا کہ انتظار کیا جائے۔

میں نے ایک رقعہ لکھ کر جیب میں رکھ لیا اور کیدار کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ میں جب بھی یوسف کی بینڈ یج کے لیے جاتا تھا، کیدار ساتھ ہی ہوتا تھا۔ کیدار کی آمد سے پہلے ہی باپو نے مجھے آواز دی۔ میں حسبِ معمول ان کے چہرے کی طرف جھک گیا اور اپنا ایک کان ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ انہوں نے اپنی بیمار مدھم آواز میں کہا کہ میں بائیں طرف والی الماری کھول کر اس کی نچلی دراز سے تصویروں والی کاپی (البم) نکالوں۔

میں نے اس ہدایت پر عمل کیا، باپو نیم دراز تھے۔ میں نے البم ان کی جھولی میں رکھ دی اور موٹے شیشوں والی عینک ان کی آنکھوں سے لگا دی۔ وہ اپنے سلامت ہاتھ کو ہولے ہولے حرکت دینے لگے اور تصویریں دیکھنے لگے۔ یہ ان کے خاندان ہی کی تصاویر تھیں۔ کچھ بلیک اینڈ وائٹ، کچھ رنگین۔ پھر انہوں نے بڑے سائز کی ایک رنگین تصویر پر انگلی رکھی اور بہت مدھم آواز میں مجھے بتایا کہ یہ ان کی پوتی سرتوں کی تصویر ہے جس کی کچھ ہی دن بعد شادی ہو رہی ہے۔ تیکھے نقوش والی یہ لڑکی خوب صورت تھی۔ حالانکہ وہ دیہاتی لباس میں تھی اور اس کے عقب میں ایک گھوڑا بھی دکھائی دے رہا تھا پھر بھی یوں لگا کہ وہ پڑھی لکھی ہے۔

اس تصویر کے ساتھ والے صفحے پر میری نظر ایک اور تصویر پر پڑی اور میں بُری طرح چونک گیا۔ یہ کھڑی ناک والا ایک پچیس چھبیس سالہ جوان تھا۔ اس کے رخسار پر ایک ویسا ہی کٹ تھا جیسا یوسف کے رخسار پر نظر آتا تھا۔ یہ نیم گول کٹ کنپٹی کی طرف سے شروع ہوتا تھا اور رخسار کے وسط تک جاتا تھا۔ مجھے اس شخص کی شکل بھی یوسف سے ملتی جلتی نظر آئی۔ پھر اگلے صفحے پر میں نے اسی شخص کی ایک اور تصویر دیکھی اور حیران رہ گیا۔ اس کا سائڈ پوز ستر اسی فیصد یوسف سے مل رہا تھا۔ ایک دم بہت سی بکھری ہوئی کڑیاں آپس میں مل گئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یوسف واقعی اپنی شکل و صورت کی وجہ سے یہاں موجود تھا۔ کم از کم ان دو تصویروں کو دیکھنے کے بعد تو یہی محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے مؤدب انداز میں باپو سے پوچھا۔ ”باپو یہ کون ہے؟“

وہ بھرائی ہوئی، بہت دھیمی آواز میں بولے۔ ”یہ پوترا اشوک سنگھ۔“

”ماشاء اللہ بڑے گبرو جوان ہیں یہ… لیکن ان کو یہاں دیکھا نہیں۔“

”یہ باہر ہوتا ہے۔“ باپو کی طرف سے مختصر جواب ملا۔

میں ششدر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد کیدار ناتھ آیا تو میں نے اس کو اشوک کے حوالے سے تھوڑا سا کریدا۔

کیدار کی باتوں سے پتا چلا کہ مخالفوں نے سردار اشوک پر کچھ جھوٹے مقدمے بنائے ہوئے ہیں۔ دشمنی داری بھی بہت بڑھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے سردار اوتار سنگھ نے اشوک سنگھ کو یہاں نہ آنے کی ہدایت کر رکھی ہے۔

”دشمنی داری سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ میں نے کیدار سے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”سردار اشوک کی سب سے بڑی دشمن تو حرام خور پولیس ہی ہے۔ لاکھوں کھا بھی گئی ہے پھر بھی سردار اشوک کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ اس کو گولی کا آرڈر دیا ہوا ہے بڑے افسروں نے۔“ کیدار نے آخری الفاظ دھیمی آواز سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہے۔

”کوئی خاص جرم کیا تھا اشوکا صاحب نے؟“

”یہی سمجھ لو۔ ایک بڑا کرخت قسم کا پولیس افسر قتل ہو گیا تھا سردار اشوکا سے۔ تب سے ان لوگوں نے اشوکا کو ہٹ لسٹ پر رکھا ہوا ہے۔ پنجاب کا چپا چپا چھان چکے ہیں، اب بھی چھان رہے ہیں۔ اپنے پیٹی بھائیوں کے لیے پولیس والوں کی بھاگ دوڑ بہت بڑھ جاتی ہے۔ عام قتل ہو تو ڈیڑھ دو سال بعد ہی فائل بند ہو جاتی ہے۔ یہاں چار پانچ سال گزر گئے ہیں مگر یہ لوگ اسے ابھی تک ڈھونڈ رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ پولیس کو جہاں بھی سردار اشوکا کا کھوج لگ گیا، اسے مقابلے میں پار کر دیا جائے گا۔“

”تو وہ پیش کیوں نہیں ہوتا؟“

”تو بھی سیدھی سیدھی پھانسی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کئی اہم سیاسی لوگ بھی اشوکا کے قتل میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ انہوں نے پنجاب میں اور پنجاب سے باہر بھی اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ دو تین مہینے پہلے احمد آباد سے کسی مخبر نے اطلاع دی تھی کہ کسی سنیما کے گیٹ کیپر نے اشوکا کو کسی سنیما ہال سے نکلتے دیکھا ہے۔ بس اس اطلاع پر پولیس کی دوڑیں لگ گئیں۔ یہاں فاضلکا اور بیکانیر وغیرہ سے بھی پولیس کی دو تین پارٹیاں بھاگم بھاگ احمد آباد پہنچ گئیں۔ کئی دن چھان بین ہوتی رہی پر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بعد میں یہ لوگ یہاں حویلی کے دو ملازموں کو پکڑ کر لے گئے۔ وہ ان سے مار پیٹ کا ارادہ رکھتے تھے مگر ایسے موقعوں پر سردار اوتار سنگھ کے تعلقات بہت کام آتے ہیں۔ دو تین گھنٹے کے اندر ملازم واپس آگئے۔ ایسے سلسلے پہلے بھی چلتے رہے ہیں…“

کیدار باتیں کر رہا تھا اور میرے دماغ کی چرخی تیزی سے گھوم رہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک اندیشہ بڑی تیزی سے سر ابھار رہا تھا۔ میرے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ سردار اشوکا کی صورت سے ملتے جلتے یوسف فاروقی کو پاکستان سے اٹھا کر یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ یہ لوگ اس سے کیا مطلب حاصل کرنا چاہتے تھے۔

میں نے کیدار ناتھ سے پوچھا۔ ”تم نے سردار اشوکا کو دیکھا ہوا ہے؟“

”نہیں یار! تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ چار پانچ سال سے روپوش ہے۔“

”تمہیں اس کی تصویر بھی نہیں دیکھی؟“

”تصویر شاید ایک آدھ بار دیکھی ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ کیدار ناتھ کا ذہن اس طرف نہیں جا رہا جدھر میں لے جانا چاہ رہا ہوں۔ یوسف اور اشوک سنگھ کی صورتوں میں جو نمایاں مماثلت نظر آ رہی تھی، کیدار نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ خاص طور سے چہرے پر کٹ لگنے کے بعد تو یہ مماثلت اور بڑھ گئی تھی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں۔ کیدار واقعی بے خبر تھا یا پھر وہ سب کچھ جانتا تھا لیکن مجھ سے چھپا رہا تھا۔

شام کے بعد میری اور ثروت کی ملاقات ہوئی۔ ثروت کو زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اوتار سنگھ کی بوڑھی ماتا جسے وڈی بے بے کہا جاتا تھا، خاموش طبع اور مذہبی عورت تھی۔ اس کی صحت بھی کچھ دنوں سے اچھی نہیں تھی۔ بڑھاپے کی دیگر بیماریوں کے علاوہ اس کی کمر کے مہروں میں بھی نقص تھا جس کے سبب وہ سارا وقت بستر پر ہی گزارتی تھی۔ چونکہ وہ بہت ہلکی پھلکی تھی اس لیے اسے اٹھانے بٹھانے میں ثروت کو خاص دقت پیش نہیں آ رہی تھی۔ ثروت نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کسی وجہ سے اپنی پوتی کی شادی پر زیادہ خوش نہیں ہے۔ ڈھولک بجتی تھی تو وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے کا کہہ دیتی تھی۔

میں اور ثروت تقریباً آدھ گھنٹا ایک ساتھ رہے۔



ثروت جلد از جلد یوسف کو دیکھنا اور اس سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کی یہ بے تابی میرے دل پر چرکا سا لگاتی تھی۔ میں نے اسے یوسف سے ملنے میں جو مضمرات تھے، وہ بتا دیے تھے۔ اب فیصلہ اسے ہی کرنا تھا اور اس کا فیصلہ یہی لگتا تھا کہ وہ یوسف سے ملے گی۔ میں نے یوسف کے لیے رقعہ لکھ رکھا تھا۔ اس میں چند لائنوں کا اضافہ کر دیا۔ ان لائنوں میں، میں نے یوسف کو بتا دیا کہ ثروت یہاں آچکی ہے اور اس سے ملنا بھی چاہ رہی ہے۔ وہ کسی بھی وقت اس سے ملنے آجائے گی۔ ایسا نہ ہو کہ اسے اچانک دیکھ کر وہ چونکتا ہوا نظر آجائے… اور کیدار کو شک ہو۔

اس روز کیدار کے ساتھ میں یوسف کی بینڈ یج کرنے گیا تو میں نے یہ رقعہ حسبِ سابق بڑی صفائی سے یوسف تک پہنچا دیا۔ یوسف کی کہنی کا زخم ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں تھا۔ مزید مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ اگلے روز میں نے ثروت اور یوسف کے ملنے کا انتظام کر دیا۔ میں باپو کے پاس کمرے میں تھا اور بائیں ہاتھ سے ان کی لمبی سفید داڑھی میں کنگھی کر رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کی کلائی پر میں نے پٹی باندھ رکھی تھی۔ میں نے باپو کو بتایا تھا کہ ان کے لیے پانی گرم کرتے ہوئے میرا پاؤں پھسلا ہے اور کلائی کا جوڑ مڑ گیا ہے۔

کچھ دیر بعد جب کیدار ناتھ مجھے لینے کے لیے آیا تاکہ میں یوسف کی پٹی بدل سکوں تو میں نے اسے بتایا کہ آج تو میں خود بھی زخمی ہوں۔ میرے لیے دایاں ہاتھ ہلانا مشکل ہو رہا ہے۔

”تو پھر؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”ثریا کو لے جاؤ۔ وہ مجھ سے بہتر کرے گی۔“

”اس کے لیے سردار اوتار جی سے آگیا لینی پڑے گی۔“

”تو لے لو۔“ میں نے کہا۔

کیدار چلا گیا اور اس روز ثروت اور یوسف کی ملاقات بھی ہو گئی۔ شام کو ثروت مجھ سے ملنے آئی تو اس نے اس ملاقات کی ساری تفصیل بتائی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اسے یوسف سے تفصیلی بات چیت کا موقع مل گیا تھا۔ جب وہ یوسف کی پٹی بدلنے کے لیے مردانے کے اس کمرے میں گئی تو دو تین منٹ بعد ہی کیدار ناتھ کو ہری سنگھ کی آواز پڑ گئی۔ وہ ”جی چھوٹے سردار“ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی آدھ گھنٹے سے پہلے نہیں ہوئی۔ یہ موقع ان دونوں کے لیے غنیمت تھا۔ انہوں نے سرگوشیوں میں ہر طرح کے سوال جواب کیے۔ ثروت نے یوسف کو لاہور سے لے کر یہاں تک کی ساری روداد سنائی۔ کچھ بھی اس سے چھپا کر نہیں رکھا۔ میں

نے پوچھا۔ ”تم نے یہ بھی بتایا کہ ہم ہوٹل میں اور جگت سنگھ کے گھر میں اکٹھے رہتے رہے ہیں؟“

”ہاں تابش! اس میں چھپانے کی کوئی بات نہیں تھی۔ یوسف کی سوچ بُری نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میاں بیوی کے طور پر سفر کرنا ہماری مجبوری تھی۔“

میں نے ثروت کی اس وضاحت کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بہرحال، میرے ذہن میں یہ خدشہ بدستور موجود رہا کہ یوسف کے دل میں شکوک و شبہات کی کونپلیں کھلیں گی۔

رات کو میں دیر تک جاگتا رہا۔ دل میں عجیب سی بے چینی تھی۔ ثروت ایک بار پھر اپنی سوچوں کا رخ یوسف کی طرف موڑ رہی تھی۔ وہ ملے تھے... انہوں نے طویل تبادلہ خیال کیا تھا۔ یقیناً ان کے درمیان وہ فاصلہ کم ہو گیا جو لاہور میں اس وقت پیدا ہو گیا تھا جب ثروت آسٹریا سے آئی تھی اور اس نے یوسف کے گرم جوش استقبال کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ بہرحال، یوسف جس قسم کے حالات میں پھنسا ہوا تھا، اس کے لیے ہمدردی اور فکرمندی کے احساسات پیدا ہونا قدرتی بات تھی اور یہ احساسات ثروت میں بھی پیدا ہو رہے تھے۔

میں دیر تک جاگتا رہا پھر ہوا خوری کے لیے پچھلے صحن میں چلا گیا۔ تاہم اس سے پہلے میں نے اطمینان کر لیا کہ بابو سو رہے ہیں۔ نیند کی حالت میں یہ قریب المرگ بابو سردار کسی موی تصویر کی طرح نظر آتا تھا۔ میں صحن میں آ گیا۔ تاریک آسمان پر ستاروں کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ انہی میں سے کوئی ایک ستارہ میری والدہ تھی اور کوئی ایک ستارہ شاید بھانڈیل اسٹیٹ کی سلطانہ بھی تھی... اور سلطانہ نے مجھ سے کہا تھا... مہروج! ایک دن وہ لڑکی تمہیں جرور ملے گی جس سے تم بہت جیادہ پریم کرت ہو۔ اور جب وہ تم سے ملے تو اس سے کہنا کہ ایک دور دیس میں تمہاری ایک بہن تھی جو بن دیکھے ہی تمہاری محبت میں گرفتار تھی... اور پھر میرے بالو کو میری اس بہن کی گود میں ڈال دینا۔

اس نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ امید اور محبت کے آمیزے میں لتھڑی ہوئی کئی باتیں کی تھیں لیکن ضروری تو نہیں ہوتا کہ انسان جو کچھ سوچے، وہ پورا بھی ہو۔ یہاں ثروت کی شادی ہو چکی تھی۔ اس نے خود کو ایک عجیب لیکن بڑے مضبوط ازدواجی رشتے میں باندھا ہوا تھا۔ ہوا میں نمی تھی۔ سفیدے اور سرو کے طویل درخت چاند کی خنک روشنی میں ہولے ہولے جھوم رہے تھے، جیسے دھیمے سروں والے کسی گیت پر سر ہلا رہے ہوں۔ کبھی کسی کتے یا بلی کی آواز سناٹے میں ارتعاش پیدا کرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ میں دھواں سا بجھنے لگا۔ کسی کا لکھا ہوا یہ فقرہ ذہن میں بار بار ابھرنے لگا... اگر قسمت میں محرومیاں لکھی ہوں تو حالات کی کروٹ بھی بیکار ہی ثابت ہوتی ہے۔ کیا میرے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہونے والا تھا...؟

ایک طرف چھوٹی سی برآمدہ نما جگہ تھی۔ یہاں دو اُپلے نظر آ رہے تھے اور چھت تلے پرانے ... گٹھے پڑے تھے۔ میں اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر ایک گٹھے پر نیم دراز ہو گیا اور بادل کی ایک ٹکڑی میں ہولے ہولے حرکت کرتے ہوئے چاند کو دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں حویلی کے زنان خانے میں پھر سے ڈھولک کی آواز ابھرنے لگی۔ لڑکیوں نے کورس کی شکل میں گانا شروع کیا۔ تیرے باجرے دی راکھی منڈیا میں نے بھیندی وے... (اے میرے محبوب میں تیرے باجرے کے کھیت کی رکھوالی کے لیے نہیں بیٹھ سکتی) گیت کی مدھم آواز میری سماعت تک پہنچ رہی تھی۔ اچانک میں بُری طرح چونکا۔ دو سائے تیزی سے اس تنہا برآمدے کی طرف آئے اور خشک پرالی کے ڈھیر کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ چند سیکنڈ بعد مجھے ایک ہانپی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ”میں سوگند کھاتی ہوں کیدار صاحب... میں آپ کی گنڈی کے پاس بھی نہیں گئی۔ میں نے تو سارا دن باورچی خانے میں گزارا ہے۔“

چند سیکنڈ بعد کیدار پھنکارا۔ ”تو گنڈی کی طرف نہیں گئی تو پھر تجھے یہ بٹوا ملا کیسے؟“

”یہ گنڈی سے کافی دور کیاری میں پڑا ہوا تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ آپ کا ہے۔ نہیں تو اسی ویلے آپ کو واپس کر دیتی۔“

”اس میں پورے نو سو روپے تھے... اب پوری طرح سے بھی دس پندرہ کم ہیں۔ باقی کہاں گئے؟“ کیدار نے کرخت آواز میں پوچھا۔

”نو سو نہیں تھے جی۔ صرف سات سو تھے۔ دو روپیا... مم، مجھ سے خرچ ہو گیا۔ میں وچن دیتی ہوں کہ وہ واپس کر دوں گی۔“

”چوری لکھ کی ہو یا ککھ کی، چوری ہی ہوتی ہے... اور تو نے کی ہے اور اگر آج کی ہے تو اس سے پہلے بھی کر رہی ہو گی۔ میں مالکوں کو بتاؤں گا تو تیرے اور بھی بہت پول کھل جائیں گے۔“

”میں سوگند کھاتی ہوں۔ واہگرو جانتا ہے۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔“



”سردار اوتار جی کو بکوانا آتا ہے وہ بکوا لیں گے تجھ سے۔“

وہ روہانسی ہو گئی۔ ”میں آپ کے آگے ہتھ جوڑتی ہوں۔ میری ماں پہلے ہی بیمار ہے۔ وہ یہ نہیں جھیل سکے گی۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں بھی اپنی جگہ بالکل بے حرکت بیٹھا رہا۔ پھر تاریکی میں کیدار ناتھ کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔ ”کاکا کہاں ہے تیرا؟“

”وہ کوٹھڑی میں سو رہا ہے۔“

”تو پھر تھوڑا سا ٹائم گزار میرے ساتھ... سوچتے ہیں تیرے بارے میں۔“

”میں... میں سمجھی نہیں؟“

”تو سب سمجھتی ہے۔ پر بھولی بن رہی ہے۔ یہ لے... یہ لے باقی کے پیسے بھی اپنے پاس رکھ۔ پر کرنا وہی پڑے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔“

”لیکن...“ وہ منمنائی۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ صرف خشک پرالی کے سرکنے کی آواز آتی رہی۔ یقیناً کیدار لڑکی کو جال میں پھنسانے میں کامیاب رہا تھا۔ یقیناً وہ اس سے دست درازی کر رہا تھا اور وہ خاموش رہنے پر مجبور تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی مدھم آواز سنائی دی۔

”اچھا، اب مجھے جانے دیں۔ مجھے سویرے سویرے ناشتا بھی بنانا ہے۔ چھوٹے سردار ہری جی نے تارن پر جانا ہے نا۔ پانچ بجے نکل جانا ہے انہوں نے۔“

کیدار ناتھ نے بھاری آواز میں کہا۔ ”ہاں ناشتے سے یاد آیا، وہ سردار جی کا لاڈلا پروہنا (مہمان) کہہ رہا تھا کہ اس کے لیے انڈا گھول کر نہ بنایا کرو۔ فرائی کیا کرو انگریزی طریقے سے۔ سفیدی علیحدہ زردی علیحدہ اور دودھ پتی بھی نہ بھیجا کرو۔ چائے بنایا کرو تھوڑے میٹھے والی...“

لڑکی بولی۔ ”ایک تو جی اس پروہنے کی فرمائشیں ہی بہت ہیں۔ کل مکئی کا میٹھا پراٹھا پکایا ہے اس کے لیے، پرسوں سموسے کی فرمائش تھی۔ پتا نہیں سردار جی اتنے نخرے کیوں اٹھا رہے ہیں اس کے...“

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر کیدار کی طنزیہ آواز ابھری۔ ”یہ وہی نخرے ہیں جو مسلمان، قربانی کے بکرے کے اٹھاتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں... بس سمجھ لے کہ اس پروہنے والی سنگت ایک دو دن ہی کی ہے، یہ چلا جائے گا کہیں۔“



## سنہرے اقوال

- صبر، ہر تکلیف کا بہترین علاج ہے
ــــــــ افلاطون

- ولولہ کامیابی کا زینہ ہے۔ یہ وہ خوبی ہے کہ جو آپ کو کسی کام کے لیے پورے جی جان سے جدوجہد کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔
ــــــــ ے۔ سی۔ راسر ٹی

- مرنے سے پہلے جب پادوف سے سوال کیا گیا کہ کامیابی کا راز کیا ہے تو اس نے اپنے شاگردوں کو بتایا کہ ”جذبہ اور ثابت قدمی“ ہی انسان کو کامیاب کرتی ہیں۔

- بہترین دانائی عزم صمیم ہے۔
ــــــــ نپولین

"پھر یہ ہے کون؟ میں نے تو ابھی تک اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ سنا ہے تین چار دن پہلے اس نے یہاں سے نس جانے (بھاگ جانے) کی کوشش بھی کی تھی؟"

"پورا پتا تو مجھے بھی نہیں۔ سنا ہے کہیں پاکستانی پنجاب سے آیا ہے۔ پر تو چھوڑ ان باتوں کو۔ یہ بتا مجھ سے کب ملنے کے لیے آرہی ہے کمرے میں؟"

"میں نہیں آؤں گی۔" ساتھ ہی چوڑیوں کی چھن چھن سنائی دی۔

"تو پھر یہ بٹوے والی ساری بات سردار جی تک پہنچے گی اور مجھے لگتا ہے کہ اور بھی کئی پول کھل جائیں گے تیرے۔ دو مہینے پہلے انگوٹھی گم ہو جانے والے معاملے میں بھی تیرا نام آیا تھا۔ اب لگ رہا ہے کہ وہ الزام بھی ٹھیک ہی تھا۔"

"میں سوگند کھاتی ہوں۔ میں نے وہ انگوٹھی کبھی دیکھی بھی نہیں۔ آپ... اپنے مطلب کے لیے مجھے خوامخواہ پھنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"تو جو بھی سمجھ لے امرت... میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے۔"

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر امرت کی آواز ابھری۔ "آپ مجھے... بار بار تنگ کرو گے۔"

"بار بار نہیں... بس ایک آدھ بار۔" کیدار کی شیطانی آواز ابھری۔

اس دوران میں کسی اندرونی کمرے سے بچے کے رونے کی باریک آواز آئی۔ "ہائے میں مری۔" امرت نے کہا پھر پرالی میں ہلچل ہوئی اور ایک سایہ سا تیزی سے اندرونی حصے کی طرف اوجھل ہو گیا۔

یقیناً جانے والی امرت تھی۔ کیدار ناتھ وہیں لیٹا رہا۔ غالباً وہ چاہ رہا تھا کہ امرت اپنی جگہ پر پہنچ جائے اور بچہ چپ کر جائے تو پھر وہ بھی اپنے کمرے کا رخ کرے۔

میں پرالی کے گٹھوں کی دوسری طرف کیدار ناتھ سے فقط دس پندرہ فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میں جان گیا تھا کہ کیدار ناتھ جان بوجھ کر انجان بنا رہتا ہے ورنہ اسے بہت کچھ معلوم ہے۔ آج اس کا اصلی چہرہ میرے سامنے آیا تھا اور یہ خاصا مکروہ تھا۔ میں نے وہیں لیٹے لیٹے ایک اہم فیصلہ کیا۔ یہ راست اقدام کا فیصلہ تھا اور اس کے لیے موقع بھی بہت اچھا تھا۔ شکار خود چل کر ایک نہایت مناسب جگہ پر آیا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پرالی کے گٹھوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا تہ خانہ ہے۔ یہ دراصل ایک زمین دوز کچا کمرا تھا جس میں ایک بڑا ڈونگی پمپ لگایا گیا تھا۔ اب یہ پمپ بیکار ہو چکا تھا۔ یہاں بس تھوڑا سا کباڑ پڑا تھا اور پرانی مشینری کے پرزے وغیرہ تھے۔ [illegible] نے اپنا خم دار چاقو ہاتھ میں لیا۔ نیم تیرگی کے باوجود اندازہ تھا کہ کیدار ناتھ کہاں موجود ہے۔ درمیانی فاصلہ [illegible] سے طے کر کے میں کیدار کے سر پر جا پہنچا۔ وہ نیم [illegible] اس نے بے پناہ حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میرے [illegible] میں چمک دار چاقو اور میرے چہرے پر پہچان تاثر [illegible] کر وہ سکتہ زدہ رہ گیا۔ پھر اس نے چلانے کی کوشش کی [illegible] میں پہلے سے تیار تھا۔ میں اس کے اوپر گرا۔ اپنے بائیں [illegible] سے میں نے اس کا منہ ڈھانپا اور دائیں ہاتھ سے چاقو [illegible] تو اس کی گردن پر رکھ دیا۔ میری گرفت اتنی سخت تھی کہ [illegible] بلند آواز اس کے منہ کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ اس [illegible] دوسری آواز نکالنے کی جرأت نہیں کی کیونکہ چاقو اس کی رگ صابن کی طرح کاٹ سکتا تھا۔ میں پھنکارا۔ "اگر [illegible] نکالو گے تو ذبح کر ڈالوں گا۔"

وہ میری گرفت کی سختی اور میری جسمانی برتری کو [illegible] طرح محسوس کر چکا تھا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر اس نے [illegible] ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں [illegible] اندر حیرت کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے [illegible] شخص باورچی خانے کی سکھ ملازمہ کو جنسی طور پر [illegible] کرنے میں مصروف تھا اور اس میں کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ اب وہ خود شدید خوف و ہراس کے نرغے میں تھا۔

اس بات سے مطمئن ہونے کے بعد کہ اب [illegible] مزاحمت نہیں کرے گا، میں نے اس کے ہونٹوں پر سے [illegible] ہتھیلی ہٹالی۔ اس کے منہ سے پیاز اور الکحل کی ہلکی سی بو اٹھ رہی تھی۔ میں نے چاقو بدستور اس کی گردن پر [illegible] اسے سر کے بالوں سے کھینچتا ہوا لکڑی کی اس سیڑھی تک [illegible] گیا جو نیچے ڈونگی پمپ والے زمین دوز کمرے میں [illegible] تھی۔ کیدار ناتھ کو معاملے کی سنگینی کا پوری طرح احساس [illegible] چکا تھا۔

وہ لرزاں آواز میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم وہ [illegible] ہو جو نظر آرہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "اور تم بھی وہ نہیں ہو جو دکھائی دیتے [illegible] تم سردار اوتار کے رازدار ملازموں میں سے ہو۔ ورنہ درجنوں ملازموں میں سے صرف تمہیں ہی یوسف کی [illegible] بحال کے بیے نہ چنا۔"

یوسف کے نام پر کیدار ناتھ نے کسی تعجب کا [illegible] کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے نام سے آگاہ ہے۔



[illegible] کے علاوہ وہ بھی بہت کچھ جانتا ہے۔ میں نے سب سے پہلے [illegible] ناتھ کی تلاشی لی۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ [illegible] جیبوں سے گاڑی کی چابی اور سگریٹ کا پیکٹ ملا۔ اس کے علاوہ وہ موبائل بھی نکلا جس کا ذکر وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے [illegible] بھی امرت سے کر رہا تھا۔ اس کی جیب سے نکلنے والا [illegible] موبائل فون میں نے فوراً آف کر دیا۔ یہ وہی موبائل تھا جس [illegible] سے رابطہ کرتا رہا تھا۔ کیدار کے لباس سے ملنے والی سب سے اہم شے اس کمرے کی چابی تھی جہاں یوسف بند تھا۔

میں نے یہ چیزیں ایک طرف رکھ دیں۔ میں نے ایک بار پھر اس کے سر کے بال پکڑے اور آتشیں لہجے میں کہا۔ "کیدار ناتھ! آج رات تیری جان صرف ایک ہی صورت میں بچے گی۔ مجھے سچ سچ بتائے گا کہ یہاں یوسف فاروقی کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جانے والا ہے اور کس طرح؟ اب میری بات کے جواب میں یہ مت کہنا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم جانتے ہو۔ تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے امرت سے کہا ہے کہ مہمان یعنی یوسف کا کھیل ختم ہونے والا ہے۔ تم نے اسے قربانی کا بکرا بتایا ہے۔ مجھے اس قربانی کی ساری تفصیل چاہیے۔"

کیدار بولا۔ "میں... بس رعب ڈال رہا تھا امرت پر۔ اسے... بتانا چاہتا تھا کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ میرا وشواس کرو، میں نے جو کچھ کہا، بس ویسے ہی کہا۔"

میں نے ایک بار پھر اس کے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے اور اسے دیوار کے ساتھ لگا کر چاقو کی نہایت تیز دھار اس کی گردن پر رکھ دی۔ "کیدارے! میں نے کہا ہے نا کہ یہ صابن کی طرح کاٹے گا اور یہ ایسا ہی کرے گا۔ مجھے گولی مت دے ورنہ اسی جگہ تیرا 'بولو رام' ہو جائے گا۔ میں بہت کچھ جان چکا ہوں، بس بہت تھوڑا تجھ سے جاننا ہے۔ اگر تو نہیں بتائے گا تو کوئی اور بتا دے گا لیکن تو یہاں سے بھی زندہ نہیں نکل سکے گا۔"

"م... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ کیا جانتے ہو تم؟"

"بہت کچھ۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہارے سردار اوتار سنگھ کا بڑا بیٹا اشوکا سنگھ پانچ سال سے مفرور ہے۔ کئی صوبوں کی پولیس اسے اب بھی ڈھونڈ رہی ہے۔ اب سردار اوتار سنگھ کو اتفاق سے یوسف کی شکل میں ایسا بندہ مل گیا ہے جو شکل صورت اور قد کاٹھ میں بہت حد تک اشوکا سنگھ سے ملتا ہے۔ اشوکا سنگھ کے گلے سے ساری بلا گلے اتارنے کے لیے یوسف کو بلی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔ یوسف کو اس طرح سے مارا جائے گا کہ اس کی موت کو اشوکا کی موت سمجھا جائے اور یہ معاملہ چتا میں جل کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ بڑی فلمی قسم کی پلاننگ کی ہے تم لوگوں نے اور اس پلاننگ کی اصل وجہ یہی ہے کہ جاوا نام کے 'فلم لائن بدمعاش' نے تمہیں حیرت انگیز طور پر اشوکا سے ملتا جلتا بندہ دے دیا ہے۔ اس نے بہت بڑا کام کیا ہے تمہارے سردار اوتار سنگھ کے لیے... یقیناً بہت بڑا کام۔"

اچانک کیدار ناتھ نے زور مارا۔ اس نے مجھے زوردار دھکا دے کر سیڑھی کی طرف بڑھنا چاہا تھا۔ میں کسی ایسی حرکت کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس کے سر کے قدرے لمبے بالوں پر میری گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ مجھے پیچھے ہٹانے میں ناکام ہوا۔ اس کا دھکا سہنے کے بعد میں نے ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پر اپنی ہتھیلی جمائی اور چاقو کا بھرپور وار کیا۔ چاقو کا تین چوتھائی پھل کیدار کی دائیں ران میں گھس گیا۔ وہ چلایا اور مچھلی کی طرح تڑپا لیکن اس کی آواز میری ہتھیلی کے نیچے ہی گونج کر رہ گئی۔ میں نے جھٹکے سے چاقو کھینچا۔ اس کی پتلون خون سے رنگین ہونے لگی اور جسم تکلیف سے لرزنے لگا۔ "اگلا وار تمہارے پیٹ پر کروں گا اور ناف کے ساتھ ایک اور ناف بنا دوں گا۔" میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔

وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔ میں نے چاقو اسی کی پتلون سے صاف کیا اور اسے کچھ اور بھی دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ میری ہتھیلی بدستور اس کے ہونٹوں پر تھی۔ کہیں دور حویلی کے اندرونی کمروں سے خواتین کا مدھم قہقہہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی ڈھولک بجنے لگی۔ یہاں اس زمین دوز کمرے میں کیدار ناتھ سمجھ چکا تھا کہ صورتِ حال اس کی توقع سے کہیں زیادہ سنگین ہے اور اگر اس نے میری بات نہیں مانی تو یہ سہانی شب اس کے جیون کی آخری شب ثابت ہو سکتی ہے۔

قریباً دس منٹ بعد کیدار ناتھ زنگ آلود ڈونگی پمپ سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھا تھا اور اس نے اپنی زخمی ران دونوں ہاتھوں سے تھام رکھی تھی۔ میں اس کے عین سامنے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ کراہ رہا تھا اور میرے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا اور جو کچھ میں نے اس سے اپنے سوالوں کے ذریعے اگلوایا، خاصا سنسنی خیز تھا۔ یوسف کو واقعی موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا تھا اور یہ کام بس اڑتالیس گھنٹے کے اندر ہی ہونے والا تھا۔

آدھ پون گھنٹے کی گفتگو میں کیدار ناتھ نے جو کچھ

بتایا۔ اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے... مقامی پولیس کو ہمیشہ یہ شک رہا تھا کہ حویلی میں ہونے والی کسی اہم تقریب میں اشوکا سنگھ چوری چھپے شریک ہوگا۔ یہ بھی ایک ایسا ہی موقع تھا۔ اشوکا کی کلوتی بہن سرنوں کور کی شادی دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ کل اس کی، تیل وغیرہ کی رسم تھی۔ اس رسم کے فوراً بعد یوسف کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔ پروگرام بڑا سنسنی خیز تھا۔ اس پروگرام کے مطابق یوسف کو ایک چکمہ دیا جا رہا تھا۔ اسے ایک گاڑی دی جا رہی تھی اور ''آزاد'' کیا جا رہا تھا۔ اس سے کہا جا رہا تھا کہ وہ فاضلکا کی طرف چلا جائے۔ فاضلکا کے بڑے ڈاک خانے کے سامنے اسے ایک بندہ ملے گا۔ باقی کا کام وہ سنبھالے گا اور اسے پوری حفاظت سے بارڈر پار کرا کے پاکستان پہنچا دے گا۔ پروگرام کے مطابق یوسف کو بھی فاضلکا کے قصبے تک نہیں پہنچنا تھا۔ راستے میں کم ازکم تین جگہ پولیس ناکے موجود تھے، گاڑیوں کی چیکنگ ہوتی تھی۔ ان میں سے ہی کسی ناکے پر یوسف کو بطور اشوکا سنگھ پہچان لیا جانا تھا یا اس پر نہایت تگڑا قسم کا شک ہو جانا تھا۔ دوسری طرف یوسف کو ہدایت تھی کہ اگر کہیں پولیس اسے روکنے کی کوشش کرے تو وہ رکے گا نہیں اور ہر صورت فاضلکا کی حدود میں پہنچے گا۔ اب اس سے آگے کا ڈراما اور بھی سنگین تھا۔ یوسف کی گاڑی کے نیچے قریباً چار کلو ٹی این ٹی والا ایک ریموٹ کنٹرول بم نصب کر دیا گیا تھا۔ جب سردار اوتار سنگھ کے اہلکار یہ دیکھتے کہ پولیس یوسف کے پیچھے لگ گئی ہے اور اسٹیج پوری طرح تیار ہو چکا ہے تو وہ یوسف کی گاڑی کو دھماکے سے اڑا دیتے۔ ان اہلکاروں کو ایک دوسری گاڑی میں یوسف کے پیچھے پیچھے رہنا تھا۔

... یہ ایک تفصیلی پلان تھا۔ اس میں بہت سی مزید جزئیات کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ ممکن تھا کہ اس میں دو چار خامیاں بھی ہوں پھر بھی اس کی کامیابی کے امکان روشن تھے۔ یوسف اور اشوکا کی مشابہت سے دھوکا کھا کر ایک بار پولیس اس کے پیچھے لگ جاتی اور وہ مارا جاتا تو سرداروں کا مقصد پورا ہو جاتا۔ اشوکا سنگھ کی جان قانون کے مسلسل تعاقب سے چھوٹ جاتی۔ وہ انڈیا میں یا پھر انڈیا سے باہر کسی جگہ کسی اور شناخت سے پُرسکون زندگی گزار سکتا...

کیدار ناتھ کی زبانی یہ تفصیلات سن کر میں سنانے میں رہ گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ لاہور میں یوسف ایک نعمت غیر مترقبہ کی طرح جاوا گروپ کے ہاتھ لگا تھا۔ جاوا کے کسی ایسے بندے نے یوسف کو دیکھا تھا جو اشوکا سنگھ کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اشوکا سے یوسف کی مشابہت دیکھ کر اس کے دماغ میں سوچ کے گھوڑے دوڑے تھے اور ان لوگوں نے یوسف کو اسپتال سے اٹھانے کا پروگرام بنایا تھا۔

صورتِ حال میری توقع سے کہیں زیادہ سنگین تھی۔ میں تلملا کر رہ گیا۔ سردار اوتار سنگھ جو اپنے تئیں بہت منصف بنتا تھا، اپنے ذاتی مقصد کے لیے بڑی بے رحمی سے ایک بے گناہ کی جان لینے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ جلد از جلد اس قاتل حویلی سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ یہ کام اگر آج کی رات ہی ہو جاتا تو بہتر تھا۔ مجھے لگا کہ کیدار ناتھ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتا ہے۔ وہ پوری طرح میرے ٹرانس میں تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں اس سے کام لے سکوں گا۔ لیکن جو کچھ ہوا، وہ انتہائی غیر متوقع اور اچانک تھا کہ میں ششدر رہ گیا۔ کیدار ناتھ نے میری توقع سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے پمپ کے قریب بیٹھے بیٹھے پانی کے ڈیڑھ انچ موٹے آہنی پائپ کا ڈھائی تین فٹ لمبا ٹکڑا ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پھر اچانک بے حد تیزی سے اس نے میرے چاقو والے ہاتھ پر وار کیا۔ یہ سخت ضرب تھی۔ چاقو میرے ہاتھ سے نکلنے میں بس ذرا کسر ہی رہ گئی...

دوسرا وار اس نے میرے سر پر کیا۔ یہ بھی مہلک وار تھا۔ میں نے جھک کر خود کو بچایا۔ تیسری دفعہ پائپ کا وزنی ٹکڑا میرے کان کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں چاقو سے بھی حملہ کر سکتا تھا مگر میں نے اپنا سر استعمال کیا۔ میری دھواں دھار ٹکر کیدار ناتھ کی پیشانی پر لگی اور وہ ڈکراتا ہوا پشت کے بل گرا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اٹھے گا مگر وہ اٹھ نہیں۔ اس کے گلے سے عجیب سی پُردرد آواز برآمد ہوئی۔ اس کے سینے کے سامنے کی طرف لہو کی سیاہی پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے حیرت سے دیکھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ٹریکٹر کے ہل کا ایک ٹوٹا ہوا حصہ اس کی پشت میں گھسا تھا اور سامنے کی طرف اس کی خمیدہ چونچ باہر نکل آئی تھی۔ آٹھ دس سیکنڈ کے اندر کیدار ناتھ کا جسم ساکت ہو گیا۔ وہ ختم ہو گیا تھا۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا۔ کتنی ہی دیر تک میں سکتہ زدہ سا اپنی جگہ کھڑا رہا... پھر حرکت میں آ گیا۔ اب سب سے پہلا کام یہ تھا کہ کیدار ناتھ کے لہولہان جسم کو جو آناً فاناً لاش میں تبدیل ہو چکا تھا، کہیں چھپایا جائے۔ مرنے سے چند سیکنڈ پہلے مجھ پر حملے کے دوران میں کیدار ناتھ نے ایک چنگھاڑ بھی بلند کی تھی۔ اس امر کا اندیشہ موجود تھا کہ یہ بلند آواز کسی کو بھی متوجہ کر سکتی۔

میں نے دو تین منٹ تک سن گن لی پھر سیڑھی چڑھ





...ور بغیر آواز پیدا کیے کچھ پرالی اتار کر نیچے لے آیا۔ یہ پرالی میں نے کیدار کی لاش پر اس طرح پھیلا دی کہ وہ اس میں بیملوف ہو کر رہ گیا۔ کچھ سڑی ہوئی سی ہی مائل پرالی پہلے ہی اس جگہ موجود تھی۔ جب تک کوئی نیچے نہ اترتا اور اچھی طرح نہ دیکھتا، کیدار ناتھ والے سانحے کا علم اسے نہیں ہو سکتا تھا۔ تہ خانے میں خون کے دھبوں کو چھپانے پر میں نے سوچ بچار نہیں کی اور پھر کیدار کی جیب سے برآمد ہونے والی اشیا کو اپنے بیگ میں رکھ کر باہر نکل آیا۔ ان اشیا میں یوسف کے کمرے کی چابی اہم ترین تھی۔

☆☆☆

دوپہر کو ثروت سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ رات والے خونی واقعے سے یکسر بے خبر تھی۔ اور وہی کیا، حویلی میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ ابھی تک کسی کو کیدار ناتھ کی غیر موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

ثروت نے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے یوسف کی پٹی بدلی ہے... ان سے دو چار باتیں بھی کی ہیں۔ وہ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ شاید آج رات تک کچھ ہونے والا ہے۔''

''مثلاً کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یوسف کا خیال ہے کہ شاید آج کسی بندے سے ان کی ملاقات کرائی جائے گی اور اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ انہیں یہاں سے روانہ کر دیا جائے۔''

''مطلب کہ آزاد کر دیا جائے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں لیکن ابھی وقت کا کوئی ٹھیک پتا نہیں۔ یہ کام آج رات ہو سکتا ہے۔ یوسف کو کالے رنگ والی ٹویوٹا جیپ پر یہاں سے بھیجی جائے گا اور وہ خود ہی ڈرائیو کر کے جائیں گے۔ وہ فاضلکا میں کسی بندے سے ملیں گے جو انہیں سرحد پار کرائے گا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہوگا؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن سردار اوتار تسلی تو پوری سے رہا ہے۔''

مجھے ثروت کا چہرہ اترا ہوا سا نظر آیا تھا۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک طرح کا روکھا پن بھی محسوس ہوا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا؟

مجھے کل رات جو کچھ معلوم ہوا، وہ بہت سنگین تھا۔ میں ابھی اس بارے میں ثروت کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ''ثروت! ہمیں بہت ہوشیار اور چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ اگلے دس بارہ گھنٹے بہت اہم ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمیں کسی طرح یوسف کو یہاں سے نکالنا پڑے گا۔ ورنہ اسے کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''کک... کیا، آپ کو کچھ معلوم ہوا ہے؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''نہیں، کوئی خاص نہیں۔ بس میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''لیکن ہم کیا کریں گے؟''

''حویلی سے باہر میرے کچھ دوست موجود ہیں، جگت بھی شامل ہے ان میں۔ میں موبائل پر ان سے رابطے کی کوشش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ ہماری مدد کر سکیں۔ ان سے بات ہو جائے تو پھر میں تمہیں ساری صورتِ حال بتا دوں گا۔''

''لیکن تابش! میں نے بہت خون خرابا دیکھ لیا ہے۔ پلیز! مجھے ایسا اور کچھ نہ دکھانا۔ کچھ ایسا سوچیں کہ بغیر کسی فساد کے یہ معاملہ حل ہو جائے۔''

''تم فکر نہ کرو ثروت! جو ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ تم نے یوسف کو بارڈر والے واقعے کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا؟'' میرا اشارہ کم ازکم پانچ افراد والے قتل سے تھا۔

میری توقع کے مطابق ثروت کا جواب نفی میں تھا۔

اسی دوران میں بیمار باپو مجھے پکارنے لگے۔ میں نے ثروت سے کہا کہ وہ تین بجے کے قریب کسی بہانے دوبارہ مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ میں اسے ساری صورتِ حال بتا دوں گا۔

ثروت کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ باپو دوا کھا کر سو چکے تھے۔ میں نے موبائل پر جگت سے رابطہ کیا اور اسے الف سے یے تک ساری صورتِ حال بے کم و کاست بتا دی۔ اس سنسنی خیز روداد نے جگت کو بھی حیران کیا۔ اپنے قاتل بیٹے کا پیچھا قانون سے چھڑانے کے لیے سردار اوتار کتنی عیاری سے ایک بے گناہ کی جان لے رہا تھا۔ حالانکہ یہ بات سو فیصد یقینی نہیں تھی کہ اس طرح اس کی جان چھوٹ جائے گی۔

میں نے کہا۔ ''جگت پیارے! میں نے کسی بھی طرح یوسف کو یہاں سے نکالنا ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''بادشاہ زادے! تُو مدد کی بات کر رہا ہے، آپاں جان دینے کو تیار ہیں۔ گوبندر بھی ایک دم تیرا عاشق بنا ہوا ہے۔ اگر کہو تو اس پوری حویلی کو بارود سے اڑا دیں گے۔ اپنے فوجی ماموں صاحب نے بہت سا بارودی سامان رکھا ہوا ہے اپنے گھر میں۔ ڈائنامیٹ، چھوٹی توپ کے پرانے

گولے اور بارودی سرنگیں وغیرہ۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ بس تم اتنا کرو کہ دو چار چوکس بندے، اور ایک فٹ گاڑی لے کر حویلی کے پاس پہنچ جاؤ اور تھوڑا سا ہلا گلا کر دو حویلی کے باہر۔"

"یار، تو مجھے غصہ چڑھانے والی گل کر رہا ہے۔ مزہ نہیں آ رہا تیری باتوں کا۔"

"کیا مطلب؟"

"شیر سے چڑی مارنے کا مت کہو۔ کوئی سانڈ شانڈ ڈیکار کر دو۔ تھوڑا سا ہلا گلا تو آپاں (ہم) سے نہیں ہوگا۔ اگر ہوگا تو لمبا چوڑا ہوگا۔"

"لیکن پیارے! اتنا لمبا چوڑا بھی نہیں چاہیے تاکہ کام ہی خراب ہو جائے۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ دس پندرہ منٹ کے لیے حویلی کے گارڈز کی توجہ حویلی کے بڑے گیٹ کی طرف ہو جائے۔ میں یوسف کو چھوٹے گیٹ کی طرف سے لے کر نکل جاؤں۔ چھوٹے گیٹ سے تیس چالیس قدم دور تیری گاڑی کھڑی ہو، ہم اس میں سوار ہو جائیں۔"

جگت سنگھ دیری سے بولا۔ "میں ساری گل سمجھ گیا ہوں۔ کیا خیال ہے، دو چار کالے انار چلا دیں بڑے پھاٹک کی طرف؟"

"کالے انار (دستی بم) ہیں تمہارے پاس؟"

"اوئے پورا ٹوکرا بھرا ہوا ہے بادشاہ زادے! تو یہ باتیں نہ پوچھ۔ بس آرڈر کر آرڈر۔ تیرے لیے اور چھوٹی کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں میں... مگر پہلے مجھے اندر کا نقشہ تو بتا۔ کوئی بڑا ہتھیار بھی ہے تیرے پاس کہ نہیں؟"

"بڑا ہتھیار بھی مل جائے گا۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "باپو کی الماری میں انگریزوں کے زمانے کی ایک بڑی زبردست رائفل میں نے دیکھی ہے۔ کافی گولیاں بھی ہیں... اور یہ تیری، کالے اناروں والی بات بھی ٹھیک ہے۔ ایک دو انار پھینکے جا سکتے ہیں، پر خوامخواہ ان سے کسی کی جان نہیں جانی چاہیے۔ میری بات سمجھ رہا ہے نا تو؟"

"بادشاہ زادے! تم پاکستانیوں نے ہم سرداروں پر خوامخواہ لطیفوں کے ڈھیر لگائے ہوئے ہیں۔ اتنے بھی کھوتے نہیں ہوتے ہم۔ ویسے یہ بتا میرے شیر ببر... تو کرنا کیا چاہ رہا ہے؟" جگت سنگھ جوشیلے انداز میں بولا۔ لگتا تھا کہ اس کے گرم خون نے ابھی سے ابالے کھانے شروع کر دیے ہیں۔

میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو پچھلے آٹھ دس گھنٹوں میں اپنے ذہن میں ترتیب دیا تھا۔ بہرحال اس رُوداد میں سے کیدار ناتھ کی موت کا ذکر حذف کر دیا۔ ہم نے تفصیل سے بات کی اور چھوٹی بڑی ساری جزئیات [illegible] کیا۔ موبائل فون پر ہماری یہ گفتگو قریباً ایک گھنٹہ [illegible] رہی۔ میرے موبائل کا بیلنس ختم ہو گیا تو جگت نے [illegible] کر لی۔ بہرحال ہم نے رات نو بجے کے لیے ایک [illegible] پلان تیار کر لیا۔

میں پچھلے دو دن سے حویلی کی اندرونی صورت [illegible] بغور جائزہ لے رہا تھا... پہرے [illegible] کی تعد [illegible] اوقات، ان کے پاس موجود اسلحہ اور اس طرح کی [illegible] معلومات مجھے مل چکی تھیں۔ ڈھائی بجے کے لگ بھگ [illegible] نے بڑی احتیاط سے باپو کی آٹومیٹک رائفل بھی الماری سے نکال لی۔ یہ باپو ہی کی طرح نفیس اور صاف ستھری تھی۔ [illegible] دل گواہی دینے لگا کہ اگر شام کو سب کچھ پروگرام کے مطابق ہو گیا تو ہم یوسف کو بہ آسانی یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ثروت کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ جب چاہتی از خود یہاں سے نکل کر جودھ پور پہنچ سکتی تھی۔

ثروت کو سہ پہر تین بجے مجھ سے دوبارہ ملنے آنا تھا... لیکن وہ وقت پر نہیں آئی۔ شاید "وڈی بے بے" کو نہلانے دھلانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ میں بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ چار بجے اور پھر پانچ بج گئے۔ اس کی شکل دکھائی نہیں دی۔ میں بے قراری سے کمرے میں ٹہل رہا تھا جب اچانک میری نظر بستر کے نیچے ایک مڑے تڑے کاغذ پر پڑی۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ ایک تہ شدہ رقعہ تھا۔ ایسا رقعہ جو یوسف مجھے لکھتا تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ میرے نام لکھا ہوا کوئی پرانا رقعہ ہے لیکن جب میں نے اسے کھولا تو پتا چلا کہ یہ ثروت کے نام تھا۔ غالباً یوسف نے کل کی ملاقات میں اسے تھمایا ہوگا۔ ثروت نے پڑھ کر لباس میں رکھ لیا ہوگا لیکن وہ اتفاقاً یہاں گر گیا۔ یہ خطرناک سچویشن تھی۔ اگر رقعہ کہیں اور گرتا تو قیامت برپا ہو سکتی تھی۔

ثروت بے حد محتاط لڑکی تھی۔ اس سے ایسی غلطی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن آج وہ مجھے اتنی ڈسٹرب نظر آئی تھی کہ پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور پڑھنا شروع کیا۔ سینے میں ایک بار دھواں سا بھرنے لگا۔ رگوں میں کڑواہٹ اتر گئی۔ [illegible] ثروت سے ملنے کے بعد یوسف نے وہی ردعمل دیا تھا جس کی توقع اس جیسے شخص سے کی جا سکتی تھی۔ یوسف نے ایک [illegible] لکھا تھا۔ "مجھے تم پر پورا بھروسا ہے ثروت! لیکن تمہارے اس کزن پر نہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں اور اب بھی [illegible] ہوں۔ یہ ہماری زندگی میں زہر گھولنے پر تلا ہوا ہے۔ ثروت

یہ تمہارے ساتھ اس لیے یہاں نہیں پہنچی کہ اسے میری سلامتی کی فکر ہے۔ صرف اس لیے آئی ہے کہ وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا تھا......"

خط میں ایک اور جگہ لکھا تھا۔ "...میرا دل بہت وسیع ہے ثروت! جس طرح کی باتیں یہ شخص تمہارے بارے میں کرتا ہے، یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ سن لیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نصرت کے عروج میں بھی جو دلچسپی اس نے دکھائی ہے اور جس طرح بار بار تم دونوں سے رابطے کرتا رہا ہے، اس میں بھی اس کی بدنیتی کو ہی دخل ہے۔ بہرحال، میں پھر کہتا ہوں، ماضی جو کچھ بھی تھا لیکن اب مجھے تم پر مکمل بھروسا ہے۔ مجھے تو اردگرد کی کوئی خبر نہیں۔ تم دیکھنے اور سمجھنے کی بہتر پوزیشن میں ہو۔ فی الحال ہمیں ان ساری باتوں کو ایک طرف رکھ کر یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنا ہے۔ اس سلسلے میں اگر تابش سے رابطہ رکھنا ضروری ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

سارا خط پڑھنے کے بعد میں بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ اب یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آرہی تھی کہ ثروت کے رویے میں اچانک تبدیلی کیوں آئی ہے۔ وہ بہت خاموش اور بجھی بجھی تھی۔ آج اس نے تین بجے آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آئی نہیں تھی۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔

اب شام کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ حویلی میں چہل پہل بڑھتی جارہی تھی۔ حویلی کے باغیچے کی طرف دیگیں کھڑکوائے جانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ اب کیدار ناتھ کی غیر موجودگی کو محسوس کرلیا گیا تھا۔ کیدار ناتھ بظاہر جیپ ڈرائیور تھا لیکن اصل میں سردار اوتار سنگھ کا خاص کارندہ تھا۔ دو تین بندے آکر مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ چکے تھے۔ خود ہری سنگھ نے بھی بار بار اس کے سیل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ فون خاموش تھا۔ اسے میں نے ہی بند کر کے کمرے میں چھپایا ہوا تھا۔ موسم میں خنکی تھی۔ سارا دن بھی ہلکے بادل رہے تھے۔ مجھے توقع تھی کہ ابھی لاش سے بُو اٹھنا شروع نہیں ہوئی۔ جب تک بُو نہ اٹھتی، میرے اندازے کے مطابق لاش کا پتا چلنا مشکل ہی تھا۔ احتیاطاً میں ایک دفعہ کنواں نما تہ خانے کی طرف گیا تھا اور جائزہ لیا تھا کہ کوئی مشکوک شے وہاں موجود نہ رہ گئی ہو۔

چھ بجے کے لگ بھگ میں نے خود ثروت سے ملنے کی کوشش کی۔ ایک ملازمہ کے ہاتھ اسے پیغام بھجوایا۔ لیکن وہ ملازمہ کسی اور کام میں لگ گئی یا پھر ویسے ہی بھول گئی۔ اب میں پچھتا رہا تھا کہ میں نے دوپہر والی ملاقات میں ہی کیوں نہ ثروت کو صورتِ حال کی سنگینی سے آگاہ کردیا۔ آدھ گھنٹے بعد میں نے حویلی کے ایک خواجہ سرا موہنا سنگھ کو ایک دے کر بھیجا۔ موہنا سنگھ نے آکر بتایا کہ وڈی بی بی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ نرس بی بی ابھی بہت مصروف ہے، آ نہیں سکتی۔

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا... پروگرام کے عین مطابق آٹھ بجے کے لگ بھگ جگت سنگھ کا فون آگیا۔ حسبِ معمول وہ جوش اور حرارت سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "ہم، بادشاہ زادے! ہم یہاں چل پڑے ہیں۔ دو گڈیاں ہیں آرہے ہیں۔ ایک گڈی دور کھڑی رہے گی۔ دوسری حویلی کے پاس چلی جائے گی۔ ایک بار اپنی گھڑیاں پھر ملاتے ہیں۔ بتا کیا ٹائم ہوا ہے تیرے پاس؟"

"آٹھ بج کر اٹھارہ منٹ......" میں نے کہا۔

"چل ٹھیک ہے۔ میں بھی آٹھ بج کر اٹھارہ منٹ پر لیتا ہوں۔" تو نے اپنا موبائل ہر وقت آن رکھنا ہے۔ بیٹری پوری ہے نا؟"

"ہاں، بیٹری تو پوری ہے۔ کسی وقت نہ اٹھاؤں تو سمجھ کہ کوئی پاس ہے۔" میں نے کہا۔ جگت سنگھ نے مجھے بتایا وہ میری والی ایل ایم جی اور اس کے ڈھیر سارے راؤنڈ بھی لے کر آرہا ہے۔

اسی دوران میں باپو نے گھنٹی بجائی۔ میں سلسلہ منقطع کرتا ہوا اپنے کمرے سے نکلا اور باپو کے پاس آگیا۔ وہ کافی بے چین نظر آتے تھے۔ میں نے کئی بار اندازہ لگایا کہ وہ اپنی پوتی کی اس شادی پر خوش نہیں ہیں۔ آج چونکہ شادی کی پندرہ روزہ تقریبات کا باقاعدہ آغاز ہوا تھا اس لیے وہ زیادہ اضطراب محسوس کر رہے تھے۔ بہرحال، یہ ان کا گھریلو معاملہ تھا، مجھے کرید کرنے کی ضرورت تھی اور نہ میرے کرید نے سے باپو نے کچھ بتانا تھا۔ میں نے انہیں سکون بخش گولی وقت سے پہلے ہی دے دی جو وہ رات کو کھاتے تھے۔

پندرہ بیس منٹ بعد میں نے پھر جگت سنگھ سے رابطہ کیا لیکن اس مرتبہ رابطہ نہیں ہو سکا۔ مجھے لگا کہ سگنل پورے نہیں آرہے۔ دس پندرہ منٹ بعد دوبارہ رابطہ کیا تو ناکامی ہوئی۔ اب میں ذرا چونکا۔ مجھے جگت سنگھ سے کوئی دوسرا نمبر بھی لینا چاہیے تھا۔ جگت خود بھی رابطہ نہیں کر رہا تھا۔ "کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو؟" میرے ذہن میں وسوسے سر اٹھانے لگے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے پھر ٹرائی کی۔ اس مرتبہ بیل جانے لگی۔ لیکن دوسری طرف سے جو بھاری سی کرخت آواز سنائی دی وہ جگت کی نہیں تھی۔ "کون ہے؟"

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں جگت کا دوست ہوں... اور تم؟"

"جگت کہاں ہے؟"

"اس کے ساتھ تھوڑا سا مسئلہ ہو گیا ہے۔ گاڑی لگ گئی ہے۔ اسے چوٹ آئی ہے۔"

"چوٹ لگی ہے؟" اس کا چھوٹا بھائی گوبند بھی ساتھ تھا، وہ کہاں ہے؟"

"وہ بھی یہیں کہیں ہے۔ تم کون ہو؟" پھر پوچھا گیا۔

مجھے بیک گراؤنڈ سے آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ جھگڑا سا ہو رہا تھا۔ کوئی شخص بڑی بلند اور کرخت آواز میں بول رہا تھا۔ میں نے فون بند کردیا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ کیا واقعی کوئی حادثہ ہو گیا تھا یا پھر کسی ناکے وغیرہ پر ان کو روک لیا گیا تھا۔ ان کی گاڑی میں اسلحہ موجود تھا اور یقیناً دو چار دستی بم بھی ہوں گے۔ حادثے والی بات دل کو نہیں لگ رہی تھی۔ دونوں گاڑیاں ایک ساتھ تو حادثے کا شکار نہیں ہو سکتی تھیں۔ اگر ایک گاڑی کے ساتھ کچھ ہوا تھا تو دوسری گاڑی کے لوگ مجھ سے رابطہ کر کے صورتِ حال سے آگاہ کر سکتے تھے۔

گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ وقت گزر رہا تھا اور ہمارے خلاف گزر رہا تھا۔ حویلی میں اب جشن کا سماں تھا۔ جنریٹر چل رہا تھا اور آرائشی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ حویلی کے بڑے پھاٹک کے سامنے دو ڈھولچی مسلسل ڈھول پیٹ رہے تھے۔ کبھی کبھی بھنگڑا ڈالنے والوں کی ایک پارٹی مجبور قص بھی ہو جاتی تھی۔

زنان خانے کے جس حصے میں باپو موجود تھے، اس حصے کو شور سے محفوظ رکھنے کے لیے درمیانی دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ اب میرے لیے یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ ثروت سے رابطہ کر سکتا۔ وہ خود کوشش کرتی تو اور بات تھی۔ اب میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ یوسف کو صورتِ حال سے آگاہ کرتا اور اسے بتاتا کہ کتنا بڑا اور سنگین مسئلہ درپیش آیا ہے۔ دوسری طرف جگت سنگھ والا "آپ سیٹ" ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے پھر جگت سے رابطے کی کوشش کی۔ اس بار پھر وہی بھاری کرخت آواز سنائی دی جس پر مجھے شبہ تھا کہ یہ کسی پولیس والے کی ہے۔ ایک دم میرے ذہن میں آیا کہ میں غلطی کر رہا ہوں۔ یہاں ڈھول اور باجے گاجے کا شور تھا۔ یہ شور دوسری طرف بھی سنا جا سکتا تھا۔ اگر جگت واقعی پولیس یا بی ایس ایف کی تحویل میں تھا تو وہ لوگ جان سکتے تھے کہ میں کسی شادی والے گھر سے بول رہا ہوں اور اگر وہ آس پاس تھے تو پھر اس حویلی تک بھی پہنچ سکتے تھے۔ اسی دوران میں دوسری طرف سے خود ہی فون بند ہو گیا۔ شاید سگنل کمزور پڑ گئے تھے۔ میں نے موبائل کے ماؤتھ پورشن پر انگلی رکھ کر کال ملائی لیکن کال نہیں ملی۔

اگلا قریباً ایک گھنٹا اسی شدید کشمکش میں گزر گیا۔ رسم اب آخری مراحل میں تھی۔ دس بجنے والے تھے۔ اب وقت نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اگر سردار اوتار سنگھ کا پہلے والا پروگرام برقرار تھا تو اب کسی بھی وقت یوسف کو اس کے بندی خانے سے نکال کر موت کے سفر پر روانہ کیا جا سکتا تھا۔ اسے جس کالی گاڑی میں بھیجا جانا تھا، وہ چھوٹے گیٹ کے پاس درختوں میں کھڑی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس گاڑی کو پوری طرح تیار کیا جا چکا ہے۔ کیدار ناتھ نے بتایا تھا کہ گاڑی کے اگلے حصے میں انجن کے نیچے قریباً چار کلو وزنی بم نصب کردیا جائے گا اور یقیناً اسے نصب کر دیا گیا تھا۔ ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے میں نے اس گاڑی کے قریب اس کے ڈرائیور کو دیکھا تھا، وہ اس کا تیل پانی چیک کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ گاڑی موت کے سفر پر نکلنے کے لیے تیار ہے۔ میرے ذہن میں فوری خیال آیا کہ مجھے اس سیاہ ٹویوٹا گاڑی تک پہنچنا چاہیے۔ کچھ ایسا ہونا چاہیے کہ یہ گاڑی یہاں سے روانہ ہونے کے قابل نہ رہے۔

میں درختوں کی اوٹ لیتا ہوا بڑی احتیاط سے اس تنہا کھڑی گاڑی کی طرف بڑھا۔ کچھ آگے جا کر مجھے زمین پر اوندھا لیٹنا پڑا۔ دو ملازم مٹھائی کے بڑے بڑے ٹوکرے اٹھائے ہوئے میرے سامنے سے گزرے۔ میں تقریباً رینگنے والے انداز میں گارڈینا کی اس باڑ تک پہنچ گیا اور پھر جھک کر اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ٹویوٹا جیپ کے پاس نکل آیا۔ حویلی کا یہ حصہ زیادہ روشن نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے دروازے چیک کیے۔ وہ لاک تھے، پچھلا دروازہ بھی مقفل تھا۔ اندر گھسنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ میں گاڑی کے نیچے رینگ گیا۔ میں نے چند سیکنڈ کے لیے اپنے موبائل فون کی ٹارچ روشن کی اور میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ گاڑی کے دو اگلے پہیوں کے درمیان ایک ایسی چیز نظر آرہی تھی جو جیپ کا حصہ نہیں تھی۔ یہ ایک سیاہ شاپر تھا۔ اس شاپر میں کوئی وزنی چیز تھی جسے ایک رسی کے ساتھ جیپ سے باندھا گیا تھا۔ یہی وہ مہلک بم تھا جس کا علم مجھے کل رات کیدار ناتھ کی باتوں سے ہوا تھا۔ یہ گاڑی کسی بھی وقت یہاں سے روانہ ہو سکتی تھی۔ گاڑی کے نیچے بندھی ہوئی یہ خاموش موت ایک

دھماکے کے ساتھ یوسف کے پرخچے اڑا دیتی۔ ثروت اور یوسف سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میری سمجھ میں فوری طور پر یہی بات آئی کہ میں اس خاموش موت کو جیپ کی باڈی سے علیحدہ کر دوں۔ میں نے قمیص کے نیچے سے اپنا خم دار چاقو نکالا۔ اسے بغیر آواز پیدا کیے کھولا اور احتیاط سے وہ رسّی کاٹ دی جس نے دھماکا خیز مواد کو گاڑی سے پیوست کر رکھا تھا۔ یہ مواد ڈائنامیٹ کے ساتھ آٹھ شیلز کی شکل میں تھا جنہیں باہم باندھا گیا تھا۔ دھماکا خیز مواد کو یوں ہاتھوں میں تھامنا ایک سنسنی خیز تجربہ ہوتا ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میں یہ مواد لے کر باہر نکل ہی رہا تھا جب ایک کرخت آواز گونجی۔ ”کون ہے؟“

میں جہاں کا تہاں ساکت رہ گیا۔ تب ایک ٹارچ کا روشن دائرہ گاڑی پر مرکوز ہوا۔ میں ایک بار پھر گاڑی کے نیچے رینگ گیا۔ یکایک بہت سی آوازیں سنائی دیں۔ بھاگتے دوڑتے قدموں کی آہٹیں ابھریں۔ کئی ٹارچیں روشن ہو گئیں۔ پھر میں نے سردار اوتار سنگھ کی بھاری بھرکم آواز سنی۔ ”کیا ہے؟“

اننت سنگھ نامی ملازم نے پکار کر کہا۔ ”کوئی گڈی کے نیچے گھسا ہوا ہے۔“

ٹارچوں کے روشن دائرے گاڑی کے نیچے رینگنے لگے۔ اب مجھے واضح طور پر دیکھ لیا گیا تھا۔ دھماکا خیز مواد میرے ہاتھ میں تھا اور میں کچی زمین پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ گاڑی کے نچلے حصے کی آئل کی بو نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ میں نے دیکھا، تین چار مسلح افراد زمین پر اوندھے لیٹ گئے اور انہوں نے اپنی ”رشین“ رائفلوں کے منہ میری طرف کر دیے۔

”باہر نکلو۔“ ایک شخص دہاڑا۔ ”نہیں تو نیچے ہی بھون دیں گے۔“

اچانک ہی حویلی کا یہ حصہ روشن تر ہو گیا۔ اردگرد کئی بلب اور ٹیوب لائٹس روشن ہو گئیں۔ باجے گاجے کا شور تھم گیا۔ مہمانوں نے ہنگامے کی بو سونگھی تو مصروفیات چھوڑ کر اردگرد جمع ہونے لگے۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ باہر نکل آتا لیکن اس سے پہلے کہ میں از خود باہر نکلتا، کسی نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اب میں سب کی نظروں کے سامنے تھا۔ کسی شخص نے چلّا کر کہا۔ ”کھڑے ہو جاؤ اور ہاتھ اوپر کر لو۔“

میں نے اٹھ کر ہاتھ کھڑے کر دیے۔ سردار اوتار سنگھ مجھ سے بیس پچیس قدم کی دوری پر کھڑا تھا۔ وہ قد کاٹھ میں سب سے بلند اور نمایاں تھا۔ اس کی اونچی پگڑی کا رنگ ٹیوب لائٹس میں دمک رہا تھا۔ چاروں طرف لوگ تھے رنگ برنگے کپڑوں والی عورتیں بھی تھیں تاہم وہ ہم سے کچھ فاصلے پر تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر مختلف چیزوں کی اوٹ میں تھیں۔ عین ممکن تھا کہ ان میں ثروت بھی شامل ہو۔ میں نے دھماکا خیز مواد نیچے رکھ دیا تھا۔ سردار اوتار سنگھ اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ”اکبر علی! آگے آجاؤ۔“

میں اس کے حکم پر چند قدم آگے آگیا۔ مسلح گارڈ آگے بڑھ کر دھماکا خیز مواد دیکھا اور مہمانوں کو سناتے کے ہوئے بولا۔ ”یہ کافی بڑا بم ہے۔ یہ تو گڈی کے پرزے کر سکتا تھا۔“

یکایک کسی نے ایک پیڑ کے پیچھے سے نکل کر پشت سے میرے سر پر رائفل کا وزنی کندا مارا۔ شدید چوٹ آئی۔ آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے ستارے ناچ گئے۔ میں گھٹنوں کے بل گرا۔ ایک اور چوٹ لگی۔ مجھے لگا کہ میری آنکھوں کے سامنے سیاہ پردہ سا تن رہا ہے لیکن میں مکمل بے ہوش نہیں ہوا۔ یقیناً میری سخت جانی میرا ساتھ دے رہی تھی۔ کئی افراد مجھ پر پل پڑے۔ مجھے اپنا چاقو نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ میرے کانوں میں ملی جلی کئی آوازیں پڑ رہی تھیں۔ بس ٹھیٹ پنجابی کے اڑتے اڑتے سے فقرے تھے۔ ”کون ہے یہ؟... اس کے ساتھی بھی ہوں گے... کیا ہے چودھری جی؟... گڈی کے نیچے بم لگا رہا تھا... دوسری گاڑیاں بھی دیکھو جی... پٹ ٹنگ بند کر دو... مارو اس کو... بم کے اوپر ریت ڈال دو... نہیں پانی میں پھینکو...“ کئی طرح کی آوازیں تھیں۔ میرے دل کے اندر سے کہیں آواز آئی۔ کہاں ہو عمران؟... دیکھو میں پھر پھنس گیا ہوں... مجھے ضرورت ہے تمہاری... لیکن وہ کہیں نہیں تھا... نہ آس پاس، نہ دور دور... اس کے نہ ہونے سے میرے اندر ایک اضافی ہمت اور توانائی پیدا ہونے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں جو کچھ کرنا ہے، مجھے اکیلے ہی کرنا ہے۔ میں اوندھا پڑا تھا۔ میری نظر ایک چمکتی کرپان پر تھی۔ یہ کرپان ایک گارڈ کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگلے چند سیکنڈ میں بہت کچھ ہوگا۔ میری جان بھی جا سکتی تھی۔ لیکن موت سے زیادہ خدشہ مجھے ایک اور بات کا تھا۔ کہیں بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ثروت بھی تو یہ نہیں سمجھے گی کہ میں واقعی اس گاڑی کے نیچے بم لگا رہا تھا...

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جاںسپاروں کی داستان کے بقیہ واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں



جیت اس کی ہوتی ہے جو جیتنا چاہے... وہ بھی جیتنے کے لیے اپنے کھیل کا آغاز ایک نئے انداز سے کرنا چاہتا تھا... اپنے کھیل کے لیے ایک نئی حکمتِ عملی اختیار کرنے والے عقل مند کی منفرد کارگزاری... اسے کامل یقین تھا کہ وہ اپنے ہدف کو حاصل کر کے منزلِ مقصود کو پالے گا...

# جینے کی آرزو

تنویر ریاض

وہ جون کا ایک گرم دن تھا جب ڈیوڈ فورڈ اپنے بہترین دوست رینڈی کارلٹن کے ہمراہ بیس فٹ لمبی کشتی میں اس جزیرے کی طرف روانہ ہوا جہاں اس کی بیٹی کو قتل کیا گیا تھا۔ اس جزیرے کو تلاش کرنا کچھ مشکل نہ تھا کیونکہ یہ اس جھیل کے کنارے واقع سب سے بڑا جزیرہ تھا اور اس کی سب سے بڑی نشانی وہ سفید حویلی تھی جو دور سے دیکھنے میں ہالی ووڈ کی کسی فلم کے سیٹ کا منظر پیش کرتی تھی۔ اس نے رینڈی کو ہدایت کی تھی کہ وہ کشتی کو جزیرے سے قریب تر لے جائے۔

”کیا واقعی تم اس جزیرے کے قریب جانا چاہتے ہو؟“ رینڈی نے پوچھا جو اسٹیئرنگ وہیل سنبھالے ہوئے پتوار چلانے والے کی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے پینل پر مختلف قسم کے میٹر لگے ہوئے تھے جبکہ دائیں جانب وہ لیور تھا جس کے ذریعے ساٹھ ہارس پاور کے انجن کو چلایا جاتا تھا۔

”ہاں۔“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ”آگے بڑھتے رہو۔ جہاں رکنا ہوگا، میں بتا دوں گا۔“

ریندی نے اسے غور سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ اس نے دھاریوں والی قمیص، خاکی پتلون اور سرخ رنگ کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ وہ دونوں اسکول کے زمانے کے دوست تھے۔ ریندی فٹ بال کا بہت اچھا کھلاڑی تھا اور اسے اوزاروں سے خاص دلچسپی تھی جبکہ ڈیوڈ تقریری مقابلوں میں حصہ لیا کرتا تھا اور حساب کے مضمون میں اس کے ہمیشہ اچھے نمبر آتے تھے۔ اب ریندی قریبی قصبے ملٹن میں ایک آٹو ورکشاپ چلا رہا تھا جبکہ ڈیوڈ نے اپنی اکاؤنٹنگ فرم کھول رکھی تھی اور وہ مختلف کمپنیوں اور افراد کے ٹیکس کے معاملات دیکھتا تھا۔

جھیل میں اور بھی چند کشتیاں تیر رہی تھیں۔ جب جزیرے پر واقع سفید حویلی واضح طور پر نظر آنے لگی تو ریندی نے کہا۔ "ہم کافی قریب پہنچ چکے ہیں۔"

"یہ کافی نہیں ہے۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔ وہ اپنے سینے پر گھٹن اور بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ یہی وہ جزیرہ تھا جہاں اس کی بیٹی کیرول نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی تھی۔ سفید حویلی دو منزلہ تھی اور اس کے چاروں طرف بہت بڑا احاطہ تھا۔ اس عمارت میں فرش سے چھت تک کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ حویلی سے ساحل تک سبز لان بچھا ہوا تھا اور ساحل پر تین بوٹ ہاؤس بنے ہوئے تھے۔ ہر ایک کی علیحدہ گودی تھی جس کے ذریعے کشتی کو جھیل میں اتارا جاتا تھا۔ ساحل پر کرسیاں، چھتریاں اور بچوں بڑوں کے لیے مختلف قسم کا تفریحی سامان موجود تھا۔ سفید حویلی کے چاروں طرف صنوبر کے بڑے بڑے درخت لگے ہوئے تھے۔

ریندی نے موٹر کی رفتار کم کی اور بولا۔ "یہی وہ جگہ ہے جہاں میلکم پریسٹن چھٹیاں گزارتا ہے۔ وہ خود بھی امیر کبیر شخص ہے اور میساچوسٹس کے گورنر کا بھائی ہونے کی وجہ سے اس کا کافی اثر رسوخ ہے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ ایک قاتل کا باپ بھی ہے۔" ڈیوڈ نے آہستہ سے کہا۔

ریندی نے لمحہ بھر کو توقف کیا اور تائید کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں، وہ ایک قاتل کا باپ ہے۔"

ڈیوڈ نے اس حویلی کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب اس کی سترہ سالہ بیٹی نے اس سے پارٹی میں شرکت کی اجازت مانگی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو یقین دلایا تھا کہ اس پارٹی میں بہت سے دوستوں کے والدین بھی موجود ہوں گے۔ اس لیے کسی قسم کی بے ہودگی کا کوئی امکان نہیں۔ اس نے مطمئن ہو کر اجازت دے دی لیکن جب صبح چھ بجے تک وہ نہیں آئی تو اس کی پریشانی بڑھ گئی پھر ایک ٹیلی فون کال نے اس کی زندگی تباہ و برباد کردی۔

"اور قریب لے جاؤ۔" اس نے ریندی سے کہا۔

ریندی نے کوئی جواب نہیں دیا اور کشتی کو آہستہ آہستہ آگے بڑھانے لگا۔ ڈیوڈ اس جزیرے کو اپنی بیٹی کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ کیرول اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی ماں پانچ سال پہلے بریسٹ کینسر میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے کوچ کر گئی تھی۔ ڈیوڈ نے اسے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔ اس کے باوجود وہ بہت سمجھدار اور خوددار لڑکی تھی۔ اس نے باپ پر بوجھ بننے کے بجائے جز وقتی ملازمت کر کے اپنے تعلیمی اخراجات خود برداشت کیے۔ ڈیوڈ اس پر جتنا فخر کرتا، وہ کم تھا۔

"سب سے قریبی گودی پر لے جاؤ۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "میں کچھ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ڈیوڈ..." ریندی نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں تیرتا ہوا جزیرے پر چلا جاؤں گا۔"

"میں نہیں چاہتا کہ کوئی نامعلوم گولی تمہارے سر میں سوراخ کردے۔"

"گویا تم میری بات نہیں مانو گے؟" ڈیوڈ نے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اتنے پُراعتماد کیوں ہو؟"

"ابھی پتا چل جائے گا۔ تم کشتی تو آگے بڑھاؤ۔"

ریندی کو مجبوراً اس کی بات ماننا پڑی۔ اس نے لیور دبایا اور کشتی کو قریبی گودی تک لے جانے لگا۔ جیسے ہی وہ اس کے برابر پہنچا، ڈیوڈ نے باہر کی جانب چھلانگ لگا دی اور کشتی کے رسّوں کو گودی پر نصب ہک سے باندھ دیا۔ اس گودی سے سفید حویلی تک پتھروں سے بنا ہوا راستہ تھا۔ اطراف میں اور بھی عمارتیں تھیں۔

ڈیوڈ کو وہاں کھڑے ہوئے چند سیکنڈ بھی نہ گزرے تھے کہ دو آدمی خاکی لباس پہنے ہوئے اس راستے پر آتے ہوئے نظر آئے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں ریڈیو تھے اور انہوں نے آنکھوں پر دھوپ کے چشمے چڑھائے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک آگے بڑھا اور ڈیوڈ کے قریب آکر بولا۔

"جناب! ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

"میں مسٹر میلکم پریسٹن سے ملنا چاہتا ہوں۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔

"کیا آپ نے ان سے ملاقات کا وقت لے رکھا ہے؟"

"نہیں لیکن تم انہیں بتا سکتے ہو کہ ڈیوڈ فورڈ ان سے ملنا چاہتا ہے۔"



"معاف کیجیے، ہم انہیں ڈسٹرب نہیں کر سکتے۔" سیکیورٹی گارڈ نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

"اور اس کا بیٹا تھامسن... کیا وہ موجود ہے؟"

"کیا واقعی آپ اس سے ملنا چاہتے ہیں؟" گارڈ کے لہجے میں حیرانی تھی۔

ڈیوڈ نے دھیمی آواز میں کہا۔ "جانتا ہوں، وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ یورپ چلا گیا ہے لہٰذا وہ جواب نہیں دے سکتا کہ اس نے میری بیٹی کے ساتھ کیا کیا تھا..."

گارڈ نے اس کے مزید قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "جناب! میں آپ سے درخواست کروں گا کہ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ یہ جزیرہ کسی کی ذاتی ملکیت ہے اور آپ مداخلت بے جا کے مرتکب ہو رہے ہیں۔"

ڈیوڈ کا دماغ گھوم گیا اور وہ چلاتے ہوئے بولا۔ "اگر میں یہاں سے نہیں گیا تو تم میرا کیا بگاڑ لو گے؟ مجھے جھیل میں پھینک دو گے؟ جیل میں ڈال دو گے یا شراب پلا کر مجھے خواب آور گولیاں دے کر مار ڈالو گے... جیسا کہ میری بیٹی کے ساتھ کیا تھا۔"

دوسرا گارڈ بولا۔ "براہِ کرم یہاں سے چلے جائیں ورنہ ہمیں پولیس کو بلانا پڑے گا۔"

ڈیوڈ نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "اس قصبے میں صرف ایک پولیس چیف اور تین آفیسرز ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ سارے کام چھوڑ کر مجھے گرفتار کرنے چلے آئیں گے؟"

دونوں گارڈز خاموش کھڑے رہے۔ ڈیوڈ نے ان کی طرف دیکھا اور بولا۔ "شاید میں غلطی پر ہوں۔ پولیس چیف ضرور آئے گا کیونکہ..."

اسی لمحے اس نے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ ریندی اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "ڈیوڈ! اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

ڈیوڈ مڑا اور ہک میں لگی ہوئی کشتی کی رسیاں کھولنے لگا۔ اس نے پلٹ کر دونوں سیکیورٹی گارڈز کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان میں سے کوئی اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو دیکھ سکے۔ وہ جیسے ہی کشتی پر سوار ہوا، ریندی نے انجن اسٹارٹ کردیا۔

☆☆☆

آدھ گھنٹے بعد وہ اس جزیرے سے کافی دور جا چکے تھے۔ ریندی اپنے ساتھ کچھ کھانے پینے کا سامان لایا تھا۔ اس نے پیکٹ کھول کر ڈیوڈ کے سامنے رکھا اور بیئر کی بوتل اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے بولا۔

"میں انگریزی کے مضمون میں اتنا اچھا نہیں تھا لیکن کسی مصنف کا کہا ہوا ایک جملہ میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا ہے۔"

"امیر لوگ ہم سے مختلف ہوتے ہیں۔ جانتے ہو کیوں؟"

"اس لیے کہ ان کے پاس زیادہ پیسا ہوتا ہے۔"

ڈیوڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس وقت تمہیں یہ بات کیسے یاد آگئی؟"

ریندی نے بیئر کا لمبا گھونٹ لیا اور بولا۔ "دیکھو ڈیوڈ! جانتا ہوں کہ اس واقعے کو بھلانا بہت مشکل ہے۔ میری شادی نہیں ہوئی اس لیے نہیں جانتا کہ اولاد کے بچھڑ جانے کا غم کتنا شدید ہوتا ہے لیکن مصنف کا کہنا بالکل درست ہے۔ امیر لوگ واقعی ہم سے مختلف ہوتے ہیں اور میلکم پریسٹن بھی ایسا ہی ایک امیر ترین شخص ہے۔ ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ کیرول کے ساتھ کیا ہوا۔ اس منحوس لڑکے نے کیرول کو شراب پلائی اور پھر اسے کوئی نشہ آور گولی دے دی۔ اس کے بعد اس کے ساتھ زیادتی کی گئی۔ ان مجرمانہ حملوں سے وہ جانبر نہ ہو سکی اور زندگی کی بازی ہار گئی۔ اس جزیرے پر کوئی اسپتال ہے اور نہ ہی وہاں ایمبولینس دستیاب تھی۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، تم اس سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔"

ڈیوڈ کی آنکھ سے آنسو ٹپکا۔ وہ ریندی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ کیرول کی موت کی اطلاع تاخیر سے دی گئی۔ میلکم نے اپنے بیٹے تھامسن کو راتوں رات پرائیویٹ جیٹ طیارے کے ذریعے یورپ بھیج دیا تاکہ وہ وہاں کی کسی یونیورسٹی میں موسم گرما کا سمسٹر مکمل کر سکے۔ پولیس چیف ہال ڈائمنڈ نے اس واقعے کی ابتدائی تحقیقات کی اور اسے حادثاتی موت قرار دے دیا۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی نے بھی اس کی تائید کی۔ دونوں ہی میلکم کے زرخرید تھے۔ اس خدمت کے عوض میلکم نے مقامی پولیس کو نئی کاریں عطیے کے طور پر پیش کیں جبکہ اس کے بھائی اور میساچوسٹس کے باأثر گورنر نے ڈسٹرکٹ اٹارنی کو آنے والے الیکشن میں امیدوار نامزد کرنے کی یقین دہانی کرا دی۔ مقامی اخبار میں بھی اس حوالے سے کوئی خبر شائع نہیں ہوئی کیونکہ وہ بھی میلکم پریسٹن کی ملکیت تھا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں کہ اس کے سوا کیا کچھ نہیں ہوا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کیرول کی موت کا بدلہ لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔" ڈیوڈ نے بیئر کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

ریندی نے اسے ہمدردی سے دیکھا اور بولا۔ "تم کیا کر

سکتے ہو؟ تمہیں گودی پر قدم رکھے ہوئے ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ دونوں گارڈز تمہارے راستے کی دیوار بن گئے۔ اس لیے تم میلکم پریسٹن تک پہنچنے کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جن سے تم کسی بار یا ریستوران میں آسانی سے ملاقات کر سکو۔"

ڈیوڈ نے جھلاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ خاموش ہو کر بیٹھ جاؤں اور اپنی بیٹی کے لیے انصاف تلاش نہ کروں؟"

"یہ میں نے کب کہا لیکن انصاف سے کیا مراد ہے؟ مقامی پولیس اور انتظامیہ سے اس کی توقع رکھنا بیکار ہے۔ اس کا لڑکا یورپ بھاگ گیا ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہو کہ کسی نہ کسی طرح میلکم تک پہنچ کر اسے گولی مار دو لیکن ایسی صورت میں تم پر ہی شک کیا جائے گا اور تم فوراً ہی دھر لیے جاؤ گے۔ تمہیں اس کام کے لیے کوئی کرائے کا قاتل بھی نہیں ملے گا کیونکہ وہ سب میلکم کے زرخرید غلام ہیں۔"

"میں تھامسن سے نمٹنے کے لیے یورپ بھی جا سکتا ہوں۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔" رینڈی اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ "اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تھامسن کے خلاف بیٹی کے قتل کا مقدمہ دائر کرو گے تو اس کے بدلے الٹی آنتیں گلے پڑ جائیں گی۔ وہ اپنے دفاع میں بڑے سے بڑا وکیل کریں گے اور تم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ البتہ اس کے جواب میں وہ تمہیں کئی معاملات میں الجھا سکتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ یہاں قانون بھی اسی کا ساتھ دیتا ہے جس کے پاس پیسا ہے۔ یہ قانون میری اور تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"کچھ بھی ہو جائے لیکن میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم اپنے ارادے میں پکے ہو۔" رینڈی نے کہا۔ "لیکن میں تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ کام بڑی ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "یہ جزیرہ ہی سارے فساد کی جڑ ہے اور انصاف کا تقاضا ہے کہ پریسٹن کو یہاں سے نکلنے پر مجبور کیا جائے تاکہ آئندہ کے لیے معصوم لڑکیوں کی عزت اور جان محفوظ رہ سکے۔ اور یہ کام میں کروں گا۔"

☆☆☆

اگلے روز وہ ریاست کے سب سے بڑے شہر پورٹ لینڈ گیا جہاں اس نے مرکزی لائبریری میں تین گھنٹے گزارے اور میلکم پریسٹن کے بارے میں اخبارات کی فائلوں اور مختلف جرائد میں شائع ہونے والے مضامین سے معلومات حاصل کرتا رہا۔ میلکم کی تین شادیوں، اس کے کاروبار اور بھائی کے بارے میں جان لینے کے بعد جب اس کی نظر ایک تصویر پر گئی جس میں تھامسن اپنے باپ کے ساتھ نظر آرہا تھا تو اس نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

کافی تلاش کے بعد اسے اپنے مطلب کا مضمون مل گیا جو ایک میگزین میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایک باتصویر کہانی تھی جس میں جزیرے پر واقع پریسٹن کی حویلی کے بارے میں مکمل معلومات درج تھیں۔ اس حویلی میں چھ بیڈ رومز، دو کشادہ لیونگ روم، ایک وسیع کچن، حویلی کے اندر اور دوسرا باہر تھا جس میں باربی کیو وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ کچن حویلی کے عقبی صحن میں بنایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بوٹ ہاؤسز میں تین طاقتور اسپیڈ بوٹس ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ حویلی کے عقبی حصے میں ہیلی کاپٹر کے اترنے کے لیے ہیلی پیڈ بھی بنایا گیا تھا۔

اس باتصویر کہانی میں جزیرے اور حویلی کے بارے میں پریسٹن کے تاثرات بھی درج تھے۔ اس کا کہنا تھا۔ "کئی برس تک دنیا کا سفر کرنے اور سیکڑوں کاروباری معاملات طے کرنے کے بعد بالآخر مجھے وہ مل گیا جس کی ہمیشہ سے خواہش تھی۔ ایک ایسی جگہ جہاں میں پناہ حاصل کر سکوں۔ جسے اپنا گھر کہہ سکوں۔ جہاں مجھے سکون ملے اور باہر کی دنیا کی فکروں سے آزاد ہو جاؤں۔ یہ جزیرہ میرے خوابوں کی تعبیر ہے جہاں میں ریٹائر ہونے کے بعد اپنی بقیہ زندگی گزاروں گا۔"

اس مضمون کو پڑھنے کے بعد ڈیوڈ نے آدھا گھنٹا لائبریری میں موجود قانون کی کتابوں کی ورق گردانی میں گزارا اور مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے بعد گھر واپس چلا آیا۔

☆☆☆

اگلے روز جب اس کی سیکریٹری لنچ کے لیے چلی گئی تو وہ بھی دفتر سے نکل کر باہر آگیا اور پیدل ہی شہر کے مرکز قلب کی جانب روانہ ہو گیا۔ ٹاؤن ہال پہنچ کر وہ سیدھا سینڈی کے پاس گیا جو ایک عمر رسیدہ عورت ہونے کے باوجود اپنے فرائض بڑی تن دہی سے انجام دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟ میرے خیال میں ابھی تمہارے پراپرٹی ٹیکس کی ادائیگی کا وقت نہیں آیا۔"

"اس وقت میں تمہارے پاس ایک اور کام سے آیا ہوں۔" ڈیوڈ کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے بولا۔ "کیا تم شہری قوانین کی ایک کاپی مجھے دے سکتی ہو؟"





"تمہارا اشارہ ٹاؤن آرڈیننس کی جانب ہے؟ کون سا چاہیے۔۔۔ سول یا کرمنل؟"

"اگر ہو سکے تو دونوں۔"

"ٹھیک ہے تم ٹھہرو، میں لے کر آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ عقب میں بنے ہوئے کمرے میں گئی اور تھوڑی دیر بعد دو کتابچے لے کر واپس آگئی۔

"ویسے تو اس کی فوٹو کاپی پانچ ڈالر میں ہوتی ہے لیکن یہ میرے پاس فالتو ہیں۔ اس لیے تم مفت میں لے جا سکتے ہو۔"

ڈیوڈ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ بند کیا اور ان قوانین کی ورق گردانی کرنے لگا۔ کئی جگہ سے اس نے نوٹس بھی لیے۔ اس دوران میں اس نے دو جگہ فون بھی کیے۔ ان قوانین پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ جھوٹ، مکر و فریب اور بچت کی گنجائش ہر جگہ ہوتی ہے۔

☆☆☆

پانچ بجے اس کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور اس کی سیکریٹری بیتھ اندر داخل ہوئی۔ وہ دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود خاصی پُرکشش تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ڈیوڈ! دفتر بند ہونے کا وقت ہو گیا۔ اب تمہیں بھی اٹھ جانا چاہیے۔"

"اوہ، مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" ڈیوڈ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم مجھے ایک منٹ دے سکتی ہو؟"

وہ تھوڑا سا حیران ہوئی پھر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کیا بات ہے ڈیوڈ؟"

ڈیوڈ نے اسے ایک کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ "پیٹر روگین یک ٹیکس فرم چلاتا ہے اور وہ سال کے باقی حصے کے لیے میرے کلائنٹس کے معاملات دیکھنے پر تیار ہو گیا ہے۔"

"ڈیوڈ۔۔۔"

وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن ڈیوڈ نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے اپنی دراز سے چیک بک نکالی۔ اس کے نام ایک بڑی رقم کا چیک لکھا اور دستخط کرنے کے بعد اسے پکڑاتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہاری سال کے بقیہ مہینوں کی تنخواہ ہے کیونکہ میں فی الحال یہ دفتر بند کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ جنوری میں دوبارہ کام شروع کر دوں۔ اس وقت اگر تم واپس آنا چاہو تو مجھے خوشی ہوگی لیکن تم اس دوران میں دوسری ملازمت تلاش کرنے میں آزاد ہو۔ مجھے تمہاری سفارش کر کے خوشی ہوگی۔"

بیتھ نے لمحہ بھر کے لیے چیک پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"تم کیا کرنے جا رہے ہو؟"

"وہی جو مجھے کرنا ہے۔" ڈیوڈ نے گول مول جواب دیا۔

☆☆☆

اگلا دن بہت مصروف گزرا۔ اس نے مطلوبہ سامان کی فہرست تیار کی اور شہر کی چھوٹی بڑی دکانوں کی خاک چھانتا رہا۔ ان میں ہارڈ ویئر کی دکان سے لے کر وال مارٹ جیسے سپر اسٹور بھی شامل تھے۔ دن کی روشنی ختم ہونے سے پہلے وہ اپنی خریداری ختم کر چکا تھا۔ اب اس کا رخ جھیل کے کنارے واقع ایک الگ تھلگ کاٹیج کی جانب تھا۔ اس کاٹیج میں چار کمرے تھے اور کھپریل سے بنی ہوئی چھت کہیں کہیں سے ادھڑی ہوئی تھی۔ دروازے پر ایک پرچہ چسپاں تھا۔

"ڈیوڈ! وعدے کے مطابق میری کزن کا یہ کاٹیج گرمیوں کے لیے تمہارے حوالے ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تمہارا کام کب ختم ہوگا۔ اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو فون کر دینا۔ رینڈی۔" ڈیوڈ نے پرچہ پڑھنے کے بعد چھوٹی سی گودی پر نگاہ ڈالی جہاں اس کے دوست کی کشتی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "دیکھوں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

☆☆☆

اسے اپنی تیاری مکمل کرنے میں مزید ایک دن لگ گیا۔ چار جولائی کی صبح وہ اپنے مشن پر روانہ ہونے کے لیے تیار تھا۔ یہ اس موسم گرما کا مصروف ترین ویک اینڈ تھا جب پورا امریکا جشن آزادی منانے میں مصروف تھا۔ اس نے کشتی کی رسیاں کھولیں اور اسے آہستہ سے جھیل میں دھکیل دیا۔ پھر اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور لیور کو پیچھے کی جانب کرتے ہوئے کشتی کا رخ جزیرے کی جانب کر دیا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور دور کا نظارہ دھندلا دھندلا معلوم ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے سفید حویلی نظر آگئی۔ اس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے اور جزیرے پر دور دور تک کسی متنفس کا نام و نشان نہ تھا۔ اس نے انجن کی رفتار آہستہ کی اور گیئر کو نیوٹرل میں ڈال دیا۔ پھر وہ کشتی کے عقبی حصے میں گیا اور اس نے اینکر گرا دیا۔ کشتی نے ہلکا سا جھٹکا لیا اور پھر ایک جگہ پر ٹھہر گئی۔

ڈیوڈ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ منصوبے پر عمل کرنے کا وقت آگیا تھا۔ اب سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ اس نے جو سوچا ہے، اس پر عمل کرے یا خاموشی سے کاٹیج واپس چلا جائے اور کشتی خالی کر کے اپنے گھر کی راہ لے۔ اس کے بعد بھول جائے کہ اسے بھی پریسٹن اور اس کے مغرور بیٹے سے اپنا حساب چکانا تھا۔

اس نے مختلف تھیلوں اور گتّے کے ڈبوں سے سامان نکالنا شروع کیا اور اسے اپنے منصوبے کے مطابق ترتیب دینے لگا۔ اس نے ان تمام چیزوں کو رسّی سے باندھ دیا تاکہ کشتی کے ادھر اُدھر ڈولنے کی صورت میں وہ اپنی جگہ پر محفوظ رہ سکیں۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر سفید حویلی کی جانب دیکھا۔ وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا نیچے آیا اور یکے بعد دیگرے دو سوئچ آن کر دیے۔

دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں تیز موسیقی کی آواز گونجنے لگی۔ آواز اتنی تیز تھی کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ اس نے فوراً ہی جیب سے فوم کے بنے ہوئے دو ایئر پلگ نکالے اور انہیں اپنے کانوں میں ٹھونس لیا۔ پھر وہ آرام سے کرسی پر بیٹھ کر متوقع ردِعمل کا انتظار کرنے لگا۔

اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند منٹ بعد ہی حویلی کے دروازے کھلنے شروع ہو گئے اور ان میں سے لوگ باہر آنے لگے۔ ان میں سے بہت کم کے جسم پر پورا لباس تھا۔ چند ایک نے ہاف پینٹ پہن رکھی تھی اور کچھ صرف تولیا لپیٹ کر ہی باہر آ گئے تھے۔ اب وہ کشتی کی جانب اشارہ کر کے چلّا رہے تھے اور ان سب کی انگلیاں اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ ڈیوڈ نے مسکراتے ہوئے موسیقی کی آواز اور بڑھا دی۔

پندرہ منٹ بعد ایک چھوٹی کشتی اس جانب آتی دکھائی دی۔ اس میں وہی دونوں محافظ سوار تھے جن سے اس کا پہلے بھی واسطہ پڑ چکا تھا۔ جب کشتی اس کے قریب آ کر رک گئی تو ڈیوڈ نے اخلاقاً موسیقی بند کر دی جسے انہوں نے اس کی کمزوری سمجھا۔ پہلے مطالبہ کیا کہ وہ فوراً اپنی کشتی سمیت یہاں سے چلا جائے۔ اس کے بعد وہ دھمکیوں پر اتر آئے۔ ڈیوڈ بڑے اطمینان سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ جب وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئے تو اس نے کاغذوں کا ایک پلندا نکالا جس کے کئی حصے نشان زدہ تھے اور انہیں پکڑاتے ہوئے بولا۔

''اگر تم یا تمہارا آقا ان کاغذات کو پڑھنے کی زحمت گوارا کرو تو جان جاؤ گے کہ میں نے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔ میں ساحل سے پچاس فٹ سے زیادہ فاصلے پر ہوں اور میں نے مسٹر پریسٹن کے ذاتی جزیرے پر قدم رکھ کر اسے نقصان نہیں پہنچایا۔ اگر تم قانون کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو اس کے مطابق کسی عمارت میں رہائش پذیر شخص اپنے پڑوسی کو ڈسٹرب نہیں کر سکتا جبکہ تم دیکھ سکتے ہو کہ میں کسی عمارت کا رہائشی نہیں بلکہ ایک کشتی پر سوار ہوں جو ساحل سے بہت دور جھیل میں لنگر انداز ہے۔ اس کے باوجود اگر تم چاہو تو پولیس کو بلا سکتے ہو لیکن وہ مجھ پر کوئی الزام ثابت نہیں کر سکیں گے۔''

ان محافظوں پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسے مسلسل دھمکیاں دیتے اور اپنا مطالبہ دہراتے رہے۔ تنگ آ کر اس نے دوبارہ سوئچ آن کر دیا۔ فضا تیز موسیقی کی آواز سے گونج اٹھی اور وہ دونوں محافظ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر وہاں سے چلتے بنے۔ اس نے آواز اور بڑھا دی تاکہ حویلی کے مکین اپنی پسندیدہ موسیقی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ وہ خود بھی موسیقی کے معاملے میں خاصا باذوق واقع ہوا تھا اور اپنے پسندیدہ نامور گلوکاروں اور موسیقاروں کے شاہکار گانے اور البم ساتھ لے کر آیا تھا۔ ایک گانا ختم ہوتا تو وہ دوسرا لگا دیتا۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔ اس نے ڈبل روٹی اور پنیر سے لنچ کیا۔ رات کے کھانے کے لیے اس نے کشتی کے عرشے پر باربی کیو کا انتظام کیا تھا۔ کشتی کے عقبی حصے میں ایک ٹوائلٹ بھی تھا جسے اس نے دو مرتبہ استعمال کیا۔ پورے دن میں اس نے صرف دو مرتبہ اپنا ریڈیو اسٹیشن بند کیا۔ ایک مرتبہ دس منٹ اور دوسری بار ایک گھنٹے کے لیے اور اس کے بعد یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

حویلی میں ٹھہرے ہوئے لوگوں کے لیے یہ شور ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ بار بار بے چین ہو کر باہر لان میں آتے اور اس کی جانب اشارہ کر کے چلّانے لگتے جیسے دھمکیاں دے رہے ہوں۔ وہ دوربین لگائے ان کی بے چینی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر میلکم پریسٹن پر گئی جو اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے برابر میں کھڑی عورت مسلسل چلا رہی تھی۔

☆☆☆

رات کا اندھیرا پھیلنے لگا لیکن اس نے اپنا پروگرام جاری رکھا۔ رات کے کھانے اور حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کشتی میں نصب دو طاقتور سرچ لائٹس بھی روشن کر دیں۔ ان میں سے ہر ایک کی روشنی دس ہزار کینڈل پاور کے برابر تھی جو حویلی اور اس کے لان کو پوری طرح منور کر رہی تھی۔ اس طرح رات کے اندھیرے میں ہونے والی کوئی بھی غیر معمولی نقل و حرکت اس کی نظروں میں آ سکتی تھی۔

دو بجے کے قریب اسے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ ایک چھوٹی ناؤ آہستہ آہستہ کشتی کی جانب بڑھ رہی تھی اور اس میں وہی دونوں محافظ سوار تھے۔ ڈیوڈ نے پھرتی سے اپنی شارٹ گن نکالی اور ریلنگ پر کھڑے ہو کر ان کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ''تم پھر آ گئے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ڈرا دھمکا کر مجھے یہاں سے جانے پر مجبور کر دو گے؟ میں تم دونوں کو گولی مار دوں گا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ یقیناً تمہارے آقا نے بتا دیا ہوگا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ تم اس بارے میں ضرور سوچو کہ اگر میں نے تم دونوں کو گولی مار دی تو تمہارا آقا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس کے لیے جیوری کے بارہ ارکان کو خریدنا ممکن نہیں اور یہاں کے زیادہ تر لوگ میرے حق میں ووٹ دیں گے۔ اس طرح میں صاف بچ جاؤں گا اور تم دونوں کا ٹھکانا قبرستان ہوگا اس لیے بہتر ہوگا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔''

وہ دونوں کچھ کہے بغیر جس طرح آئے تھے، اسی طرح واپس چلے گئے۔

☆☆☆

دوسرے روز صبح کے وقت ڈیوڈ نے کچھ لوگوں کو حویلی سے باہر آتے دیکھا۔ وہ بوٹ ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔ بوٹ ہاؤس کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک موٹر بوٹ برآمد ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ ڈیوڈ کی کشتی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جب وہ قریب آئی تو ڈیوڈ نے دیکھا کہ اس کے عقبی حصے میں میلکم پریسٹن بیٹھا ہوا تھا۔ ڈیوڈ نے ساؤنڈ سسٹم بند کر دیا اور خودکلامی کے انداز میں بولا۔ ''بادشاہ خود ہی پہنچ گیا۔''

موٹر بوٹ اس کی کشتی کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ میلکم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بلند آواز میں بولا۔ ''کیا ہم تمہاری کشتی پر آ سکتے ہیں؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی کشتی کا دروازہ کھول دیا اور ڈرائیور نے بڑی مہارت سے موٹر بوٹ اس کے ساتھ لگا دی۔ میلکم پھرتی سے چھلانگ لگا کر کشتی پر آ گیا اور ڈیوڈ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ دبلا پتلا شخص تھا لیکن چہرے کو بارعب بنانے کے لیے اس نے مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس نے مشہور برانڈ کی جینز، ہلکے سبز رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس نے ڈیوڈ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''صورتِ حال ایسی ہو گئی ہے کہ مجھے تم سے بات کرنے کے لیے یہاں آنا پڑا۔''

''تم اپنے اندازے کی بنیاد پر یہ بات کہہ سکتے ہو۔'' ڈیوڈ نے جواب دیا۔

میلکم نے کہا۔ ''میرے لیے یہ وقت بہت خاص ہے۔ ہر سال چار جولائی کو میں اپنی فیملی، دوستوں اور ساتھ کام کرنے والوں کو اپنے جزیرے پر مدعو کرتا ہوں تاکہ وہ پوری طرح ہفتے بھر کی تفریح سے لطف اندوز ہو سکیں۔ میں ان کے لیے باربی کیو، ناشتے، کشتی رانی اور مچھلیاں پکڑنے کا انتظام کرتا ہوں تاکہ انہیں پوری طرح آرام کرنے کا موقع فراہم کرتا ہوں لیکن اس بار تم نے سب چوپٹ کر دیا۔''

''ہر سال چار جولائی کو میں اور میری بیٹی اچھے اچھے کھانے تیار کرتے اور آتش بازی دیکھنے جایا کرتے تھے۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس کے بغیر مجھ پر کیا گزر رہی ہے؟''

''میں جانتا ہوں۔'' پریسٹن نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں تاکہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

ڈیوڈ نے تیزی سے جواب دیا۔ ''تم مجھے یہاں سے جانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔''

پریسٹن نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''اچھا پوائنٹ ہے۔ میں تمہیں مطمئن کرنے کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''تم واقعی جاننا چاہتے ہو؟'' ڈیوڈ نے تلخی سے کہا۔

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے اپنے بیٹے تھامسن کو یورپ سے بلاؤ پھر پولیس چیف اور ڈسٹرکٹ اٹارنی کے سامنے اسے پیش کرو تاکہ وہ اعتراف کر سکے کہ اس نے میری بیٹی کے ساتھ کیا کیا تھا۔''

''تمہاری بیٹی کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ محض ایک حادثہ تھا۔'' میلکم نے کہا۔

''وہاں کیرول کی دو بہترین دوست بھی موجود تھیں۔ انہوں نے مجھے پوری تفصیل بتا دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تھامسن نے پہلے اسے شراب پلائی پھر اسے پنیر میں لپیٹ کر ایک گولی کھلا دی۔ وہ منشیات کی اتنی بڑی مقدار برداشت نہ کر سکی اور مر گئی۔ اور تم اسے حادثہ کہہ رہے ہو؟''

''ان لڑکیوں نے پولیس کو ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔'' میلکم نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ انہوں نے پیسوں کے عوض اپنا بیان بدل دیا ہوگا۔''

میلکم پریسٹن نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھے اور بولا۔ ''تھامسن فی الحال واپس نہیں آ سکتا۔ اس لیے اس معاملے پر کوئی بات کرنا بیکار ہے۔ اس کے علاوہ تم جو چاہو، وہ تمہیں دے سکتا ہوں۔''

''تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

پریسٹن نے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں اور میرے پاس کتنی دولت ہے۔ میں تمہیں دو طرح کی پیشکش کر رہا ہوں۔ ان میں سے ایک بہت سادہ ہے۔ یعنی یہ کہ تمہارا سالانہ وظیفہ باندھ دیا جائے۔ یہ بالکل قانونی کام ہوگا اور میں اس کے لیے ہر طرح کی ضمانت دینے کے لیے تیار ہوں۔ رقم کا تعین ہم دونوں باہمی مشاورت سے کریں گے۔''

''اور دوسری پیشکش کیا ہے؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

"اس ریاست میں میری کچھ کمپنیاں اپنے مالی معاملات کی دیکھ بھال کے لیے تمہاری فرم کی خدمات حاصل کر لیں۔ اس طرح تم بہت تھوڑے وقت میں مال دار بن جاؤ گے۔"

ڈیوڈ نے تلخ لہجے میں بولنا شروع کیا۔ "مانتا ہوں کہ تم بہت دولت مند ہو اور تمہارے پاس ملٹن کی پوری آبادی کی مجموعی دولت سے زیادہ پیسا ہے۔ تمہیں کبھی بل ادا کرنے، ڈاکٹرز کی فیس ادا کرنے، کرسمس کے تحائف خریدنے اور جنوری کے مہینے میں گھر کو گرم رکھنے کے لیے کسی پریشانی کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ تم جیسے دولت مند شخص کو تو ہر روز چرچ جا کر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے لیکن اس کے برعکس تم کیا ہو۔ ایک مکار شخص جو سمجھتا ہے کہ ہر چیز قابلِ فروخت ہے۔"

پریسٹن کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ تیز لہجے میں بولا۔ "میں کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہوں لیکن اپنی بے عزتی کروانے یہاں نہیں آیا۔"

"میں نے اپنا مطالبہ تمہیں بتا دیا۔ اس کے سوا کوئی بات قابلِ قبول نہیں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میرے خلاف مقدمہ کر سکو گے تو یہ شوق بھی پورا کر لو۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے یہاں قانون کتنی آہستگی سے حرکت میں آتا ہے۔ سردیوں سے پہلے اس کا فیصلہ نہیں ہو سکے گا جبکہ میں زیادہ عرصے یہاں نہیں رکوں گا۔ اور اگر تمہارا خیال ہے کہ ریاست کے قانون میں کوئی تبدیلی کروا سکتے ہو تو اس میں بھی مہینوں لگ جائیں گے۔ ویسے بھی ٹاؤن کونسل میں گرمیوں کی چھٹیاں ہیں۔"

پریسٹن نے سر ہلایا اور اپنی موٹر بوٹ پر واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ڈیوڈ نے ساؤنڈ سسٹم کو پوری آواز سے چلا دیا اور یہ موسیقی پریسٹن اور اس کے مہمانوں کا پیچھا کرتی رہی۔

☆☆☆

اس نے موسیقی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ حویلی میں قیام پذیر مہمانوں کے لیے اس نے کتابیں پڑھ کر سنانے کا بھی اہتمام کر ڈالا جنہیں وہ پہلے ہی ٹیپ پر ریکارڈ کر چکا تھا۔ اس طرح اس کے محصور سامعین کو جین آسٹن، چارلس ڈکنز اور آرتھر کانن ڈائل کے شاہکار سننے کو مل رہے تھے۔ جب بھی ریڈیو سگنل صاف سنائی دیتے تو وہ ریڈیو پر نشر ہونے والے ٹاک شوز لگا دیتا تاکہ پریسٹن، اس کے خاندان کے افراد اور دوست اس گفتگو سے لطف اندوز ہو سکیں۔

کسی روز گرمی زیادہ ہوتی تو وہ جھیل میں تیراکی کرتا۔ کبھی کبھی بارش بھی ہو جاتی بلکہ ایک روز تو گرج چمک کے ساتھ طوفان بھی آیا۔ اس کے باوجود ڈیوڈ نے اپنا کام جاری رکھا۔ کبھی کبھی جھیل میں تیرنے والی دوسری کشتیاں اس کے قریب آتیں اور ان میں بیٹھے ہوئے لوگ اسے دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ ہلاتے اور انگلیوں سے اس کی جانب اشارہ کرتے۔ کبھی کبھی کوئی منچلا اپنی کشتی اس کے قریب لے آتا اور اس کی جانب بیئر کی بوتل اچھال دیتا۔ کبھی کبھی وہ لوگ اس سے پوچھتے کہ وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے اور جب وہ انہیں اس کی وجہ بتاتا تو وہ اس سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے چلے جاتے۔

جولائی کے آخر میں جمعے کے روز اسے تھوڑی سی پریشانی ہوئی جب جھیل میں گشت کرنے والی ایک سرکاری کشتی اس کے قریب آئی۔ انہوں نے ڈیوڈ سے اس کی کشتی کے کاغذات طلب کیے۔ اس نے پہلے موسیقی کی آواز بند کی پھر بڑی شائستگی سے متعلقہ آفیسر کو کشتی کی رجسٹریشن، آگ بجھانے والے آلات اور دیگر آلات کے بارے میں کاغذات دکھا دیے۔ وہ مطمئن ہو کر چلے گئے تو ڈیوڈ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ قسمت اس کا ساتھ دے رہی ہے۔

رینڈی اکثر و بیشتر اس سے ملنے آتا رہتا۔ وہ اس کے لیے تازہ پھل، سبزیاں اور دیگر کھانے پینے کی اشیا بھی ساتھ لے کر آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی ڈیوڈ اپنی کشتی میں جھیل کے کنارے بنے ہوئے پیٹرول پمپ پر چلا جاتا تاکہ کشتی میں ایندھن بھروا سکے یا رینڈی کے کزن کے کاٹیج میں غسل کرنے اور لمبی نیند لینے کے لیے چلا جاتا۔ اس دوران میں رینڈی کشتی کی صفائی کرتا اور اس کی نگرانی کرتا رہتا۔ ایک دن وہ دونوں بیٹھے ٹھنڈے مشروب سے دل بہلا رہے تھے کہ رینڈی نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا پروگرام کیسا چل رہا ہے؟"

"اب تک تو ٹھیک ہی ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان کے کان زیادہ عرصے یہ شور و غل برداشت کر سکیں گے۔"

"یہ اچھی بات ہے کہ تم نے اسے زچ کر دیا۔" رینڈی نے کہا۔

ڈیوڈ نے سفید حویلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دشمن کے کیمپ کی کیا خبر ہے؟"

"تمہارے تصور سے بہت زیادہ۔" رینڈی نے کہا۔ "پریسٹن تو اپنے موقف پر سختی سے قائم ہے لیکن اس کی بیوی کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔ اسے اس جزیرے سے بہت محبت ہے اور تم سے وہ نفرت کرتی ہے کیونکہ تم نے ان لوگوں کا سکون غارت کر دیا ہے۔ اس لیے وہ اپنے شوہر پر زور دے رہی ہے کہ بیٹے کو واپس بلا کر اسے قانون کے حوالے کر دیا جائے۔"

"کیا واقعی؟ وہ اپنے بیٹے سے ہاتھ دھونے کے لیے تیار ہے؟"

رینڈی قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "تھامسن اس کی پہلی بیوی کے بطن سے ہے جبکہ یہ اس کی تیسری بیوی ہے لہٰذا اسے اپنے سوتیلے بیٹے کی کوئی پروا نہیں۔ وہ صرف اپنی جنت کا سکون چاہتی ہے۔"

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ جو لوگ وہاں ملازمت کرتے ہیں، وہ اپنا کام ایمان داری سے سرانجام دے رہے ہیں؟ انہوں نے بھی مدد کے لیے کچھ لڑکیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کے ذریعے یہ معلومات مجھ تک پہنچ گئیں۔"

"اس اچھی خبر کے لیے تمہارا شکریہ۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"تمہارا یہ پروگرام کب تک جاری رہے گا؟" رینڈی نے پوچھا۔

"موسمِ سرما کی آمد تک۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "یا جب تک کہ وہ اپنی شکست تسلیم نہ کر لے۔"

"اس میں تو ابھی کافی وقت ہے۔"

"کیرول کی خاطر میں سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

☆☆☆

اس نے موسمِ گرما کے رخصت ہونے تک بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں اور اپنی کشتی کے اردگرد جھیل میں دل کھول کر تیراکی کرتا رہا۔ کبھی کبھی رات کو اس کے خواب میں کیرول آتی۔ یہ اس کے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی بلکہ اس سے اسے مزید تقویت ملتی۔ وہ اس کی یادوں میں زندہ تھی اور خواہ تیز دھوپ ہو یا موسلا دھار بارش ہو رہی ہو، وہ موسم کی پروا کیے بغیر جاں نثار رہتا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ حق پر ہے اور ایک رات کیرول نے اسے بچا لیا۔

وہ ایسا ہی ایک خواب تھا جو وہ عموماً دیکھا کرتا تھا۔ کیرول کچن روم میں بیٹھی اپنا ہوم ورک کر رہی تھی اور اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے نیند سے بیدار ہو گیا۔ اس نے [illegible] اٹھایا تو اسے کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی۔ موسیقی کی آواز بند تھی [illegible] اسے ایک سرسراتی ہوئی آواز سنی۔ اسے لگا کہ کشتی [illegible] رہی ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ کشتی کی لائٹس آن کر دے لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ رینگتا ہوا فرش پر [illegible] ریلنگ کے پاس پہنچ کر اس نے سر اٹھایا۔ پورے چاند کی روشنی نے جھیل کو منور کر رکھا تھا۔ تبھی اسے پانی میں کچھ غیر معمولی حرکت محسوس ہوئی۔

اس نے کشتی کا ہک اٹھایا اور پانی میں پھینک دیا۔ وہ اسے دائیں بائیں گھماتا رہا پھر اسے یوں لگا جیسے ہک کسی چیز سے ٹکرایا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ہک کو اوپر کھینچنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک شخص پانی کی سطح سے برآمد ہوا۔ اس نے تیراکی کا لباس پہنا ہوا تھا اور چہرے پر ماسک چڑھایا ہوا تھا۔ اس نے ہک کو پوری طاقت سے ہلانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس شخص کی پیٹھ پر لدے ٹینک سے آکسیجن خارج ہونا شروع ہو گئی۔ اس شخص نے اپنے دائیں جانب غوطہ لگایا اور تیرتا ہوا کشتی سے دور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈیوڈ نے بتیاں روشن کر دیں اور پوری آواز سے گانے لگا دیے۔

☆☆☆

اگست کا مہینا ختم ہونے والا تھا کہ ایک دن رینڈی اس سے ملنے آیا۔ اس بار وہ ایک چھوٹی کشتی پر آیا تھا لیکن اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان یا بیئر کی بوتلیں نہیں لایا۔ اس نے خاموشی سے ایک اخبار اس کے سامنے کر دیا جس میں اس کاٹیج کی اچانک اور پراسرار آتشزدگی کی خبر شائع ہوئی جہاں ڈیوڈ نے اپنا سامان رکھا ہوا تھا۔ اس نے خبر پڑھ کر اخبار رینڈی کو واپس کر دیا اور بولا۔ "تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے؟"

"ہاں اور میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ ٹھیک ہی کر رہے ہو۔"

"وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا لیکن میں اپنا کام جاری رکھوں گا۔" ڈیوڈ نے کہا۔

مزدوروں کے دن سے ایک ہفتہ قبل ڈیوڈ نے بھی وقفہ لیا۔ یہ وقت اس نے ایک موٹیل میں آرام کر کے گزارا لیکن اختتامِ ہفتہ وہ اپنی کشتی پر واپس آ گیا اور زور و شور سے اپنا ساؤنڈ سسٹم آن کر دیا۔ اب اس نے موسیقی کے ساتھ امریکا کے سابق اور موجودہ صدر کی تقریروں کے ٹیپ بھی بجانا شروع کر دیے تھے۔ ان میں کارٹر سے لے کر ریگن اور بش سینئر و جونیئر سبھی کی تقریریں شامل تھیں۔ وہ تمام رات کشتی کی لائٹس آن رکھتا۔ اس نے اپنی دوربین سے دو مرتبہ میلکم پریسٹن کو حویلی سے باہر آتے دیکھا اور دونوں مرتبہ ایک جوان عورت اس کے ہمراہ تھی جو ڈیوڈ کی جانب اشارہ کر کے زور زور سے چلا رہی تھی۔

موسمِ گرما ختم ہوا، خزاں نے اپنا ڈیرا جما لیا۔ ایسی ہی ایک صبح بوٹ ہاؤس کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک موٹر بوٹ برآمد ہوئی جسے میلکم پریسٹن بے ڈھنگے پن سے چلا رہا

تھا۔ ڈیوڈ نے موسیقی کی آواز بند کردی۔ پریسٹن اس کی کشتی پر آیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ دس منٹ تک اسے دھمکیاں دیتا اور مغلظات بکتا رہا۔ جب وہ لمحہ بھر کے لیے رکا تو ڈیوڈ نے کہا۔

"تم یہی کچھ کہنے کے لیے یہاں آئے ہو؟"

پریسٹن نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح جیت جاؤ گے؟"

ڈیوڈ نے کہا۔ "میں ابھی تک یہاں موجود ہوں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں جیت رہا ہوں۔"

"تم... تمہاری اوقات کیا ہے۔" پریسٹن دانت پیستے ہوئے بولا۔ "میرے نزدیک تم ایک مونگ پھلی کے دانے کے برابر ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں یہ سب کچھ کرنے دوں گا؟"

اس کے ساتھ ہی اس کی زبان سے گالیوں کا طوفان بہہ نکلا پھر وہ لمحہ بھر کو رکا اور بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمہیں دیکھ لوں گا۔"

ڈیوڈ نے آواز کے بٹن کی جانب ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ "اپنی بیوی کو میری نیک خواہشات پہنچا دینا۔"

☆☆☆

ایک ہفتے بعد وہ کشتی میں ایندھن ڈلوانے گودی پر آیا تو اس نے تازہ اخبار بھی خرید لیا اور سرسری طور سے اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ اچانک ایک خبر پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ اس نے اس خبر کو تین بار پڑھا اور واپس جزیرے پر آ گیا جہاں اس کی نظر ایک بورڈ پر گئی جو کسی پراپرٹی ڈیلر کی طرف سے لگایا گیا تھا اور اس پر لکھا تھا۔ "برائے فروخت۔"

اس نے کشتی گھمائی اور اسے ایک خالی گودی پر لنگر انداز کر دیا۔ پھر اس نے کچھ دیر ساحل پر چہل قدمی کی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ جزیرہ اب اس کی بیٹی کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نرم نرم گھاس پر لیٹ کر اپنی ٹانگیں پھیلا دیں اور گہری نیند سو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک کشتی کے انجن کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گودی کی طرف بڑھا تو اسے رینڈی اپنی چھوٹی سی کشتی سے باہر آتا دکھائی دیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

"میں جلد از جلد تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔"

ڈیوڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔"

وہ کچھ دیر اپنے دوست کے ساتھ گودی پر کھڑا رہا۔ اس کی نگاہ کچھ فاصلے پر موجود درختوں پر جمی ہوئی تھی جن کے پتوں کا رنگ موسم کے ساتھ تبدیل ہو رہا تھا۔ یہ ایک دلکش نظارہ تھا پھر اس نے جزیرے کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور مسکراتے ہوئے رینڈی کی جانب دیکھنے لگا۔

رینڈی کو اس کے چہرے پر پھیلا ہوا اطمینان دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم جیت گئے؟"

"شاید!" اس نے مبہم لہجے میں جواب دیا۔

"اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" رینڈی نے جھنجلاتے ہوئے پوچھا۔

ڈیوڈ نے وہ اخبار اس کی جانب بڑھا دیا جو اس نے کچھ دیر پہلے خریدا تھا۔ رینڈی نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر مطلوبہ خبر باآواز بلند پڑھنے لگا۔ "مسٹر پریسٹن کو امید ہے کہ وہ بہت جلد اس جزیرے کو فروخت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہ اس جزیرے سے فروخت ہونے والی رقم سے کولیریڈو کے پُرفضا قصبے آسپن میں اپنے لیے نیا گھر بنائیں گے۔ اس علاقے میں زمین اور جائداد کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی ہے اور یہاں امریکا کی نامور شخصیات نے تعطیلات گزارنے کے لیے مکانات خرید رکھے ہیں۔"

رینڈی نے اخبار تہ کر کے اس کی جانب بڑھایا اور بولا۔ "تم نے اس جزیرے کی اہمیت کو زیرو کر دیا ہے۔ اب شاید ہی کوئی گاہک اسے خریدنے میں دلچسپی ظاہر کرے۔"

"یہ میرا مسئلہ نہیں۔ یہی کافی ہے کہ میں نے اسے اس جزیرے سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے جسے وہ اپنی جنت کہا کرتا تھا۔ اب یہ میری بیٹی کا جزیرہ ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ دوسری جگہ اپنی جنت بنا لے گا۔"

ڈیوڈ مسکرایا۔ رینڈی نے اتنی بھرپور مسکراہٹ کافی عرصے بعد اس کے چہرے پر دیکھی تھی۔ ڈیوڈ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "میں نے اسے اس جنت سے نکال دیا ہے۔ یہی میری جیت ہے۔ اب دنیا کے کسی کونے میں اسے جنت نصیب نہیں ہوگی۔ میں سائے کی طرح اس کا تعاقب جاری رکھوں گا۔ ویسے میں بھی کولیریڈو نہیں گیا۔ اس بہانے وہ خوب صورت شہر بھی دیکھ لوں گا۔"

رینڈی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت ڈیوڈ کو اس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔



# نجات

کمزور و دل گرفتہ لمحے کس کی زندگی میں نہیں آتے... کچھ لوگ ان لمحوں کی خلش کو نہاں خانہ دل کی زینت بنا لیتے ہیں اور کچھ سے محرمِ راز کی باتیں منکشف ہو جاتی ہیں... ایک غموں سے چور بیوہ کا قصہ... جس کے رازِ دل... قابلِ گرفت ٹھہر چکے تھے...!

جینی ٹی وی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ ٹی وی نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے ہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ریسیور اٹھانے سے پیشتر وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ اس کے شوہر کی تدفین کو ابھی دو دن ہی گزرے تھے۔ شاید یہ اس کی کسی سہیلی کا فون ہو سکتا ہے، وہ سوچنے لگی۔ وہ اس کی خیر و عافیت دریافت کرنا چاہ رہی ہوگی۔ اگر کوئی سہیلی نہیں تو پھر یہ اس کے شوہر کا کوئی پرانا کاروباری شناسا ہوگا

جسے اس کے شوہر کی موت کی خبر ابھی ملی ہوگی اور وہ بیوہ سے اظہارِ تعزیت کرنا چاہتا ہوگا۔ اس کے شوہر کے شناساؤں کے تعزیتی فون تو مسلسل آ رہے تھے۔

بہرحال جو کوئی بھی تھا، جینی اس وقت فون سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ اس وقت صرف اور صرف تنہائی چاہتی تھی۔ وہ اپنی تنہائی میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں چاہتی تھی اسی لیے وہ ریسیور اٹھانے سے گریز کر رہی تھی۔

لیکن فون کی گھنٹی تھی کہ مسلسل بجے جا رہی تھی۔

جینی نے جھنجلاتے ہوئے فون اٹھالیا۔

''ہیلو۔'' جینی نے کہا۔

چند لمحوں کے لیے دوسری طرف خاموشی رہی۔

گریٹ، جینی نے سوچا۔ لگتا ہے کہ کسی نقب زن نے اخبار میں اس کے شوہر کی وفات اور تدفین کی خبر پڑھی ہوگی اور وہ یہ جاننے کے لیے فون کر رہا ہوگا کہ آیا کوئی گھر میں موجود ہے یا نہیں تاکہ وہ اپنی واردات کی پلاننگ کر سکے۔

جینی کے ذہن میں اچھے ہی خیالات کی یلغار جاری تھی۔

جینی ابھی ریسیور واپس رکھنے جا رہی تھی کہ دوسری جانب سے ریکارڈنگ کی آواز آنے لگی۔

جینی چونک گئی۔ یہ خود اس کی اپنی آواز تھی۔

''میں تمہیں بتاؤں یہ میری خواہش ہے کہ وہ مر جائے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کسی کو معاوضہ دے کر اسے شوٹ کرا دوں یا کسی صورت اسے ٹھکانے لگوا دوں۔ میں اس سے اس حد تک عاجز آچکی ہوں۔''

پھر ریکارڈنگ بند ہوگئی لیکن ٹیلی فون کی لائن ابھی ڈس کنیکٹ نہیں ہوئی تھی۔

جینی خاموشی سے ریسیور کان سے لگائے رہی۔ وہ اس حد تک خوف زدہ ہو چکی تھی کہ کچھ کہنے سے قاصر تھی۔ اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ وہ بس دوسری جانب سے فون کرنے والے کی آواز سننے کی منتظر تھی۔ اس نے دیر تک ریسیور کان سے لگائے رکھا لیکن دوسری جانب بدستور خاموشی چھائی رہی۔ اور پھر لائن ڈیڈ ہوگئی۔

جینی نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

وہ سوچ میں گم ہوگئی کہ اس نے یہ الفاظ کب کہے تھے؟ وہ ذہن پر زور ڈالنے لگی کہ فون کرنے والے کے ہاتھ اس گفتگو کی ریکارڈنگ کیسے آگئی؟

بالآخر اسے یاد آ گیا۔ یہ بات اس نے اس وقت کی تھی جب وہ اپنی بہن میری سے فون پر گفتگو کر رہی تھی یقیناً اسے یہ بات کہے دو مہینے ہو چکے تھے۔ اس رات اس نے ضرورت سے زیادہ پی لی تھی اور تب اس کے اور شوہر کے درمیان معمول کی تکرار شروع ہوگئی تھی۔ نشے میں مدہوش جینی نے تب اپنی بہن میری کو فون کیا تھا تاکہ وہ اس سے اپنے دل کی بھڑاس نکال سکے۔ بعد میں میری نے ہی اسے احساس دلایا تھا کہ وہ کس قسم کے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ تب جینی کو پتا چلا تھا کہ نشے کی کیفیت میں وہ یہ کچھ کہہ گئی تھی۔

لیکن کسی نے اس کی یہ گفتگو ٹیپ کیوں کی تھی؟

پہلے تو اس کا دھیان اپنی بہن میری کی طرف چلا گیا۔ نہیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری ہرگز ایسا نہیں کر سکتی۔ یقیناً اسے بخوبی احساس تھا کہ وہ یہ باتیں کیوں کر رہی ہے۔ وہ ان کے گھریلو جھگڑوں سے واقف تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ڈپریشن کی کیفیت میں اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی ہے۔

ڈیل تو پھر وہ کون ہو سکتا ہے جس نے یہ گفتگو ٹیپ کی تھی؟ پھر وہ اسے دو ماہ سے اپنے پاس حفاظت سے رکھے ہوئے تھا؟ کیا وہ اس بات کا منتظر تھا کہ اس ٹیپ شدہ گفتگو کو استعمال کرنے کا تھوڑا سا امکان پیدا ہو جائے؟

اچانک اسے خوف کے ساتھ غصہ بھی آنے لگا۔ اگر کسی نے اس کی یہ گفتگو ٹیپ کی تھی تو مزید اور کیا کچھ ٹیپ کیا ہوگا؟ کہیں ایسا تو نہیں اس کے گھر میں خفیہ طور پر آواز ریکارڈ کرنے کے آلات نصب کیے گئے ہوں؟ اور یہ سلسلہ نہ جانے کتنے ماہ سے جاری ہو؟

وہ غصے اور خوف کی اسی ملی جلی کیفیت میں مبتلا تھی جب فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی۔

جینی نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کے لیے چند گہرے گہرے سانس لیے اور قدرے پُرسکون ہوتے ہی لپک کر ریسیور اٹھالیا۔

''ہیلو؟'' اس نے اپنا لہجہ نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز ابھری۔ ''ادائی کا انتظام کرنے کا وقت آ گیا ہے۔'' لہجہ پُرسکون تھا اور بات سیدھی مطلب کی کی گئی تھی۔

''کیا؟'' جینی نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔



''پیمنٹ کا انتظام کرلو۔''

''تم کون ہو؟''

''تم کوئی کام کروانا چاہتی تھیں اور یہ بات چپکے سے سن لی گئی تھی۔'' اس شخص نے کہا۔ ''کام ہو گیا ہے اور اب پیمنٹ ہونی ہے۔'' لہجہ اب بھی پُرسکون تھا۔

''تم پاگل ہو۔'' جینی نے جواب دیا۔ ''میں اسے مردہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں تو بس اس وقت غصے میں تھی جب یہ بات کہی تھی۔''

''یہ بات بہت سے لوگوں کے علم میں ہے کہ تم یہی چاہتی تھیں کہ وہ مر جائے۔'' اسی مردانہ آواز نے کہا۔ ''تمہیں اس معاملے سے اسی لیے الگ تھلگ رکھا گیا تاکہ تم ایک غمزدہ بیوہ کا کردار جس حد تک بہتر ادا ہو سکتا ہے، کر سکو۔ ہم نے اس کی ہلاکت کے لیے کار میں بم نصب کیا تھا تاکہ یہ ظاہر ہو جیسے یہ کسی گروہ کی کارروائی ہے۔''

جینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اس شخص کی بات سن رہی تھی۔

''تمہاری جانب سے اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم یہ ٹیپ پولیس تک پہنچا دیں گے۔'' اسی مردانہ آواز نے قدرے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اور پھر تحقیقات تمہارے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوں گی۔ سب کچھ میڈیا اور نیوز میں آجائے گا۔''

''تم کون ہو اور تم میری گفتگو ٹیپ کیوں کر رہے تھے؟'' جینی نے جاننا چاہا۔

''ہر چیز کی وجوہات ہوتی ہیں۔'' اسی آواز نے کہا۔ ''اب ہمیں صرف دو لاکھ ڈالر چاہئیں۔''

''دو لاکھ ڈالرز؟''

''تم رقم اکٹھا کرنا شروع کر دو۔ میں تمہیں دو دن کے بعد فون کروں گا کہ رقم کہاں پہنچانی ہوگی۔''

''میں اتنی رقم اکٹھی نہیں کر سکتی۔'' جینی نے جواب دیا۔

''تم یہ بات بھول رہی ہو کہ ہم تمہاری زندگی کے ہر ایک پہلو سے بخوبی واقف ہیں۔'' اس آواز نے کہا۔ ''بس رقم کا بندوبست کرلو۔''

''مجھے کیسے پتا چلے گا کہ یہ کام تم ہی نے کیا ہے؟'' جینی نے سوال کیا۔ ''میرے شوہر کے بہت سے دشمن تھے۔ ان میں سے کسی ایک نے اسے قتل کر دیا ہوگا۔''

''تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ آیا

## پردادا نے کہا تھا

دونوں کی شادی ہو گئی۔

پھر ہنی مون منانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

میاں بیوی نے طے کیا کہ اسی جزیرے پر چلیں جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں کوئی نہیں مرتا۔ موت جب بھی اس جزیرے میں کسی کے گھر گئی نامراد ہی واپس گئی۔

وہ دونوں اسی جزیرے میں پہنچے۔

ساحل پر اترتے ہی انہیں ایک عمر رسیدہ بوڑھا دکھائی دیا۔

وہ بوڑھا بچے کی طرح دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اور اپنی ایڑیاں زمین پر رگڑ رہا تھا۔

یہ منظر دیکھا تو شوہر نے آگے بڑھ کر بوڑھے سے پوچھا ''بڑے میاں کیوں رو رہے ہو؟''

بوڑھے نے جواب دیا ''مجھے میرے ابا نے مارا ہے!''

یہ سن کر میاں بیوی بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔

پھر بیوی نے پوچھا ''آپ کو کیوں مارا ہے؟''

''میں نے دادا جان کے سگریٹ چرائے تھے!''

پھر میاں نے سوال کیا ''دادا جان کے سگریٹ کیوں چرائے تھے؟''

بوڑھے نے زمین پر ایڑیاں رگڑتے اور زور زور سے روتے ہوئے کہا ''میں نے تھوڑی ہی چرائے تھے وہ تو پردادا نے مجھ سے کہا تھا کہ چپکے سے لے آؤ، اب بھلا میں کیا کرتا!''

یہ سنتے ہی دونوں میاں بیوی بے ہوش ہو گئے۔

میں نے اسے قتل کیا ہے یا نہیں۔" اس آواز نے کہا۔ "اگر تم چاہتی ہو کہ پولیس تم سے دور رہے تو رقم کا بندوبست کرلو۔"

اور پھر لائن ڈیڈ ہوگئی۔

جینی کمرے میں تنہا رہ گئی۔ کوئی اس سے بات کرنے والا وہاں موجود نہیں تھا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے، اس نے خود سے سوال کیا۔

یہ اس نوعیت کا مسئلہ نہیں تھا کہ جس کے بارے میں وہ اپنی بہن سے بات کرسکتی۔ اگر وہ بات کرنا چاہتی تب بھی فون پر یہ بات نہیں ہوسکتی تھی۔ شاید وہ لوگ اب بھی فون پر اس کی گفتگو سن رہے ہوں۔ شاید اس کے مکان میں آواز خفیہ طور پر ریکارڈ کرنے کے آلات نصب ہوں۔ شاید یہ آلات اس کی بہن کے گھر میں بھی نصب کیے گئے ہوں۔

جینی سوچ میں پڑ گئی۔

لگتا ہے وہ شخص صحیح کہہ رہا تھا، جینی کو احساس ہوگیا۔ وہ دو لاکھ ڈالرز کا انتظام کرسکتی ہے اور اسے یہ انتظام کرنا ہی پڑے گا۔

☆☆☆

دو دن بعد فون آگیا۔

جینی نے گھنٹی بجتے ہی لپک کر فون اٹھالیا۔

"ہیلو؟" اس نے اپنا لہجہ پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا رقم تمہارے پاس ہے؟" اسی آواز نے بنا کسی تمہید کے پوچھا۔

"ہاں۔" جینی نے بھی لاتعلقی کے انداز میں جواب دیا۔

"رقم ایک اسپورٹس بیگ میں رکھ لو۔" اسی آواز نے کہا۔

"رقم بیگ میں رکھ کر کیا کروں؟" جینی نے جاننا چاہا۔

"میں سب کچھ تفصیل سے بتا رہا ہوں۔ کرٹمن ورلڈ کے بعد ہیوڈیزرٹ روڈ پر ایک جگہ ہے۔ وہاں چند انڈسٹریل یونٹ بنے ہوئے ہیں۔ کل صبح دس بجے اپنی کار میں اس جگہ پہنچ کر انڈسٹریل یونٹس کی پچھلی طرف چلی جانا۔ وہاں ایک کوڑے دان رکھا ہوا ہے۔ رقم کا بیگ اس کوڑے دان کے برابر میں رکھ دینا۔ پھر واپس سڑک پر آکر اپنا واپسی کا سفر جاری رکھنا۔ کہیں رکنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد ہم تم سے کوئی رابطہ نہیں کریں گے۔"

"لیکن اگر .....؟" جینی نے کچھ کہنا چاہا۔

اسے اپنا جملہ نامکمل چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ لائن ڈیڈ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ہیوڈیزرٹ روڈ پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے جینی اچھا لگ رہا تھا۔ یہ ایک معروف دو رویہ ہائی وے تھی۔ وہ لوگ رقم اٹھا کر چلتی ٹریفک میں کہیں بھی غائب ہو سکتے تھے۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے بھی نہیں رک سکتی تھی کہ وہ کون لوگ ہیں۔ وہ سڑک کے کنارے انتظار بھی نہیں کرسکتی تھی کیونکہ وہاں کار پارکنگ کی جگہ خاصی تنگ تھی اور اس کا وہاں موجود ہونا نگاہوں میں آسکتا تھا۔

انڈسٹریل یونٹس کے پاس پہنچ کر اس نے اپنی کار کی رفتار آہستہ کردی اور اُسے گھما کر عمارت کے عقب میں پہنچ گئی۔ وہاں ایک کوڑے دان رکھا ہوا تھا۔

جینی نے اپنی کار کوڑے دان سے قدرے فاصلے پر روک دی لیکن انجن بند نہیں کیا۔ پھر اس نے کار میں رکھا ہوا وزنی اسپورٹس بیگ نکالا اور کوڑے دان کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ وہ بیگ ہدایت کے مطابق کوڑے دان کے برابر میں رکھ دیا اور واپس اپنی کار کی جانب پلٹ گئی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی ہیں۔ لیکن اطراف میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

شاید یہ میرا وہم ہے، اس نے خود سے کہا۔ رقم وصول کرنے والا شاید ابھی یہاں پہنچا ہی نہ ہو۔ کار میں سوار ہونے اور کار کو دوبارہ سڑک پر لے جانے میں اس نے کسی قسم کی عجلت سے کام نہیں لیا۔

پھر سڑک پر پہنچ کر اس نے اپنی کار رواں ٹریفک میں شامل کردی اور گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔

اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ وہ جلد از جلد اس مقام سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔

وہ لوگ اس کے بارے میں یقیناً بہت کچھ جانتے تھے۔ لیکن اس کے بارے میں ہر بات نہیں جانتے تھے۔ اور شاید جان بھی نہ پائیں۔ اس لیے کہ اسپورٹس بیگ میں رکھا ہوا بم ان کے پرخچے اڑا دے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے کار بم دھماکے میں اس کے شوہر کے پرخچے اڑ گئے تھے۔

اور یہ سب کمال اس کے عاشق کا تھا جو ایک ماہر بم ساز تھا۔

# آخری جیت

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

خود شناسی ایسا ہنر ہے جس میں بہت کم لوگ مہارت رکھتے ہیں... اس کے راستے پُرپیچ و کٹھن ضرور ہوتے ہیں مگر ان پر چل کے ہی حقیقت تک رسائی ممکن ہوتی ہے... اپنی ہی ذات میں قید ایک ایسے ہی شخص کی کج فہمی... جو سمجھتا تھا کہ اب وقت کی لگام اس کے ہاتھ .... آچکی ہے....

... آخری جیت کا دلچسپ ماجرا

وہ بُری طرح زخمی تھا۔ پہاڑی سے گرتے گرتے بھی اس کی انتہائی کوشش تھی کہ اپنے چہرے کو زخمی ہونے سے بچالے مگر پھر بھی اس کا دایاں رخسار شدت سے چھل گیا تھا۔ تاہم اسے اس زخم کی پروا نہ تھی کیونکہ رخسار کی ہڈی سلامت تھی۔ گرتے وقت اس نے اپنے جسم کا سارا بوجھ دائیں پیر پر ڈال دیا تھا چنانچہ دائیں پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ہڈی ٹوٹنے کی آواز اس نے سنی تھی۔ اسے شبہ تھا کہ کہیں کولہے کی ہڈی بھی نہ ٹوٹ گئی ہو۔ خیریت گزری کہ اس کی کھوپڑی بچ

گئی تھی اور وہ بے ہوش بھی نہیں ہوا تھا۔ پہاڑی سے گرتے وقت اس کے حلق سے ایک دہشت ناک چیخ نکلی تھی پھر وہ کوشش کے باوجود چند لمحوں تک اپنی متواتر چیخوں پہ قابو نہ پاسکا۔ تاہم جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ پوری قوت سے اپنے ساتھی کو آوازیں دینے لگا۔

"نور احمد... نور احمد..."

میلوں تک پھیلے کوہ کیرتھر کے نشیبی دشوار گزار جنگل میں اس کے اور نور احمد کے سوا کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔ نور ... حادثے کے مقام سے سو گز کے فاصلے پر لکڑی کے چھوٹے سے کیبن میں تھا اور ناشتے کے برتن وغیرہ دھو رہا تھا۔ ناشتا تیار بھی اسی نے کیا تھا۔ یہ کیبن نما چھوٹی سی چوبی عمارت بھی فاریسٹ آفیسر یا فاریسٹ چوکیدار کے زیر استعمال رہتی تھی۔

بجار خان کی جگر خراش چیخیں سن کر اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ دونوں گزشتہ رات ایک دشوار گزار اور کیکر اور لئی کا جنگل عبور کر کے یہاں پہنچے تھے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی تاریکی ہر طرف اپنا تسلط جما چکی تھی اور اب وہ گورکھ ہل کے قریب تھے۔ دھند کے باعث بجار خان اطراف کا جائزہ نہیں لے سکا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد وہ اس مقصد سے باہر نکلا تھا اور اب اچانک بجار خان کی چیخیں سن کر پہلے تو نور... یہ سمجھا کہ اس نے کوئی حیرت انگیز چیز دریافت کرلی ہوگی اس لیے خوشی سے چیخ رہا ہے مگر جب اس نے ذرا غور سے بجار خان کی آواز پر دھیان دیا تو اسے اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ بجار خان کی آواز میں جوش اور ولولے کے بجائے خوف اور دہشت کا عنصر نمایاں ہے۔ شاید اچانک اس کا کسی خوف ناک درندے سے سامنا ہوگیا ہوگا۔ نور... نے سوچا اور المونیم کی پلیٹ ایک طرف پھینک کر اپنی رائفل اٹھا کے آواز کی سمت دوڑا۔ دن نکلا ہوا تھا۔ کھلے آسمان پر بادل کے ٹکڑے بھی تیر رہے تھے۔ سردی بھی پڑ رہی تھی اس پہاڑی جنگل میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا اور بجار خان خطرے میں تھا... جس کا مطلب یہ تھا کہ خود وہ بھی... یعنی نور احمد بھی خطرے میں ہے۔

بجار خان کی آواز اسے پہاڑی کی طرف سے آتی محسوس ہوئی۔ وہ احتیاط سے جھاڑیاں دیکھتا ہوا پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ بجار خان نے اب آوازیں دینی بند کردی تھیں لیکن اس کی کراہیں اب بھی نور... کی راہنمائی کر رہی تھیں۔ جب وہ بجار کی کراہوں کے سہارے دوسری طرف اترا تو بجار خان پہاڑی کے نیچے خاصا زخمی حالت میں پڑا ہوا نظر آیا۔ اس کے عقب میں گورکھ ہل کسی دیو قامت عفریت کی طرح اپنے سینے پر کوہ کیرتھر کی بلندیاں سجائے کھڑا تھا۔

"کیا ہوا...؟" نور... نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"گگ... گر... گر گیا ہوں... میں..."

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" نور نے بے قراری سے پوچھا۔

"مم... مجھے کیبن میں لے چلو۔ شش... شاید کوئی ہڈی وغیرہ... آہ..." وہ کراہا۔

"اگر کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہے تو تمہارا ہلنا جلنا مناسب نہیں ہے۔ تمہیں ٹھہرنا چاہیے۔" نور... نے کہا۔

"بب... بے وقوف! میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔" بجار خان نے کراہتے ہوئے کہا۔ "یہاں بہت سردی ہے۔ مجھے کیبن میں لے چلو پھر کسی قریبی گوٹھ سے کسی ڈاکٹر کو دیکھ لینا۔"

نور... نے ہونٹ بھینچ کر کچھ سوچا۔ شاید وہ اندازہ کر رہا تھا کہ کیا وہ زخمی بجار خان کو اٹھا کر کیبن تک لے جاسکتا ہے؟ اگرچہ ڈیل ڈول دونوں کا تقریباً برابر تھا مگر ایک زخمی وجود کو لے کر ڈھلوانی چڑھائی چڑھنا بلاشبہ وقت طلب ہی نہیں، مشکل طلب بھی تھا۔

"کیا سوچنے لگے بے وقوف؟ جلدی کرو۔" بجار پھر کراہا۔

"کوشش کرتا ہوں میرے دوست۔" بالآخر نور... نے ایک گہری سانس لے کے کہا اور اس پر جھکا۔ بمشکل تمام اسے سہارا دے کر اٹھایا اور جب اپنے کاندھے پر لادا تو زخمی بجار خان بری طرح کراہ کر رہ گیا۔ شاید اس کی زخمی ہڈیاں مزید چٹخنے لگی تھیں۔

"پروا مت کرو... آگے بڑھو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی تکلیف کو دانتوں تلے دبالیا۔

نور... نے ڈھلان نما چڑھائی چڑھنا شروع کی۔

"دن میں بھی دور تک کہیں بنجر اور سنگلاخ ویرانوں میں کتوں اور بھگیڑوں کے رونے چلانے کی کریہہ... آوازیں گونج رہی تھیں۔ بجار خان غیر معمولی قوت ارادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی چیخیں ضبط کر رہا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی گھٹی گھٹی کراہیں نہیں روک سکتا تھا جو شدید کرب و اذیت کے باعث اس کے منہ سے نکل رہی تھیں ــ نور کو بھی اس کا زخمی وجود سنبھالے ہوئے دانتوں تلے پسینہ آگیا تھا۔ وہ تھوڑا سستا کر پھر چڑھائی چڑھنے لگتا۔ سخت سردی اور یخ بستہ ہواؤں کے باوجود اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ پھوٹ کر





بہے پر بہہ رہا تھا۔ نور سانس لینے کے لیے ذرا رکتا تو وہ... سے ڈانٹنے لگتا۔

"جلدی کرو احمق، رکو مت۔"

کیبن کے دروازے پر پہنچ کر وہ دونوں بے دم ہوگئے۔ ایک شدید کرب و تکلیف کی وجہ سے اور دوسرا محنت کی وجہ سے۔ کیبن بھی کیا تھا۔ کسی تباہ حال ریسٹ ہاؤس کا منظر پیش کرتا تھا۔ وہاں کاٹھ کباڑ ہی پھیلا ہوا تھا۔ تاہم یہاں آنے والی شکاری ٹیموں نے اسے ٹھہرنے کے قابل بنا رکھا تھا۔ انہوں نے بھی کچھ محنت اس پر کر کے ٹوٹے ہوئے فرش پر دریاں، چادریں ڈال دی تھیں۔ رلیاں موٹی اور گرم تھیں۔ دونوں انہی بستروں پر ڈھیر ہوگئے۔

مضروب بجار خان تو جیسے بستر پر گرتے ہی بے ہوش ہوگیا تھا۔

کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور سرد ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔

نور... کو احساس تھا کہ اٹھ کر دروازہ بند کرنا چاہیے اور پھر آتش دان میں مزید لکڑیاں ڈالنی چاہئیں تا کہ کمرا گرم ہوجائے لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ یہ کام کرے۔

کمرے میں اب دم بخود سی خاموشی کا راج تھا۔ صرف آتش دان میں بچی کھچی لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد بجار خان کو ہوش آیا۔ "میں ابھی زندہ ہوں، نور احمد۔" اس نے چیختے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چلو جلدی کرو۔ کھڑے ہوجاؤ۔ ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ۔"

نور بمشکل بستر کا سہارا لے کر بڑی مشکل سے کھڑا ہوا اور پھر لڑکھڑا کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہ دروازے سے باہر نہیں گیا بلکہ دروازہ بند کر کے آگ کے قریب دھرے چوبی اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے؟ تم جاتے کیوں نہیں؟" بجار خان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

نور چند ثانیے پرسوچ انداز میں چپ رہا۔ جیسے وہ... جانے کی وجہ سے خود بھی لاعلم ہو پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تمہیں یہاں میری ضرورت پڑ سکتی ہے بجار خان۔"

"نہیں، مجھے یہاں تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔" بجار خان نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "مجھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے جاؤ جلدی سے ایک ڈاکٹر کو لے آؤ... یہاں گورکھ ہل سے شمال مغرب میں روہی گوٹھ ہے وہاں سے تمہیں بہ آسانی ڈاکٹر مل جائے گا۔ اس کے پاس یقیناً کوئی چھوٹی موٹی سواری بھی ہوگی۔ ورنہ بیل گاڑی سہی۔ جاؤ جلدی۔"

نور... نے سلگتی ہوئی لکڑیوں سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ "دوست محمد، تین چار روز بعد یہاں پہنچنے والا ہے۔ ہمارے لیے اس کا انتظار کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔"

دوست محمد ان دونوں کا دوست تھا اور دادو شہر میں رہتا تھا... یہ چھوٹا سا فارم ہاؤس اور زمین کا یہ حصہ اس کے بہنوئی سومر خان کی ملکیت تھا۔ سیزن میں یہ تینوں یہاں جنگلی آئی بیکس (پہاڑی بکرا) تلور اور بھٹ تیتروں کے شکار کے لیے اکثر اکٹھے ہوتے تھے۔ بجار خان اور نور... تو لاڑکانہ سے آتے تھے، جبکہ دوست محمد دادو سے آتا تھا۔ تینوں دوست اپنے اپنے علاقوں میں اوسط درجے کے ذمے دار تھے، تاہم خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ شکار کا انہیں جنون تھا۔ تینوں میں ان بن بھی ہوتی رہتی تھی مگر شکار کے مشترکہ جنونی شوق نے انہیں درگزر سے کام لینا بھی سکھا دیا تھا۔

ان کے شکار کا یہ "ٹور" پندرہ دنوں کا تھا۔ دو روز پہلے ہی بجار اور نور... لاڑکانہ سے یہاں سہون شریف آئے تھے۔ سومر خان سے مل کر اس سے چابی لی تھی اور پھر ایک بیل گاڑی میں سوار ہو کر وہ یہاں پہنچے تھے۔

نور... کا خیال تھا کہ اپنی شکاری مہم کو دوست محمد کے آنے تک موخر رکھا جائے کیونکہ کوہ کیرتھر کے سنگلاخ اور اندھی کھائیوں سے وہی زیادہ واقفیت رکھتا تھا مگر بجار خان جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دبیز کہر سے اور خون کو برف بنا دینے والی سردی میں آئی بیکس کے ٹھکانوں کی کم از کم نشاندہی کرلی جائے... نور... نے تو اس کا ساتھ نہ دیا۔ البتہ صبح ہوتے ہی بجار خان خود ہی اپنی رائفل اٹھائے گورکھ ہل کے پہاڑی سلسلے میں جا پہنچا اور وہیں دبیز کہر کے باعث ایک قدرے بلند پہاڑی سے اس کا ایک پاؤں پھسلا اور وہ نیچے آرہا۔ اب اس کی غلطی کا خمیازہ نور... کو بھی بھگتنا پڑ رہا تھا۔ کیونکہ ان تینوں میں پہلے سے یہ معاہدہ طے تھا کہ کسی بھی ایک ساتھی پر مصیبت پڑنے پر وہ سب کچھ بھول کر اس کی نجات کے لیے کوشاں ہوں گے۔

"بے وقوف! تم نے سنا نہیں، میں کیا کہہ رہا ہوں؟" اس بار بجار خان نے تحکمانہ انداز اختیار کیا۔

"میں شدید تکلیف میں مبتلا ہوں اور دوست محمد کے آنے تک میں یہ تکلیف برداشت نہیں کرسکوں گا۔"

"اگر میں یہاں سے روانہ ہوا تو جنگل میں راستہ بھول جاؤں گا... باہر بہت ٹوٹ کر کہر پڑ رہا ہے۔ شاید آبادی تک بھی نہ پہنچ سکوں۔" نور... نے عذر پیش کیا۔

"راستہ بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مغرب کی طرف منہ کر کے سیدھے چلتے رہنا تم روہی گوٹھ جا پہنچو گے۔"

"میں سمتوں کے معاملے میں قطعی نابلد ہوں۔"

"سورج کی طرف دیکھتے ہوئے سفر کرنا۔ سورج مغرب میں غروب ہوتا ہے۔"

"اور میں کسی اندھی کھائی میں غروب ہو جاؤں گا، سورج ہے کہاں؟" نور... منمنا کر بولا۔ "آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں بجار خان، میں جنگل میں گم ہو جاؤں گا۔"

"یار! تم کوشش تو کرو۔" بجار خان کی حالت پتلی ہونے لگی۔ "کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟ تم معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔"

نور... بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا مگر کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا۔ احکام کی تعمیل کرنا یوں بھی اس کی عادت ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ بڑی واضح تھی — نور احتیاط پسند تھا۔ شکاری مہمات میں وہ کم ہی زخمی ہوتا تھا جبکہ بجار اور دوست محمد اپنی جلد باز فطرت اور تنوع مزاجی کے باعث اکثر زخمی ہوتے اور بڑی مشکل میں پڑتے تھے۔ لہٰذا ہمیشہ نور... کو ہی انہیں سنبھالنا پڑتا تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ بعد میں بجار اور دوست محمد دیانت داری کے ساتھ شکار کا اضافی "مال" نور... کی نذر کر دیا کرتے تھے۔

یوں بھی بجار اور دوست محمد ایک طرح سے ایک دوسرے کے کاروباری شراکت دار بھی تھے... زمینداری کے علاوہ انہوں نے لاڑکانہ شہر میں کھاد کی ایک بہت بڑی ایجنسی بھی کھولی ہوئی تھی... اور دونوں اس میں شراکت دار بھی تھے۔

اب صورتِ حال ذرا تبدیل ہو چکی تھی۔ حکم دینے والا بستر پر بے بس پڑا تھا۔ احکام کی پشت پر تعمیل کرانے والی قوت موجود نہ ہو تو احکام کھوکھلے الفاظ بن کر رہ جاتے ہیں۔

"میں یقیناً جنگل میں راستہ بھول جاؤں گا بجار خان!" بالآخر نور... نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اور تم یہاں بے یار و مددگار پڑے رہو گے۔ تم اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہیں کر سکتے اس لیے تمہاری دیکھ بھال کے لیے میرا یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔ دوست محمد تو دو تین روز بعد ہی پہنچے گا تم ہی نے جلد بازی کی جو نکل پڑے۔ اب اس وقت تک تم تنہا کیسے رہو گے؟ ان حالات میں تمہارا مشورہ میرے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شدید تکلیف کی وجہ سے تمہارا ذہن صحیح فیصلے کرنے کے قابل نہیں رہا۔ سوچنے سمجھنے کا کام مجھ پر چھوڑ دو اور خاموشی سے پڑے رہو۔" ماحول میں سنگین خاموشی طاری ہو گئی۔

☆☆☆

رات کا کھانا بھی نور... نے پکایا۔ اس قسم کے سارے کام اس کے ذمے تھے۔ کھانا پکانا، برتن دھونا، صاف کرنا، سامان اٹھانا، باندھنا، کھولنا، رکھنا، بجار مزے کرتا تھا لیکن وہ دن اس پر بہت بھاری گزرا۔ نور... نے پہلے اس کا چہرہ پانی سے صاف کیا پھر طبی امداد کے ڈبے سے دوا نکال کر زخموں پر لگائی جس کی وجہ سے خون بہنا بند ہو گیا۔ بجار خان کا چہرہ خون بہنے کی وجہ سے پیلا پڑ گیا تھا لیکن پانی سے دھلنے کے باعث دیکھے جانے کے قابل ہو گیا... اس پر دن بھر غشی طاری رہی کبھی کبھی وہ ہذیان بکنے لگتا جب نور... رات کا کھانا تیار کرنے لگا تو بجار خان غشی کی کیفیت سے چونکا اور ہوش میں آ گیا۔ وہ چپ چاپ بے حس و حرکت بستر پر پڑا ہوا تھا کیونکہ ذرا سی حرکت کا مطلب درد اور کرب کی ایک لہر برداشت کرنا تھا۔ وہ اب نور... پر بھی نہیں بگڑ رہا تھا۔ اس نے نور... کا یہ رخ پہلی بار دیکھا تھا اور اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ چاہے جتنا چیخے چلائے اور حکم دے اور خوشامد کرے، نور... اپنا فیصلہ نہیں بدلے گا۔ قسمت پر شاکر ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس لیے اب وہ خاموشی سے دوست محمد کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

نور... نے کھانا تیار کرنے کے بعد ایک پلیٹ اس کی طرف بھی بڑھائی لیکن اس نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا۔

"تمہیں کچھ نہ کچھ ضرور کھانا چاہیے بجار۔"

"تمہیں پتا نہیں شاید کہ آپریشن کے لیے خالی پیٹ ہونا کتنا ضروری ہوتا ہے۔"

"آپریشن؟" نور...... زیرِ لب بڑبڑایا۔ "ابھی کون آپریشن کر رہا ہے؟ اس میں تو ابھی کئی روز لگیں گے بجار۔"

"پتا نہیں دوست محمد آئے یا نہ آئے... شاید وہ کسی کام میں پھنس گیا ہے۔ ہمیں اپنی شکاری مہم ادھوری چھوڑ کر واپسی کا سفر اختیار کرنا چاہیے۔" بجار بولا۔ نور... سر ہلا کر رہ گیا۔

نور... خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ پھر اس نے گھمائے بغیر کہا۔ "تم بہت زخمی ہو بجار! صرف پیر کی ہڈی نہیں ٹوٹی ہے بلکہ کولہے کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی ہے... تم نے کیبن تک گھسٹتے ہوئے آنے کی ضد کر کے بہت بڑی غلطی کی۔





اگر میرا مشورہ قبول کر لیتے تو شاید تمہیں اتنا نہ پچھتانا پڑتا۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔"

کمرے پر سکوت طاری ہو گیا۔ نور... نے عادت کے مطابق غیر شعوری طور پر بجار کے حکم کی تعمیل میں فوراً اپنا منہ بند کر لیا۔ مگر چند لمحوں بعد اس نے بجار خان کی طرف دیکھے بغیر پھر بولنا شروع کر دیا۔

"بجار خان! تم شاید دوست محمد کی آمد تک زندہ بھی نہ رہو۔ تمہیں آبادی سے میلوں دور یہاں اس کیبن میں مرنا پڑے گا اور تمہارے جنازے میں میرے سوا کوئی شریک نہیں ہو سکے گا۔"

اس مرتبہ بجار خان بستر پر کہنی کے بل اٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ "نور...." اس نے چلا کر کہا۔

"ہمت سے کام لو بجار خان! تمہیں خود بھی اس تلخ حقیقت کا احساس ہے، تمہیں معلوم ہے کہ تم دوست محمد کی آمد تک زندہ نہیں رہ سکو گے۔"

"تو پھر... تو پھر... تم کسی ڈاکٹر..."

"نہیں بجار! میں یہاں رک کر تمہاری دیکھ بھال کروں گا۔ میں تمہیں اس حالت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"مجھے تمہاری نہیں... ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

"درست ہے مگر ہم یہاں دوست محمد کی آمد کا انتظار کریں گے۔ وہی تمہارے لیے آبادی سے ڈاکٹر لائے گا۔"

"لیکن... لیکن تم خود بھی تو ابھی ابھی کہہ رہے تھے... شاید اس وقت تک میں زندہ نہ بچوں۔"

"بے شک اس وقت تک تمہارا زندہ بچنا ناممکن ہے۔"

بجار خان نے بستر پر کہنی کھسکا کر اپنا جسم اور اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ درد کی شدت سے بے ساختہ ایک چیخ اس کے حلق سے نکلی جسے روکنے کی کوشش میں اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور اس کا سانس پھول گیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

"تم آ... کیا کہنا چاہتے ہو نور... ؟ کیا تم میری مدد نہیں کرو گے اور یہیں بیٹھے بیٹھے مجھے مرتا ہوا دیکھتے رہو گے؟"

نور... نے کانٹے میں مٹر کے کئی دانے پھنسا کے [illegible] میں اچھی طرح لپیٹ کر منہ میں ڈالے پھر [illegible] پر نظریں جما کر اطمینان سے انہیں چبانے لگا۔

"تم ٹھیک سمجھے بجار!" اس نے کہا۔

"میرا بھی ارادہ ہے۔ اب میں تمہیں یہاں دفن کر کے ہی واپس جاؤں گا... یہاں... گورکھ ہل میں..."

☆☆☆

بجار خان کو گورکھ ہل... کی پہاڑی سے گرے ہوئے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔

نور... دیوار کے پاس لگے ہوئے بستر پر آرام سے رات بھر سوتا رہا۔ وہ صرف دو مرتبہ آتش دان میں لکڑیاں ڈالنے کے لیے اٹھا تھا۔ دوسری مرتبہ اٹھ کر اس نے دیکھا کہ بجار خان اپنے بستر پر کھسکتا ہوا رائفل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ رائفل اس کے سرہانے لگی کھڑی تھی۔ نور... نے بڑے آرام سے رائفل اٹھا کر اپنے بستر کے نیچے رکھ لی۔ بجار خان نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

صبح جب نور... بیدار ہوا تو اس نے ناشتے کے لیے چاول ابالنے کا اعلان کیا۔ بجار نے کہا کہ اسے بھی بھوک محسوس ہو رہی ہے، وہ بھی چاول کھائے گا۔ اس کی حالت میں کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ راتوں رات اس کے چہرے پر کئی گہری لکیروں کا اضافہ ہو گیا تھا اور اس کی آنکھیں زرد ہو کے اس طرح چمک رہی تھیں جیسے بخار میں تپتے ہوئے مریض کی آنکھیں چمکتی ہیں۔ شاید اس نے رات بھر میں درد اور اذیت سے مفاہمت کر لی تھی کیونکہ اب وہ اپنی تکلیف کا اظہار بھی نہیں کر رہا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اب اس کے سامنے ایک نیا خطرہ نمودار ہو چکا تھا۔

نور... نے چمچے کی مدد سے چاول کھلائے اور پھر اپنے ہاتھوں سے کافی پلائی۔

"کافی بہت عمدہ تھی۔" بجار خان نے کافی پینے کے بعد کہا۔ "اور مقوی بھی۔ یہ مجھے دوست محمد کے آنے تک زندہ رکھے گی۔"

"نہیں بجار خان!" نور... نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "زندہ رہنے کے لیے صرف کافی، کافی نہیں ہے۔"

"میں ضرور زندہ رہوں گا۔ تم بس میری دیکھ بھال کرتے رہو۔"

نور... نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں بجار خان! تمہاری قوتِ ارادی بہت مضبوط ہے، تمہارے اعصاب فولادی ہیں اور تمہیں ہمیشہ ہر مقابلے میں جیتنے کی عادت رہی ہے لیکن موجودہ صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔"

"کیا مطلب؟" بجار خان نے اس کی طرف دیکھا۔

چوبی کیبن میں چند ثانیے سنسنی طاری رہی۔
"اس بار مقابلہ تمہارے اور میرے درمیان ہے۔"
"تمہارے اور میرے درمیان تو ہمیشہ مقابلہ ہوا ہے اور جیت ہمیشہ میری ہوئی ہے۔"
"لیکن اس بار مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے۔"
"ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساجھی رہے ہیں نور احمد۔"
"صرف کاغذات پر..." نور نے کہا۔ "عملی دنیا میں ہم کبھی برابر کے حصے دار نہیں رہے۔ کاروباری معاملات میں تمام فیصلے تم کرتے تھے، تمام احکامات تم دیتے تھے۔ میں تو ان فیصلوں پر سر جھکاتا تھا۔ میں ڈیو ہو کر تمہارے احکام کی تعمیل کے لیے سدھائے ہوئے کتے کی طرح دوڑتا تھا۔"
"تم میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں کبھی ڈیو یا اپنے سے کمتر نہیں سمجھا، میں ہمیشہ تمہیں اپنا..."
"جھوٹ مت بولو بجار خان! لفظوں سے ماضی تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ تمہارے قدموں کے نشان ہر شخص میرے چہرے پر دیکھ سکتا ہے۔ میں جب بھی آئینہ دیکھتا ہوں، مجھے اپنے چہرے پر تمہارے قدموں کے نشان ثبت نظر آتے ہیں۔"
نور... خاموش ہوا۔ پھر اچانک وہ غصے اور غم کی شدت سے کانپنے لگا۔ اس نے کافی کی پیالی زور سے چولہے میں پھینک دی۔
"تمہیں شمع تو یاد ہوگی بجار خان؟"
"شمع؟"
"ہاں! میری پہلی بیوی۔"
"وہ... وہ... تمہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔"
"ہاں، اور صرف تمہاری وجہ سے۔ وہ خوب صورت تھی اور اچھی بیوی تھی۔ اگر تم اسے مجھ سے چھین کر خود شادی کر لیتے تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن نہیں، تمہیں شمع کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تم تو دراصل میری ایک ایسی چیز تباہ کرنا چاہتے تھے جس سے مجھے بہت محبت تھی۔ مجھے یاد ہے بجار خان! جب میں چھوٹا تھا تو میرا بڑا بھائی اکثر میرے کھلونے توڑ دیا کرتا تھا صرف اپنی حاکمیت جتانے کے لیے اور مجھے یہ احساس دلانے کے لیے کہ میں اس کے رحم و کرم پر ہوں اور اس کی خوشنودی حاصل کر کے ہی خوش رہ سکتا ہوں۔ تمہارا رویہ بھی بالکل یہی تھا۔ بجار خان! کیا تمہیں معلوم ہے اب شمع کہاں ہے؟"
"مجھے نہیں معلوم۔" بجار خان اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔
"تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔ تم نے میری ... کی حد تک تو میری بہت تذلیل کی ہی مگر تم نے اپنے دوست کی عزت پر بھی نقب لگا ڈالی... میں واقعی بزدل، ڈرپوک اور کمزور تھا۔ جب ہی تو تم اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ میری عزت پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ بے چاری جانے کس خوف کے تحت مجھے کچھ بتا نہ سکی تھی... اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔ اور پھر ایک دن وہ شکارپور چلی گئی۔ اپنے بوڑھے ماں باپ کے گھر۔ پھر وہیں اس نے خودکشی کر لی۔ خودکشی کرنے سے پہلے اس نے ایک چھوٹے سے کاغذ پر تمہارے بارے میں مختصراً لکھ ڈالا تھا اور آخر میں اس نے مجھے ہی قصوروار ٹھہرایا کہ میری ڈرپوک طبیعت کے باعث وہ تمہارے ہاتھوں برباد ہوتی رہی، اس نے شاید ٹھیک ہی تو کہا تھا۔"
نور... اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ آتش دان میں لکڑیاں چیخ رہی تھیں۔ کیبن کی سنگین خاموشی تپنے لگی تھی۔
"بجار خان! میری مثال اس اونٹ کی سی ہے جو بظاہر اپنے مالک کا ہر وار سہتا ہے اپنے اندر کینہ پالتا رہتا ہے اور منتظر رہتا ہے کہ کب کھولی میں مالک کمزور یا بیمار پڑے اور وہ اس سے انتقام لے۔ پھر وہ موقع پاتے ہی اسے مسل کر ختم کر دیتا ہے۔"
بجار خان کو اپنے وجود میں بے رحم موت کی سرسراہٹ اترتی محسوس ہونے لگی۔ اس نے ابھی تک اپنے دفاع میں کچھ نہیں کہا۔
"تم کتنے بہادر ہو بجار خان؟" نور نے کہا۔
"کیا تم میں آہستہ آہستہ مرنے کی جرأت ہے؟ تم جانتے ہو کہ تمہیں مرنا پڑے گا... اب تم کبھی مجھ پر حکم نہیں چلا سکو گے۔ اب تم کسی پاک دامن عورت کو داغ دار کر کے اسے زندہ درگور نہیں کر سکو گے... اب صورت حال میرے قابو میں ہے۔ میں زندہ رہوں گا اور تمہیں مرنا پڑے گا۔ یہ ہمارے درمیان آخری مقابلہ ہوگا بجار خان! اور میرے عزیز دوست! میں یہ مقابلہ جیت کر رہوں گا۔"
"کیا تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو نور احمد؟"
نور نے کوئی جواب نہیں دیا وہ پُرسکون انداز میں کھڑا رہا۔
"لیکن تم بزدل ہو، کم ہمت ہو، بڑا کام دیکھ کر تمہیں پسینہ آنے لگتا ہے۔ تم بہت بزدل ہو۔"
نور... آہستہ آہستہ قدم جماتا ہوا بجار کے بستر کے قریب آ گیا۔



دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
"آگے بڑھو، اٹھاؤ رائفل، اگر تم میں ذرا بھی ہمت ہے تو اس کا مظاہرہ کرو۔ میں تمہیں روک بھی نہیں سکوں گا۔ بندوق کی نال کا رخ میری طرف کر کے صرف لبلبی ہی تو دبانی ہے۔ آگے بڑھو نور... رائفل اٹھاؤ۔"
"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں رائفل سے تمہیں قتل کر کے تمہارے قتل کے الزام میں باقی عمر جیل میں گزار دوں؟ تم اس قابل تو نہیں ہو۔" نور نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "میں تمہارا منصوبہ سمجھ رہا ہوں بجار خان! اس طرح تمہاری تکلیف کا فوری خاتمہ ہو جائے گا اور مجھے ساری زندگی قید میں کاٹنا پڑے گی۔ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہو تم؟ شکریہ میرے عزیز دوست! میں تمہاری اذیتوں کا خاتمہ نہیں کروں گا۔ تمہیں سسک سسک کر مرنا پڑے گا۔"
بجار خان نے مسکرانے کی کوشش کی تو اس کا زخمی چہرہ مسخ ہو گیا۔
"سسکنے اور اذیتیں برداشت کرنے میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے لیکن میں مروں گا ہرگز نہیں۔ میں زندہ رہوں گا نور احمد میں عہد کرتا ہوں کہ شہر واپس پہنچ کر تمہیں ایسا سبق دوں گا کہ تم ساری عمر نہیں بھول سکو گے۔"
"مجھے افسوس ہے میرے دوست! تم اس خواب کی تعبیر کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔ تمہیں ہر قیمت پر مرنا پڑے گا اور جیسا کہ میں نے کہا ہے، میں تمہیں، اپنے ہاتھوں سے دفن کر کے یہاں سے جاؤں گا۔"
"مجھے افسوس ہے میرے ساتھی! میں اس معاملے میں تم سے قطعی تعاون نہیں کر سکتا۔ میرے تعاون سے تم بالکل ناامید ہو جاؤ۔"
نور نے بے پروائی سے کندھے جھٹکائے۔ "دیکھو ... ضد کرو گے بجار! تو مجھے واقعات میں ذرا تبدیلی کرنی پڑے گی۔ اگر تم دفن ہونے سے پہلے نہ مرے تو میں مجبوراً تمہیں مرنے سے پہلے دفن کر دوں گا، پھر ظاہر ہے تمہارے پاس مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ ویسے دفن ہونے کے بعد تم جب چاہے مر سکتے ہو۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہو گی۔"

☆☆☆

نور نے ناشتے کے برتن دھو کر اپنے کاروباری جذبے کے تحت کھدائی شروع کر دی۔ اس کام کے لیے اس نے کیبن کے سامنے ایک صاف اور ہموار جگہ منتخب کی جو کیبن کے دروازے کے بالکل سامنے تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بجار اپنے بستر پر بے حس و حرکت پڑا ہوا اسے اپنی قبر کھودتے دیکھ سکتا تھا۔ نور... کو قبر کھودنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ ایک تو وہ جسمانی مشقت کا عادی نہیں تھا مگر یہ مشقت تو اسے کرنا تھی۔ ایک زنگ آلود پھاوڑا اس کے ہاتھ لگ گیا۔
ایک گھنٹے تک مسلسل محنت کرنے کے بعد نور، جب بری طرح تھک گیا تو کیبن میں آ کر سستانے لگا۔
"بجار خان! مجھے تمہاری قبر کھودنے میں بہت وقت ہو رہی ہے۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔
"تمہیں معلوم ہے۔ میں عملی کاموں میں اناڑی ہوں۔ اگر تم میرا کام آسان بنانے کے لیے کوئی تعمیری تجویز پیش کرو تو میں اسے شکریے کے ساتھ قبول کرلوں گا۔"
بجار خان نے کوئی تجویز پیش نہیں کی، وہ خاموش پڑا رہا۔ نور... چند منٹ بعد دوبارہ قبر کھودنے میں جت گیا۔ کبھی کبھی وہ کیبن کی طرف دیکھ کر یہ اطمینان کر لیتا تھا کہ بجار خان اسے اپنی قبر کھودتے ہوئے دیکھ رہا ہے یا نہیں...؟ اسے ایک بار بھی مایوسی نہیں ہوئی۔ نور... دوپہر تک چھ فٹ لمبا اور دو فٹ چوڑا زمین کا قطعہ صرف چار انچ گہرا کھود سکا۔ کام کی

**شگفتہ**

پر کسی شخص نے ایک بچے کو ڈوبنے سے بچا لیا۔ کچھ دیر بعد بچے کا باپ اس شخص کو تلاش کرتا ہوا آیا اور پوچھا۔ "کیا آپ ہی نے میرے بچے کی جان بچائی ہے؟"
اس شخص نے کہا۔ "جی ہاں، مگر یہ تو میرا اخلاقی فرض تھا آپ خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"
بچے کے باپ نے کہا۔ "میں آپ کو شرمندہ نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ بچے کی جیب میں جو گھڑی تھی وہ کہاں ہے؟"

ایک مشہور کرکٹر نے ایک بار کھیل کے میدان میں ایک چھوٹے سے بچے کو جھڑک دیا تو اخبارات میں اس کی بد اخلاقی پر بڑی لے دے ہوئی۔ خود کھلاڑی کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بچے کا پتا معلوم کر کے وہ اس کے گھر گیا۔ اس کی آٹوگراف بک منگوائی۔ دستخط کیے اور مسکرا کر پوچھا۔ "اب تو تم خوش ہو گئے ہو گے؟"
"جی ہاں۔" بچے نے اس کی آستین پکڑ کر کہا۔ "میرا فاؤنٹین پن آپ نے اپنی جیب میں لگا لیا ہے اسے واپس کرتے جائیے!"

اس رفتار سے وہ خود بھی خاصا مایوس ہوا۔ محنت کرنے سے بھوک چمک گئی تھی چنانچہ وہ کیبن میں آکر کھانا تیار کرنے لگا۔ بجار خان نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا البتہ کافی شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ نور ـــ نے اس سے کھانا نہ کھانے کی وجہ بھی نہیں پوچھی، اسے بہت زور سے بھوک لگ رہی تھی اس لیے اس نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔

''کیا واقعی تم یہ قبر میرے لیے تیار کر رہے ہو؟'' اچانک بجار خان نے سوال کیا۔

نور ـــ نے کھانا کھاتے ہوئے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر تم خوامخواہ محنت کر رہے ہو۔ میں تمہاری آسانی کے لیے فی الحال مرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔''

نور ـــ نے گھوم کر بجار خان کو دیکھا۔ ''تم اب تک سمجھے ہی نہیں بجار خان!'' اس نے کہا۔ ''جب تمہاری قبر تیار ہو جائے گی تو میں تمہیں اس میں زندہ دفن کر دوں گا۔ اگر تمہیں بہت جلدی ہو تو دفن ہونے سے پہلے ہی مر سکتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بس یہ نہ بھولو کہ تم بالکل بے بس اور لاچار ہو۔ تم مجھے کسی اقدام سے نہیں روک سکو گے۔ میں تمہیں گھسیٹتا ہوا تمہاری قبر تک لے جاؤں گا اور پھر تمہارا جسم اس میں پھینک کر اوپر مٹی ڈالنا شروع کر دوں گا۔ تم ذرا بھی مدافعت نہیں کر سکو گے۔''

''کیا تم واقعی مجھے زندہ دفن کر دو گے؟'' بجار خان نے بے یقینی سے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں، اگر تم اپنی قبر تیار ہونے تک نہ مرے تو مجھے یہی کرنا پڑے گا۔ پہلے پہل تو تمہیں زندہ دفن کرنے کا خیال مجھے بالکل پسند نہیں آیا تھا لیکن اب میں جتنا غور کر رہا ہوں، میری پسندیدگی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔''

بجار خان کو یقین نہیں آیا کہ نور احمد سنجیدہ ہے کیونکہ کسی شخص کو زندہ دفن کرنے کا خیال اس کے لیے ناقابلِ تصور تھا۔

''تم مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو نور احمد۔''

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے تمہیں خوف زدہ کرنے کی، آنے والا وقت تمہیں خود خوف زدہ کر دے گا۔'' نور .. نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اپنے رعب دبدبے سے سالوں سے مجھے خوف زدہ رکھا ہے بجار خان! میں ہر وقت تم سے خوف زدہ رہتا تھا کہ نہ جانے تم کیا کر بیٹھو؟ میں نے اپنی پوری زندگی خوف و دہشت میں گزار دی ہے۔ میرے مقابلے میں تمہیں جس خوف و دہشت کا سامنا ہے، اس کی مدت بہت کم ہوگی۔ میں نے سنا ہے کہ زندہ دفن، دنیا کا دہشت ناک ترین تجربہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے تمہارے لیے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میرے لیے بھی تم سے انتقام لینے کا یہ سنہری موقع ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا مجھے زندہ دفن کر کے تم قتل کے الزام سے بچ جاؤ گے؟''

''ہاں، مجھے اس کا پورا یقین ہے۔'' نور ـــ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کس طرح؟ جب تم پولیس کو میری موت کی اطلاع دو گے تو میری لاش ضرور قبر سے نکالی جائے گی اور اس کا پوسٹ مارٹم ہوگا پھر پولیس میرے زخم دیکھ کر تم سے پوچھے گی کہ آخر تم نے میری جان بچانے کے لیے کسی ڈاکٹر کی مدد کیوں حاصل نہیں کی؟''

''میں کہہ دوں گا کہ میں تمہیں یہاں تنہا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا تاکہ تمہاری دیکھ بھال کر سکوں۔ اس کے علاوہ، چونکہ میرے پاس کوئی سواری نہیں تھی اور مجھے آبادی تک پہنچنے کا راستہ بھی نہیں معلوم تھا اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کیبن میں رک کر دوست محمد کی آمد کا انتظار کروں... نہیں... نہیں... ٹھہرو، میں کہوں گا، تم نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں تمہیں تنہا چھوڑ کر ہرگز نہ جاؤں کیونکہ تمہیں یقین تھا کہ میں کبھی اس بڑے پہاڑی جنگل میں راستہ تلاش نہیں کر سکوں گا اور تم اس کیبن میں تنہا و بے یار و مددگار پڑے رہنے سے خوف زدہ تھے۔''

''اچھا، ٹھیک ہے تو پھر تم نے مجھے دفن کیوں کیا؟''

''اس لیے کہ تمہیں دفن کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر میں تمہاری [illegible] کیبن کے [illegible] ڈال دیتا تو جنگلی درندے اسے کھا جاتے اور اگر میں تمہاری لاش کیبن میں رہنے دیتا تو میں خود یہاں نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ میں ایک لاش کے ساتھ اس کمرے میں رات بسر نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے مجھے مجبوراً تمہاری لاش دفن کرنی پڑی۔''

''تمہیں معلوم ہے نور احمد کہ وہ لاش نکال کر اس کا پوسٹ مارٹم ضرور کریں گے؟''

''ضرور کریں۔ کون روکتا ہے انہیں، وہ تمہاری لاش نکال کر شہر لے جائیں گے اور وہاں تمہاری ٹوٹی ہوئی ہڈیاں گنیں گے اور ظاہر ہے یہ ہڈیاں دیکھ کر ایک [illegible] گا کہ تمہاری موت ان زخموں کی تاب نہ [illegible] وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد وہ تمہاری لاش واپس کر [illegible] [illegible] بہت شاندار طریقے سے تمہارا جنازہ اٹھے گا، میں [illegible] کرتا ہوں بجار خان! کہ تمہارے جنازے میں ضرور [illegible] کروں گا۔ نہ صرف شرکت کروں گا بلکہ غمگین نظر آنے کی کوشش کروں گا۔''

''مگر پولیس نے میری لاش کا پوسٹ مارٹم کیا تو اسے [illegible] معلوم ہو جائے گا کہ میری موت زخموں کی وجہ سے نہیں [illegible] گھٹنے سے واقع ہوئی ہے۔ ظاہر ہے اگر تم زندہ انسان کو [illegible] تو اس کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوگی اور پولیس تم سے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گی تو تم کیا [illegible] دو گے؟''

نور [illegible] اطمینان سے کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے کھانا [illegible] کھانے کے دوران میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اس کا پتا چلنا بہت مشکل ہوگا بجار خان! جب میں تمہیں قبر میں لٹاؤں گا اور تم پر مٹی ڈالنا شروع کروں گا تو تمہاری موت دراصل خوف و دہشت کی وجہ سے ہوگی، دم گھٹنے سے نہیں، دم گھٹنے کی تو نوبت ہی نہیں آئے گی۔ تم اچھی طرح دفن ہونے سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔ کیونکہ تم جسمانی [illegible] بہت کمزور ہو چکے ہو اور تمہارے جسم سے خون بہت بہہ چکا ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ تم خوف و دہشت سے مر جاؤ گے۔ جب تمہاری لاش باہر نکالی جائے گی تو مٹی [illegible] ہوئی ہوگی اور پوسٹ مارٹم سے یہ ثابت ہوگا کہ [illegible] سے گرنے کے باعث تمہاری کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں [illegible] بہت سی اندرونی چوٹیں آئی تھیں اور بہت خون بہا تھا۔ چوٹوں کی نوعیت سے تمہاری شدید تکلیف اور اذیت کا [illegible] آسانی سے ہو جائے گا۔ یہ سب چیزیں سامنے [illegible] ہوئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پوسٹ مارٹم [illegible] ڈاکٹرز کا ذہن دم گھٹنے کی طرف جائے گا ہی [illegible] تمہاری موت قدرتی قرار دے دی جائے گی۔''

[illegible] کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔

☆☆☆

نور [illegible] کی کوشش تھی کہ وہ دوست محمد کے آنے سے [illegible] [illegible] ویسے بھی اسے یقین ہو چکا تھا کہ دوست [illegible] کسی کام میں پھنس گیا ہے۔ تاہم وہ کسی وقت بھی [illegible] سکتا تھا... نور کو قبر کھودتے ہوئے دور روز تک [illegible] بجار خان دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا [illegible] یہاں پہنچ جائے ورنہ ایک اذیت ناک موت [illegible] [illegible] کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ نور [illegible] انتقام میں اس قدر بھی جا سکتا ہے۔ شاید اس کی مثال ایک ایسے ہی گیدڑ جیسی تھی جس کی بھوک شکار کو کمزور پا کر غالب آجاتی ہے اور نور... بھی انتقام کی بھوک سے مغلوب ہو چکا تھا۔

وہ سنگین وقت آن پہنچا تھا۔ نور ـــ نے اپنے دونوں ہاتھ زخمی بجار خان کی بغلوں میں ڈال دیے۔

''نور احمد...'' بجار خان کی آواز کپکپا گئی۔

''مت کرو ایسا یار!''

نور... کوئی جواب دیے بغیر اسے دروازے کی طرف گھسیٹنے لگا۔ بجار خان نے دیوانوں کی طرح اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش چاہی۔ اس نے بڑی مشکل سے بستر کا ایک کونا پکڑ لیا لیکن وہ چند لمحوں سے زیادہ اس پر اپنی گرفت قائم نہیں رکھ سکا کیونکہ وہ بے حد کمزور ہو گیا تھا جب نور... اسے گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے آیا تو اس کی جدوجہد بالکل ختم ہو گئی۔ وہ بے ہوش سا ہو گیا۔

نور... بیدردی سے اس کا بے سدھ وجود پتھریلی زمین پر گھسیٹتا ہوا کھدی ہوئی قبر تک لے گیا اور اسے کنارے لٹا کر اپنا سانس درست کرنے لگا۔

جب اس نے جھک کر بجار خان کا جسم قبر میں لڑھکانے کی کوشش چاہی تو بجار خان کو ہوش آ گیا۔ اور اس کی نظریں قبر کی گہرائی پر پڑیں۔ دہشت سے اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلنے لگیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ قبر کے اندر پڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اوپر کی طرف تھا اور اسے آسمان کا ایک محدود حصہ نظر آرہا تھا۔

''نور احمد! خدا کے لیے... مجھے معاف کر دو۔'' وہ گڑگڑایا۔

''قبر زیادہ گہری نہیں ہے دوست!'' وہ سنگین اور پتھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں لیکن فی الحال کام چل جائے گا۔ میرا وعدہ رہا کہ تمہاری مستقل قبر خوب گہری ہوگی یعنی... موت کی قبر...''

نور ـــ نے اس پر مٹی ڈالنی شروع کر دی۔

''نور احمد!... رحم... رحم...'' بجار خان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''مجھ پر رحم کرو... نور احمد! مجھے معاف کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک غلام کی طرح زندگی بھر تمہاری خدمت کروں گا۔''

نور ـــ نے اس کی آہ و بکا پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ [illegible] بجار خان کے [illegible] پر مٹی ڈالنے لگا۔ چہرے پر مٹی گرتے ہی بجار خان گلا پھاڑ کر چیخنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے لیکن اس کی انگلیاں بھی قبر کے کنارے

تک نہ پہنچ سکیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر چند انچ سے زیادہ نہیں اٹھ سکا اور دوبارہ گر گیا۔

”میرے... خدا... میرے... خدا... یا... اللہ سائیں... میری مدد کر!...“ وہ پھر چیخنے لگا۔

نور احمد خاموشی سے مٹی ڈالتا رہا۔ اس کی حرکات و سکنات سے عجلت کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے مٹی ڈال رہا تھا۔

نور احمد نے پیروں کی طرف سے مٹی ڈالنی شروع کی تھی جب مٹی بجار خان کی کمر تک پہنچ گئی اور قبر اوپر تک بھر گئی تو اس نے بجار خان کے پیٹ اور سینے پر مٹی ڈالنی شروع کر دی۔

نور احمد کو اس وقت کچھ اور دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ جب اس نے بجار خان کے ہاتھوں پر مٹی ڈالنی شروع کی کیونکہ بجار خان نے ہاتھ چلا چلا کر مٹی اوپر اچھالنی شروع کر دی تو وہ اس بھیانک موت سے خود کو بچانے کی آخری کوشش کر رہا تھا۔ نور احمد کچھ دیر تک اس کی یہ آخری مدافعت تو برداشت کرتا رہا۔ پھر تنگ آ کر وہ دو بڑے پتھر لے آیا۔ اس نے بجار خان کے دونوں بازو ان وزنی پتھروں کے نیچے دبا دیے۔

”پولیس تم سے ان پتھروں کے بارے میں ضرور سوال کرے گی نور احمد!“ بجار خان نے چلا کر کہا۔

”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ نور احمد نے یقین دلایا۔ ”ذرا محنت تو ہوگی مگر میں بعد میں مٹی کھود کر یہ پتھر نکال لوں گا۔“

مٹی ڈالنے کا عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ بجار کا صرف چہرہ مٹی سے باہر رہ گیا۔ بجار پھسل پھسل کر آنے والی مٹی سر ہلا ہلا کر گردن سے ہٹا رہا تھا۔ نور احمد نے پھاوڑا ایک طرف رکھ دیا اور قبر پر جھک کر بجار کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”بجار خان! میرے عزیز دوست! اب جدائی کے لمحات بے حد قریب آ گئے ہیں۔“

”نور احمد! خدا کے لیے، میری بات...“

”خدا حافظ بجار خان! میرے دوست! میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا اور اس سنہری موقع کو بھی...“ نور احمد کے چہرے کی مسکراہٹ بڑی سنگین اور مکروہ تھی۔ ”خاص طور پر یہ آخری چند روز عمر بھر نہیں بھول سکوں گا جو میں نے تمہاری صحبت میں گزارے ہیں۔“ نور احمد نے ہاتھ سے دھکیل کر کچھ مٹی بجار خان کے چہرے پر پھینکی۔

”لعنت ہو تجھ پر کمینے کتے۔“ بجار خان نے پوری قوت سے چیختے ہوئے کہا۔ ”یاد رکھو، مجھے قتل کر کے تم سزا سے نہیں بچ سکو گے کبھی نہیں۔ تجھے ساری عمر جیل میں سڑنا پڑے گا۔ ذلیل، کمینے، میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ تجھے اپنے کیے کی پوری پوری سزا ملے گی نور احمد۔“

جب پورے چہرے پر مٹی کی ایک پتلی سی تہ جم گئی۔ بجار خان کی آواز آنی بھی بند ہو گئی۔ البتہ تہ کے نیچے اس کے ہونٹ بدستور ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ نور احمد کھڑا ہو گیا۔ اس نے جوتے سے کھسکا کھسکا کر مٹی ڈالنی شروع کر دی۔ چند لمحوں تک بجار خان زور زور سے سر ہلا کر مٹی ادھر اُدھر کھسکاتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس نے حرکت کرنی بند کر دی۔ نور احمد نے دوبارہ پھاوڑے کی مدد سے مٹی ڈالنی شروع کر دی۔ جب قبر اوپر تک بھر گئی تو وہ دونوں جوتے ٹھیک اس جگہ رکھ کر کھڑا ہو گیا جہاں اس کا چہرہ ہونا چاہیے تھا۔ پھر اس نے دونوں جوتوں پر زور ڈالتے ہوئے جھک کر قبر میں زندہ مدفون آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سنو بجار خان! غور سے سنو اگر تم تک میری آواز پہنچ رہی ہو تو سنو... پہلے میں جب بھی آئینہ دیکھتا تھا تو مجھے اپنے چہرے پر تمہارے قدموں کے نشان نظر آتے تھے مگر اس وقت میں تمہارے چہرے پر کھڑا ہوں۔ تم اسی قابل تھے بدنصیب...“

☆☆☆

میں ان دنوں ضلع دادو کے ڈسٹرکٹ اسپتال میں فرانزک میڈیسن ڈپارٹمنٹ میں چیف میڈیکل آفیسر تھا۔ میرا کام لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرنا اور باریک بینی سے اندرونی اعضا کا معائنہ کرنے کے بعد رپورٹ تیار کرنا ہوتا تھا۔ یہ کام میں پوری دلچسپی اور انہماک سے کیا کرتا تھا۔ لاش کو چیرا لگا کر اسے کھول کے رکھ دیتا تھا۔ میں چونکہ جاسوسی کہانیاں پڑھنے کا شوقین ہی نہیں بلکہ لکھتا بھی تھا... اس لیے یہ کام میں بڑی ذمے داری اور لگن سے کرتا تھا۔ میری رپورٹس پولیس کے لیے بہت معاون و مددگار ثابت ہوتی تھیں... بلکہ خود میں بھی بعض اہم نکتے پولیس کو سمجھا دیا کرتا تھا۔

انسپکٹر سجاول خان بڑا فرض شناس اور دیانت دار پولیس آفیسر تھا۔ میری اس سے اچھی خاصی دوستی تھی۔ رات تقریباً بارہ بجے وہ ایک بجار خان نامی آدمی کی مٹی میں لتھڑی لاش لے کر آیا۔

لاش موبائل میں رکھی تھی۔ دو پولیس کانسٹیبل ساتھ تھے۔ میں نے لاش سرجیکل روم میں رکھوائی۔ کام شروع کرنے سے پہلے میرے آفس روم میں آرام سے بیٹھ کر انسپکٹر سجاول نے مجھے کچھ اہم اور ضروری باتیں بتائیں۔

”یار بھئی! چند روز پہلے ایک دوست محمد نامی شخص مجھ سے ملنے تھانے آیا تھا۔“

انسپکٹر سجاول نے مجھے بتانا شروع کیا۔ اس وقت کمرے میں صرف ہم دو افراد تھے۔ میں بڑے غور سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے یہ تفصیل سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے دو دوست نور احمد اور بجار خان کچھ روز قبل شکار کھیلنے کے لیے کوہ کیرتھر کے علاقے گورکھ ہل گئے تھے۔ ان تینوں کا پروگرام طے شدہ تھا مگر دوست محمد کو اچانک ایک ضروری کام پڑ گیا اور وہ اس شکاری مہم میں شریک نہ ہو سکا۔ بعد میں ملاقات پر نور احمد نے دوست محمد کو افسوس ناک اطلاع دی کہ بدقسمتی سے بجار خان کا گورکھ ہل کی پہاڑی سے پاؤں پھسلنے کے دوران گر کر شدید زخمی ہونے کے بعد انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں، پیروں اور کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ شدید زخمی حالت میں زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گیا۔ سردست اس نے بجار خان کو گورکھ ہل میں ہی دفنا دیا تھا۔ پھر بعد میں اس کی لاش آبائی قبرستان رجب ڈکانہ لے جانے لگے تو اچانک دوست محمد کے دماغ میں کچھ سوال اٹھے کہ وہ لاش لے کر میرے پاس آ گیا۔ اسے نور احمد پر شبہ سا ہوا کہ ممکن ہے کسی چھپی ہوئی دشمنی کی بنا پر کہیں اس کا دوست نور... کسی جرم کا مرتکب نہ ہوا ہو... نور... دوست محمد کی حرکت پر ناراض تو ہوا... مگر اس نے بھی کہہ دیا میں تمہارے ساتھ ہوں... تم بے شک لاش کا پوسٹ مارٹم کروا لو... اس کی ہڈیاں جب تمہیں ٹوٹی ہوئی ملیں گی تو تمہیں تب ہی میری بات کا یقین آئے گا۔ دوست محمد نے یونہی اس کا شک دور کرنے کے لیے سمجھایا کہ یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہے کہ متعلقہ تھانے کی پولیس کے علم میں اس کی قبر کی منتقلی کی بات کی جائے۔ اب تم اس لاش کا پوسٹ مارٹم کر کے ابھی مجھے بردست زبانی رپورٹ دو۔“

انسپکٹر سجاول اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”نور احمد اور دوست محمد کدھر ہیں؟“ میں نے کسی قدر تجسس سے پوچھا۔

”دونوں تھانے کے مہمان خانے میں موجود ہیں۔“ انسپکٹر سجاول خان نے بتایا۔

میں نے اپنے اسسٹنٹ گلاب بلوچ کو بلایا اور اسے سرجیکل باکس ریڈی کرنے کا کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں سرجیکل روم میں بجار خان کی لاش کی چیر پھاڑ میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

گھنٹے بھر بعد میں اپنے روم میں آیا۔ جہاں انسپکٹر سجاول بے چینی سے میرا منتظر تھا۔

”ہاں بھئی، بتاؤ...“

میں اپنی کرسی پر بیٹھا اور اسے بتایا۔

”پوسٹ مارٹم کے ذریعے یہ بات یقینی طور پر تو میں نہیں بتا سکتا تھا کہ بجار خان... کو پہاڑی سے دھکا دیا گیا تھا یا وہ خود ہی اپنا پاؤں پھسلنے سے گرا تھا۔ لیکن زخموں کے جائزے سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ چوٹیں بہت خطرناک تھیں اور طبی امداد کی عدم موجودگی میں جان لیوا ثابت ہو سکتی تھیں۔ زخموں کی نوعیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بجار خان... چوٹیں آنے کے بعد خاطر خواہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا ہوگا۔ خصوصاً اس کا نچلا دھڑ حرکت کرنے کے بالکل قابل نہیں رہا تھا تاہم...“ میں چند ثانیوں کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔

”پوسٹ مارٹم کے دوران میں ایک قابل ذکر اور دلچسپ بات دیکھنے میں آئی کہ... بجار خان کے منہ میں مٹی تھی۔ خیر، یہ امر اتنا حیرت انگیز نہیں ہے کیونکہ اسے کفن کے بغیر دفنایا گیا تھا اس لیے مٹی اس کے منہ میں جا سکتی تھی لیکن... مٹی کی خاصی بڑی مقدار اس کے معدے میں بھی پائی گئی ہے۔ اس سے صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ... مرنے والے نے اپنی موت سے پہلے دانستہ کچھ مٹی کھائی تھی ورنہ معدے میں مٹی پہنچنا ناممکن ہے اور وہ بھی اتنی بڑی مقدار میں؟ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب بجار خان کو دفن کیا گیا تو وہ نہ صرف زندہ تھا بلکہ اپنے ہوش و حواس میں بھی تھا۔“

میں اپنی تحقیقات کا خلاصہ انسپکٹر سجاول خان کے سامنے بیان کرنے کے بعد معنی خیز مسکراہٹ سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

میں نے دیکھا انسپکٹر سجاول کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ جو آخری نکتہ میں اسے سمجھانا چاہ رہا تھا، وہ اس کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ میز پر رکھے فون پر اپنے تھانے میں رابطہ کر کے نور احمد کی گرفتاری کے احکامات جاری کر رہا تھا۔

عمل

اسماقادری

قسط 42

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور یا اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے . . . ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے ۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو ۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے ، یہ تو بس ہو جاتی ہے ۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے ۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں . . . کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے ۔ ستا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے . . . اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے ۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

## گزشتہ اقساط کا خلاصہ
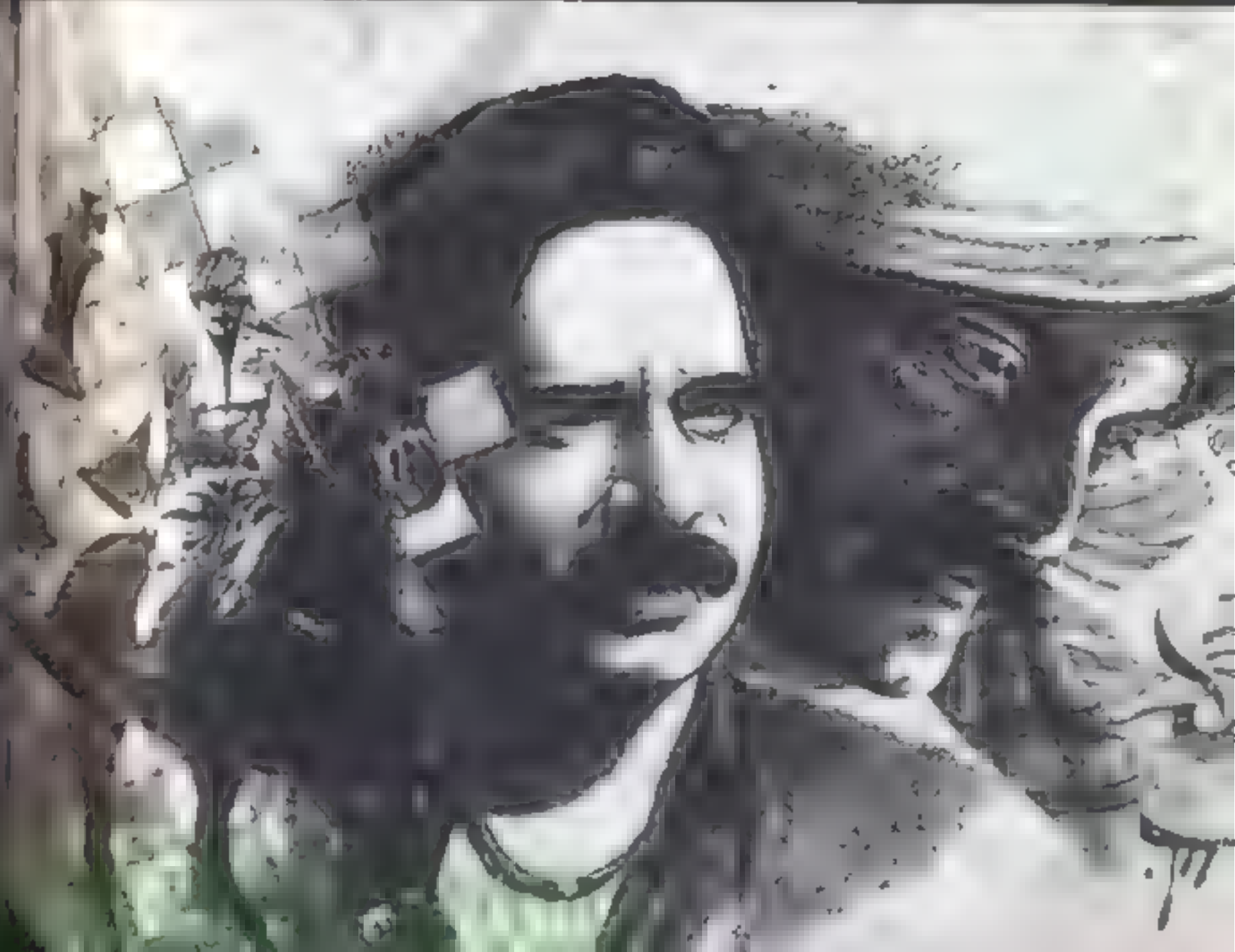
[illegible] خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک [illegible] نوجوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ [illegible] ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں [illegible] چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو [illegible] شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور [illegible] کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری [illegible] ت پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی [illegible] کا تعلق بھی [illegible] آباد سے ہے۔ چودھری افتخار [illegible] ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ [illegible] کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ [illegible] چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا [illegible] کا نام زیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ [illegible] کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے [illegible] کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ شہریار کی [illegible] ات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ [illegible] اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل [illegible] ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام [illegible] کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے [illegible] خبر نا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے [illegible] اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہریار کو پتا چلتا ہے کہ اس [illegible] جاسوسی کی جا رہی ہے۔ وہ اپنے گھر میں جاسوسی کے [illegible] ہونے والی ڈیوائس کو ڈھونڈ لیتا ہے۔ شہریار کو [illegible] تبدیل ہوتا ہے۔ ماریا لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے تو [illegible] وہ مشاہدہ خان کو اس کی نگرانی کرنے کی ہدایت دیتا [illegible] اسلم شہریار کو ماہ بانو کے نکاح کے سلسلے میں خود بھی [illegible] ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں [illegible] جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں [illegible] ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ [illegible] کی جگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس [illegible] ہسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی [illegible] کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم [illegible] ماریا کی ماں [illegible] سے انتقام کی [illegible] کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہریار اللہ آباد اور [illegible] کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی کو بم سے [illegible] میں وہ بچ نکلتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید [illegible] شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہریار فورس میں

شامل ہونے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلا دی جائے گی۔ شہریار، ماہ بانو اور اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ پھر اس کے ایکسیڈنٹ کا ڈراما پلے کردیا جاتا ہے۔ شہریار انڈر گراؤنڈ ہوجاتا ہے اور اس کی پلاسٹک سرجری اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہوجاتی ہے تاہم مراد شاہ کشور اور آفتاب سے بہت خلوص سے ملتا ہے۔ ادھر شہریار کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں کے ایک گروبوبی کو اس مشن میں اپنے ساتھ شامل کرلیتا ہے۔ بوبی، ایک ہندو خواجہ سرا شانتی کے پاس لے جاتا ہے۔ شانتی اسے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دیتی ہے مگر پھر اسے کراچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں لے آتی ہے۔ وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شانتی کسی چکر میں ملوث ہے۔ وہ ہیڈ کو رپورٹ کرتا ہے اور شانتی کے آدمی اسلحے سمیت پکڑے جاتے ہیں تاہم شانتی کو گرفتار کرنے کے بجائے اس کی نگرانی شروع کردی جاتی ہے۔ ادھر ذیشان سوچتی کو اٹھا کر اس سے، اگلوا لیتا ہے کہ وہ را کی ایجنٹ ہے۔ اس سے کافی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ذیشان شہریار کو تفصیل سے تمام صورت حال سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر جاوید علی ہیڈ کو رپورٹ کررہا ہوتا ہے کہ نوازش علی کی بیٹی شازمین اس کی گفتگو سن لیتی ہے۔ وہ جاوید علی کو حقیقت بتانا چاہتی ہے اور دوسرے دن اپنے کمرے میں آنے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ شانتی پکڑے جانے والے مال کے بارے میں ورما کو وضاحت دیتی ہے۔ وہ کراچی فون کرکے رنجی پر نظر رکھنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ورما اس کی گفتگو سن لیتا ہے اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ ورما اپنا ٹھکانا چھوڑتا ہے مگر ایف پی کا اہلکار اس کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے نئے ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے۔ شہریار، اس کی تصویر بھیجی جاتی ہے تو وہ اسے شناخت کرلیتا ہے۔ ادھر جاوید علی شازمین کے کمرے میں پہنچ کر شازمین سے معلومات حاصل کرتا ہے، ورما کوٹھی پر کارروائی کی تیاری کرتا ہے۔ ادھر اظفر اور اس کے ساتھی جنگل میں جاتے ہیں مگر انہیں ہلاک کردیا جاتا ہے اور ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ ان کی موت حادثاتی ہوئی ہے۔ نوازش علی کی کوٹھی پر آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں موجود انتہا پسند کوٹھی کو بارودی مواد سے اڑا دیتے ہیں۔ جاوید علی شدید زخمی ہوکر اسپتال پہنچ جاتا ہے جبکہ نوازش علی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں البتہ شازمین اور اس کی دونوں والدہ محفوظ رہتی ہیں۔ ادھر شہریار، ورما کے ٹھکانے پر پہنچ کر اسے قابو کر لیتا ہے۔ شازمین دارالامان پہنچ جاتی ہے۔ وہ جاوید علی سے ملنے پر اصرار کرتی ہے۔ جاوید علی اس کے لیے گاڑی بھجوا دیتا ہے۔ را والے شازمین کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں اور، ہسپتال سے واپسی میں اسے اغوا کرلیتے ہیں۔ ستمبر، شازمین سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کسی واضح صورت حال سے آگاہ نہ کرنے پر اس پر تشدد کا حربہ آزماتی ہے۔ پھر اس کو مردہ سمجھ کر سنسان جگہ پھنکوا دیا جاتا ہے تاہم شازمین بچ جاتی ہے اور اسپتال میں طبی امداد کے بعد اس کی حالت بہتر ہو جاتی ہے مگر شازمین وہاں خودکشی کرلیتی ہے۔ ادھر ورما سے پوچھ گچھ ہورہی ہوتی ہے اور اس پر تشدد کا ہر حربہ آزمایا جاتا ہے تاہم وہ خودکشی کرلیتا ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے کیونکہ چودھری افتخار ایک دن کے لیے گھر سے گیا ہوتا ہے تاہم رات میں اچانک واپسی پر اس کا کشور سے سامنا ہوجاتا ہے اور وہ غصے سے پاگل ہوجاتا ہے مگر مراد شاہ، کشور کو چودھری سے بچاتا ہے۔ ادھر شہریار کو سیکنڈ کردیا جاتا ہے اور اسے سلو والے مشن پر کراچی بھیجا جاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ اس کے اپارٹمنٹ میں زہریلی گیس چھوڑی جاتی ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں اور انہیں مارنے کی نیت سے آنے والے لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ پولیس کو پتا چل جاتا ہے کہ یہ قاتلانہ حملہ چودھری کی طرف سے کروایا گیا مگر چودھری پہلے ہی نیویارک چھوڑ چکا ہوتا ہے۔ ادھر سلو کی نگرانی کی جارہی تھی۔ وہ ایک شاپنگ سینٹر میں بم رکھتا ہے تاہم شہریار اسے ایک میدان میں پھینک دیتا ہے۔ مگر سلو کو گرفتار نہیں کیا جاتا۔ ریاض انور سلو کو وزیر اعلیٰ کے سیکیورٹی گارڈ میں شامل کرواتا ہے۔ وزیر اعلیٰ کے بیٹے کی دعوت ولیمہ میں وہ ایک اہم شخصیت کو مارنے کی کوشش کرتا ہے تاہم اسے گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ ادھر مشا برہان کی والدہ، انتقال کر جاتی ہیں اور اس کی شادی گل سے ہوجاتی ہے۔ مشا برہان ایک دہشت گرد کو پکڑ کر آرمی کے حوالے کردیتا ہے۔ شہریار واپس لاہور آجاتا ہے۔ عمر فاروق اسے بتاتے ہیں کہ اسے ایک اہم مشن سونپا جارہا ہے۔ آخر وہ گھڑی آہی گئی تھی جس کے لیے اسے تیار کیا جارہا تھا۔

**اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے**

''بھارت؟'' وہ اب بھی حیران تھا۔

''ہاں بھارت۔ تمہیں بھارت جانا ہوگا اور وہاں سے ڈاکٹر فرحان جمیل کو آزاد کروا کر واپس وطن لانا ہوگا۔ پاکستان میں ہر سو دندناتے را والوں کو بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ ان کے منہ سے بھی شکار چھینا جاسکتا ہے۔'' عمر فاروق کے لہجے میں چنگاریاں سی تھیں۔

''لیکن یہ ڈاکٹر فرحان جمیل ہیں کون؟ کچھ ان کا حدود اربعہ تو پتا چلے؟'' ایک شخص کو اگر بھارت جاکر چھڑانے کی ذمے داری اسے سونپی جارہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی بہت خاص آدمی تھا لیکن خود وہ فرحان جمیل نام کے کسی آدمی سے واقف نہیں تھا۔

''ڈاکٹر فرحان جمیل ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں ہم فخریہ اپنے ملک کا سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ بظاہر وہ ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں لیکن حقیقتاً ایک بڑے ریسرچر ہیں۔ وہ اپنی تعلیم انہوں نے انگلینڈ اور امریکا کی بڑی یونیورسٹیز میں مکمل کی، وہیں کام کیا تھا اور وہیں سے انہیں مائیکرو اور بیکٹیریا پر کام کرنے کا شوق ہوا۔ پاکستان واپس آنے کے بعد بھی انہوں نے یہ ریسرچ جاری رکھی۔ ان کا تعلق چونکہ ایک متمول خاندان سے ہے، اس لیے کافی عرصے تک وہ اپنے طور پر اپنی لیبارٹری میں کام کرتے رہے پھر بعد میں انہوں نے حکومت سے رابطہ کرکے بتایا کہ انہوں نے تحقیق سے وہ طریقہ دریافت کر لیا ہے جس کے ذریعے وہ حیاتیاتی ہتھیار تیار کرسکتے ہیں





لیکن یہ بھی سچ ہو کہ پاکستان کوئی جارحیت پسند ملک نہیں ہے لیکن ہمیں مسلسل دوسری طاقتوں سے خطرہ لاحق رہتا ہے اس لیے ہم اپنے بجٹ کا ایک بڑا حصہ دفاع پر خرچ کرنے پر مجبور ہیں۔ دفاعی نقطۂ نظر سے ہی ہم نے ایٹم بم بھی تیار کیا ہے اور اگر ڈاکٹر فرحان کی وجہ سے ہم ایک اور کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو ہمارے دشمنوں کو یہ ایک اشارہ ہوتا کہ پاکستان کی طرف بری نظر ڈالنے سے پہلے وہ اچھی طرح سوچ لیں کہ پاکستان اتنا بھی کمزور نہیں ہے کہ وہ تر نوالہ سمجھ کر نگل سکیں۔

''حکومت کی طرف سے ڈاکٹر فرحان کو منظوری مل گئی کہ وہ اپنی ذاتی تحقیق کو آگے بڑھائیں اور اس کے لیے حکومتی وسائل کو استعمال کریں۔ لیکن اس سے قبل کہ ڈاکٹر فرحان کام شروع کرتے، بھارت میں مقیم ان کی نانی کا پیغام آگیا کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ مرنے سے پہلے اپنی بیٹی اور اکلوتے نواسے کو دیکھ لیں۔ یہ ایک جذباتی معاملہ تھا۔ ڈاکٹر فرحان اپنی والدہ اور نانی کو مایوس نہیں کرسکتے تھے اس لیے انہوں نے چند دن کی مہلت لی اور بھارت روانہ ہوگئے۔ اصولاً تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہاں جاکر ان کا بھرپور استقبال ہوتا اور ان کے ماموں اور کزنز خوش ہوتے کہ برسوں بعد بہن اور اس کے بیٹے کی شکلیں دیکھنے کو ملیں لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر فرحان کی نانی نے انہیں اور ان کی والدہ کو بطور خاص اس لیے وہاں بلوایا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ جائداد کی تقسیم کرنا چاہتی تھیں۔ یہ بات ان کے ماموؤں کو منظور نہیں تھی۔ بہن جس کے دور ہونے کی وجہ سے وہ اس کے حصے کو اپنا ہی سمجھتے تھے اور برسوں سے اس کے حصے کی زمین پر کاشت کرکے لاکھوں کما رہے تھے، زمین کے بدلے وہ روپے سمیٹ کر لے جائے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کر سازش تیار کی اور ڈاکٹر صاحب کو ایک جاسوس کی حیثیت سے گرفتار کرلیا گیا۔ بدقسمتی سے بھارتی حکام کو کسی طرح اس بات کی بھنک بھی مل گئی کہ ڈاکٹر فرحان کس قسم کی تحقیق کررہے ہیں۔ چنانچہ ان کا کیس پکا ہو گیا۔ پھر ان کی والدہ کو بھائیوں نے باور کروایا کہ وہ زمین میں حصہ لینے کا خیال دل سے نکال دیں تو اس کی صورت میں ان کے بیٹے کی آزادی کے لیے کوشش کی جاسکے۔ ماں کے لیے بیٹے سے بڑھ کر کیا ہوسکتا تھا۔ وہ راضی ہو گئیں مگر ہوا یہ کہ ستم یہ کہ انڈین گورنمنٹ نے انہیں بھی بے دخل کر کے انہیں پاکستان واپس بھیج دیا۔ اب وہ بے چاری یہاں ہیں اور فون اور خطوں کے ذریعے اپنے بھائیوں سے درخواست کرتی رہتی ہیں کہ کسی طرح ان کے بیٹے کو آزاد کروا کر پاکستان بھجوایا جائے۔ بھائی کچھ کرتے نہیں لیکن بہن کو اطلاع دیتے رہتے ہیں کہ فرحان کی آزادی کے لیے پانی کی طرح پیسا بہا رہے ہیں لیکن فرحان پر اتنے سخت الزامات ہیں کہ اس کی رہائی کی کوئی صورت نہیں بن پارہی۔

''ڈاکٹر فرحان کی والدہ زیادہ پڑھی لکھی خاتون نہیں ہیں، والد کا انتقال ہوچکا ہے اور بہن بھائی کوئی ہے نہیں اس لیے اچھے خاصے باحیثیت خاندان سے تعلق ہونے کے باوجود ان کی رہائی کے لیے بڑے پیمانے پر کارروائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ حکومت پاکستان نے ان کو آزاد کروانے کے لیے ایک کوشش کی تھی کہ قیدیوں کے تبادلے کے ذریعے ڈاکٹر فرحان کو یہاں واپس لایا جاسکے لیکن بھارتی حکومت نے صاف انکار کردیا اور کہہ دیا کہ وہ ایک مبینہ جاسوس کو کسی طور آزاد نہیں کرسکتے۔ اس جواب کے بعد ہمارے پاس مزید اصرار کی گنجائش نہیں تھی اور یوں پانچ سال سے ڈاکٹر فرحان وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ اب ہم تمہارے سپرد یہ کام کررہے ہیں کہ تم کسی بھی طرح انہیں وہاں سے آزاد کروا کر لاؤ تاکہ وہ واپس آکر دوبارہ اپنا کام سرانجام دے سکیں۔ اس سلسلے میں تمہیں جو بھی وسائل درکار ہوں گے، وہ کسی نہ کسی طرح ہماری طرف سے مہیا کیے جاتے رہیں گے۔ لیکن ہم کھل کر کہیں بھی تمہاری حمایت نہیں کریں گے۔'' عمر فاروق نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''سر بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں شہریار! اس مشن پر جاتے ہوئے تمہیں یہ بات ذہن میں رکھنی ہوگی کہ ایک جاسوس یا سیکرٹ ایجنٹ بلاشبہ کسی ملک کے لیے اس کا سرمایۂ افتخار ہوتا ہے اور پوری قوم اس کے اس احسان تلے دبی ہوتی ہے کہ اس نے اپنی جان کی بازی لگا کر دفاع وطن کے لیے کام کیا لیکن مصلحتیں کبھی کھل کر اس کا اعتراف نہیں کرنے دیتیں۔ کوئی سیکرٹ ایجنٹ جب دشمن کی سرزمین پر پکڑا یا مارا جاتا ہے تو اس کی حکومت بھی اسے قبول نہیں کرتی۔ تم بھی یہاں سے بے شک پاکستان کی بہتری اور استحکام کی خاطر اپنی جان ہاتھ میں لے کر بھارت کی سرزمین پر پہنچو گے لیکن وہاں پہنچتے ہی تمہاری پاکستانی شناخت ختم ہوجائے گی۔ تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہوگا کہ تم خود کو پاکستانی ثابت کرسکو۔'' ذیشان نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے حقائق سے آگاہ کیا۔ ان باتوں سے بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ

اسے جان بوجھ کر جہنم میں جھونکا جا رہا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے جذبۂ حب الوطنی کو بہت ٹھونک بجا کر دیکھنے کے بعد ہی اسے سی ایف پی میں شامل کیا گیا تھا اور اس کے اوپر اتنا کثیر سرمایہ خرچ کر کے اس کی تربیت کے ساتھ ساتھ ظاہری تبدیلی کے عمل سے گزارا گیا تھا۔ ان سب باتوں کے پیچھے کسی قسم کی بدنیتی کارفرما نہیں تھی۔ نہ ہی اسے قربانی کا بکرا بنایا جا رہا تھا بلکہ اس کا انتخاب صرف اور صرف اس حقیقت کی بنیاد پر کیا گیا تھا کہ وہ وقت پڑنے پر وطن پر اپنا تن من دھن نچھاور کرنے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتا تھا۔ آج اس کے اس جذبے کی آزمائش تھی تو وہ کیسے پیچھے ہٹتا۔ سر اٹھا کر متانت اور سنجیدگی سے بولا۔

”گرفتاری یا موت کا ڈر مجھے میرے مشن سے پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ نہ ہی میں نے اپنے سینے پر تمغے سجانے کے لیے اس آگ میں کودنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرے ساتھ وہاں کیا ہوگا۔ نہ ہی مجھے یہ لالچ ہے کہ مجھے گارڈ آف آنرز پیش کرتے ہوئے قبر میں اتارا جائے۔ اگر اپنے وطن کی خاطر کام کرتے ہوئے میں کسی گندے نالے یا جوہڑ میں گر کر بھی مر جاؤں گا تو میرے لیے یہ ایک بڑا اعزاز ہوگا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی ضائع نہیں کی۔“

”مجھے تم پر فخر ہے بیٹا! مجھے معلوم تھا کہ تم سے ہمیں ایسا ہی جواب سننے کو ملے گا۔“ عمر فاروق بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اسے گلے لگانے کے لیے آگے بڑھے۔ وہ بھی فوراً ہی احتراماً کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اسے گلے لگایا اور جب وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو دونوں کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ان کے ساتھ کمرے میں موجود ذیشان بھی سحر زدہ سا یہ منظر دیکھ رہا تھا اور اس کے دل نے بے ساختہ یہ خواہش کی تھی کہ کاش شہریار کی جگہ وہ ہوتا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ہر شخص کی اپنی ایک جگہ مخصوص ہوتی ہے جہاں رہ کر اسے اپنے حصے کا کام انجام دینا پڑتا ہے اور اس کی کامیابی یہی ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام ایمانداری سے انجام دیتا رہے۔

”ذیشان، ڈاکٹر فرحان کے کوائف پر مشتمل ایک فائل اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔ تم اطمینان سے اس فائل کو پڑھ لینا۔ تمہیں ابھی فوری طور پر روانہ نہیں ہونا ہے۔ چند دن ملیں گے تاکہ تم آرام سے یہ کیس سمجھ سکو۔ مزید کچھ معلومات درکار ہوں گی تو وہ بھی ذیشان فراہم کر دے گا۔ اس عرصے میں تمہارے خدوخال کو ایک فائنل ٹچ دیا جائے گا تاکہ تم اس عادل خان سے مختلف نظر آؤ جو کراچی میں سلو دالے کر کام کر رہا تھا۔ میں نے تمہارے سرجن کو کراچی جانے سے پہلے فائنل ٹچ سے اسی لیے روک دیا تھا کہ تمہارا چہرہ کسی کے لیے بھی آشنا نہ رہے۔ چاہے وہ سی ایف پی کے اہلکار ہی کیوں نہ ہوں اور اب تو یہ تبدیلی اس لیے بھی ضروری ہے کہ وزیر اعلیٰ ہاؤس میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد تم بہت سوں کی نظروں میں آ گئے ہو۔ اس لیے تمہیں مزید تبدیلی کے عمل سے گزارنا ہماری مجبوری ہے۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں سر۔“ عمر فاروق کی لمبی چوڑی وضاحت کا اس نے بہت اختصار سے جواب دیا البتہ نظریں اس فائل پر جما کر رکھیں جو سینٹرل ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی۔

”اس فائل میں ڈاکٹر فرحان جمیل کے کوائف موجود ہیں۔“ اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے ذیشان نے فائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے خاموشی سے فائل لینے کے بعد اسے کھول کر دیکھا۔ سامنے ہی ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر لگی ہوئی تھی جس میں فراخ پیشانی، روشن آنکھوں اور تیکھے نقوش والا ایک پینتیس چھتیس سالہ شخص مسکرا رہا تھا۔ اس کی ذہانت اور آسودہ حالی اس کے چہرے سے ہی ظاہر تھی۔

”یہ بھارت جانے سے قبل کھینچی گئی ڈاکٹر فرحان کی آخری تصویر ہے۔ گرفتاری کے بعد بھی انہیں منظرِ عام پر نہیں لایا گیا۔ ابتدا میں عدالتی کارروائی کے لیے انہیں عدالت لایا جاتا تھا لیکن وہ بھی اس طرح کہ ان کا چہرہ موٹی چادر میں چھپا ہوا ہوتا تھا۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ عدالت کے روبرو جس شخص کو پیش کیا جاتا رہا وہ واقعی ڈاکٹر فرحان ہیں یا کوئی اور... لیکن ہماری انٹیلی جنس رپورٹ بہرحال یہ بتاتی ہے کہ ڈاکٹر فرحان زندہ ہیں چنانچہ ہماری خواہش ہے کہ ہم کسی طرح انہیں وطن واپس لا سکیں۔ ہمارے وطن میں گنتی کے چند ہی تو لوگ ہیں جن سے ہم وطن کی ترقی اور بہبود کی امید رکھ سکتے ہیں اور ان چند میں سے ایک سے بھی محروم ہو جانا ہمارے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ اس سے تم سمجھ گئے ہو گے کہ اس مشن کے لیے تمہارا انتخاب کیوں کیا گیا ہے۔“

تصویر کا جائزہ لیتے دیکھ کر ذیشان نے اسے مزید تفصیل سے آگاہ کیا لیکن اس کا ذہن تو اس کے آخری جملے میں ہی اٹک گیا تھا۔ اس نے آہستگی سے فائل کو بند کیا اور سنجیدگی سے ذیشان اور عمر فاروق کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”بار بار وضاحتیں دے کر آپ لوگ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مجھے نہ تو آپ کی نیک نیتی پر کوئی شبہ ہے، نہ ہی میرا جذبہ اتنا کمزور کہ ذرا سی آزمائش سامنے آنے پر ایمان ڈولنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ وضاحتیں دینے سے آپس کا باہمی اعتماد مجروح ہوتا ہے اور اس کیس میں تو کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لیے برائے مہربانی اب آپ میں سے کوئی ایسی کوئی بات نہ کرے جس کو سن کر مجھے شرمندگی ہو یا میری دل آزاری ہو۔ میں آپ لوگوں کا حصہ ہوں اور آپ لوگوں جیسا ہی ہوں۔ ہاں اگر آپ کو میرے جذبے پر کوئی شک ہو تو الگ بات ہے۔“

”تم غلط سمجھ...“ ذیشان نے تیزی سے وضاحت کرنی چاہی لیکن عمر فاروق نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

”کوئی وضاحت نہیں ذیشان! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ ہم میں سے ہے اور ہماری طرح ہی کا جذبہ رکھتا ہے اس لیے اسے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔“ انہوں نے ذیشان سے کہا اور پھر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”گڈ آف لک شہریار! تم اس کیس کو اچھی طرح اسٹڈی کرو۔ اس دوران میں تمہارے جانے کی تیاریاں مکمل ہو جائیں گی۔ وہاں تمہیں اجازت ہے کہ اس مشن پر اپنے ساتھ کسی مددگار کو لے جا سکتے ہو۔ وہ شخص کون ہوگا، اس کا انتخاب تم کرو گے۔“

”ٹھیک ہے سر! میں سوچ کر بتاؤں گا۔“ اس پیشکش کے جواب میں کوئی مطالبہ کرنے کے لیے ابھی اس کا ذہن واضح نہیں تھا اس لیے اس نے مہلت لے لی۔

”اچھی طرح سوچ لو۔ تم مجھ سمیت جس کی طرف اشارہ کرو گے، وہ خوشی سے تمہارے ساتھ جانے کے لیے راضی ہو جائے گا۔“ انہوں نے جواب دیا اور اپنی جگہ سے ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔

”تم ریسٹ کرو۔ اب ہم چلتے ہیں۔“ انہوں نے ذیشان کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جانے کا عندیہ دیا اور اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ وہ ڈاکٹر فرحان جمیل کی فائل تھامے لیے گہری سوچ میں ڈوبا وہیں بیٹھا رہ گیا۔

☆☆☆

”بیٹھو!“ میجر اسفندیار نے اپنے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ اپنے پروگرام کے مطابق گل مینا کے ساتھ واپسی کا ارادہ رکھتا تھا کیونکہ اپنے تئیں وہ احمد یار کو میجر اسفندیار کے حوالے کر کے اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ لیکن صبح ہی صبح ہوٹل میں اسے میجر اسفندیار کی طرف سے پیغام ملا کہ فی الحال وہ اپنی واپسی کا ارادہ ملتوی کر دے، انہیں اس سے کچھ کام ہے۔ اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے یہ بات مان لی۔ بعد میں اسے پتا چلا کہ وہ جس ڈائیوو سے جانے والا تھا، اس کی روانگی بھی ملتوی ہو گئی ہے۔ اصل میں گزشتہ روز جو واقعہ ہوا تھا، اس نے لوگوں پر دہشت سی طاری کر دی تھی۔ ایک ساتھ اتنے افراد قتل کیے جانے پر شہری سراپا احتجاج تھے اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ احتجاج کرنے والوں میں تمام مکتبۂ فکر کے لوگ شامل تھے جو اس قسم کے ہر واقعے کی مذمت کرتے ہیں۔ فی الحال شہر کے حالات کشیدہ تھے۔ شریف لوگ اپنے گھروں سے باہر نکلتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ واقعے کا ردِعمل انہیں نقصان نہ پہنچا دے۔ اس صورتِ حال پر مشابرم خان کا دل بری طرح کڑھ رہا تھا اور بس نہیں چلتا تھا کہ ایسی دہشت گرد کارروائی میں حصہ لینے والے تمام مجرموں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے انہیں گولیوں سے بھون ڈالے یا پھر کوئی اور بہت سخت سزا دے۔ یونہی جلتے کڑھتے بہت سا وقت گزر گیا تو میجر اسفندیار کا ایک آدمی گاڑی لے کر اس کے ہوٹل آ پہنچا۔ اس آدمی کے ساتھ روانہ ہونے سے قبل اس نے گل مینا کو بہت سی تسلیوں کے ساتھ کمرے کو لاک کر کے وہیں تک محدود رہنے کی ہدایت کی اور پھر روانہ ہو گیا۔

اب وہ میجر اسفندیار کے سامنے تھا اور وہ دراز قد میجر بڑے غور سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ آخرکار وہ اپنے اس کام سے فارغ ہوا تو لب کشائی کی۔

”مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نہایت کام کے بندے ہو اس لیے مجھے چاہیے کہ تمہیں اپنی معاونت کے لیے روک لوں۔ اب تم بتاؤ کہ تم میرے لیے کیا کام کر سکتے ہو۔“

”جو بھی آپ کہیں... بشرطیکہ وہ ملکی مفاد میں ہو۔“ مشابرم خان نے نہایت اعتماد سے اسے جواب دیا۔

”ظاہر ہے ایسا ہی ہوگا۔ میں نے اپنے جسم پر یہ یونیفارم ملکی مفاد کی حفاظت کے لیے ہی پہنی ہے۔“ میجر اسفندیار نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ شاید اسے باہر کے ایک بندے کو اپنے ساتھ شامل کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن اس لیے مجبور تھا کہ حکم اوپر سے آیا تھا۔ پھر وہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ یہ صرف مشابرم خان تھا جس کی وجہ سے وہ دہشت گردی کے واقعے کے ایک اہم مجرم کو بغیر ہاتھ پیر ہلائے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اس سے بے حد اہم معلومات حاصل کر لی تھیں۔

”کل تمہاری مدد سے ہم نے احمد یار نامی جس آدمی کو گرفتار کیا تھا، اس سے ہمیں بہت اہم معلومات حاصل ہوئی

ہیں۔'' مشابرم خان کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہونے پر اس نے خود کو سنبھالا اور تفصیلات بتانا شروع کیں۔

''احمد یار سے معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمیں نہایت محنت اور نزاکت سے کام کرنا پڑا۔ اس شخص نے اپنے جوتے کی ایڑی میں زہر کا ایک کیپسول چھپا رکھا تھا۔ اگر ہم نے اسے اتنی تکنیک سے باندھ کر نہ ڈالا ہوتا تو وہ ہوش میں آتے ہی وہ کیپسول کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا۔ اسے یہی سبق دیا گیا ہے کہ جب تم یہ خطرہ دیکھو کہ تمہارے ذریعے کچھ قیمتی راز ظاہر ہونے والے ہیں تو اپنی زندگی کا خاتمہ کر لو اور ہمیشہ کی زندگی پا کر جنت میں چلے جاؤ۔ ہمارا طریقہ کار ہے کہ کسی مجرم کے اپنی تحویل میں آتے ہی لباس سمیت اسے اس کی ہر شے سے محروم کر دیتے ہیں اور وہ ہمارے مہیا کیے گئے لباس میں ہماری تفتیش کا سامنا کرتا ہے۔ اس طرح اگر مجرم نے کوئی نقصان دہ شے یا ڈیوائس وغیرہ چھپا رکھی ہو تو وہ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ احمد یار کے سامان کے تجزیے کے دوران ہمیں پتا چلا کہ اس کے دائیں جوتے کی ایڑی گھوم سکتی ہے اور ایڑی کے گھوم کر سامنے آجانے والے حصے میں ایک ایسا خلا موجود ہے جس میں زہریلا کیپسول رکھا گیا ہے۔ باقی اس کے پاس سے ایسی کوئی قابلِ ذکر شے نہیں نکلی۔ ایک ٹرانسمیٹر ہے جو پہلے ہی سامنے آگیا تھا۔'' میجر اسفند یار نے ذرا رک کر اپنے سامنے رکھے گلاس سے پانی کا ایک گھونٹ بھرا اور پھر دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ احمد یار سے تفتیش کے دوران ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا پڑا۔ ایسے لوگ خودکشی کا رجحان رکھنے کے باعث کچھ بھی اگلنے کے لیے بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ تفتیش کے لیے ہم اسے اس مقام پر لے گئے جہاں آدمی خود اپنے منہ سے موت کی تمنا کرتا ہے لیکن موت بھی اس کی مدد کے لیے نہیں آتی۔ بالآخر تنگ آکر اسے اپنی زبان کھولنی پڑی اور اس نے انکشاف کیا کہ وہ اور اس کے ساتھی یہاں کے ایک راہنما بشیر اکبر کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ بشیر وہی شخص ہے جو مارے جانے والوں کے نظریات کا سخت مخالف ہے اور اپنی باتوں سے اس نے اپنے ساتھیوں کے دلوں میں ان لوگوں کے لیے سخت نفرت بھر دی ہے۔ چند قریبی لوگوں کے دلوں میں یہ نفرت انتہا کو پہنچا دی گئی ہے اور یہ قریبی لوگ اس کے اشارے پر کسی بھی شخص کی جان لینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ احمد یار کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ بشیر اکبر نے ان کے ذہنوں کو بری طرح ماؤف کر دیا ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہو چکے ہیں اور کسی معمول کی طرح ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں جس کا حکم انہیں بشیر دیتا ہے۔ احمد یار کے خون کے نمونے کا تجزیہ کرنے پر یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ وہ نشے کا عادی ہے اور یقیناً اسے اس عادت میں اسی لیے مبتلا کیا گیا ہوگا کہ وہ بنا سوچے سمجھے بے دام غلام کی طرح احکامات کی پیروی کرتا رہے۔

''ان تمام باتوں کی روشنی میں ہمارے لیے بشیر کا کردار بہت مشکوک ہو چلا ہے اور ہمیں کوشش کرنی ہے کہ اس بندے کی حقیقت تک پہنچ سکیں۔ اس سلسلے میں بطورِ خاص تم سے اس لیے مدد چاہتا ہوں کہ میرے ماتحتوں میں بھی بشیر کے مداح بھی شامل ہیں جو اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈریں گے اس لیے ان حالات میں تم ہی سب سے کارآمد آدمی ثابت ہو سکتے ہو۔'' میجر اسفند یار جو تفصیلات بتا رہا تھا انہیں سن کر مشابرم خان کے ذہن میں پیر آباد کے... غلام علی اور اللہ آباد کے شاہنواز کی صورتیں ابھر رہی تھیں۔ وہ دونوں بھی تو مذہبی راہنما کے بہروپ میں دشمن کے ایجنٹ ثابت ہوئے تھے جو معصوم ذہنوں میں زہر گھول کر انہیں دہشت گرد بنانے میں مصروفِ عمل تھے۔

''میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ بتائیں کہ اس سلسلے میں آپ کے ذہن میں کیا پلان ہے؟'' اس نے ٹھوس لہجے میں نہایت عزم کے ساتھ میجر اسفند یار سے کہا تو وہ اس کے ساتھ اپنا پلان ڈسکس کرنے لگا۔

☆☆☆

''یہ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ اتنی خوب صورت کہ میں عادی نہ ہونے کے باوجود ہر روز نیند سے اٹھ کر مارننگ واک پر جانے کے لیے مجبور ہو جاتا ہوں اور جب واپس آتا ہوں تو لگتا ہے آنکھوں میں خوش رنگ منظر بھر کے ساتھ لے آیا ہوں۔ آنکھوں میں بسے ان مناظر اور ہر سو بکھری پرندوں کی چہچہاہٹوں کے ساتھ بیٹھ کر لکھنا کتنا خوش گوار تجربہ ہے، میں آپ کے سامنے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔'' مصطفیٰ خان کے گھر کی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر یہ جملے ادا کرنے والا شخص آفتاب تھا۔ آئرلینڈ وآمد کے بعد وہ فوری طور پر [illegible] کے ساتھ اپنے گھر منتقل ہو گیا تھا اور آج مصطفیٰ خان نے بطورِ خاص انہیں کھانے پر مدعو کیا تھا۔

اس دعوت میں اسلم اور [illegible] بھی شریک تھے۔ [illegible] اور [illegible] اس وقت کچن میں مصطفیٰ خان کی بیوی کی مدد کر رہی تھیں جبکہ اسلم اس محفل میں شامل تھا جس میں بیٹھ کر آفتاب آئرلینڈ کی شان میں رطب اللسان تھا۔ [illegible]





[illegible] کو بھی یہ شہر رہائش کے لیے پسند آیا تھا لیکن وہ آفتاب جتنا متاثر اس لیے نہیں تھا کہ اس نے اپنی زندگی کے بے شمار شب و روز جنگل کے قدرتی ماحول میں گزارے تھے۔ اس کی قوتِ شامہ اس مہک سے آشنا تھی جو صبح آنکھ کھلتے ہی مشامِ جاں کو معطر کر دیتی ہے اور وہ ان چہکتے پکھیروؤں کو بھی خوب جانتا تھا جن کی چہچہاہٹیں کسی محبوبِ دلنواز کی طرح بڑی مٹھاس سے انسان کو نیند سے جگا دیتی ہیں اور وہ ڈسٹرب کیے جانے کے باوجود بے مزہ نہیں ہوتا۔ آفتاب نے بھی اپنی زندگی کے کچھ سال اسی جنگل سے متصل پیر آباد میں گزارے تھے لیکن بدقسمتی سے پیر آباد اور آئرلینڈ کو سنبھالنے والے ہاتھ مختلف تھے اس لیے وہاں کا ماحول اور نقشہ بھی مختلف تھا اور آفتاب کا متاثر ہونا سمجھ آتا تھا لیکن اسلم بہرحال اس جتنا متاثر نہیں تھا۔

''آپ لکھنے لکھانے والے آدمی ہیں نا اس لیے آپ کے لیے یہ جگہ بہترین ثابت ہوئی ہے لیکن ایک انجینئر کی حیثیت سے آپ میری رائے لیں تو یہاں کام کرنا بہت مشکل ہے۔ قدم قدم پر آدمی کو جنگلی حیات کے تحفظ کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور اچھے بھلے چلتے کام کو صرف اس وجہ سے روک دینا پڑتا ہے کہ جس جگہ پر ہم کام کر رہے ہیں وہاں کسی نایاب نسل کے جانور کا مسکن تو موجود نہیں ہے۔ اس وقت بڑی شدید جھنجلاہٹ ہوتی ہے کہ اب کیا کریں اور دل میں خیال آتا ہے کہ کاش ہم پاکستان میں ہوتے جہاں اپنی من مانی کرتے ہوئے کسی کو بھی نیست و نابود کر دیتے اور کوئی بھی ہمیں پوچھنے والا نہ ہوتا کہ یہاں جو نادر انواع پائی جاتی تھیں، وہ معدوم ہو گئیں تو کیونکر۔'' مصطفیٰ خان کے لہجے میں جو طنز کی کاٹ سی تھی اسے آفتاب اور اسلم بخوبی محسوس کر سکتے تھے کہ وہ بھی ایسے حساس دلوں کے مالک تھے جو وطنِ عزیز میں ہر سو راج کرتی بدنظمی پر کڑھتے تھے اور کڑھتے چلے جاتے تھے۔

''آپ کی مشکل اپنی جگہ لیکن میں یہاں آکر بہت خوش ہوں۔ یہاں آنے کے بعد میرے کام میں اتنی روانی آگئی ہے کہ میں سوچ رہا ہوں کہ ایک ناول لکھنا بھی شروع کر دوں۔ اس ناول کا خاکہ بھی میرے ذہن میں ترتیب پا چکا ہے اور جلد ہی میں اسے شروع کرنے والا ہوں۔ حقیقتاً میں یہاں آکر بہت پچھتا رہا ہوں کہ پہلے ہی میں نے شہریار صاحب کا مشورہ قبول کیوں نہ کیا اور پاکستان سے سیدھا یہاں آنے کے بجائے نیویارک میں کس لیے آباد ہو گیا؟'' مصطفیٰ خان کی بات کے تسلسل کو جاری رکھنے کے بجائے آفتاب نے آئرلینڈ کی شان میں قصیدہ خوانی کو زیادہ مناسب سمجھا اور [illegible] اپنے پچھتاوے کا اظہار کرنے لگا۔

''شہریار کے مشوروں پر عمل نہ کرنے والے اکثر بعد میں اسی طرح پچھتاتے نظر آتے ہیں۔ ویسے اچھا ہوا کہ آپ نے پہلے نیویارک میں قیام کر کے دیکھ لیا تب ہی تو آپ آئرلینڈ کی صحیح قدر و قیمت کو سمجھ سکے ہیں۔'' مصطفیٰ خان نے بھی خوش گوار لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ ان کی تعداد تین ہونے کے باوجود صرف وہ دونوں ہی گفتگو میں حصہ لے رہے تھے اور اسلم محض خاموش سامع کا کردار نبھاتا ضرورت پڑنے پر اخلاقاً مسکرا دیتا تھا۔ اس کی زندگی کے اتنے بہت سے ماہ و سال جنگل میں بستے ان آزاد منش اور قدرے وحشی لوگوں کے ساتھ گزرے تھے جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں ایسی کسی محفل میں سرے سے شرکت ہی نہ کی تھی اور وہ ہر طرح کے ادب و آداب سے قطعی آزاد تھے... تو ان بگڑے ہوئے لوگوں میں رہتے ہوئے وہ بھی ذرا بگڑ گیا تھا، اگرچہ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ خود کو وہاں بھی منفرد رکھ سکے لیکن آدمی کے لیے کسی ماحول میں رہتے ہوئے اس سے مکمل فرار ممکن نہیں ہوتا۔ وہ ماحول کسی نہ کسی کمزور مقام سے نقب لگا کر اس کے اندر اتر ہی جاتا ہے، سو اسلم بھی اس ماحول کو چھوڑ دینے کے باوجود مہذب دنیا میں رہتے ہوئے کبھی کبھار خود کو اس دنیا کے لیے اجنبی محسوس کرنے لگتا تھا اور یہ اجنبیت اس کے لبوں پر چپ کا تالا ڈالتی رہتی تھی جیسا کہ آج وہ اس محفل میں محض خاموش سامع تھا۔

''آپ صحیح کہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شہریار صاحب کے مشوروں پر عمل نہ کرنے والے ضرور پچھتاتے ہوں گے کیونکہ ان کے مشورے میں پورا پورا خلوص شامل ہوتا تھا۔ ان جیسا مقام و مرتبہ رکھنے والوں میں ایسے مخلص لوگ مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ مجھے تو جب ان کا خیال آتا ہے یہی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور زندگی دے۔''

''آمین، مجھے یقین ہے کہ وہ بہت لمبی زندگی پائے گا کیونکہ دنیا کو اس جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔'' آفتاب کو آنکھ سے خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے مصطفیٰ خان نے اس کا جملہ مکمل بھی نہ ہونے دیا اور خود بولنا شروع کر دیا۔

''شہریار شروع سے بڑی حساس اور مہم جو طبیعت کا مالک ہے۔ دورانِ تعلیم ہم لوگ اکثر ہی چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں کسی ایڈونچر کے لیے نکل جاتے تھے۔ ایک بار ہم میں سے کچھ لڑکے شرارت میں آکر پرندوں کا شکار کرنے کی کوشش کرنے لگے تو شہریار بڑا سخت ناراض ہوا کہ گاڑی میں انواع و اقسام کے پیک کھانے موجود ہونے کے باوجود وہ

لوگ کیوں ان معصوم پرندوں کو زندگی کا لقمہ گانے سے روک دینا چاہتے ہیں جو اگر پکنے کے بعد پلیٹوں تک پہنچیں تو شاید کسی ایک شخص کا پیٹ بھرنے کے لیے بھی کافی نہ ہوں لیکن زندہ رہ کر اپنے گیت الاپتے رہیں تو بہت سے لوگوں کو زندگی کی تازگی اور سرخوشی کا احساس دلاتے رہیں۔ اس بات پر ان لڑکوں نے شہریار کا بہت مذاق اڑایا تھا کہ اس مستقبل کے بیوروکریٹ کے اندر تو کسی شاعر کی روح حلول کر گئی ہے اور جا کر اس کے ماموں کو اطلاع دینی چاہیے کہ آپ کا ہونہار بھانجا ہرگز وہ بننے کے لائق نہیں رہا جو آپ اسے بنانا چاہتے ہیں۔ شہریار نے ان کے مذاق اڑانے کی بالکل پروا نہیں کی اور اس بات پر اڑا رہا کہ ان پرندوں کو شکار نہیں کیا جائے گا۔ ممکن تھا کہ نوبت مار کٹائی تک جا پہنچتی کیونکہ وہ لڑکے مسلسل اسے زچ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ہم باقی ساتھیوں نے مل کر معاملہ رفع دفع کروا دیا۔ اب اتفاق دیکھو کہ ہم آگے چلے تو ان شریر لڑکوں میں سے پھر کسی کے اندر شکار کی خواہش مچلی اور اس نے زبان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرنے کے بجائے خاموشی سے اپنی ایئرگن نکالی اور ایک درخت پر بیٹھے پرندوں پر استعمال بھی کر ڈالی۔ بدقسمتی سے وہ کسی پرندے کو تو شکار نہ کر پایا لیکن ایک کوّے کا گھونسلا نشانے پر آ گیا اور پھر مت پوچھو کہ کوّوں نے اس لڑکے کا کیا حال کیا۔ وہ جہاں جہاں جاتا تھا، کوّے اس کے پیچھے چلے آتے تھے اور اس کے سر پر ٹھونگیں برساتے تھے۔ بڑا برا حال ہو گیا تھا اس بے چارے کا۔ تنگ آ کر اس نے ٹرپ ہی ادھورا چھوڑ دیا اور واپس گھر چلا گیا۔ بعد میں گروپ کے سارے لڑکے شہریار کو چھیڑتے رہے کہ اس بے چارے کو تمہاری بددعا لگی ہے۔ بس وہ ایسے ہی دن تھے۔ نوجوانی کی بے فکری میں ہم موج میلا کرتے پھرتے تھے اور اب اپنی اپنی ذمے داریوں میں گھرے لمبے عرصے تک ایک دوسرے سے فون پر رابطہ کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔'' مصطفیٰ خان بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

آفتاب حیران تھا کہ وہ شہریار کی حالت سے جان بوجھ کر تغافل کیوں برت رہا ہے اور کیوں نہیں چاہتا کہ اس محفل میں اس حوالے سے کوئی گفتگو ہو کہ شہریار پاکستان کے ایک اسپتال میں نیم مردہ حالت میں پڑا ہوا ہے اور اسے ان سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ صحافی ہونے کی حیثیت سے وہ پاکستان سے اتنی دور ہونے کے باوجود بھی وہاں کے حالات سے واقف رہتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ شہریار ایک قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہونے کے بعد کومے کی حالت میں پڑا ہوا ہے اور ڈاکٹر حتمی طور پر کچھ نہیں کہتے کہ وہ کبھی ہوش میں آئے گا یا آ بھی سکے گا یا نہیں؟ بہرحال یہ تو طے تھا کہ مصطفیٰ خان ناواقف نہیں تھا، اس نے صاف محسوس کیا تھا کہ مصطفیٰ خان نے خود گفتگو کا رخ بدل دیا تھا اور پھر اسے ایک خفیف سا اشارہ بھی تو کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے اس موضوع کو چھیڑنے سے روک رہا ہو۔ اس اشارے کو سمجھ کر وہ چپ تو ہو گیا تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ اس اشارۂ زباں بندی کے پیچھے کوئی تو راز ہے جسے شہریار کا بچپن کا دوست مصطفیٰ خان جانتا ہوگا۔ مصطفیٰ خان بھی خوب ہی آدمی تھا۔ جدی پشتی رئیس خاندان سے تعلق رکھنے والے اس شخص نے صرف دوستی نبھانے کی خاطر اپنے سے بہت ہی کم حیثیت لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک قابل انجینئر کی حیثیت سے یہاں کی ایک نامور تعمیراتی کمپنی میں ملازمت کرنے کے علاوہ سٹی سینٹر میں ایک عدد اسٹور کا مالک بھی ہے جس کی آمدنی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ اس آمدنی میں سے اسٹور پر کام کرنے والے درجن بھر ملازمین کو اتنی معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں کہ ان کے اپنے گھر بخوبی چلتے تھے۔ ماہ بانو اور اسلم بھی ان ملازمین میں شامل تھے جنہیں مصطفیٰ خان کے گھر میں قریبی دوستوں اور عزیزوں کی سی حیثیت حاصل تھی اور یہ سب اس لیے تھا کہ وہ شہریار کے بھجوائے ہوئے مہمان تھے اور شہریار جیسے باکمال آدمی کا دوست بھی باکمال تھا کہ دوستی کی خاطر پھر کسی فرق کو خاطر میں ہی نہ لاتا تھا۔

کھانا بہت خوش گوار ماحول میں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد ایک دور کافی کا بھی چلا پھر محفل برخاست کر دی گئی۔ مصطفیٰ خان نے اصرار کر کے آفتاب اور کشور کو ان کے گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی۔ آئرلینڈ میں ایک آرام دہ گھر کرائے پر لے لینے کے بعد آفتاب کے مالی حالات ایسے نہیں رہے تھے کہ وہ گاڑی خریدنا بھی افورڈ کر سکے بس یہ وہ لوگ اس سہولت سے محروم تھے۔ مصطفیٰ خان کو تکلیف نہ دینے کا خیال دل میں ہونے کے باوجود اس کے اصرار کے باعث آفتاب کو اس کی لفٹ کی پیشکش قبول کرنی پڑی۔

''آپ حیران ہوئے ہوں گے کہ میں نے آپ کو ڈائننگ ٹیبل پر شہریار سے متعلق بات مکمل کیوں نہیں کرنے دی؟'' گاڑی آگے بڑھاتے ہی مصطفیٰ خان نے [illegible] سے ذکر چھیڑ دیا۔

''بالکل حیرانی تو ہوئی تھی لیکن خاموش اس لیے رہا کہ شاید اس کے پیچھے کیا مصلحت ہو۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''اصل میں یہ خود شہریار کی خواہش تھی۔ مسلسل دشمنوں میں گھرے رہنے کی وجہ سے شاید اسے اندازہ تھا کہ کسی روز وہ ان کا نشانہ بن سکتا ہے اس لیے اس نے جب میرے پاس ماہ نو عرف مہرین اور اسلم کو بھجوایا تو مجھ سے یہ درخواست بھی کی کہ مجھے کچھ ہونے کی صورت میں ان دونوں میاں بیوی کو کوئی خبر نہ ہونے دینا۔ اس خواہش کے پیچھے کیا وجہ تھی، یہ میں نے جاننے کی کوشش نہیں کی لیکن اس کی خواہش کا خیال ضرور رکھا اسی لیے وہ دونوں میاں بیوی نہیں جانتے کہ ان کے پیچھے پاکستان میں شہریار پر کیا گزر چکی ہے۔ آپ سے بھی میری یہی درخواست ہے کہ آئندہ آپ دونوں بھی اس سلسلے میں محتاط رہیے گا۔'' اپنی مختصر سی وضاحت میں اس نے آفتاب کی الجھن تو دور کر دی لیکن اس بات سے بے خبر رہا کہ ایک الجھن نے اسلم کے ذہن میں بھی جگہ بنالی ہے جو بے شک ان کی محفل میں خاموش سامع کا کردار نبھا رہا تھا لیکن مصطفیٰ خان کا یک دم موضوع بدل دینا اور آنکھ سے اشارہ کرنا اس نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

☆☆☆

''آج میں تمہیں ایک بڑی حیرت انگیز جگہ لے جاؤں گی۔'' شیخ زید روڈ پر دوڑتی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان طرح دار حسینہ نے جو خود کو لائلہ کہلاتی تھی اور شاید حقیقت میں لیلیٰ تھی، اپنی سنہری زلفوں کو ایک ادا سے جھٹکتے ہوئے ارادہ ظاہر کیا تو اس کے پہلو میں براجمان چودھری افتخار جو پہلے ہی اس پر ریشہ خطمی تھا، اس ادا پر مزید نثار ہونے کو دوڑا۔ نثار ہونے کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے اس نے اپنے ہاتھوں کا بے باکانہ استعمال شروع کر دیا۔

''نائی مین۔ میں گاڑی چلا رہی ہوں۔ کوئی حادثہ ہو گیا تو ہم دونوں سیدھے اوپر جائیں گے۔'' چودھری کی جسارت پر برا مانے بغیر لائلہ نے اسے بڑے پیار سے ہنستے ہوئے بالکل ایسے تنبیہ کی جیسے کوئی بے پروا مزاج کی ماں اپنے لاڈلے سپوت کو محض دنیا دکھاوے کے لیے تنبیہ کرے اور دراصل اسے ذرا پروا نہ ہو کہ اس کا بچہ اپنی شرارتوں کے باعث کون سی تباہیاں مچاتا پھر رہا ہے۔ لائلہ نے چودھری کو یہ چھوٹ دی تھی تو اس لیے کہ وہ اس کال گرل کو بے حد و حساب نواز رہا تھا۔

اپنے دبئی کے قیام کو رنگین بنانے کے لیے اس نے یہ بندوبست کیا تھا اور بہت خوش تھا کہ لمبے قد، سانولی رنگت اور تیکھے نقوش والی یہ حسینہ اس پر دل و جان سے فدا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ سر سے پیر تک مصنوعی رنگوں میں رنگی اس حسینہ کا یوں فدا ہونا بھی مصنوعی ہے اور وہ اس طرح ہر اس شخص پر فدا ہو جاتی ہے جو اسے اس کی ڈیمانڈ کے مطابق نوازنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ بہرحال اس حسینہ میں کوئی ایسا جادو ضرور تھا کہ چودھری نے پچھلے تین دن سے اسے ہی اپنا رفیق بنا رکھا تھا۔ اس میں لڑکی کے حسن سے زیادہ ذہانت کا بھی دخل تھا اور صرف خلوت میں ہی نہیں، جلوت میں بھی چودھری کو خوش کرتی تھی۔ اس کے ساتھ دبئی میں گھومنے میں اسے خوب لطف آ رہا تھا اور وہ حسب عادت لڑکی اور شراب کی بوتل کے ساتھ کمرے تک محدود رہنے کو ہی ترجیح نہیں دے رہا تھا۔ اپنی ذہانت کے اس کمال کی وجہ سے لائلہ نے ایک طرف تو خود کو حد سے زیادہ ''استعمال'' ہونے سے بچا رکھا تھا تو دوسری طرف وہ جی بھر کر چودھری کی جیبیں خالی کروا رہی تھی۔ کل وہ اسے اسی طرح ''آج میں آپ کو ایک حیرت انگیز جگہ لے جاؤں گی'' کہہ کر سونے کے بازار میں لے گئی تھی اور یہ بازار ایسا تھا کہ اس میں ہر طرف سونا بکھرا پڑا تھا۔ بے شمار جگمگاتی دکانیں تھیں جن کے اندر ہر طرح کے زیورات بھرے پڑے تھے۔ بھاری بھرکم زیورات، جنہیں تیل کی دولت سے مالا مال شیخ بخوشی اپنی بیگمات کی نذر کرتے تھے، دیکھنے والے کو متاثر کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔

چودھری صاحب کی فریفتگی کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے لائلہ نے بھاری بھرکم زیورات کا ایک سیٹ معاوضے کے علاوہ بطور بونس حاصل کر لیا۔ اس قسم کے دوسرے کئی بونس وہ گزشتہ تین دنوں میں حاصل کر چکی تھی کہ دبئی میں گھومنے پھرنے کے لیے بھی عموماً شاپنگ مالز کا ہی رخ کرنے کا رواج تھا اور اگر کسی شاپنگ مال میں گھومتے ہوئے چودھری صاحب کی منظور نظر کو کوئی قیمتی سوٹ، پرس، جیولری یا شو پسند آ جاتا تھا تو یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ محض قیمت کی گرانی کی وجہ سے چودھری صاحب کے ساتھ ہونے کے باوجود اپنی من پسند چیز سے محروم ہو جاتی چنانچہ خوب شاپنگ ہو رہی تھی جس سے چودھری کے خزانے میں کمی ہونے کا سوال اس لیے پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ اس خزانے کو اپنے کمزور مزارعوں کی خون پسینے کی محنت سے بھرنے کا ہنر خوب جانتا تھا۔ اب تو اس خزانے میں ہیروئن کی آمدنی سے ہونے والا اضافہ بھی شامل ہو گیا تھا چنانچہ چودھری تفریح کے نام پر خوب دولت اڑا رہا تھا۔ اب بھی لائلہ نے اسے ایک حیرت انگیز جگہ لے چلنے کا ذکر کیا تو وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً راضی ہو گیا کہ

اسے اس حسینہ پر لٹائے جانے والے درھموں پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

لائلہ نے گاڑی "امارات" نامی مال کی وسیع پارکنگ میں پارک کی اور پھر وہ دونوں جگمگاتی روشنیوں میں گاڑی سے نکل کر یوں ساتھ چلے کہ اپنے شانے سے لگی لائلہ کے گرد چودھری نے ایک ہاتھ کا حلقہ اس طرح سے بنا رکھا تھا کہ اس کی انگلیاں لائلہ کی جینز اور ٹاپ کے درمیان موجود ایک خاصی بڑی خالی جگہ پر اس کی ناف پر تھرک رہی تھیں۔ لائلہ کو اس جسارت پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ وہ یہی سب برداشت کرنے کی تو فیس لیتی تھی چنانچہ مگن سی اسے مختصر راستوں اور خودکار زینوں سے گزار کر ایک ایسی جگہ لے گئی جس نے چودھری کو سچ مچ مبہوت کر دیا۔ یہاں اس نے شیشے کی دیوار کے پار ایسا نظارہ دیکھا کہ لمحہ بھر کے لیے کنفیوز ہو گیا کہ دبئی میں ہے یا واپس نیویارک پہنچ گیا ہے اور مراد شاہ کے اپارٹمنٹ کی فرنچ ونڈو میں کھڑا باہر کا نظارہ کر رہا ہے۔

"یہ اسکی دبئی ہے۔" اس کی کیفیت دیکھ کر لائلہ نے فخر سے بتایا۔

"کمال ہے بھئی، مجھے تو ایسا لگا کہ میں دبئی کے بجائے نیویارک میں ہوں۔ ایسی برف باری کا دبئی میں کہاں تصور کیا جا سکتا ہے؟" چودھری متاثر تھا۔ حقیقتاً ساڑھے بائیس ہزار میٹر پر مشتمل یہ برفانی علاقہ تھا ہی متاثر کن کہ گرم لو اڑاتے صحرا میں اس کا تصور ہی ذہن میں نہیں آ سکتا تھا لیکن عربوں نے یہ کمال کر دکھایا تھا۔ بلندی سے گرتی برف، پھسلواں راستوں پر اسکیٹنگ بورڈ پر گرم لباسوں میں پھسلتے لوگ، پتوں پر برف کے ذرات لیے کھڑے پائن کے درخت، برف پر پھسلنے والی گاڑیاں اور ایک دوسرے پر برف اڑاتے سرخوشی سے کھیلتے بچوں کو دیکھ کر بھلا کون یہ گمان کر سکتا تھا کہ یہ سب نقلی ہے۔ لیکن یہ تھا بہرحال نقل ہی جسے عربوں نے اپنی دولت کے بل بوتے پر نقل بمطابق اصل حسب خواہش بنا کر دکھا ڈالا تھا۔

"جس کے پاس دھن دولت ہو وہ ہر شے کا تصور کر سکتا ہے ورنہ تو اسکی دبئی کی تعمیر تو کیا لائلہ جیسی عورت کی قربت بھی خواب بن جاتی ہے۔" لائلہ نے ہنستے ہوئے چودھری کی بات کا جواب دیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ "آئیں چلیں، ذرا چل کر اس موسم کا لطف اٹھاتے ہیں۔"

اور اگرچہ چودھری کے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا کہ زندگی میں اپنے وطن کے شمالی علاقہ جات کے علاوہ بہت سے سرد ممالک کا بغرض تفریح سفر کیا تھا، پھر بھی وہ لائلہ کو خوش کرنے کے لیے اس کے ساتھ کھنچا چلا گیا۔ کنٹوں اور گرم لباس کے حصول کے بعد وہ دونوں اس علاقے میں داخل ہوئے تو یکدم ٹھنڈک کا احساس ہوا کیونکہ اس جگہ پر درجہ حرارت منفی ایک یا دو ہوتا تھا اور گرم علاقوں میں رہنے والوں کے، چاہے وہ چوبیس گھنٹے ہی اے سی میں رہتے ہوں، مزاج پوچھنے کے لیے کافی تھا۔ اندر گھستے ہی لائلہ تو ہوا ہو گئی اور پیروں سے اسکیٹنگ بورڈ باندھے برف پر پھسلنے کا لطف اٹھانے لگی البتہ چودھری کے لیے یہ تجربہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگر شوق ہی شوق میں پھسل جاتا تو نہ تسلیم کیے جانے والے بڑھاپے کی ہڈیاں جو اگرچہ بہت سنبھال کر رکھی گئی تھیں پھر بھی تھیں تو بوڑھی ہی، ٹوٹ پھوٹ جانے کے بعد مرمت میں خاصی مدت لیتیں اور اس عرصے کے لیے وہ زندگی سے لطف اندوز ہونے سے محروم ہو جاتا اس لیے بہتر سمجھا کہ ایسے کسی خطرناک تجربے سے دور ہی رہے۔ لیکن جب یہاں تک آ گیا تھا تو کچھ تو کرنا ہی تھا اس لیے برف پر پھسلنے والی گاڑی کا رخ کیا۔ اس گاڑی کو انسان دوڑاتے تھے چنانچہ اس میں بیٹھ کر اس کی انا کو خاصی تقویت ملی لیکن پھر وہ جلد ہی اس کھیل سے بھی اکتا گیا ورا اسکیٹنگ کا لطف اٹھاتی لائلہ کو اشارے سے باہر نکلنے کا کہا۔ وہ فوراً آ گئی۔

"مزہ آ گیا۔ بہت دنوں بعد یہاں آئی ہوں۔ اگر آپ نہ بلاتے تو میں اپنا گھنٹا پورا کیے بغیر باہر نکلنے والی نہیں تھی۔" مال سے باہر نکلتے ہوئے اس نے بچوں کی سی خوشی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

"ایسا کروں گا کہ جب بھی میرا دبئی دوبارہ آنا ہو گا تو تمہیں یہاں سے اپنے ساتھ نیویارک لے چلوں گا، تم وہاں برف باری کے سیزن میں چلنا اور خوب انجوائے کرنا۔" یہ سوچے بغیر کے اب شاید خود اس کا نیویارک میں داخلہ بھی مشکل ہو، اس نے لائلہ سے وعدہ کیا۔ ویسے بھی ضروری نہیں ہوتا کہ ایک کال گرل سے کیے ہر وعدے کو نبھایا جائے۔ ایسے وعدے صرف اسے خوش کرنے کے لیے ہوتے ہیں تاکہ وہ آپ کو زیادہ سے زیادہ خوش کر سکے۔

ان کا اگلا پروگرام دبئی کی ہوائی سیر کا تھا۔ اس کی فرمائش بھی لائلہ نے ہی کی تھی اور چودھری کو اس پر [illegible] نہیں تھا کہ خود اس نے بھی کبھی دبئی کو اس انداز سے نہیں دیکھا تھا۔ دبئی کو ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر دیکھنا اس کے لیے ایک خوش گوار تجربہ ثابت ہوا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس سفر میں اسے لائلہ کی قربت میسر تھی۔ بلند و بالا عمارتوں سے بھرے دبئی کی فضا کی سیر کرتا ہوا وہ نظروں سے عمارتوں کی بلندی ناپ رہا تھا، لائلہ کے جسمانی نشیب و فراز میں زیادہ الجھا ہوا تھا۔

"یہ برج دبئی ہوٹل ہے۔ اسے برج العرب بھی کہتے ہیں۔" ہیلی کاپٹر سمندر کے کنارے کی طرف پہنچ کر نیچی پرواز کرنے لگا تو لائلہ نے ایک کھلے ہوئے بادبانوں والی کشتی جیسی عمارت کی طرف چودھری کی توجہ مبذول کروائی۔ "یہ ہوٹل ہمارے دبئی کی پہچان ہے۔ یہاں دنیا کی ہر سہولت میسر ہے۔ باغ، ریسٹورنٹ، کلب سمیت یہاں ہر وہ شے موجود ہے جس کے بارے میں کوئی انسان سوچ سکتا ہے۔ لیکن یہاں ایک کمرے کا کرایہ اتنا زیادہ ہے کہ عام آدمی یہاں قیام کا تصور نہیں کر سکتا۔" لائلہ برج العرب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔

"تو ٹھیک ہے، میں کل ہی اس ہوٹل میں شفٹ ہو جاتا ہوں پھر جب تک میں یہاں ہوں، تم میرے ساتھ وہیں رہنا۔" چودھری کو ایسا لگا کہ اس کے برج العرب کو چھوڑ کر کسی اور ہوٹل میں مقیم ہونے کی وجہ سے لائلہ اسے عام آدمی قرار دے رہی ہے اس لیے فوراً ہی اعلان کر دیا کہ وہ خود وہاں شفٹ ہو جاتا ہے۔ اس خبر کو سن کر لائلہ بے حد خوش ہوئی۔

"او سو سویٹ ڈارلنگ! تم نے تو میری دلی خواہش پوری کر دی۔" اس نے پائلٹ کی پروا کیے بغیر چودھری کے چٹاچٹ کئی بوسے لے ڈالے۔ اس تفریحی پرواز سے فارغ ہو کر وہ کھانے کے لیے جمیرہ ہوٹل پہنچے تب بھی چودھری پر ان بوسوں کا سحر طاری تھا۔ یہ سحر اس وقت ٹوٹا جب اس کے خاص موبائل نے جیب میں پڑے پڑے وائبریشن کی۔ یہ موبائل اسے الفا کی طرف سے بھجوایا گیا تھا اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس سے کی جانے والی کال ٹریس نہیں ہوتی تھی۔ اگر کوئی ٹریس کرنے کی کوشش کرے تو کال ہی ڈس کنیکٹ ہو جاتی تھی۔ پہلے پہل جب دنیا کا یہ منفرد ترین موبائل اس کی ملکیت میں آیا تھا تو اسے بڑا احساس تفاخر ہوا تھا لیکن اب بوجھ لگنے لگا تھا کیونکہ دوسری طرف سے اس سے رابطہ کرنے والے عموماً احکامات ہی صادر کرتے تھے، اور ان کا حکم ماننا آج بھی اسے بڑا دشوار لگتا تھا۔ اب بھی موبائل نے وائبریٹ کیا تو اس کا دل چاہا کہ کال ریسیو نہ کرے اور لائلہ کی قربت سے لطف اندوز ہوتا رہے لیکن اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے قبل ہی اسے یاد آ گیا کہ الفا نیویارک میں کشور اور آفتاب کے اپارٹمنٹ پر کروائے گئے ناکام حملے کے بعد پہلے ہی اس سے ناراض ہے اور کال ریسیو نہ کرنے کی صورت میں اس کی ناراضگی مزید بڑھ سکتی ہے، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی کال ریسیو کر ہی لی۔

سینگ والا ہمیشہ فاتح ہوتا ہے

"امید ہے کہ اب تک تمہارا تفریحی ٹور مکمل ہو گیا ہو گا اس لیے مہربانی کر کے پاکستان واپس چلے جاؤ تاکہ وہاں تمہیں تمہارے حصے کی ڈیوٹی سونپی جا سکے۔" الفا نے ایسے لہجے میں اس سے یہ جملے کہے جیسے وہ فون پر اس کی تصویر دیکھ رہا ہو اور جانتا ہو کہ وہ ایک ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کسی طرح دار حسینہ کی معیت میں زندگی کا لطف اٹھا رہا ہے۔

"میں پہنچ جاؤں گا۔ آپ بتائیں کہ آپ مجھے وہاں کب دیکھنا چاہتے ہیں؟" اس نے مینو کارڈ کا جائزہ لیتی لائلہ کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"کل... پہلی دستیاب فلائٹ سے۔" الفا نے حکم جاری کر کے فوراً ہی سلسلہ منقطع کر دیا تو اس نے بے بسی سے جھنجلاتے ہوئے موبائل واپس جیب میں ڈال لیا۔

"خیریت ڈارلنگ! کس کا فون تھا؟ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟" اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگاتے ہوئے لائلہ نے اس سے پوچھا۔

"پاکستان سے میرے پی اے کی کال تھی۔ کل ایک اہم بزنس پارٹی میٹنگ کے لیے وہاں پہنچ رہی ہے اس لیے کل میرا وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔" اس نے ترسے ہوئے چہرے کے ساتھ بتایا کہ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو اس نے

لانگ سے کل رات برج العرب میں شفٹ ہونے کا وعدہ کیا تھا اور اب فوراً ہی اسے یہاں سے روانگی کا حکم نامہ مل گیا تھا۔

"اوہ... یہ تو سارا پروگرام ہی خراب ہو گیا۔ کیا تم اس میٹنگ کو دو چار دن کے لیے ٹال نہیں سکتے یا پھر کسی اور اعتماد کے بندے سے کہو کہ وہ یہ میٹنگ نمٹا لے۔" وہ بڑی ادا سے ٹھنکی۔

"سوری ڈارلنگ! پارٹی بہت بڑی ہے اور میٹنگ بھی بہت اہم اس لیے ہمیں ہی اپنے پروگرام میں تبدیلی کرنی ہو گی۔ لیکن تم اداس نہ ہو، میں بہت جلد دوبارہ یہاں کا چکر لگاؤں گا اور آنے سے پہلے ہی برج العرب میں ڈبل بیڈ روم بک کروالوں گا۔ پھر ہم دونوں بہت سارے دن وہاں ساتھ رہیں گے۔" چودھری اس کی ادا سے متاثر تو ضرور ہوا تھا لیکن زیر اس لیے نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ جو زبردست تھا، اس کی جان کو آجاتا چنانچہ فی الحال اس کے حکم کی تعمیل میں ہی بھلائی تھی۔

☆☆☆

مشابرم خان بُری طرح لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے جسم پر بہت سے زخم تھے جن سے نکلتے خون نے اس کے لباس کو رنگ ڈالا تھا۔ جسم پر موجود یہ زخم اسے کسی لڑائی یا حادثے کے نتیجے میں نہیں لگے تھے بلکہ اس نے خود اپنے آپ کو لگائے تھے۔ صرف اور صرف اس لیے کہ بشیر تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس نے اور میجر اسفند یار نے بہت غور کیا تھا کہ اس شخص پر کس طرح ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے لیکن کوئی بھی طریقہ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اتنی مضبوط حیثیت کا مالک تھا کہ اگر فوج اس کے خلاف براہ راست ایکشن لینا چاہتی تو پورے علاقے میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور اس کے ہزاروں پیروکار بپھر کر فوج کے خلاف ہی اٹھ کھڑے ہوتے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ صرف احمد یار کے بیان کی بنیاد پر اسے گرفتار کرنے کے بارے میں سوچا جا سکے۔ خفیہ طور پر اغوا کرنا بھی اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ جہاں رہتا تھا، وہاں ہر وقت مسلح افراد پہرا دیتے تھے اور ان مسلح افراد سے بھڑے بغیر اس تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ اپنی قیام گاہ سے وہ بہت کم باہر نکلتا تھا اور جب بھی نکلتا تھا، اس کے ساتھ اس کے ذاتی محافظوں کی فوج موجود ہوتی تھی۔ ان مسلح محافظوں کے نرغے میں گھس کر اس تک پہنچنے کے لیے بھی فوج ہی کی ضرورت پڑتی پھر اس کے بعد بھی نتائج بدترین ہی نکلتے تھے کہ سب سے بڑا مسئلہ اس کے حواریوں کا تھا۔ بشیر کو کچھ ہوتا تو وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر سڑکوں پر نکل آتے اور انہیں سنبھالنا انتظامیہ کے بس سے مشکل ہو جاتا۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے تو یہی غور کرنا شروع کیا کہ بغیر کسی ہنگامے کے اس تک کس طرح پہنچا جائے۔

آخر کار مشابرم خان کو ہی ترکیب سوجھی۔ میجر اسفند یار اس ترکیب پر عمل کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ اپنے کسی آدمی کو اس طرح سے زک پہنچانا کہ وہ شدید زخمی نظر آئے، بڑی عجیب سی بات تھی۔ پھر اسے یہ بھی فکر تھی کہ اپنے پروگرام کے مطابق اگر مشابرم خان بشیر کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو اکیلا کیا کر سکے گا لیکن مشابرم خان نے اسے راضی کر لیا۔ میجر اسفند یار کو بھی آخر کار ہتھیار ڈالنے پڑے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

بڑی احتیاط کے ساتھ مشابرم خان کو زخمی کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ یہ زخم اس نوعیت کے تھے کہ بظاہر دیکھنے میں تو وہ خاصا زخمی نظر آئے لیکن اسے ایسا کوئی خطرناک زخم نہیں لگایا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ پھوٹ جائے یا بہت زیادہ خون بہنے کی وجہ سے وہ نقاہت محسوس کرنے لگے۔ احتیاطاً اسے پہلے سے طاقتور ادویات کے ساتھ ساتھ خون کے بہاؤ کو روکنے والی ادویات بھی استعمال کروا دی گئی تھیں اور جو یہ اس کا لیر لیر پیراہن خون میں تر بتر نظر آتا تھا، اس میں اس کا اپنا خون بہت کم موجود تھا اور بیشتر رنگینی اس بے چارے بکرے کے خون کی تھی جسے آج کھانے کے لیے ذبح کیا گیا تھا۔

حسب پروگرام لڑکھڑا کر چلتا مشابرم خان جب پتھروں سے بنی اس عمارت کے دروازے پر پہنچا جس کے ایک حصے میں بشیر کی رہائش گاہ تھی، باقی حصہ اور محافل وغیرہ کے لیے مخصوص تھا، تو وہ جان بوجھ کر گر گیا۔ اسے گرتے دیکھ کر دروازے پر موجود محافظوں میں سے ایک لپک [illegible] کے قریب آیا۔ مشابرم خان نے ایسے دم سادھ لیا جیسے وہ بے ہوش ہو۔ محافظ نے قریب آ کر اس کا جائزہ لیا اور پھر وہیں سے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی۔

"یہ تو بڑا زخمی ہے۔ لگتا ہے کسی نے اس پر بڑا ظلم کیا ہے۔" جواب میں ایک اور محافظ دوڑ کر اس کے قریب پہنچا۔

"واقعی اس بے چارے کی تو بہت بُری حالت ہے [illegible] ایسا کرتے ہیں اسے اندر پہنچا دیتے ہیں۔ اندر ڈاکٹر [illegible] ہی... اس کی مرہم پٹی کر دے گا۔ بعد میں یہ ہوش میں [illegible] خود ہی بتا دے گا کہ اس کی یہ درگت کس نے بنائی ہے۔"



دوسرے محافظ نے بھی قریب آنے پر اس کی حالت دیکھی تو ہمدردی سے بولا پھر فوراً ہی وہاں ایسی ہلچل مچ گئی جو کسی شدید زخمی کو اسپتال منتقل کرنے کے وقت مچتی ہے۔ مشابرم خان نے اپنی آنکھیں پوری طرح بند کر رکھی تھیں اور صرف کانوں سے اردگرد کی صورت حال کا اندازہ لگا رہا تھا۔ کسی کے کہنے پر اندر سے اسٹریچر منگوایا گیا اور دو تین آدمیوں نے اسے اس اسٹریچر پر منتقل کیا۔ پھر اسٹریچر... حرکت میں آیا، اندر کی طرف جانے لگا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ کم از کم وہ اپنے منصوبے کے پہلے حصے میں تو کامیاب ہو گیا تھا اور اندر تک رسائی حاصل کر لی تھی ورنہ یہی مرحلہ سب سے مشکل تھا۔

وہ ایک دو بار بہانے سے یہاں آ کر امکانات کا جائزہ لے چکا تھا۔ عبادت کے اوقات میں وہاں موجود محافظ زیادہ محتاط رہتے تھے اور کسی بھی شخص کو بلا ضرورت وہاں رکنے کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ ایسے میں وہ بشیر کی رہائش گاہ تک رسائی کیسے حاصل کرتا البتہ اس نے بشیر کو دیکھا ضرور تھا۔ [illegible] داڑھی والے اس شخص کی رنگت گوری تھی۔ قد کاٹھ اچھا تھا لیکن آنکھوں میں جو سانپ جیسی چمک تھی، وہ مقابل کو زیادہ دیر اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں ہونے دیتی تھی۔ اس نے کچھ دیر بشیر کے پیچھے وہاں عبادت کی اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک خوش الحان شخص تھا۔ لیکن پھر بھی جانے کیوں وہ شخص اس کے دل کو بھایا نہیں تھا اور نہ ہی دل میں احترام کے وہ جذبات ابھرے تھے جو کسی نیک نام اور پرہیزگار شخص کو دیکھ کر ابھرتے ہیں۔ مشابرم خان تو ایسا شخص تھا کہ کسی بھی قسم کے فرق کو خاطر میں لائے بغیر ہر عالمِ دین کا احترام کرتا تھا کیونکہ اس کا نظریہ تھا کہ معمولی اختلافات کے ساتھ ان میں سے ہر شخص دین کی خدمت کر رہا ہے اور اگر اس نے اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر رکھی ہے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

اس کے اسٹریچر کو احاطے میں ہی عبادت گاہ سے ہٹ کر بنائی گئی ایک نسبتاً چھوٹی عمارت میں لے جایا گیا۔ آنکھ کی جھری سے گردوپیش کا جائزہ لیتے مشابرم خان نے وہاں کے [illegible] سے اندازہ کر لیا کہ یہ وہی چھوٹا سا اسپتال ہے جس کے بارے میں اسے علم ہوا تھا کہ یہاں چوبیس گھنٹے ڈاکٹر اور نرسنگ اسٹاف ڈیوٹی پر حاضر رہتا ہے اور نہ صرف بشیر کے معمولی اشارے پر اس کی خدمت کے لیے پہنچ جاتا ہے بلکہ اس کے منظورِ نظر افراد کو بھی یہاں علاج کی سہولت میسر رہتی ہے۔ اس کا اسٹریچر اندر پہنچا تو ڈیوٹی پر موجود اسٹاف نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ فوراً ہی اس کے پھٹے ہوئے خستہ لباس کو اس کے جسم سے الگ کر کے اس کے زخموں کی صفائی اور مرہم پٹی کر دی گئی۔ اس مرہم پٹی کے دوران میں وہ منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں خارج کرتا رہا تاکہ ایک تو طبی امداد دینے والوں کو اس کی تکلیف کا یقین ہو جائے، دوسرے یہ بھی واضح ہو جائے کہ وہ بے ہوش نہیں ہے۔ بے ہوشی کا ڈراما کر کے وہ باہر موجود محافظوں کو تو بے وقوف بنا سکتا تھا لیکن ظاہر ہے طبی عملہ جعلی بے ہوشی کے دھوکے میں نہیں آسکتا تھا۔ البتہ ان کے سامنے نیم غنودگی اور نقاہت کی اداکاری تو کی ہی جا سکتی تھی۔

"اسے پین کلر دے دو۔" شاید اس کی مسلسل کراہوں سے تنگ آ کر ڈاکٹر نے یہ ہدایت دی تھی۔ فوراً ہی اس ہدایت پر عمل ہوا اور اس کا بازو پکڑ کر کسی نے اس میں سوئی چبھو دی۔ سوئی کی چبھن کے ساتھ اس نے اپنے جسم میں اترتی دوا کو محسوس کیا لیکن پھر تھوڑی دیر بعد وہ احساسات سے عاری ہو گیا۔ اسے دیا گیا پین کلر یقیناً نشہ آور تھا جس نے اسے سکون کی نیند سلا دیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک چھوٹے لیکن صاف ستھرے کمرے میں موجود تھا۔ کمرے میں سفید رنگ کا غالب استعمال ظاہر کر رہا تھا کہ یہ اسپتال کا کمرا ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ کی کلائی میں کینولا لگا تھا جس کی مدد سے قطرہ قطرہ گلوکوز اس کے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔ قریب ہی کرسی ڈالے ایک نوعمر و خوش شکل لڑکی بیٹھی اس کی صورت تک رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ لڑکی مسکراتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں مسٹر!" قریب آ کر اس کی کلائی کو تھامتے ہوئے اس نے شیریں لہجے میں دریافت کیا۔

"میں کہاں ہوں؟" نرس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے غائب دماغی سے سوال کیا۔

"آپ اسپتال میں ہیں، آپ کو شدید زخمی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ ہم نے آپ کی مرہم پٹی کر کے لباس تبدیل کروایا۔ آپ بتائیں کہ آپ ہوش میں آنے کے بعد کیسا محسوس کر رہے ہیں؟" نرس نے نرم لہجے میں اس کی یادداشت بحال کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

"میں ٹھیک ہوں لیکن کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ یہاں تک کیسے پہنچا؟" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"آپ اپنے ذہن پر زور دیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کو بلاتی ہوں۔" اسے تسلی دے کر نرس کمرے سے باہر نکل گئی۔

مشابرم خان ملنے والی مہلت سے فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر اپنے ذہن میں وہ کہانی دہرانے لگا جو یہاں والوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اسے سنانی تھی۔ چند منٹوں میں ہی نرس، ڈاکٹر کے ساتھ واپس آ گئی۔ ڈاکٹر نے سپاٹ تاثرات کے ساتھ اس کا معائنہ کیا اور اپنے کام سے فارغ ہو کر اس سے مخاطب ہوا۔

''تمہارا نام کیا ہے مسٹر؟''

''مشابرم خان۔'' اس نے سچ بتایا۔

''ویل مسٹر مشابرم خان! اب تمہاری حالت کافی بہتر ہے۔ زخم بہت زیادہ ہیں لیکن کوئی بھی زخم زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ تمہیں یہ زخم کیسے آئے؟''

اپنے سپاٹ لہجے کے باوجود ڈاکٹر کی آنکھوں میں تجسس تھا کیونکہ بحیثیت ڈاکٹر زخموں کی نوعیت دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ زخم کسی حادثے کے نتیجے میں نہیں آئے ہیں بلکہ کسی تیز دھار ہتھیار سے لگائے گئے ہیں۔

''مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے ڈاکٹر صاحب! میں بے چارہ غریب مسافر یہاں آ کر خوامخواہ پھنس گیا۔ میں تو اپنی ماں کی میت میں شریک ہونے کے بعد اپنی بیوی کو لے کر پنجاب جا رہا تھا۔ وہاں میری ڈرائیور کی نوکری ہے۔ گاؤں سے ادھر آ کر گاڑی میں سیٹیں بھی بک کروائی تھیں پھر پتا چلا کہ حالات کی وجہ سے گاڑیاں آگے نہیں جا رہیں۔ میں اور میری بیوی ادھر ہی پھنس گئے۔ بیوی نے کہا بھی کہ واپس گاؤں چلو لیکن میں اس انتظار میں رک گیا کہ گاڑیاں چلیں گی تو آگے چلے جائیں گے۔ واپس گاؤں جانے اور پھر آنے میں وقت بھی لگتا اور خرچہ بھی ہوتا۔ بیوی میری بات مان گئی۔ ہم یہیں ایک ہوٹل میں رہنے لگے۔ ہوٹل سے میں کبھی کبھی نماز پڑھنے ادھر بھی آ جاتا تھا۔ کل بھی مغرب کی نماز میں آیا تھا۔ نماز پڑھ کر نکلا تو ایسے ہی اِدھر اُدھر گھومنے لگا اور گھومتے ہوئے ذرا سنسان جگہ پر پہنچ گیا۔ وہاں فوراً ہی دو آدمیوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے ساتھ مار پیٹ کرنے لگے۔ میں نے ان سے اپنا جرم پوچھا تو کہنے لگے تیرا جرم یہ ہے کہ تو ان کا پیروکار ہے۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ بھائی میں ایک مسافر ہوں لیکن انہیں میری بات سمجھ نہیں آئی۔ وہ مجھ پر تشدد کرتے رہے اور کہنے لگے جن سترہ افراد کو بس سے اتار کر ہلاک کیا گیا، وہ بھی غریب مسافر تھے۔ ان پر رحم نہیں کیا گیا تو ہم تم پر کیوں رحم کریں۔ ہم تو تم سے اور تمہارے جیسے دوسروں سے اپنے ساتھیوں کے قتل کا بدلہ لیں گے۔ ہم تمہیں تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔ وہ مجھے زخمی کرتے رہے اور ہنستے رہے۔ میں تکلیف اور خوف سے بے ہوش ہو گیا اور شاید وہ لوگ مجھے مردہ سمجھ کر وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے بہت دیر بعد ہوش آیا تو میں ہمت کر کے اس ویرانے سے نکل پڑا۔ وقت ایسا نہیں تھا کہ اجالا ہوتا اور مجھے راستے سمجھ آتے، بس ایسے ہی چل پڑا۔ تکلیف اور کمزوری کی وجہ سے ٹھیک طرح سے چلا جا رہا تھا اور نہ ہی راستے سمجھ آ رہے تھے لیکن میں ہمت کر کے چلتا رہا۔ چلتے چلتے سورج نکل آیا اور میں نے دیکھا کہ میں ادھر آنے والی سڑک پر ہوں تو ہمت بڑھ گئی کہ تھوڑی اور کوشش کروں گا تو ٹھیک جگہ پر پہنچ جاؤں گا۔ اس کے آگے تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ میں عبادت گاہ کے سامنے پہنچ کر گر گیا تھا، جہاں سے گیٹ پر موجود گارڈز مجھے لے کر یہاں آئے اور آپ لوگوں نے مہربانی کر کے میری مرہم پٹی کر دی۔'' اس نے نہایت روانی سے وہ کہانی سنا دی جو پہلے سے سوچ رکھی تھی۔

''تم نے ان لوگوں کی شکلیں دیکھی تھیں جنہوں نے تمہیں اس طرح زخمی کیا؟'' ڈاکٹر اس کی سنائی داستان سے متاثر نظر آ رہا تھا چنانچہ ذرا نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب! ان لوگوں نے چہرے پر نقابیں لگا رکھی تھیں اور وہاں اندھیرا بھی بہت تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم ان لوگوں کو پہچان سکتے تو بہت اچھا ہوتا۔ تمہارے مجرموں کو تمہارے سامنے سزا دی جاتی۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ ہمیں یہ تو سمجھ آ ہی گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ اب بھی انہیں ایسے ہی چھوڑا نہیں جائے گا۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والے لوگ ہیں اور ہم سے ٹکرانے والوں کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔'' ڈاکٹر کا لہجہ خاصا سنگین تھا اور اس کے الفاظ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ یہاں صرف ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ہی کام نہیں کر رہا بلکہ بشیر کا مقربِ خاص ہے اسی لیے اس قسم کے عزائم کا اظہار کر رہا ہے۔

''آپ جو کریں آپ کی مرضی ہے ڈاکٹر صاحب میں غریب آدمی ہوں، ور کسی پھندے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ آپ مجھ پر اتنی مہربانی کریں کہ ہوٹل میں میری بیوی کو اطلاع کروا دیں کہ میں یہاں ہوں۔ وہ بے چاری بڑی پریشان ہو گی کہ میں رات واپس کیوں نہیں آیا اور اب بھی دن چڑھے تک کہاں ہوں۔'' اس نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ اسے کسی انتقام وغیرہ سے دلچسپی نہیں ہے، اپنی بیوی کے لیے فکرمندی کا اظہار کیا۔

''تم نے دن چڑھے کے الفاظ غلط استعمال کیے ہیں۔





تم بے ہوش تھے اس لیے تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ دن چڑھنے کے بعد دوبارہ ڈھلنے کے لیے تیار ہے۔'' ڈاکٹر نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اطلاع دی۔

''یہ تو بہت بُرا ہوا۔ میری بیوی بے چاری نے تو رو رو کر اپنی حالت خراب کر لی ہو گی۔'' وہ مضطرب نظر آنے لگا۔

''جو ہو گیا سو ہو گیا۔ تم ہمیں ہوٹل کا نام اور اپنا کمرا نمبر وغیرہ بتاؤ۔ میں یہاں سے کسی کو بھیج کر تمہاری بیوی کو یہیں بلوا لیتا ہوں۔ اچھا ہے وہ ہو گی تو تمہاری دیکھ بھال بھی کر لے گی اور تمہارا دل بھی لگا رہے گا۔ آج کی رات کم از کم تم کو یہیں گزارنی پڑے گی پھر کل صبح تمہارا چیک اپ کرنے کے بعد میں فیصلہ کروں گا کہ تمہیں چھٹی کب دی جائے۔'' ڈاکٹر اس سے کہہ کر باہر نکل گیا جبکہ نرس وہیں موجود رہی۔

''ڈاکٹر صاحب تو بہت مہربان آدمی لگتے ہیں۔'' نرس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے تبصرہ کیا۔

''اپنے لوگوں کے لیے وہ بہت مہربان ہیں ورنہ باہر والوں کو تو منہ بھی نہیں لگاتے۔'' نرس نے جواب دیا۔

مشابرم خان نے اس بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا... وہ سمجھ گیا تھا اپنے لوگوں سے اس کا کیا مطلب ہے۔

''بشیر صاحب یعنی بڑے صاحب کو آپ کے بارے میں بتایا جائے گا تو انہیں بھی بہت افسوس ہو گا۔ ہم میں سے کسی کے پیر میں کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔ میں نے ان کی طرح اپنے دیوانوں سے اتنی محبت کرتے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ جب ہی تو ہم بھی ان پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔'' وہ چھوٹی سی لڑکی بڑی عقیدت سے بتا رہی تھی اور مشابرم خان سوچ رہا تھا کہ بشیر کیسا جادوگر ہے جس نے سب کے دل اپنی مٹھی میں لے رکھے ہیں۔

''میری ان سے زیادہ واقفیت نہیں ہے، بس آتے جاتے یہاں ٹھہرتا ہوں تو عبادت کے دوران دور سے دیدار کر لیتا ہوں۔'' اس نے ایسے لہجے میں بتایا جیسے اپنی اس محرومی پر بڑا افسردہ ہو۔

''ہم میں سے زیادہ تر کو انہیں دور سے دیکھ کر ہی خوش ہونا پڑتا ہے۔ ان کے اتنے چاہنے والے ہیں وہ آخر کس کس سے ملیں گے لیکن تم اداس نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری داستان ان تک پہنچی تو وہ تمہیں ملاقات کے لیے اپنے پاس ضرور بلائیں گے۔'' نرس نے مسکراتے ہوئے اسے امید دلائی۔

''پھر تو میں اپنے اس طرح زخمی ہونے کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔'' اس نے بے ساختگی سے کہا تو نرس دھیمے سروں میں ہنس دی۔ وہ بڑی نوخیز لڑکی تھی جو یوں ہنستے ہوئے اچھی لگ رہی تھی۔

''تم کب سے یہاں ملازمت کر رہی ہو؟ تمہاری تو بڑے صاحب سے ملاقات ہوئی ہو گی؟'' مشابرم خان نے اسے کھوجنا شروع کر دیا۔

''نہیں، میں یہاں دو مہینے پہلے ہی تو آئی ہوں۔ میری ڈیوٹی یہیں پر ہوتی ہے جبکہ ان کو ضرورت پڑے تو ڈاکٹر صاحب خود ان کے پاس چلے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ظاہر ہے کوئی سینئر نرس ہوتی ہے۔'' اس نے بھولپن سے بتایا۔

''یہاں کتنے ڈاکٹرز اور نرسیں ہیں۔ کیا یہ کافی بڑا اسپتال ہے؟'' اس نے اپنی کھوج کا سلسلہ جاری رکھا۔

''یہ زیادہ بڑا اسپتال نہیں ہے، بس یوں سمجھ لو کہ یہاں صرف بڑے صاحب، ان کے ذاتی ملازمین اور عبادت گاہ کے اسٹاف کا علاج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھار باہر سے تمہارے جیسا کوئی مریض آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہاں چوبیس گھنٹے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ دو جونیئر ڈاکٹرز ہیں جن میں سے ایک لیڈی ڈاکٹر ہیں جبکہ نرسیں مجھ سمیت چار ہیں۔ ہم دو دو کر کے دن رات کی شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔ کبھی کسی کو چھٹی کی ضرورت پڑے تو ایک نرس سے بھی کام چل جاتا ہے کیونکہ عام طور پر اسپتال میں کوئی مریض داخل نہیں ہوتا۔'' وہ بھولپن سے اسے ساری معلومات فراہم کرتی چلی گئی۔

''کیا دونوں جونیئر ڈاکٹرز بھی شفٹوں میں کام کرتے ہیں؟'' اس کے ذہن میں جو منصوبہ تھا، اس پر عمل کرنے کے لیے مکمل معلومات ہونا ضروری تھی۔

''نہیں، دونوں ڈاکٹرز دن کے اوقات میں چھ چھ گھنٹوں کی شفٹ میں کام کرتے ہیں۔ رات میں صرف بڑے ڈاکٹر صاحب ہی ہوتے ہیں۔ البتہ دونوں جونیئر ڈاکٹرز اس بات کے پابند ہیں کہ اگر انہیں ایمرجنسی میں رات کو یہاں بلوایا جائے گا تو وہ فوراً پہنچ جائیں گے۔'' نرس نے بتایا۔

مشابرم خان اس سے اسی نوعیت کے مزید سوالات بھی کرید کرید کر پوچھتا رہا۔ وہ فطرتاً کچھ معصوم لڑکی تھی جو سادگی سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔ تقریباً پون گھنٹا گزرا ہو گا کہ ڈاکٹر دوبارہ وہاں آ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات خاصے گمبھیر تھے۔

مشابرم خان جانتا تھا کہ اس کے پاس اس کے لیے کیا خبر ہوگی پھر بھی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے۔" ڈاکٹر نے اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

"میری بیوی تو ٹھیک ہے نا؟" مشابرم خان نے گھبرانے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے لوگوں کی اس سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ ریسیپشن پر موجود بندے نے بتایا ہے کہ کل رات گئے دو افراد وہاں آئے تھے اور تمہاری بیوی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کے ساتھ جاتے ہوئے تمہاری بیوی نے کسی قسم کا ہنگامہ نہیں کیا تھا اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ اسے زبردستی اس کی مرضی کے خلاف لے جایا گیا ہے۔" ڈاکٹر نے اسے وہی اطلاع دی جو وہ پہلے سے جانتا تھا۔ میجر اسفندیار کے ساتھ اس کا یہ پروگرام پہلے ہی طے پاچکا تھا کہ وہ لوگ گل بینا کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اس طرح ایک تو وہ گل بینا کے محفوظ مقام پر ہونے سے مطمئن بھی رہتا، دوسرے یہ ڈراما بھی کرسکتا تھا کہ اس کی بیوی کو اغوا کرلیا گیا ہے چنانچہ ڈاکٹر کے خبر دیتے ہی پریشان ہونے کی اداکاری شروع کردی۔

"وہ اپنی مرضی سے کہیں نہیں جاسکتی ڈاکٹر صاحب! یہاں ہمارا ایسا کوئی جاننے والا نہیں ہے جس کے ساتھ وہ اتنی رات کو جاسکے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اسے ڈرا دھمکا کر یا پھر دھوکے سے کہیں لے جایا گیا ہے۔" اس نے تقریباً رونے والی شکل بنالی۔

"ایسا ہوسکتا ہے۔ ہم فرض کرسکتے ہیں کہ وہ دونوں تمہاری بیوی کے پاس پہنچے ہوں گے اور انہوں نے اسے اطلاع دی ہوگی کہ مشابرم خان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ وہ اسپتال میں داخل ہے اور تمہیں بلا رہا ہے۔ تو ظاہر ہے وہ اس جال میں آکر ان کے ساتھ چل پڑی ہوگی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کرنے والے لوگ کون تھے؟" ڈاکٹر نے خود ہی ایسا تجزیہ پیش کردیا کہ مشابرم خان کو کہانی بنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی البتہ ڈاکٹر کے اٹھائے گئے سوال کا جواب اسے دینا تھا۔

"میرے خیال میں تو یہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے مجھے تشدد کرکے مارنے کی کوشش کی تھی۔ ان سے مار کھانے کے دوران میں نے انہیں بتادیا تھا کہ میں یہاں کون سے ہوٹل میں اپنی بیوی کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"ویران کمینوں نے انتقام کے جوش میں ایک معصوم عورت کو اغوا کر ڈالا۔ جانے وہ ظالم اس بے چاری کے ساتھ کیا کریں گے۔ اس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ رات بھر میں اس کی عزت کسی طور محفوظ نہیں رہی ہوگی اور پتا نہیں کتنے درندے اس کے جسم کو بھنبھوڑتے رہے ہوں گے۔ تم دیکھنا کہ جلد ہمیں کہیں سے اس کی کٹی پھٹی لاش مل جائے گی۔"

مشابرم خان کی بات سن کر ڈاکٹر نے ایسے الفاظ میں ایک ان دیکھے منظر کا نقشہ اس کے سامنے کھینچ کر رکھ دیا کہ مشابرم خان حقائق سے واقف ہونے کے باوجود کانپ اٹھا۔

"اگر میری گل کو کچھ ہوا تو میں ان میں سے ایک ایک کی تکا بوٹی کر ڈالوں گا۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں عزم کا اظہار کیا۔

"تم خود کو تھامے رکھو۔ تمہارے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اس کا حساب لینے کے لیے ہم سب تمہارا ساتھ دیں گے۔ میں خود بڑے صاحب سے تمہارے سلسلے میں بات کروں گا۔ فی الحال تم یہاں ریسٹ کرو۔ ہم کوشش کریں گے کہ تمہاری بیوی کو تلاش کیا جاسکے۔" ڈاکٹر اسے تسلی دے کر باہر نکل گیا تو اس نے اپنا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔ یہ اداکاری اس لیے ضروری تھی کہ کمرے میں مستقل موجود نرس کے ذریعے دوسروں کو بھی خبر ہوسکے کہ وہ اپنی بیوی کے غیاب پر کتنا افسردہ ہے۔ حسبِ توقع نرس اس کے قریب چلی آئی اور اس کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دینے لگی۔

"اتنے پریشان مت ہو مسٹر۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اندازے غلط ہوں اور تمہاری بیوی بالکل محفوظ ہو۔" وہ بہت معصومیت سے اسے امید دلا رہی تھی۔ مشابرم خان کو افسوس ہوا کہ اسے اتنی معصوم لڑکی کو دھوکا دینا پڑ رہا ہے اور یہ صرف اس لیے تھا کہ وہ لڑکی ان لوگوں کا حصہ تھی جن کے خلاف اسے کارروائی کرنی تھی۔ اس نے رونے کی اداکاری بند کردی اور نرس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"کیا تم رات میں بھی یہاں رہوگی؟" یہ سوال اس اعتبار سے بہت اہم تھا کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کے لیے رات کا وقت سب سے مناسب تھا لیکن ایک پہرا دیتی نرس کی موجودگی میں کچھ کرنا بہت مشکل تھا۔ علاوہ ازیں کہ اسے کسی طرح ناک آؤٹ کردیا جاتا اور اس کا اس نرس کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ ہم یہاں بارہ بارہ گھنٹوں کی شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔ میری ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے۔ میری جگہ سسٹر کشمالہ آجائیں گی لیکن آج ان کی ساتھی نرس چھٹی پر ہیں اس لیے میری طرح وہ فل ٹائم تمہارے کمرے میں نہیں رہ سکیں گی۔ انہیں دوسرے کام بھی نمٹانے ہوں گے۔ لیکن تم فکر نہ کرو، تم اب بہتر ہو اور تمہارے ساتھ اب کوئی مسئلہ نہیں کہ رات بھر کسی کا تمہارے پاس رہنا ضروری ہو۔ پھر بھی اگر تم ضرورت محسوس کرو تو اپنے بیڈ کے ساتھ موجود یہ گھنٹی کا بٹن دبا دینا۔ سسٹر کشمالہ فوراً تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔" وہ نرم لہجے میں اسے سمجھانے لگی۔

"ٹھیک ہے، تم چلی جاؤ۔ صبح تو آہی جاؤ گی اور یہ اچھی بات ہے۔ رات تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گی۔ اگر مجھے گل بینا کی طرف سے پریشانی نہیں ہوتی تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ آرام سے لمبی تان کر سو جاتا۔" وہ ایک بار پھر افسردہ نظر آنے لگا۔

"تمہاری یہ پریشانی بھی اللہ دور کردے گا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے کہوں گی کہ وہ بڑے صاحب سے تمہارے لیے دعا کرنے کو کہیں۔ ان کی دعاؤں میں بڑا اثر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی دعا سے تمہیں تمہاری گل بینا بالکل صحیح سلامت مل جائے گی۔"

نرس کے لہجے میں بشیر کے لیے گہری عقیدت تھی۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اتنی معصوم اور ہمدرد لڑکی بھی ایسے فریب کے جال بننے والوں میں شامل ہے لیکن اصل المیہ بھی یہی تھا کہ معصوم اور بھولے بھالے لوگ ہی ایسے چالبازوں کے جال میں زیادہ آسانی سے پھنس جاتے تھے جو انہیں اپنے اشاروں پر نچاتے رہتے تھے۔

"اچھا اب تم آرام کرو۔ میں چلتی ہوں۔ مجھے گھر جانے سے پہلے اپنا یونیفارم بھی بدلنا ہے۔ تم اگر اپنے ذہن پر دباؤ محسوس کرو تو دواؤں میں یہ نیلے رنگ کی گولی ہے، اسے کھا لینا۔ اسے کھانے سے تمہیں سکون سے نیند آجائے گی۔" وہ اسے ہدایات دیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تو وہ بھی آنکھیں موند کر چپ چاپ لیٹ گیا۔ ابھی اسے ایکشن میں آنے کے لیے تھوڑا وقت گزرنے کا انتظار کرنا تھا اس لیے تب تک آرام کرلینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

☆☆☆

ٹی ایف پی والوں نے ریاض انور کا پیچھا چھوڑا نہیں تھا۔ اس کی مسلسل نگرانی ہورہی تھی اور اس نگرانی کے نتیجے میں اس کے معمولات جاوید علی کے علم میں آگئے تھے جو کہ ریاض کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے ہی کراچی میں رکا ہوا تھا۔ یوں تو یہ کام کراچی یونٹ والے بھی کرسکتے تھے لیکن چونکہ وہ یونٹ پہلے سے اس کیس پر کام کررہا تھا، اس لیے کیس انہی کے پاس رہنے دیا گیا تھا۔ البتہ مدد کے لیے کراچی کے اہلکار ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ اب بھی نگرانی کا کام وہی انجام دے رہے تھے۔ جاوید علی بس اپنی جگہ بیٹھے رپورٹیں وصول کرتا رہتا تھا۔ وہ ابھی جان بوجھ کر بھی باہر نہیں نکل رہا تھا۔ اگرچہ وزیراعلیٰ ہاؤس میں سلو کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے اس نے اور عادل خان دونوں نے اپنے حلیے کافی تبدیل کرلیے تھے لیکن پھر بھی اوپر سے اسے احتیاط برتنے کی ہدایت کی گئی تھی اور وہ انتظار کررہا تھا کہ داڑھی مونچھیں مزید بڑھ جائیں تو وہ خود کو نئے روپ میں ڈھال کر باہر نکل سکے۔ اس دوران میں اس نے منصوبہ بندی البتہ کرلی تھی اور اب ایکشن کے لیے تیار تھا۔ اس مقصد کے لیے کراچی یونٹ کے انچارج نے اس سے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا تھا اور اس کے مطالبے پر گاڑیوں سمیت دیگر اشیا کا انتظام کردیا تھا۔ ان انتظامات کے ساتھ جاوید علی اور چند دوسرے اہلکار منہ اندھیرے نکل کھڑے ہوئے۔

وہ دو الگ الگ گاڑیوں میں تھے جن میں سے ایک گاڑی ٹنٹڈ گلاسز والی تھی۔ اس گاڑی میں جاوید علی خود موجود تھا اور ان کا رخ اس پارک کی طرف تھا جہاں ان کی معلومات کے مطابق ہر روز علی الصباح ریاض انور جاگنگ کے لیے جاتا تھا۔ نگرانی کے باعث یہ بات سامنے آگئی تھی کہ طویل ٹریک پر جاگنگ کیے بغیر ریاض انور کا دن شروع نہیں ہوتا تھا اور یہی ایک معمول تھا جو بنا کسی تعطل کے جاری رہتا تھا ورنہ اس کے علاوہ تو پورا دن اس کا شیڈول ہر روز مختلف ہی رہتا تھا۔

جاوید علی نے جاگنگ کے اوقات سے ہی فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ آج کل ریاض انور کی شوگر بہت بڑھی ہوئی ہے اور ڈاکٹرز کے مطابق یہ بے پناہ ذہنی دباؤ اور بڑھتے ہوئے وزن کا نتیجہ ہے۔ ذہنی دباؤ کم کرنا تو اس کے بس میں نہیں تھا البتہ جاگنگ کا دورانیہ بڑھا کر وزن کم کرنے کی اپنی سی کوشش کررہا تھا۔

جاوید علی کی ٹنٹڈ گلاسز والی گاڑی کے ساتھ نکلنے والی دوسری گاڑی نے تھوڑا سا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد اپنی رفتار میں اضافہ کردیا تھا اور دیکھتے دیکھتے اپنے ساتھیوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی لیکن ان میں سے کسی کو تشویش اس لیے نہیں تھی کہ یہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ وہ مقررہ رفتار سے سفر کرتے ہوئے جب اطمینان سے اپنے مطلوبہ پارک تک پہنچے تو گاڑی سے اترتے ہی انہیں دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان دھماکوں کے ساتھ ہی لوگوں کی پریشان چیخیں

بھی تھیں اور اندازہ ہو رہا تھا کہ پارک میں اچھی خاصی بھگدڑ مچ چکی ہے۔

شہر میں آئے دن ہونے والے بم دھماکوں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں کسی پبلک پلیس پر جانے میں ویسے ہی خوف سا پایا جاتا تھا اور وہ پٹاخوں کی آوازیں سن کر بھی ہراساں ہو جاتے تھے۔ یہاں تو پھر ٹھیک ٹھاک زوردار دھماکے ہوئے تھے اور ہر طرف دھواں دھواں محسوس ہو رہا تھا۔ گاڑی سے اترنے والے اہلکار دھوئیں یا بھگدڑ کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے اور ایک مختصر وقفے کے بعد دوبارہ نمودار ہوئے تو ان میں سے ایک کے شانے پر ایک بھاری بوری لدی ہوئی تھی۔ اس نے گاڑی کے قریب پہنچ کر اس بوری کو پچھلی سیٹوں کے پائیدان میں پٹخ دیا۔ پچھلی نشست پر براجمان جاوید علی نے اپنا پیر بوری پر رکھ کر آہستہ سے دبایا تو اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ بوری میں ایک انسانی جسم موجود ہے۔ وہ اطمینان کے اظہار کے لیے جیب سے چیونگم نکال کر اسے چبانے لگا جبکہ اس اثنا میں نیچے اترنے والے دوبارہ سوار ہو چکے تھے اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ کر تیزی سے سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

"کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟" اس نے بوری پر سے پیر اٹھائے بغیر اپنے ساتھ بیٹھے شخص سے دریافت کیا۔

"نو سر! ہم بہت آسانی سے اسے نکال کر لے آئے۔ دھماکوں اور دھوئیں کی وجہ سے ہر شخص پریشان تھا۔ اس کے ساتھ آئے باڈی گارڈز بھی گھبرا گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ حالات کے پیش نظر ریاض انور کو اپنے گھیرے میں لے کر وہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کرتے، ہم نے انہیں ناک آؤٹ کر دیا اور ریاض انور کو بھی کلوروفام سے بے ہوش کرنے کے بعد بوری میں ڈال کر لے آئے۔" اس نے رپورٹ دی۔

"اس کے گارڈز کو تو نقصان نہیں پہنچا؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ ٹھیک ہیں سر۔ صرف بے ہوش کیا ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے میں خود ہی ہوش میں آجائیں گے ورنہ کوئی لے آئے گا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"گڈ!" اس بار جاوید علی نے اختصار سے کام لیا۔

گاڑی نے واپسی کا سفر پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے طے کیا۔ اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچ کر انہوں نے ریاض انور کو تفتیش کے لیے مخصوص کمرے میں منتقل کر دیا اور اس کے ہوش میں آنے تک فیصلہ کیا گیا کہ ناشتا کر لیا جائے۔ وہ لوگ ناشتا کر رہے تھے کہ اس دوران میں ہی نیوز چینلز سے واقعے کی خبر نشر ہونا شروع ہو گئی۔ حسب معمول مختلف چینلز کے نمائندے ہیجان خیز لہجے میں اس واقعے کی رپورٹنگ کر رہے تھے اور سوال اٹھائے جا رہے تھے کہ ریاض انور جیسے نیک نام سیاست دان کو اغوا کرنے والے لوگ کون ہو سکتے ہیں اور اس اغوا کا کیا مقصد ہے۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے ریاض انور کے گارڈز، قریبی ساتھیوں اور اہل خانہ کے تاثرات معلوم کرنے کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ ہر شخص اپنے اپنے طور پر اس واقعے پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کر رہا تھا کہ ریاض انور کو فوری طور پر بازیافت کروا کر اس کے اغوا کاروں کو کڑی سزا دی جائے۔ ایک نیوز چینل والے پھرتی دکھاتے ہوئے ریاض انور کی بیوی اور بیٹی تک بھی پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں فطری طور پر اس واقعے پر افسردہ نظر آرہی تھیں۔ خصوصاً ریاض انور کی جواں سالہ بیٹی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس کا باپ کتنی محبت کرنے والا آدمی ہے اور ایک باپ کی حیثیت سے اس سے کتنی شدید محبت کرتا ہے۔ وہ روتے ہوئے صدر، وزیراعظم سمیت قانون نافذ کرنے والے اداروں سے اپیل کر رہی تھی کہ اسے اس کا باپ واپس لوٹایا جائے۔ یہ ایک بیٹی کے اپنے باپ کے لیے حقیقی جذبات تھے، ورنہ وہ اس کے لیے دل میں صرف افسوس ہی محسوس کر سکتے تھے کیونکہ ریاض انور جیسے کردار کے شخص کو جس کی وجہ سے بے شمار گھر اجڑے تھے، رعایت دینا ان کے بس میں نہیں تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر جاوید علی اور اس کے مددگاروں نے اس خصوصی کمرے کا رخ کیا جہاں ریاض انور کو رکھا گیا تھا۔ وہ اس دوران ہوش میں آچکا تھا اور خوف زدہ سا اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا کیونکہ اس کمرے کا ماحول ہی ایسا تھا کہ اندر داخل ہونے والے کو بھی فوراً اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ایک عقوبت خانہ ہے۔ دیواروں پر لٹکے تشدد کے کئی آلات، چھتوں میں فکس کنڈے جس سے رسیاں لٹکی ہوئی تھیں، خودکار ہتھکڑیوں والی کرسیاں جس میں سے ایک پر اس وقت ریاض انور براجمان تھا اور ایسی ہی بے شمار دوسری شے سے کمرا بھرا پڑا تھا جو گواہی دیتی تھیں کہ اس عقوبت خانے میں لائے جانے والے کی روح تک بلبلا اٹھتی ہوگی۔

جاوید علی اور اس کے ساتھیوں نے چہروں پر ایک نقابیں لگائی ہوئی تھیں جنہوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے پورے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ جاوید علی کمرے میں

ہو کر سیدھا ریاض انور کی طرف بڑھا اور اس کے مقابل کھڑے ہو کر اسے کینہ توز نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کی نظروں میں ایسی شعلوں کی سی لپک تھی کہ ریاض انور نے ذرا دیر میں ہی گھبرا کر آنکھیں نیچی کرلیں۔

''صرف نظریں جھکانے سے کام نہیں چلے گا ریاض انور! تجھ جیسے بے غیرت کو تو زندہ زمین میں دفن ہو جانا چاہیے۔ تیرے جو کرتوت ہیں وہ سات سمندروں کا پانی بہانے کے بعد بھی تجھے پوتر نہیں ہونے دیں گے۔'' جاوید علی نے نفرت سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی ریاض انور کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ جاوید علی کے رویّے کا سبب بھی یہی تھا کہ وہ اسے جسمانی اذیت میں مبتلا کرنے سے پہلے اتنے زیادہ نفسیاتی دباؤ میں لے لینا چاہتا تھا کہ وہ فوراً ہی ٹوٹ جائے اور حقائق جاننے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہ آئے۔

''تم کون لوگ ہو؟'' آخرکار ریاض انور نے ہمت کر کے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''ہم جہنم کے داروغے ہیں اور تمہیں تمہاری بداعمالیوں کی سزا دینے کے لیے پکڑ لائے ہیں۔'' اس نے خوف ناک لہجے میں جواب دیا۔

''دیکھو، مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور میرے اچھے کردار کی گواہی بے شمار لوگ دیتے ہیں۔'' اس نے اپنے خشک لبوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''لیکن ہمارا شمار ان بے شمار لوگوں میں نہیں ہوتا جو تمہارے پرستار ہیں۔ ہم ان گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جنہیں تمہاری حقیقت معلوم ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تم را کے پٹھو ہو اور شریف بن کر اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہو۔'' جاوید علی نے آخر بلّی کو تھیلے سے باہر نکال ہی لیا تاکہ ریاض انور اگر اپنے اغوا کے سلسلے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو تو وہ غلط فہمی دور ہو جائے۔

''یہ غلط ہے۔ میں اپنے ملک سے محبت کرتا ہوں جب ہی تو میں نے یہاں کئی فلاحی ادارے قائم کر کے عوام کی فلاح و بہبود کی ذمے داری اٹھا رکھی ہے۔'' وہ حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کرنے لگا۔

''اور اس فلاح و بہبود کے بہانے تم جب چاہتے ہو، امدادی سامان کے ساتھ ہتھیار اور بارود بھیج کر کسی بھی علاقے میں آگ لگا دیتے ہو۔'' جاوید علی نے طنز کیا تو ریاض انور کے چہرے پر چھائی پریشانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور پورے جسم پر پسینے کی دھاریں سی بہنے لگیں۔

''یہ... یہ جھوٹ ہے، مجھ پر الزام ہے۔'' وہ مذبذب لہجے میں تردید کرنے لگا۔

''اب تم اس بات سے بھی انکار کر دو گے کہ جس دن کراچی میں خون کی ہولی کھیلی گئی، اس سے فقط ایک دن پہلے تم سے رات گئے سلو نامی دہشت گرد ملنے آیا تھا۔ یہ دہشت گرد انڈیا کا تربیت یافتہ ہے اور اس نے وزیراعلیٰ سے ملنے کے دکھاوے کے موقع پر ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی جو ان کا سیاسی مخالف ہے اور کتنی عجیب بات ہے کہ وزیراعلیٰ نے صرف تمہاری سفارش پر سلو کو قواعد و ضوابط کے خلاف اپنے سیکیورٹی اسٹاف میں شامل کیا تھا۔'' وہ ریاض انور پر اپنی معلومات ظاہر کر کے اسے بتا رہا تھا کہ اس پر کچا ہاتھ نہیں ڈالا گیا بلکہ بہت سوچ سمجھ کر یہاں لایا گیا ہے۔

''کیا تمہارا تعلق آئی ایس آئی سے ہے؟'' ریاض انور نے دہشت زدہ سے لہجے میں پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا ہے ناکہ ہم جہنم کے داروغہ ہیں اور تم جیسے بداعمالوں کو ان کے اعمال کے سبب جہنم کی سیر کرواتے ہیں۔ تمہارے ساتھ بھی یہ سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔'' جاوید علی نے اسے اطلاع دی۔

''دیکھو، تم میرے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتے۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہاں، سلو کو وزیراعلیٰ کے سیکیورٹی اسٹاف میں ملازمت ضرور دلوائی تھی لیکن صرف اور صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اور وہ بھی اس وجہ سے کہ سلو نے مجھ سے خود اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ چونکہ وہ اسلحے کا استعمال جانتا ہے، اس لیے اسے کسی خاص شخصیت کا باڈی گارڈ رکھوا دیا جائے۔ میرے وزیراعلیٰ سے اچھے دوستانہ تعلقات ہیں اس لیے میں نے ان سے اس کی سفارش کر دی۔ بعد میں وہ کیا نکلا کیا نہیں، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے تو نیک نیتی سے ایک بے سہارا لڑکے کی مدد کی تھی۔'' ریاض انور نے سنبھالا لینے کی کوشش کرتے ہوئے بہانہ بنایا۔

''میرے خیال میں ہمیں انگلی ٹیڑھی کرنی ہی پڑے گی۔'' اس کی ڈھٹائی دیکھ کر جاوید علی نے کہا اور ہاتھ سے جانے کیا اشارہ کیا کہ ریاض انور پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ بُری طرح لرزتا ہوا ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چیخنے لگا۔ دراصل وہ جس دھاتی کرسی پر بیٹھا تھا، اس میں کرنٹ چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کرنٹ کی شدت اتنی نہیں تھی کہ وہ جان سے چلا جاتا لیکن تکلیف تو بہرحال اسے ہوئی تھی۔ اتنی شدید کہ وہ سر سے پیر تک کانپ اٹھا تھا۔ چند سیکنڈز کا کرنٹ برداشت کرنے کے بعد جب اسے اس عذاب سے نجات ملی تو وہ نڈھال سا بُری طرح ہانپنے لگا۔

''یہ ابھی صرف ٹریلر ہے، اگر تم نے اپنی زبان نہیں کھولی تو اگلا جھٹکا اس سے زیادہ شدید ہوگا۔''

''تم لوگ کیوں میری جان کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ میں بتا چکا ہوں کہ میرا را سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔'' وہ اپنے بیان پر قائم رہا جس کی پاداش میں اس کا جسم ایک بار پھر جھٹکوں کی زد میں آ گیا۔ اس بار دورانیہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ ریاض انور سہہ نہ سکا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسے بڑی بےدردی سے ساتھ پھر ہوش میں لایا گیا۔ اس بار اس کا دم خم واضح طور پر غائب لگ رہا تھا۔ دراصل وہ کوئی تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ یا جاسوس تو تھا نہیں کہ اس قسم کے تشدد کو حوصلے سے سہہ سکتا۔ آرام اور آسائش سے بھرپور زندگی گزارنے والے جسم میں اتنا دم خم ہی نہیں تھا کہ زیادہ دیر ہمت کا مظاہرہ کر سکتا چنانچہ جلد ہی ٹوٹ گیا۔

''تم لوگ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' بالآخر جب اس کا خشک ہو جانے والا حلق اور اکڑ جانے والی زبان اس قابل ہوئے کہ وہ کچھ بول سکے تو اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تم را کے لیے کب سے اور کیا کام کر رہے ہو؟'' جاوید علی نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''دس سال ہو گئے مجھے ان کے چنگل میں پھنسے ہوئے۔ دس سال سے میں مجبور ہوں کہ ان کے ہر اشارے اور ہر حکم پر عمل کروں۔'' اس نے مظلومیت سے بھرپور لہجے میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم اپنی مرضی سے ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے ہو؟'' جاوید علی چونکا۔

''نہیں بلکہ دس سال پہلے انہوں نے میرے لیے یہ جال تیار کیا تھا۔ ایک روز انہوں نے مجھے مذاکرات کے بہانے ایک جگہ بلایا اور پھر میری بیٹی کو اس کے اسکول سے اغوا کر لیا۔ میں ان کے دیے لالچ میں شاید نہ آتا لیکن بیٹی کی زندگی بچانے کے لیے ان کا حکم ماننے پر مجبور ہو گیا۔ اب وہ جو کہتے ہیں، میں اس پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہوں۔ آج بھی میری بیٹی ان کے نشانے پر رہتی ہے۔ اب تو وہ جوان ہو چکی ہے اور مجھے دھمکایا جاتا ہے کہ اگر میں نے ان کا کوئی حکم ماننے سے انکار کیا تو وہ میری بیٹی کو اغوا کر کے پہلے تو اس کی آبروریزی کریں گے پھر اس کی نچی ہوئی بے لباس لاش کسی معروف چوراہے پر پھینک دیں گے۔ تم ہی بتاؤ ان حالات میں، میں کیسے ان کا حکم نہیں مانتا۔'' مظلومیت کی اداکاری کرتا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور خود کو مجبور ظاہر کرتے ہوئے ان مراعات اور عیاشیوں کا ذکر گول کر دیا جو اسے را کی خدمات کے عوض دستیاب تھیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ اسے بلیک میل کرنے کے لیے اس کی لاڈلی بیٹی کو اغوا کیا گیا تھا لیکن ایسا صرف ایک بار ہوا تھا جبکہ بعد میں وہ لالچ میں ان کے لیے کام کرتا رہا تھا۔ را کے سورماؤں نے اسے دولت، شراب اور شباب کی لت لگا دی تھی۔ فراوانی سے ملتی ان تینوں چیزوں نے اس کے ضمیر کو مکمل طور پر سلا دیا تھا اور اب وہ بے حد بے شرمی سے ان کے لیے کام کر رہا تھا۔

''اگر یہ سچ بھی ہے تو مجھے تمہارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ تم نے ایک اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے اس ملک کی ہزاروں بیٹیوں کو داؤ پر لگا دیا۔ کیا تمہارے پاس کوئی حساب ہے کہ تمہاری وجہ سے کتنی عورتیں بیوہ اور یتیم ہوئیں اور کتنوں کو آبروریزی کی اذیت سے گزرنا پڑا؟'' جاوید علی کے اس سوال کے جواب میں اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا البتہ جاوید علی کے پاس ایسے کئی سوال تھے جن کے جواب وہ دے سکتا تھا۔ جاوید علی پے در پے اس سے وہ سوالات پوچھتا چلا گیا اور ریاض انور نے جہاں اس کو جوابات دینے میں مزاحمت کی، وہاں اس کی مناسب تواضع بھی کر ڈالی۔

☆☆☆

''تم نے کیا سوچا ہے؟ کسے اپنے ساتھ بھارت لے جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' اس کے بالمقابل بیٹھے ذیشان نے اس سے پوچھا۔

''دیکھو کسے لے جاتا ہوں، ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا۔ بس ایک نام ذہن میں ہے لیکن معلوم نہیں کہ اسے ساتھ لے جانا ممکن ہوگا بھی یا نہیں۔'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔

''وہ کون؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم جاوید علی کو اپنے ساتھ لے جانا پسند کرو گے۔ وہ خاصا ایکٹیو لڑکا ہے اور تمہاری اس کے ساتھ خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔''

''نہیں، جاوید کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ فی الحال اسے یہیں رہ کر کام کرنے دو۔'' اس نے ذیشان کا سوال گول کر کے اس کی بات کے صرف ایک حصے کا جواب دیا۔

''میں بھی ذاتی طور پر اسے اس کی جگہ سے ہٹانے کے حق میں نہیں تھا لیکن اگر تم خواہش کرتے تو تمہیں انکار بھی نہیں کیا جاتا۔ جاوید نے اس مختصر عرصے میں بڑی کارکردگی دکھائی ہے۔ پہلے نوازش علی کی کوٹھی میں تہنیت خوب صورتی

سے کام کیا، پھر وزیراعلیٰ ہاؤس میں تمہارے ساتھ مل کر بڑا کارنامہ انجام دیا اور اب ریاض انور کے مزاج پوچھ رہا ہے۔'' ذیشان کے لہجے میں اپنے ماتحت کے لیے تحسین تھی۔

''میں تم سے ریاض انور کے بارے میں پوچھنے ہی والا تھا۔ کیا رہا اس کا؟'' اس نے فوراً دریافت کیا۔ جواباً ذیشان نے اسے ریاض انور کے اغوا سے لے کر اس پر تشدد تک کی ساری کہانی سنادی۔

''جاوید علی نے تو ریاض انور کی ناک میں رسّی ڈال کر اسے کسی سدھائے ہوئے فرماںبردار جانور کی طرح بنا ڈالا ہے۔ اگلا پچھلا سب اگل ڈالا ہے اس نے کہ کب کب اور کیا کیا کیا۔ بڑا مال کمایا ہے اس خبیث نے بھارتیوں کی خدمت کے عوض اور اسی رقم میں سے تھوڑا بہت فلاحی کاموں میں لگا کر عوام کو الّو بناتا رہا ہے۔ سلو کے سلسلے میں بھی وہ را کے اشارے پر ایک خوفناک منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ را والوں نے حکومت سے ڈیل ہوجانے کے باوجود سلو کے وجود کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے اسے راہ سے ہٹانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے کو عملی جامہ ریاض انور نے پہنچانا ہے۔ وہ اتنی پہنچی ہوئی چیز ہے کہ اتنی رازداری برتنے کے باوجود اسے معلوم ہو چکا ہے کہ سلو کو کس جیل میں رکھا گیا ہے اور اس نے پورا منصوبہ تیار کرلیا ہے کہ کس طرح جیل میں سلو کو ہلاک کروانا ہے۔''

ذیشان اسے جاوید علی کی ریاض انور سے حاصل کردہ معلومات سے آگاہ کرنے لگا جس میں سب سے قابلِ ذکر بات سلو کی ہلاکت کے منصوبے سے متعلق تھی۔ بھارتی حکومت سے معاملات طے ہوجانے کے بعد سلو کے معاملے کو بہت رازداری سے ہینڈل کیا جارہا تھا اور اس کی تقدیر کا فیصلہ عدالت کے بند کمرے میں کیا جانا تھا۔ میڈیا والوں کو جس حد تک مناسب سمجھا جاتا، بعد میں ایک پریس کانفرنس کے ذریعے آگاہ کردیا جاتا۔ البتہ فی الحال ہر ایک نے اپنے ہونٹ سی رکھے تھے اور اس کیس کی کھوج میں لگے صحافیوں کو بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ انہیں معلومات کے حصول کے لیے کس شخص کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان حالات میں ریاض انور کی 'باخبری' واقعی بڑی معنی خیز اور حیرت انگیز تھی۔

''منصوبہ کیا ہے؟'' شہریار نے اس معاملے میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''جس جیل میں سلو کو رکھا گیا ہے، وہاں ریاض انور کے کچھ گرگے پہلے ہی سے قید ہیں۔ عرصے سے وہاں یہ سازش تیار کی جارہی ہے کہ کس طرح جیل توڑ کر وہاں سے فرار ہوا جائے۔ ریاض انور کے بقول اب اس منصوبے پر عمل کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے چند اور خطرناک گرگوں کو جیل میں داخل کروا چکا ہے۔ کسی دن اچانک لوگوں کو خبر ملے گی کہ سینٹرل جیل میں قیدیوں کے درمیان دنگا فساد ہوا اور معاملات اس حد تک آگے چلے گئے کہ جیل انتظامیہ کے لیے حالات پر قابو پانا ممکن نہیں رہا۔ ان خراب حالات سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف تو وہ لوگ سلو اور شاید اس کے ساتھ کسی ایک آدھ قیدی کو مزید ہلاک کردیں گے، کچھ لوگ لامحالہ زخمی بھی ہوں گے اور دوسری طرف خطرناک مجرموں کو جیل سے فرار ہونے کا موقع مل جائے گا۔''

''اس منصوبے پر اندر کے لوگوں کی شمولیت کے بغیر تو عمل نہیں ہوسکتا۔'' ذیشان سے تفصیلات سن کر اس نے تبصرہ کیا۔

''بالکل، یہ اندر کے لوگ ہی تو ہوں گے جو ان دنگا کرنے والوں کو ہتھوڑی، پانے، ڈنڈے وغیرہ جیسی اشیا فراہم کریں گے اور موقف یہ اختیار کیا جائے گا کہ قیدیوں نے یہ چیزیں جیل کی ورکشاپ سے چرائی ہیں۔ آتشیں ہتھیاروں کا مسئلہ یوں حل ہوگا کہ قیدی چند سپاہیوں سے ان کی رائفلیں چھین لیں گے جو اصل میں انہیں چھیننے سے زیادہ خود پیش کی جائیں گی۔'' ذیشان کے جوابات سن کر اسے اندازہ ہورہا تھا کہ ریاض انور کو کتنا بروقت اغوا کرلیا گیا ورنہ وہ موذی تو اپنا کام دکھا چکا تھا۔

''ایسا کرو کہ جو کچھ ہونے جارہا ہے، اسے ہونے دو اور بس سلو کو کسی طرح وہاں سے نکال لو۔'' ذیشان نے اتنی ساری تفصیلات سنا کر شاید اسے اتنا حیران نہ کیا ہوتا جتنا اس نے اپنے ایک جملے سے اسے حیران کردیا تھا۔

''میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا ہوں۔ ہم کیسے ایسا کرسکتے ہیں کہ اتنی بڑی سازش کے بے نقاب ہوجانے کے باوجود اس پر عمل ہوجانے دیں؟'' وہ اپنی حیرت کو لبوں پر سوال بنا کر لے آیا۔

''تم نے کچھ دیر پہلے مجھ سے پوچھا تھا کہ اپنے ساتھ بھارت لے جانے کے لیے میرے ذہن میں کس کا نام ہے تو سنو... میں سلو کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔'' اس نے دھماکا کیا۔

''کیا؟'' ذیشان کا منہ کھل گیا۔

''سلو کے کیس پر کام کرتے ہوئے میں نے مسلسل



اس پہلو پر نظر رکھی ہے کہ کسی طرح بھارتیوں کو ان کا تیار کردہ نہایت مہلک ہتھیار اس طرح واپس لوٹا دوں کہ اس ہتھیار سے نکلنے والے شعلے انہیں ہی بھسم کر ڈالیں۔ قسمت نے اس سلسلے میں ہم پر بڑی مہربانی کی ہے اور سلو پر واضح ہو گیا ہے کہ بھارت اس کا ہمدرد نہیں ہے اور وہ لوگ اسے صرف اور صرف اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بعد دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکنا چاہتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ سلو جیسا جذباتی لڑکا بھارتیوں کی اس حرکت پر بری طرح بھڑکا ہوا ہوگا اور اگر ہم ان شعلوں کو ذرا سی ہوا دے دیں تو وہ ان پر قہر بن کر ٹوٹنے کے لیے تیار ہوجائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے جو مہم درپیش ہے، اس میں سلو جیسا نڈر اور بے جگر شخص ساتھ دینے کے لیے سب سے مناسب رہے گا۔'' اس نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔

''پھر بھی، بڑا عجیب سا لگ رہا ہے کہ تم سلو کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ تمہیں جس مہم پر جانا ہے، اس میں کسی قابلِ اعتماد ساتھی کی ضرورت ہوگی اور سلو کو میں قابلِ بھروسا نہیں سمجھتا۔'' ذیشان نے اعتراض اٹھایا۔

''تم مجھ پر چھوڑ دو کہ میں اسے کس طرح ہینڈل کرتا ہوں اور کیسے اس سے کام لیتا ہوں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس کا نام لیا ہے اور سچ پوچھو تو مجھے اس مہم پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اس سے زیادہ مناسب کوئی نہیں لگا۔'' وہ اپنی بات پر قائم تھا۔

''لیکن مشکل یہ ہے کہ ریاض انور کو اغوا کرلینے کے بعد جیل والی سازش پر عمل کیسے ہوگا؟ اس سازش کا ماسٹر مائنڈ تو وہی ہے جسے ظاہر ہے ہم کسی سے رابطہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے اور نہ ہی آزاد کرسکتے ہیں۔'' ذیشان کی اپنی ہی الجھنیں اور پریشانیاں تھیں۔

''ہمیں ریاض انور کو آزاد کرنا ہوگا لیکن ذرا سلیقے سے۔ ہم ریاض انور کے اغوا کو اغوا برائے تاوان کا روپ دے سکتے ہیں۔ ریاض انور سے ڈسکس کرکے معلوم کرلو کہ اس کی فیملی جلد از جلد کتنی بڑی رقم کا بندوبست کرسکتی ہے۔ وہ رقم لے کر اسے چھوڑ دینا پھر وہ اپنے منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے آزاد ہوگا اور ہمارا کام بن جائے گا۔'' اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''اور تمہارے خیال میں ریاض انور اتنا بچہ ہے کہ ہماری بنائی گئی کہانی کو اپنے بھارتی آقاؤں سے چھپالے گا۔'' ذیشان نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان سے بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہ خبیث آدمی ضرور اپنے آقاؤں کو اطلاع دینے کی کوشش کرے گا لیکن اسے اس حرکت سے روکنے کے لیے ہم اپنا کوئی آدمی اس کے ساتھ متعین کرسکتے ہیں جو ہر وقت اس کے قریب رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہے گا۔''

''ایسا آدمی تو خود مشکوک ہوجائے گا۔'' ذیشان نے اعتراض کیا۔

''نہیں ہوگا مشکوک، اگر ہم ذرا سلیقے سے منصوبہ بندی کریں گے تو سب ممکن ہوجائے گا۔ ویسے بھی ہم کوئی زندگی بھر کے لیے تو اس خبیث کا ٹھیکا لینے والے نہیں ہیں۔ اس سے اس منصوبے پر عمل کرواؤ اور پھر اس کا کام تمام کر کے اپنا آدمی واپس بلوا لو۔ یہ تو پہلے سے طے ہے تاکہ ریاض انور جیسے غدار کو اب زیادہ عرصے کے لیے اس دھرتی کا بوجھ بنا کر نہیں رکھنا ہے۔''

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ ہم ایسا کرسکتے ہیں کہ اپنا ایک لڑکا ریاض انور کے ساتھ بھیج دیں اور ریاض انور اپنے منہ سے لوگوں کو یہ کہانی سنائے کہ اغوا کاروں نے رقم کی وصولی کے بعد اسے شدید زخمی اور بے ہوش حالت میں ایک ایسی ویران جگہ پر ڈال دیا تھا جہاں سے وہ اتفاقاً وہاں پہنچ جانے والے اس نوجوان کی مدد سے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ وہ تعریف کرے گا کہ نوجوان نے بڑی ہمدردی سے اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ پیٹ بھر کر کھانا کھلایا اور خود گھر تک چھوڑنے آیا۔ نوجوان کے اتنے احسانات کے بدلے میں اگر وہ اسے اپنے قریبی اسٹاف میں ملازمت دے دے گا یا یونہی اپنے ساتھ رکھے گا تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا بلکہ لوگ اس کی احسان شناسی کو سراہیں گے۔ بس یوں ہمارا کام بن جائے گا۔'' اب ذیشان کا دماغ بھی چل پڑا تھا۔

''گڈ! اب تم اسی ٹریک پر سوچ رہے ہو جس پر میں سوچ رہا ہوں۔ میری مانو تو ایک کام اور کرنا، ریاض انور کو اس کی جوان بیٹی کے حوالے سے بھی تھوڑا ڈرا دینا تاکہ اگر اس کے ذہن میں ہم سے دھوکے کا خیال آئے بھی تو وہ اس پر عمل کرنے کی ہمت نہ کرسکے۔'' ذیشان کو شاباش دینے کے ساتھ اس نے ایک اہم مشورہ بھی دیا۔

''بس اب تم بے فکر ہوجاؤ۔ اب میں تمہارا منصوبہ سمجھ چکا ہوں تو ہر کام بہترین طریقے سے انجام پاجائے گا۔ لیکن یاد رکھو کہ سلو کے سلسلے میں تمہیں پہلے کرنل صاحب سے اجازت لینی ہوگی تب ہی ہم اس منصوبے پر عمل کرسکیں گے

ورنہ تو سب سے آسان حل یہ ہے کہ ریاض انور کو گولی مار کر اس کی لاش کسی کچرا کنڈی یا نالے میں پھینک دی جائے۔"

"اس کی تم فکر نہیں کرو۔ میں کرنل صاحب سے ابھی بات کر لیتا ہوں۔" اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تھوڑی دیر بعد جب وہ ریسیور واپس کریڈل پر رکھ رہا تھا تو کرنل توحید کو راضی کر چکا تھا۔

"اوکے، یہ کام تو ہو گیا۔ میں جاوید علی سے بات کر کے اس منصوبے کی جزئیات کو ڈسکس کر لوں گا پھر ہم اس پر عمل کر گزریں گے۔" کرنل صاحب کی اجازت مل جانے پر ذیشان نے آگے کا پروگرام سیٹ کرنا شروع کر دیا۔ یہ کیس کیونکہ جاوید علی کے پاس تھا اس لیے اس سے ڈسکس کرنا سب سے زیادہ ضروری تھا۔ ذیشان نے فوری طور پر اس سے رابطہ کیا اور ریاض انور کے حوالے سے جو کچھ ان کے درمیان طے ہوا تھا، اسے ان تفصیلات سے آگاہ کیا۔ ان تفصیلات میں یہ ذکر شامل نہیں تھا کہ سلو کو جیل سے نکال کر شہریار کے ساتھ بھوربٹ بھیجا جا رہا ہے۔ جاوید علی کو بس اتنا بتا دینا کافی تھا کہ منصوبے کے مطابق سلو کو ہلاک ہونے سے بچا کر اسے اس طرح جیل سے فرار کروانا ہے کہ وہ سی ایف پی کی تحویل میں آجائے۔ یہ حکم سن کر جاوید علی نے یقیناً یہ گمان کیا ہوگا کہ اپنے ایک اہم مجرم کا ہاتھ سے نکل جانا سی ایف پی کو اچھا نہیں لگا اس لیے وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر اسے دوبارہ اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں تاکہ اس سے مزید معلومات وغیرہ حاصل کی جا سکیں۔

"میں نے آپ کا سارا پلان سمجھ لیا ہے سر! اس پر ان شاء اللہ کامیابی سے عمل بھی ہو جائے گا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد ریاض انور کا کیا کیا جائے گا؟ کیا ہم اس جیسے موذی کو ایسے ہی آزاد چھوڑ دیں گے؟" اس نے نہایت غور سے ذیشان کی ساری بات سننے کے بعد سوال اٹھایا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم اسے صرف وقتی طور پر ڈھیل دے رہے ہیں۔ بعد میں اس کا پتا بھی صاف کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں پلان تمہیں خود ہی تیار کرنا ہوگا، بس ٹائمنگ کا خیال رکھنا۔ جیل والی سازش پر عمل ہونے سے پہلے کچھ نہیں ہونا چاہیے اور وہ پوری طرح تمہاری نگرانی میں بھی رہنا چاہیے۔" ذیشان نے فوراً ہی اس کا ذہن صاف کیا۔

"اس طرف سے آپ بے فکر رہیں سر! میں ریاض انور کے ساتھ اپنا آدمی لگانے کے ساتھ ساتھ اس کے جسم سے ایک ایسی ڈیوائس بھی اٹیچ کروا دوں گا کہ جن اوقات میں ہمارے بندے کا اس کے قریب رہنا ممکن نہیں ہوگا، اس وقت بھی ہم اس کی سرگرمیوں سے آگاہ رہیں گے۔"

"گڈ! مجھے تمہاری صلاحیتوں پہ پورا بھروسا ہے اس لیے میں نے اپنا مقصد تم پر واضح کر کے تمہیں فری ہینڈ دے دیا ہے۔ اپنی سہولت اور طریقۂ کار کے مطابق کام کرو اور نتیجہ وہ دو جس کے ہم خواہش مند ہیں۔" ذیشان نے کھلے دل سے اس کی تعریف کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"ایک اہم مرحلہ تو سمجھو طے ہو گیا۔ اب دوسرا کام یہ کرو کہ اپنا ایک بندہ اس جیل میں پہنچا دو جہاں سلو موجود ہے۔ اس کا کام یہ ہوگا کہ سارا وقت سلو کے قریب رہ کر اس کی نگرانی اور حفاظت کرے۔ خصوصاً اس وقت جب پلان کے مطابق اسے قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس وقت ہمارے آدمی کو نہ صرف سلو کو پروٹیکٹ کرنا ہوگا بلکہ اسے اپنے ساتھ لے کر فرار بھی ہونا ہوگا تاکہ سلو ہم تک پہنچ جائے۔" ذیشان، جاوید علی کو اس کا کام سمجھا کر فارغ ہوا تو شہریار نے ایک اور اہم کام کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ ذیشان نے اس پوائنٹ کو نوٹ کر لیا۔ اس سلسلے میں وہ بیٹھے بیٹھے فوری طور پر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس سلسلے میں اسے جیل کے اعلیٰ حکام سے رابطہ کرنا پڑتا اور یہ رابطہ بھی وہ براہِ راست کرنے کے بجائے کرنل توحید کے ذریعے ہی کر سکتا تھا کیونکہ یہ کرنل توحید ہی تھے جو آئی ایس آئی اور سی ایف پی کے درمیان توازن قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ سی ایف پی کے وجود کو پوشیدہ رکھنے کی جدوجہد کر رہے تھے اور اس جدوجہد میں ان جیسے چند اور بھی اعلیٰ فوجی عہدے دار شامل تھے۔ کرنل توحید جیل کی انتظامیہ میں سے کسی قابلِ اعتماد آدمی سے رابطہ کرتے تو ایک طرف ان کا کام آسان ہو جاتا اور دوسری طرف فرار کی سازش کرنے والے خطرناک مجرموں کے فرار کو بھی ناکام بنانے یا نئے سرے سے گرفتار کرنے کے سلسلے میں کارروائی کی جا سکتی تھی۔ معاملہ بہت نازک تھا اور مقابل موجود دشمن کے خطرناک سازشی اور مکار ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا۔ اس لیے وہ دونوں سر جوڑے بہت دیر تک ایک ایک پوائنٹ کو ڈسکس کرتے رہے۔ ساتھ ہی جاوید علی کے لیے بھی ہدایات تیار ہوتی رہیں کہ سب سے [illegible] کا تھا۔ اگر ریاض انور کی اغوا برائے تاوان والی [illegible] میں جھول آجاتا تو دشمن چوکنا ہو جاتا اس لیے پلے کا یہی ایکٹ سب سے زیادہ جان دار اور نیچرل ہونا ضروری تھا۔ بہرحال، بہت دیر کی دماغ پاشی کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو خاصے مطمئن تھے۔



☆☆☆

"تم کھانے سے فارغ ہو چکے ہو اس لیے بہتر ہے کہ دوائیں لے کر تھوڑی دیر میں سو جاؤ۔ تم جتنا آرام کرو گے تمہارے لیے اتنا ہی اچھا ہوگا۔" نائٹ شفٹ میں کام کرنے والی نرس کشمالہ نے اس کے سامنے سے کھانے کی ٹرے ہٹاتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ دن کی شفٹ میں کام کرنے والی کم سن نرس کے مقابلے میں پختہ عمر کی خاصی [illegible] عورت تھی جس کی حرکات و سکنات سے ہی ایک خاص [illegible] جھلکتی تھی۔

"بڑے ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں نرس؟" مشابرم خان نے اس کی بات پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر اس سے پوچھا۔

"کیوں؟ تم انہیں کیوں پوچھ رہے ہو؟ کوئی تکلیف ہے؟ مجھے بتاؤ ہو سکتا ہے کہ میں ہی تمہارا مسئلہ حل کر دوں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ ایک تجربہ کار نرس بھی ڈاکٹر کی طرح کم نہیں ہوتی۔ میں تمہیں بہت اچھی دوا دے سکتی ہوں۔" وہ ڈاکٹر کو بلانے پر آمادہ نہیں تھی۔

"مجھے جسمانی تکلیف کا مسئلہ نہیں ہے نرس۔ میں اپنی بیوی کی وجہ سے پریشانی میں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا وہ اسے تلاش کرنے میں میری مدد کریں گے لیکن ابھی تک انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔" اس نے کسی پریشان حال کی طرح تھکے تھکے لہجے میں اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"اوہ آئی سی، مجھے تمہارے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا پتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس سلسلے میں کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ تمہاری بیوی کو کون لوگ لے گئے ہیں۔ بہرحال تم فکر مت کرو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ جلد تمہاری بیوی کو تلاش کر لیا جائے گا اور اسے اغوا کرنے والوں کو عبرت ناک سزا بھی دی جائے گی۔" [illegible] نرس اسے تسلیاں دینے لگی۔

"آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں نرس لیکن جب تک میری بیوی نہیں مل جاتی، مجھے سکون نہیں ملے گا۔" اس نے اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی کیفیت سمجھ رہی ہوں مسٹر مشابرم خان! آپ بہت پریشانی میں ہیں لیکن فی الحال صبر اور حوصلے سے جینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ آپ ہمت کریں [illegible] رکھیں کہ ان مشکل حالات میں آپ تنہا نہیں ہیں۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔" وہ اس کے ہاتھ تھام کر اس کی دل [illegible] گی پھر پلٹ کر سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی دوائیں اس کے سامنے رکھیں۔

"آپ یہ دوائیں کھا لیں۔ انہیں کھانے سے آپ کے زخم بھی ٹھیک ہوں گے اور نیند بھی اچھی آجائے گی۔" مشابرم خان نے دیکھا کہ ان دواؤں میں نیند کی وہ گولی بھی شامل ہے جس کے بارے میں پچھلی شفٹ کی نرس نے بھی اسے آگاہ کیا تھا۔ اس نے کشمالہ سے دوائیں لے کر اپنے منہ میں رکھتے ہوئے چپکے سے وہ گولی نیچے گرا دی۔ باقی دواؤں کی تو بہرحال اسے ضرورت تھی اس لیے انہیں کھانا ضروری تھا۔

"بس اب آپ لیٹ جائیں۔ تھوڑی دیر میں آپ کو نیند آجائے گی۔" اس کے ہاتھ سے خالی گلاس لے کر ٹیبل پر واپس رکھنے کے بعد کشمالہ نے اس کا تکیہ ٹھیک کیا اور اسے آرام سے لٹانے کے بعد اس کے اوپر ہلکا کمبل پھیلا دیا۔ مشابرم خان نے بھی خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ اس کے آنکھیں بند کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد کشمالہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

مشابرم خان نے آنکھیں کھول کر دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی صرف ساڑھے آٹھ ہوئے تھے اور اسے جو کارروائی کرنی تھی، اس کے لیے آدھی رات کا وقت زیادہ مناسب رہتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس وقت کا جاگ کر انتظار کرنے کے بجائے ڈھائی تین گھنٹے کی نیند لے لینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ بہرطور وہ زخمی تو تھا اور اسے آرام کی ضرورت بھی تھی۔ اپنی مضبوط قوتِ ارادی کی وجہ سے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بغیر کسی الارم کے بھی مقررہ وقت پر ضرور جاگ جائے گا چنانچہ اطمینان سے سو گیا۔ ٹھیک ڈھائی گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ گھڑی کی سوئیاں گیارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ لیٹا باہر کی سن گن لیتا رہا۔ یہاں اسے دن کے اوقات میں بھی زیادہ آوازیں اور چہل پہل محسوس نہیں ہوئی تھی اور اب تو بالکل ہی سناٹے کا راج تھا۔

اس سناٹے میں اس کے کانوں نے قدموں کی مدھم چاپ واضح طور پر سن لی۔ آنے والا اس کے کمرے کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے اندر جھانکا۔ اس نے آنکھوں میں معمولی سی جھری پیدا کرتے ہوئے آنے والے کو دیکھا۔ وہ نرس کشمالہ تھی جس نے اس کے گہری نیند میں ہونے کا اندازہ لگایا اور پھر دروازہ دوبارہ احتیاط سے بند کر کے واپس پلٹ گئی۔ اس کے واپس جانے کے بعد وہ آہستگی سے بستر سے نیچے اترا اور تکیے اور کمبل کو اس انداز میں بستر پر پھیلایا کہ دور سے دیکھنے والے کو یہی گمان گزرے کہ کمبل

تنے کوئی سویا ہوا ہے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ کمرے میں موجود اکلوتی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ دن بھر میں وہ جائزہ لے کر پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کمرے سے باہر نکلنے کے لیے اس کھڑکی کا استعمال کرے گا کیونکہ دروازے سے نکلنے میں یہ خطرہ تھا کہ کوریڈور میں اسٹاف کے کسی شخص سے سامنا نہ ہو جائے۔ سلائڈنگ ونڈو نے اس کا کام ویسے بھی آسان کر دیا تھا۔ اسے بس ایک شیشہ ہی کھسکانا تھا، اس کے بعد اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس نے نہایت احتیاط اور خاموشی سے یہ مرحلہ طے کیا اور باہر کودنے کے بعد کھڑکی کو دوبارہ بند کر دیا۔ باہر کا موسم اندر کے مقابلے میں قدرے سرد تھا اور لحہ بھر کے لیے اسے جھرجھری سی آگئی لیکن پھر وہ سنبھل گیا۔ سردی کا موسم نہ ہونے کی وجہ سے ابھی اتنی ٹھنڈک نہیں تھی کہ گرم کپڑوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے پریشانی ہو۔

کھڑکی سے کود کر نکلنے کے بعد بھی ابھی وہ اسپتال کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلا تھا اور ابھی اسے احاطے کی دیوار پھلانگنی تھی لیکن اس سے قبل وہ کسی ایسی شے کا متلاشی تھا جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے۔ وہ جس طریقے سے یہاں پہنچا تھا اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار لا سکے۔ اگر وہ ایسی کوئی کوشش کرتا تو اس کا ہتھیار فوراً ہی ڈاکٹر وغیرہ کی نظر میں آجاتا اور وہ مشکوک سمجھا جاتا لیکن وہ چاہتا تھا کہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے لیے کچھ تو اس کے پاس ہو۔ اس سلسلے میں اس کے ذہن نے ڈاکٹروں کے استعمال میں رہنے والے سرجیکل آلات کے حصول کی راہ دکھائی تھی۔ اس کی جس کمرے میں مرہم پٹی کی گئی تھی، وہاں اس نے اس قسم کی چیزیں دیکھی تھیں۔ بالکل خالی ہاتھ جانے کے بجائے اگر وہ ذرا سی کوشش سے کوئی آلہ بطور ہتھیار حاصل کر لیتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے اندازے سے اس کمرے کی کھڑکی پر طبع آزمائی کی جس میں اس کے خیال کے مطابق اس کی مرہم پٹی کی گئی تھی۔ احتیاط کی وجہ سے اس نے کھڑکی کو بہت معمولی سا کھسکایا تھا۔ اس معمولی سی درز میں سے فوراً ہی روشنی اور آوازوں نے باہر کی طرف رخ کیا۔ آوازیں سن کر اس نے شکر کیا کہ اس نے بے دھڑک کھڑکی کھولنے کے بجائے احتیاط سے کام لیا تھا۔ پیدا ہونے والی جھری سے آنکھ لگا کر اس نے اندر جھانکا۔ اندر ڈاکٹر، نرس کشمالہ اور ایک عورت موجود تھی۔ عورت بیڈ پر نیم دراز تھی اور ڈاکٹر اور نرس اس کے سر پر کھڑے تھے۔ ان تینوں کے درمیان کسی بات پر بڑے شد و مد سے بحث ہو رہی تھی اور شاید اسی وجہ سے کسی کو کھڑکی کا پٹ کھسکائے جانے کا احساس نہیں ہوا تھا۔

"میں نے کہہ دیا ہے کہ میں کسی مستند لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی کے بغیر اپنا ابارشن نہیں کرواؤں گی۔" اس نے خوب صورت خدوخال والی عورت کو بلند لہجے میں کہتے ہوئے سنا۔

"ہم یہاں کسی لیڈی ڈاکٹر کو نہیں بلا سکتے۔ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ بڑے صاحب کبھی بھی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے۔" ڈاکٹر نے انکار کیا۔

"لیکن میں بھی لیڈی ڈاکٹر کے بغیر اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ بڑے صاحب اگر دل بھر کر مجھ سے کھیل لینے کے بعد میری طرف سے بے پروا ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنی جان گنوا دوں۔ میرا شوہر ہے، بچے ہیں، گھر ہے۔ نذر محمد کے واپس آنے کے بعد میں دوبارہ اس کے ساتھ اپنے گھر میں ہنسی خوشی رہ سکتی ہوں۔ میرے بچوں کو میری ضرورت ہے۔ میں مر گئی تو کون ان کو پالے گا؟"

بلند لہجے میں بولتی عورت کا لہجہ آخر میں آکر یاس زدہ ہو گیا تھا جبکہ کھڑکی کے باہر کھڑا یہ سب سنتا مشابرم خان دم بخود تھا۔ عورت کے جملوں نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ یقیناً عورت کا شوہر طویل عرصے سے علاقے سے باہر گیا ہوا تھا اور اسی عرصے میں بشیر اکبر نے عورت کو اپنی داشتہ بنا رکھا تھا۔ اس عیاشی کا جو نتیجہ نکل سکتا تھا، وہ نکل چکا تھا اور اب بشیر کے ہمدم وہمراز ڈاکٹر اور نرس اس کوشش میں تھے کہ عورت کے خاوند کے واپس آنے سے پہلے پہلے اس کی کوکھ میں پلتے بشیر کے گناہ کی نشانی کو مٹا ڈالیں لیکن عورت خوف زدہ تھی کہ تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر کی عدم موجودگی سے کہیں وہ اپنی جان ہی نہ کھو بیٹھے اسی لیے ان کے درمیان یہ بحث ہو رہی تھی۔

ان تینوں کے درمیان اچھی خاصی گرما گرمی ہو رہی تھی۔ مشابرم خان اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا... لہٰذا ان کو بحث میں الجھا دیکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

اس کمرے کی کھڑکی سے ہٹ کر اس نے ساتھ والے کمرے کی کھڑکی پر طبع آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ تو وہ دیکھ ہی چکا تھا کہ اس کا اندازہ غلط تھا اور یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں اس کی مرہم پٹی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے کی کھڑکی کھولنے پر اسے اپنا گوہر مقصود حاصل ہو گیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں اس کی مرہم پٹی کی گئی تھی۔ وہ کھڑکی کھول کر بند [illegible]



[illegible] کمرے کے اندر کودا اور اپنی مطلوبہ چیزیں سمیت [illegible] بار پھر کھڑکی کے راستے واپس باہر آگیا۔ اب اس کا [illegible] اسپتال کی چار دیواری کی طرف تھا۔ چار دیواری زیادہ [illegible] تھی۔ اس نے پوری طاقت سے جمپ لگائی تو ہاتھ [illegible] کی منڈیر کو تھامنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ زور لگا کر [illegible] کے اوپر چڑھ گیا اور فوراً ہی دوسری طرف چھلانگ لگا [illegible] یہاں زمین نرم تھی اور اسپتال کی چار دیواری کے ساتھ [illegible] مختلف قسم کے پودے لگائے گئے تھے جن کی وجہ سے [illegible] روشنی میں منظر خاصا خوب صورت لگتا تھا لیکن اس [illegible] اندھیرے میں جس پودے پر جا کر گرا اس کے کئی [illegible] اس کے جسم میں پیوست ہو گئے۔ وہ پہلے ہی زخمی تھا۔ [illegible] کانٹے چبھنے سے بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں سے ایک سسکاری نکلی لیکن پھر ہونٹ بھینچ کر اس نے اس تکلیف پر قابو پایا اور کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

اب اس کا رخ اس حصے کی طرف تھا جہاں بشیر اکبر کی رہائش گاہ تھی۔ مین گیٹ سے لے کر اس کی رہائش گاہ تک ایک پختہ سڑک بنی ہوئی تھی۔ یہ سڑک اسپتال کے سامنے سے بھی گزر رہی تھی لیکن مشابرم خان پختہ سڑک پر چلنے کے بجائے کچی زمین پر ہی چلتا رہا۔ کیونکہ سڑک پر چلنے کی صورت میں وہ فوراً ہی نظر میں آجاتا، اس لیے وہ احتیاطاً کچی زمین پر ہی چلتا رہا جہاں جابجا موجود پودے اور درخت بوقت ضرورت اسے چھپنے کے لیے آڑ فراہم کر سکتے تھے۔ [illegible] گزری کہ وہ کسی بھی قسم کی دشواری میں پڑے بغیر بشیر کی رہائش گاہ کے قریب پہنچ گیا۔ پہلی بار یہاں آنے کے [illegible] وہ جدید سائنس کے کارنامے کے باعث اس عمارت [illegible] پورے محل وقوع سے واقف تھا۔ میجر اسفندیار نے اسے کمپیوٹر کی اسکرین پر پوری عمارت دکھائی تھی۔ اس تصویر میں متحرک سائے بھی نظر آئے تھے جو یقینی طور پر وہاں پہرا دے رہے تھے۔ رہائشی عمارت میں محض ان دو پہرے داروں کی موجودگی پر شاید اس لیے اکتفا کیا گیا تھا کہ پوری عمارت کے گرد حفاظت کا زبردست انتظام موجود تھا اور [illegible] داروں کی بڑی تعداد کے علاوہ دیواروں پر برقی تار [illegible] گئے تھے اور کسی فرد واحد تو کیا، چھوٹی موٹی مسلح [illegible] کے لیے بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ آسانی سے اس دفاعی حصار کو توڑ سکے۔ اسی لیے اندر مختلف یونٹ کی شکل میں بنی [illegible] کی حفاظت کے لیے زیادہ تردد نہیں کیا گیا تھا۔ [illegible] خان جس ترکیب سے اندر گھسنے میں کامیاب ہوا تھا [illegible] ترکیب اس کے ذہن میں نہ آئی ہوتی تو وہ کبھی یہاں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

رہائش گاہ کے عقبی حصے میں پہنچ کر وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اندر کی آہٹ لیتا رہا۔ اندر خاموشی تھی لیکن یہ تو طے تھا کہ اندر کم از کم دو پہرے دار موجود تھے۔ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے چار دیواری کا جائزہ لیا۔ اس چار دیواری کی بلندی اسپتال کی دیواروں سے زیادہ تھی۔ اس نے پہلے کی طرح اچھل کر اس پر چڑھنا چاہا تو انگلیاں محض منڈیر کو چھو کر ہی رہ گئیں اور وہ اوپر چڑھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس نے اپنے وجود کی تمام تر توانائیاں مجتمع کرتے ہوئے ذرا پیچھے ہٹ کر دوڑ لگاتے ہوئے ایک اور کوشش کی۔ اس بار وہ کامیاب رہا اور انگلیاں منڈیر پر جم گئیں لیکن ساتھ ہی اسے شدید اذیت سے بھی گزرنا پڑا۔ دیوار پر شیشے کے ٹکڑے لگائے گئے تھے جو اس کی انگلیوں میں کھب گئے تھے۔ اس نے بمشکل اپنی چیخوں کو حلق سے خارج ہونے سے روکا اور بے پناہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے زخمی ہاتھوں پر زور دیتا ہوا اوپر چڑھ گیا۔ اس کوشش میں اسے جس تکلیف سے گزرنا پڑا، وہ ناقابل بیان تھی لیکن پہاڑوں کے بیٹے کا عزم بھی پہاڑوں جیسا تھا۔ وہ اس تکلیف سے گزر کر بے حد مدھم آواز کے ساتھ نیچے کود گیا۔ اندر دیوار کے ساتھ ساتھ بہت سے پودے اور چھوٹی قامت کے درخت لگائے گئے تھے۔ ان کم قامت درختوں کو لگانے کا مقصد یقیناً یہی تھا کہ کوئی ان درختوں کے سہارے عمارت کے اندر یا باہر آجا نہ سکے۔ اس نے ایسے ہی ایک درخت کی آڑ میں بیٹھ کر اپنی قمیص کا دامن پھاڑا اور دونوں زخمی ہاتھوں پر مٹی کا لیپ کر کے ہاتھوں پر بمشکل پٹیاں باندھ لیں۔ کانچ کے ٹکڑے اندر پیوست ہونے سے ہاتھوں میں بڑے گہرے زخم آئے تھے جن سے تیزی سے خون کا اخراج ہو رہا تھا۔ خون کے اس اخراج کو روکنے کے لیے وہ فی الحال یہی ترکیب استعمال کر سکتا تھا۔ اس کام کے دوران میں وہ اپنے اردگرد سے غافل نہیں ہوا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اس دوران وہاں کوئی پہرے دار نمودار نہیں ہوا تھا جبکہ اصولاً مستقل گشت کرنے والے پہرے داروں میں سے کسی ایک کو تو اب تک وہاں سے گزرنا چاہیے تھا۔ اس نے چند لمحے مزید پہرے دار کے نمودار ہونے کا انتظار کیا پھر خود انہیں تلاش کرنے کا فیصلہ کر کے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ باہر موجود ان دو پہرے داروں سے نمٹے بغیر وہ اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا ورنہ بعد میں وہ دونوں اس کے لیے مسئلہ کھڑا کر دیتے۔

نہایت محتاط قدموں سے چلتا ہوا وہ بائیں طرف سے

نکل کر عمارت کے سامنے کے حصے کی طرف چل پڑا۔ کچھ دیر کے بعد اسے دونوں پہرے دار گیٹ کے قریب بیٹھے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کی پیالیاں تھیں جبکہ ایک سگریٹ بھی سلگا ہوا تھا جس سے دونوں باری باری کش لے رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں کسی کی دخل اندازی کے خطرے سے بالکل بے نیاز تھے اور نہایت بے پروائی سے اپنی معمول کی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ ان کی رائفلیں بھی بے پروائی سے ایک طرف رکھی ہوئی تھیں۔ اگر مشابرم خان کے پاس اس وقت کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ بہت آسانی سے انہیں قابو کر سکتا تھا لیکن اس وقت دونوں کو ایک ساتھ قابو کرنے کی کوشش کرنا اس اعتبار سے خطرناک تھا کہ اگر وہ آڑ سے نکل کر ان کی طرف بڑھتا تو دونوں میں سے کسی کی بھی اس پر نظر پڑ سکتی تھی اور پھر ان کے لیے اپنی رائفلیں اٹھا کر اسے قابو کر لینا یا ٹھکانے لگا دینا ذرا مشکل نہ ہوتا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا جس پر عمل کر کے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا جا سکتا۔

”اچھا بھائی چائے کا شکریہ۔ تو آرام سے بیٹھ میں ذرا راؤنڈ مار کر آتا ہوں۔“ ابھی اسے کوئی تدبیر سوجھی بھی نہیں تھی کہ ہوا کے دوش پر لہراتی آواز سنائی دی۔ اس نے ذرا سا سر نکال کر جھانکا۔ دونوں پہرے داروں میں سے ایک اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا اور رائفل اٹھا کر شانے سے لٹکالی تھی۔ اس نے قدموں کو حرکت دی تو مشابرم خان نے دیکھا کہ وہ اسی سمت آرہا ہے جہاں وہ خود چھپا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے کچھ حصے میں پودوں کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر میں ہی راؤنڈ لگانے کے لیے آنے والا پہرے دار اس کی نظر میں آگیا۔ وہ نہایت اطمینان سے چل رہا تھا اور اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے سر پر کتنا بڑا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ اس کی یہ بے خبری اور اطمینان مشابرم خان کے لیے مفید ثابت ہوا اور جیسے ہی وہ اس کی کمین گاہ سے چند قدم آگے بڑھا، اس نے کسی چیتے کی سی پھرتی اور خاموشی سے جست لگا کر اسے پیچھے سے اس طرح جکڑا کہ اس کا ایک ہاتھ پہرے دار کے منہ پر جما ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ کے بازو نے اس کی گردن کے گرد اس طرح حلقہ تنگ کر دیا تھا کہ وہ بے بس سا ہو گیا تھا۔ اس بے چارے کو اتنی مہلت بھی نہیں ملی تھی کہ شانے پر لٹکی اپنی رائفل اتارنے کے لیے ہی ہاتھ چلا سکتا۔ مشابرم خان نے اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اسے نیچی زمین پر گھسیٹ لیا اور اسے پشت کے بل زمین پر گرا کر خود اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ ایک ہاتھ پہرے دار کے منہ اور ناک کو ڈھانپے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں زور لگا کر وہ اس کا گلا دبا رہا تھا۔ ذرا دیر کی محنت کے بعد گارڈ نے ہاتھ پیر پٹخنا چھوڑ کر اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ سر بھی ایک طرف ڈھلک گیا۔ مشابرم خان نے سینے پر کی گرفت ختم کر کے اسے چیک کیا۔ وہ زندہ تھا لیکن اس کے کافی دیر تک ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ اس کے سینے سے اتر گیا اور اس کی رائفل اپنے قبضے میں لے لی۔ پہرے دار سے نمٹنے کی کوشش میں اس کے زخمی ہاتھ سے ایک بار پھر خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ تکلیف بھی شدید تھی لیکن اس وقت اس کے پاس اپنے زخموں پر دھیان دینے کی فرصت نہیں تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ راؤنڈ پر نکلنے والا پہرے دار جب اپنے ساتھی کے پاس واپس نہیں پہنچے گا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو کر خود اسے دیکھنے کے لیے نکل کھڑا ہوگا۔ یہ عمارت اتنی وسیع و عریض نہیں تھی کہ اس کے گرد ایک چکر لگانے میں کسی کو چند منٹ سے زیادہ وقت درکار ہوتا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس سے قبل کہ دوسرا پہرے دار اپنے ساتھی کی تلاش میں نکلے، وہ اس کے استقبال کے لیے تیار ہو۔ وہ ایک بار پھر اسی مقام پر جا کھڑا ہوا جہاں سے جھانک کر اس نے گیٹ کے قریب بیٹھے پہرے داروں کو چائے اور سگریٹ نوشی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ دوسرا پہرے دار ابھی تک اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا اور اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ سگریٹ ختم ہونے تک اس کا اطمینان باقی رہا۔ اس کے بعد کچھ بے چین نظر آنے لگا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور مزید بے چین نظر آنے لگا۔ پھر شاید اس کے لیے اپنی جگہ پر بیٹھا رہنا ممکن نہیں رہا، اور وہ کسی خطرے کی بو سونگھ کر رائفل شانے سے اتار کر محتاط انداز میں اپنی جگہ سے حرکت میں آیا لیکن اپنے ساتھی کے برعکس اس نے اس جانب سے عمارت کا راؤنڈ لگانے کے بجائے جہاں مشابرم خان موجود تھا، دوسری جانب کا رخ کیا تھا۔ چنانچہ مشابرم خان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ سے پہلے والے کی طرح دبوچ سکے۔ وہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے پہرے دار کے مڑنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ موڑ مڑ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پھر وہ حرکت میں آیا۔ خود فرنٹ کی طرف سے گزر کر پہرے دار کے تعاقب میں جا رہا تھا۔ محتاط ہونے کے باوجود اس کے قدموں کی رفتار تیز تھی۔ ہاتھوں میں موجود رائفل نے اس کے اعتماد میں اضافہ کر دیا تھا اور اب وہ اس فکر میں مبتلا نہیں تھا کہ [illegible] کے مقابلے میں خود نہتا ہے۔ ویسے وہ جو منصوبہ اپنے [illegible]



[illegible] کر آیا تھا، اس میں آتشیں ہتھیار چلانے کی گنجائش [illegible] نہیں وہ جانتا تھا کہ ان ہتھیاروں کی دہشت ہی الگ [illegible] اور سامنے والا مقابلے پر ڈٹنے سے پہلے خود دس بار [illegible]

تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے تیزی سے [illegible] سامنے کا حصہ پار کر لیا اور احتیاط سے اس جانب [illegible] پہرے دار گیا تھا۔ مشابرم خان نے نظروں سے [illegible] اور اس کے درمیان فاصلے کا اندازہ لگایا اور پنجوں کے [illegible] تیز قدموں سے اس کی طرف دوڑ پڑا۔ پہرے دار [illegible] قبل ہی اس جگہ سے گزرا تھا اس لیے اسے اندازہ [illegible] تھا کہ خطرہ اس کی پشت کی طرف سے آگے بڑھ رہا [illegible] اس کی ساری توجہ آگے کی جانب مرکوز تھی۔ اپنی پشت [illegible] مشابرم خان کی موجودگی کا اسے اسی وقت پتا چلا جب مشابرم خان کے ہاتھوں میں موجود رائفل کی نال اس کی گردن سے جا لگی۔

”بغیر کوئی آواز نکالے اپنی رائفل پھینک دو ورنہ اپنے ساتھی کی طرح تم بھی جان سے چلے جاؤ گے۔“ نہایت سرد لہجے میں اس نے پہرے دار کو حکم دیا اور جان بوجھ کر اسے [illegible] ساتھی کے مرنے کی غلط اطلاع دی تاکہ وہ اس [illegible] میں مبتلا ہو جائے کہ جو شخص ایک آدمی کو قتل کر سکتا ہے [illegible] دوسرا قتل کرنا کون سا مشکل ہوگا۔

”تت... تم کون ہو؟“ اس نے خوف زدہ لہجے میں [illegible]

”میں جو بھی ہوں، تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ ہاں اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو مجھ سے تعاون کرو۔“ [illegible] آواز میں غرایا۔ آواز دھیمی ہونے کے باوجود غراہٹ میں [illegible] دہشت تھی کہ پہرے دار نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس کی۔ اس کی کیفیت کا اندازہ لگا [illegible] خان اسے رائفل کے بل پر دھکیلتا ہوا عمارت کے عقب میں لے گیا۔

”تم دونوں کے علاوہ اس عمارت کی حفاظت کے لیے [illegible] ہیں؟“ اس نے پہرے دار سے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔ ایک وقت میں بس دو ہی آدمی ڈیوٹی [illegible] صبح ہماری ڈیوٹی ختم ہوگی تو ہماری جگہ دوسرے دو [illegible] جائیں گے۔“ اس نے بتایا۔

”اس کے علاوہ یہاں حفاظت کا کیا انتظام ہے؟ [illegible] ہے کہ کوئی الیکٹرانک الارم سسٹم وغیرہ تو [illegible] نہیں ہے؟“

"نہیں، اس کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ بڑے صاحب کی حفاظت پر مامور ہر آدمی نے اپنی جان کی بازی لگا کر ان کی حفاظت کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور بجلی کی سی تیزی سے اس پر حملہ کر دیا۔ اس کی اب تک کی کیفیت کے باعث مشابرم خان کے لیے یہ حملہ قطعی غیر متوقع تھا۔ بہت تیزی سے پیچھے ہٹنے کے باوجود اس کے ہاتھ پر ایک ہلکا سا چرکا لگ ہی گیا۔ اس نے دیکھا کہ پہرے دار کے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا خنجر ہے جس سے وہ دوسرا وار کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔ مشابرم خان اس لڑائی کو طول نہیں دے سکتا تھا کیونکہ شور شرابے کی صورت میں اندر موجود بشیر اکبر ہوشیار ہو سکتا تھا۔

اس نے پہرے دار کے دوسرا حملہ کرنے سے قبل تیزی سے حرکت کی اور ہاتھ میں موجود رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے بھرپور وار کیا۔ اس کا نشانہ پہرے دار کا سر تھا لیکن کیونکہ پہرے دار خود بھی حرکت میں تھا اس لیے اس کا نشانہ خطا گیا اور رائفل کا بٹ اس کے شانے پر لگا۔ شانے پر لگنے والی یہ ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا اور جھٹکا لگنے کے باعث اس کے ہاتھ سے خنجر نکل گیا۔ خنجر ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر اس نے ایک وحشت ناک چیخ ماری اور چھلانگ لگا کر خنجر تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن اب مشابرم خان اسے مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس نے ایک بار پھر رائفل کو گھمایا اور اس بار اس کا نشانہ بالکل درست تھا۔ پہلی ہی ضرب سے پہرے دار کی کھوپڑی تڑخ گئی اور وہ لہراتا ہوا نیچے آ گرا۔ مشابرم خان نے احتیاطاً اسے ایک ضرب اور لگا دی لیکن حقیقتاً اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پہلی ضرب پر ہی بغیر آواز نکالے جہانِ فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ مشابرم خان اس کی رائفل کو پہلے ہی اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔ اس اضافی وزن کو ایک طرف پھینک کر اس کا خنجر اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ عجیب وضع کا خنجر تھا جس کی شکل کچھ ہلالی نما تھی اور وہ بے طرح جھلملا رہا تھا۔ دیکھنے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ خنجر کی دھار بہت تیز ہے اور وہ انسانی گوشت تو کیا ہڈیوں اور دیگر سخت چیزوں کو بھی بہ آسانی کاٹ سکتا ہے۔ خنجر کی ان خصوصیات کے پیشِ نظر مشابرم خان نے اسے اپنے ہاتھ میں ہی پکڑ لیا اور رائفل شانے سے لٹکا لی۔ اب اس کا رخ مرکزی عمارت کے دروازے کی طرف تھا جہاں اس کے یقین کے مطابق بشیر اکبر چین کی نیند سو رہا تھا اور اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کے عیش کدے کے باہر کون سی قیامت آ کھڑی ہوئی ہے۔

مرکزی دروازے پر آٹومیٹک لاک لگا ہوا تھا۔ اس قسم کے لاک کی خصوصیت ہوتی ہے کہ اسے اندر سے بغیر چابی لگائے صرف لٹو گھما کر کھولا جا سکتا ہے لیکن باہر سے کھولنے کے لیے ہر صورت چابی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس قسم کی مشکلات سے نمٹنے اور ہتھیار کے طور پر اپنے ساتھ کچھ سرجیکل آلات چرا لایا تھا لیکن اتفاق سے اسے ان چیزوں کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ یہاں آ کر ہتھیار کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا اور دروازے کا لاک کھولنے کے لیے بھی ہاتھ میں موجود خنجر بہت موزوں تھا۔ اس نے خنجر کی نوک کو اپنے مقصد کے لیے آزمایا تو ذرا سی کوشش سے ہی لاک کھل گیا۔ لاک کھلنے کے بعد اسے اندر داخل ہونے سے کون روک سکتا تھا۔ وہ آرام سے اندر گھستا چلا گیا۔ دبے قدموں چلتا ہوا عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ کچن کے برابر والے کمرے میں اسے ایک ادھیڑ عمر عورت سوئی ہوئی نظر آئی۔ عورت صورت سے ہی ملازمہ لگ رہی تھی جو یقینی طور پر بشیر اکبر کی رہائش گاہ پر کھانا پکانے اور صفائی ستھرائی جیسے کاموں کے لیے رکھی گئی تھی۔ مشابرم خان دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور عورت کی کنپٹی پر ہلکی سی ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ ملازمہ کو بے ہوش کرنے کے بعد اس نے باہر نکل کر احتیاطاً اس کے کمرے کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ اس کے بعد وہ ایک ایک کر کے کمروں کو چیک کرتا چلا گیا۔ ڈرائنگ روم، ڈائننگ ہال، لیونگ روم سب ہی اعلیٰ درجے کی اشیا سے مزین تھے اور یہ سارا اہتمام صرف ایک شخص کے لیے تھا۔ خالی کمروں میں جھانکتا ہوا وہ ایک کمرے کے دروازے پر پہنچا تو اس کے وجدان نے اسے بتایا، یہ کمرا خالی نہیں ہے اور کمرا خالی نہ ہونے کا مطلب تھا کہ وہاں بشیر موجود ہے۔ اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے اس نے دروازے پر کان لگا کر دوسری طرف سے کوئی آواز سننے کی کوشش کی لیکن وہاں مکمل سکوت تھا لیکن اس سکوت سے اس کا یہ یقین متزلزل نہیں ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے۔ وہ عمارت کے سارے کمرے دیکھ چکا تھا۔ وہاں اسے ایک بیڈ روم بھی ملا تھا لیکن اس کی سجاوٹ بتا رہی تھی کہ وہ مہمانوں کے لیے مختص ہے۔ شاید کبھی کبھار بشیر کا کوئی خاص مہمان آتا ہو گا تو اسے اس بیڈ روم میں ٹھہرانے کا اعزاز عطا کیا جاتا ہو گا ورنہ یہاں اس رہائش گاہ سے ہٹ کر ایک عمارت ایسی بھی تھی جسے مہمان خانے کا نام دیا گیا تھا اور دور دراز علاقوں سے آنے والے مخصوص افراد کو وہاں ٹھہرایا جاتا تھا۔

اس نے یہ سوچتے ہوئے کہ ... سے اس پر بیٹھے





تھی کہ وہ یہاں اپنے اس عیش کدے میں گھریلو ملازماؤں کو مقصد برآری کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ ان عورتوں کی زبانیں عقیدت، خوف، لالچ یا کسی بھی دوسری وجہ سے بند رہتی ہوں گی لیکن زرینہ ان کے گلے میں اٹک گئی تھی۔ مشابرم خان خود اپنے کانوں سے اس ضدی عورت کی بحث سن کر آیا تھا اور اب بشیر اکبر کی زبان سے اس کی موت کے احکامات جاری ہوتے ہوئے بھی سن لیے تھے۔

"تم بخت اتنی بڑی بڑی رقمیں لیتے ہیں مجھ سے لیکن کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتے۔" بشیر نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھا اور بڑبڑاتا ہوا ڈگمگاتے قدموں سے ایک صوفے کی طرف بڑھا۔ اس کے قدموں کی ڈگمگاہٹ نے بتایا کہ وہ نشے میں ہے۔ شاید نشے ہی کی وجہ سے وہ اتنے خراب لہجے اور بلند آواز میں بات کر رہا تھا ورنہ عام حالات میں اس کی جو تقریریں وغیرہ مشابرم خان نے سنی تھیں، ان



... ہونے کی وجہ سے بھی کمرے میں سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے دروازے کی ناب کو گھمایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اس لیے کھولا نہیں جا سکا۔ اب اس کے پاس خنجر کو آزمانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس بار اس نے پہلے سے کئی گنا زیادہ احتیاط برتتے ہوئے کارروائی کی۔ بشیر نیند کا کچا ہوا تو معمولی سے کھٹکے پر بھی جاگ سکتا تھا۔ ایک منٹ سے کم وقت میں وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ ناب گھما کر دروازے کو بس اتنا دھکا دیا کہ اس میں ذرا سی جھری پیدا ہو جائے اور اندر داخل ہونے سے پہلے کمرے کا باہر ہی سے جائزہ لے سکے۔ لیکن آنکھ لگانے سے پہلے ہی اسے اندر سے بلند مردانہ آواز سنائی دینے لگی۔ تب ہی اس پر منکشف ہوا کہ کمرا ساؤنڈ پروف ہے جو رازداری اور آرام کے تقاضے بھرپور طریقے سے ادا کر سکتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا ایک بڑا نقصان یہ تھا کہ کسی بھی قسم کی بیرونی آواز اندر نہ جانے کی وجہ سے اندر موجود شخص کو بیرونی حرکت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بشیر کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی کہانی ہوئی تھی۔

"نہیں ماتی سالی تو اسے ایک زہر کا انجکشن لگا دو لیکن بار بار فون کر کے مجھے ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا ... کا تو بول دینا سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ اس کی یا اس کے خاندان میں سے کسی کی کیا مجال ہے کہ ہماری کہی بات کو رد کرے۔ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو بے فکری سے کرو۔ آگے کے حالات میں خود سنبھال لوں گا۔ اور ہاں، کل تک میرے لیے کسی نوجوان ملازمہ کا بندوبست کر دو۔ وہ جو بڈھی کھوسٹ تم نے بھیجی ہے، اس کی شکل دیکھ کر تو میرا کھانا کھانے کا بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ اس بڑھیا کی وجہ سے میرا موڈ اور رات دونوں برباد ہو کر رہ گئے ہیں۔" بشیر کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ فون کان سے لگائے مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ اس کی گفتگو سن کر مشابرم خان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ڈاکٹر کو زرینہ نامی عورت کے بارے میں ہدایات دے رہا ہے۔

"اور ہاں سنو، اب کی بار جس کسی کو بھی بھیجو اسے پہلے بنگلے پر لا کر بھیجنا۔ میں بار بار ایسی مصیبتوں کو نہیں بھگت سکتا۔ تمہاری غفلت کی وجہ سے ہی آج وہ عورت سر پر چڑھ گئی ہے۔" اس کی نان اسٹاپ ہدایت کا سلسلہ جاری تھا۔ اب صورتِ حال اور بھی زیادہ واضح ہو گئی تھی۔ بشیر اکبر ... عوام کا خدمت گار رہنما تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے ہر طرف یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ اتنا مصروف رہتا ہے کہ اس نے شادی سے بھی گریز کر رکھا ہے۔ لیکن حقیقت

میں اس کا لہجہ نہایت دھیما اور نرم ہوتا تھا یا پھر یہ تھا کہ خلوت میں وہ اپنی اصلیت کے ساتھ ظاہر ہو رہا تھا۔ اب مزید انتظار بیکار تھا اس لیے مشابرم خان نے پیش قدمی کا فیصلہ کیا اور یک دم ہی پورا دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی وہ بجلی کے کوندے کی طرح اندر داخل ہوا اور پھر فوراً ہی اپنی پشت پر دروازے کو بند کر دیا۔ یہ صورتِ حال بشیر کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بُری طرح ہڑبڑا کر کھڑا ہوا تو اس کے ہاتھ میں موجود جام چھوٹ گیا اور دبیز قالین پر بے آواز گرا۔ اس میں موجود ام الخبائث بہہ کر قالین میں جذب ہو گئی۔

"کک... کون ہو تم؟" وہ لڑکھڑاتی آواز میں کیا جانے والا اپنا سوال مکمل کرتا، اس سے قبل مشابرم خان اس کے سر پر پہنچ کر خنجر کی دھار اس کے گلے پر رکھ چکا تھا۔

"کوئی آواز نکالے بغیر صرف اور صرف میری ہدایات پر عمل کرو ورنہ میں تمہاری شہ رگ کاٹ دوں گا۔" مشابرم خان نے خوفناک لہجے میں دھمکی دی۔

"یہ خنجر دور ہٹاؤ۔ میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔" بشیر کی نظریں خنجر پر گڑی ہوئی تھیں اور وہ مشابرم خان کی موجودگی سے زیادہ اس کے ہاتھ میں پکڑے خنجر سے خائف نظر آ رہا تھا۔

"میں نے یہ خنجر تمہارے ایک چاہنے والے سے چھینا ہے۔ وہ اس خنجر سے میری جان تو نہیں لے سکا لیکن میں تمہاری جان بہت آرام سے لے سکتا ہوں۔ اس لیے کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔" خنجر اس کی شہ رگ سے ہٹائے بغیر اس نے مزید دھمکی دی۔

"میں نے کہا ہے نا کہ میں تمہاری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ تم یہ خنجر دور ہٹا لو اور بتاؤ کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس بار مشابرم خان کو بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ خنجر سے بے پناہ خوف زدہ ہے۔

"تمہیں میرے ساتھ یہاں سے اس طرح چلنا ہوگا کہ کسی کو بھی یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف زبردستی یہاں سے لے جایا جا رہا ہے۔" اس نے خنجر ہٹانے کے بجائے اس کا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا اور اب بس اتنی ہی کسر باقی تھی کہ خنجر کی دھار اس کی جلد میں اتر جاتی۔

"میں راضی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا لیکن تم یہ خنجر دور ہٹاؤ۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا تو مشابرم خان نے اس کا بے پناہ خوف دیکھتے ہوئے خنجر کا دباؤ ذرا کم کر دیا۔

"ہم ابھی اور اسی وقت چلیں گے۔ تم یہ بتاؤ کہ باہر جانے کے لیے تمہاری گاڑی کون ڈرائیو کرتا ہے؟"

"میرے پہرے داروں میں ہر ایک ڈرائیونگ جانتا ہے اور میں کہیں جاتے وقت ان میں سے کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ ضرور رکھتا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"اس وقت ان دونوں میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں ہے کہ گاڑی چلا سکے۔ ویسے بھی تمہیں اکیلے ہی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟"

"ہاں۔" اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے تو پہلے اپنے نائب کو یہ اطلاع دو کہ تمہیں ابھی اور اسی وقت سب کچھ چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے دنیا سے کٹ جانے کا حکم ملا ہے اس لیے تم یہاں سے جا رہے ہو۔" بشیر کا جو ریکارڈ ان کے پاس موجود تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہلے بھی کم از کم دو بار اس طریقے سے غائب ہو چکا ہے اسی لیے اس نے اس وقت بھی اسے یہی بہانہ بنانے کا حکم دیا۔

"میں سمجھ گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ تم اب ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور مجھے فون کرنے دو۔" بشیر بہت آسانی سے تعاون پر آمادہ ہو گیا تھا۔ مشابرم خان کو اس سے ایسے بودے پن کی امید نہیں تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اس سے اپنی بات منوانے کے لیے اچھے خاصے تشدد سے کام لینا پڑے گا لیکن یہاں تو بہت آسانی سے بات بن گئی تھی اور وہ اس آسانی کو غیبی امداد سمجھ رہا تھا کیونکہ ظاہری طور پر بہت مضبوطی دکھانے کے باوجود وہ لمحہ بہ لمحہ کمزور ہوتا جا رہا تھا اور اس کے خیال میں ایسا خون کے مستقل رساؤ کی وجہ سے تھا۔

"میں تمہیں ذرا بھی چھوٹ نہیں دے سکتا۔ میرا خنجر تمہاری شہ رگ پر ہی رکھا رہے گا۔ تم فون کرو۔ اگر مجھے ذرا بھی گڑبڑ محسوس ہوئی تو میں تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔" وہ بشیر کے ساتھ ذرا بھی رعایت کرنے کو تیار نہیں تھا کیونکہ اسے ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ اس کا یہ متعاون رویہ کہیں کوئی چال ہی نہ ہو۔

"ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی لیکن ذرا احتیاط کرنا۔ یہ نہ ہو کہ خنجر انجانے میں میرے گلے میں گھس جائے۔" اسے راضی نہ ہوتے دیکھ کر اس نے ہتھیار ڈال دیے لیکن ساتھ ہی ایک خوف زدہ سی التجا کرنا نہ بھولا۔

"میں بے احتیاطی صرف اسی صورت میں کروں گا جب تم احتیاط نہیں کرو گے۔" مشابرم خان نے سنجیدگی سے جواب دیا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے فون کی طرف متوجہ کیا۔ بشیر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق فون کا ریسیور اٹھا کر





نائب کو... جانے کی اطلاع دینے لگا۔ اس نے مشابرم خان کے اشارے پر بات کو زیادہ طول نہیں دیا تھا مختصراً بتا کر کال منقطع کر دی تھی۔

"اب یہ بتاؤ کہ گاڑی کی چابیاں کہاں ہیں؟" وہ فون سے فارغ ہوا تو مشابرم خان نے اس سے استفسار کیا۔

"چابیاں اس میز کی دراز میں ہیں۔" اس نے ... سے بتایا۔

"نکالو۔" مشابرم خان اسے خنجر کی زد میں لیے ہوئے دراز تک لے گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے دراز کھولی۔ چابیوں کے ساتھ ہی سیاہ رنگ کا ولایتی پسٹل بھی رکھا تھا۔ پسٹل دیکھ کر مشابرم خان کی گرفت خنجر پر کچھ اور بھی سخت ہو گئی۔ بشیر نے اس کے جسم میں پیدا ہونے والا تناؤ واضح طور محسوس کیا اور پسٹل کی طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت کیے بغیر صرف چابیاں نکال لیں۔ وہ چابیاں نکال چکا تو مشابرم خان نے اسے پیچھے سے ٹھوکا دے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ وہ دونوں بیڈروم سے لے کر پورٹیکو تک اس طرح آئے کہ بشیر کی گردن پر ہنوز خنجر رکھا ہوا تھا۔

"تم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھو۔ میں پیچھے بیٹھوں گا۔" مشابرم خان نے اسے حکم دیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا خنجر بشیر کی گردن سے دور ہٹا تھا لیکن اس موقع پر بھی اس نے ... پھرتی کا مظاہرہ کیا اور بشیر کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے تک خود بھی عقبی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ لمحہ بھر میں ہی اس کا خنجر ایک بار پھر بشیر کی گردن پر تھا۔

"گلو کمپارٹمنٹ کھولو۔" بشیر اگنیشن میں چابی لگا رہا تھا کہ اسے پیچھے سے یہ حکم ملا۔ اس نے ہارے ہوئے انداز میں کمپارٹمنٹ کھول دیا۔ اس میں جدید ساخت کا ایک چھوٹا سا پسٹل رکھا ہوا تھا۔ مشابرم خان نے لپک کر پسٹل اپنے قبضے میں کر لیا۔

"میں ایک بار پھر تمہیں یاد دلا رہا ہوں کہ کوئی گڑبڑ نہیں کرنا ورنہ میں تمہارے دیوانوں سے بھی زیادہ پاگل ... ہوں۔ اپنی جان خطرے میں دیکھ کر میں تمہیں کسی ... نہیں بخشوں گا۔ ہاں اگر تم مجھ سے تعاون کرتے رہے ... میری حد تک تمہاری زندگی کی ضمانت ہے۔" اس نے پھنکارنے والے انداز میں بشیر کو یاددہانی کروائی تو وہ بس ... خشک لبوں پر زبان ہی پھیر کر رہ گیا اور اس کی اجازت سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ بے آواز انجن والی قیمتی گاڑی ... رفتاری سے آگے بڑھی۔ مشابرم خان نے خود کو عقبی نشست کے پائیدان میں اس طرح چھپا لیا کہ باہر سے ایک نظر دیکھنے پر وہ کسی کو دکھائی نہ دے۔ گاڑی کی چیکنگ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر خود بشیر اکبر موجود تھا۔ البتہ اس موقع پر اسے اپنی ایک کوتاہی کا احساس ضرور ہوا۔ وہ بشیر کو اسی حلیے میں اٹھا کر باہر لے آیا تھا جس میں وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھا شراب نوشی کر رہا تھا۔ عبادت گاہ کے محافظ جو ہمیشہ اسے نفیس نقش و نگار سے مزین ٹوپی اور چغے میں دیکھنے کے عادی تھے، اسے اس رف حلیے میں دیکھ کر ضرور چونکتے لیکن اب اس کے پاس اپنی غلطی کو درست کرنے کا موقع نہیں تھا۔ گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی اور وہ بہت مشکل سے بار بار دماغ کو اپنی لپیٹ میں لینے والی دھند کو سر جھٹک کر دور کر رہا تھا۔ آخرکار گاڑی عمارت کے مین گیٹ کو پار کر ہی گئی اور اس نے اپنے دل میں بڑی شدت سے اللہ کا شکر ادا کیا۔

"لیفٹ پر لے لو اور پھر جہاں سڑک ختم ہو وہاں گاڑی روک لینا۔" اس نے ایک اور حکم صادر کیا اور مشکل سے سر کو جھٹکا۔ بس اب ذرا ہی دیر کا راستہ بچا تھا۔ اس کے بعد طے شدہ منصوبے کے مطابق آرمی کی گاڑیاں ان کی منتظر ہوتیں۔ میجر اسفندیار سے یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ رات گیارہ سے صبح فجر تک آرمی کی دو گاڑیاں مسلسل مقررہ جگہ پر موجود رہیں گی اور اس کے بعد سارے معاملات وہ لوگ اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے۔ اس نے بہت کوشش سے مقررہ جگہ پر پہنچنے تک اپنے حواس کو قائم رکھا۔ شکر کا ایک مقام یہ بھی تھا کہ شک میں مبتلا ہو کر بشیر کے بی فنڈوں کی کوئی گاڑی تعاقب میں نہیں آئی تھی یا شاید ان میں سے کسی کی جرأت ہی نہیں ہوئی تھی کہ وہ بلا اجازت اس کی گاڑی کے پیچھے آ سکے۔ سچ جو بھی تھا، اس کے لیے یہ حقیقت سب سے

> ## گلاب اور کانٹا
>
> "یہ ٹھیک ہے کہ تم ایک گلاب نہیں بن سکتے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم ایک کانٹا بن جاؤ۔ یہاں ایک راز کی بات ہے اور وہ میں تمہیں بتا ہی دیتا ہوں کہ جو شخص کانٹا نہیں بنتا، وہ بالآخر گلاب بن ہی جاتا ہے۔"
>
> (اشفاق احمد، زاویہ 3۔ انتخاب ماہا ایمن، پنجاب)

بڑی تھی کہ اس نے اپنا مشن کامیابی سے مکمل کرلیا ہے۔ اس کے حسبِ ہدایت بشیر نے مقررہ جگہ پر گاڑی روکی تو اس نے گاڑی کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں اور ایک بار پھر سر جھٹک کر دماغ کو گرفت میں لے لینے والی دھند سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس بار اسے اپنی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی اور آنکھیں خودبخود ہی بند ہوتی چلی گئیں۔

"اسٹریچر لاؤ اور اسے ایمبولینس میں شفٹ کرو۔ ہری اپ۔" بند آنکھوں سے اس نے جو آخری چند آوازیں سنیں، ان میں گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ کسی کی چیختی ہوئی آواز میں کہا جانے والا یہ جملہ بھی شامل تھا۔ پھر اس کے بعد وہاں کیا کچھ ہوا، اسے خبر نہ ہوسکی۔

☆☆☆

"اتنے چپ چپ کیوں رہتے ہو بادشاہو! کچھ گل شل کیا کرو۔ ایسے زبان سی کر بیٹھے رہو گے تو جیل میں وقت گزارنا بڑا مشکل ہوجائے گا۔" جیل میں اس وقت تفریح کا وقفہ تھا اور قیدی کھلے میدان میں مختلف کھیل کھیل کر اپنا دل بہلا رہے تھے۔ سلو کا شمار خطرناک مجرموں میں ہوتا تھا اس لیے اسے سب سے الگ تھلگ کال کوٹھری میں رکھا گیا تھا اور ابتدائی ایام میں اسے اس کی کوٹھری سے بالکل بھی باہر نہیں نکالا جاتا تھا۔ اندھیری اور سیلن زدہ کال کوٹھری کے چند دنوں نے ہی اس کے دماغ کے بہت سے کیڑے جھڑا دیے تھے اور وہ ایک نفرت میں ڈوبے ہوئے دشمن کی حیثیت کے بجائے مختلف انداز میں سوچنے لگا تھا۔ سوچ کی اس تبدیلی کے بہت سے محرکات تھے جن میں سب سے پہلا محرک تو یہ سوال تھا کہ اسے وزیرِاعلیٰ کے بیٹے کے ولیمے میں اس کے مخالف سیاسی لیڈر کے قتل کے لیے کیوں چنا گیا تھا؟ اس بھری پُری محفل میں متعدد سیکیورٹی اہلکاروں کی موجودگی میں وہ ایک شخص کو قتل کرنے کے بعد کیسے بچ کر نکل سکتا تھا؟ اور اگر یہ ممکن ہی تھا تو وہ بیک ڈور اور مددگار جنہیں اس واردات کے بعد اسے جائے وقوعہ سے فرار کروانا تھا، عین موقع پر کدھر غائب ہوگئے تھے؟ اور وہ آدمی کون تھا جو اس کی ناکامی کے بعد اسے شوٹ کردینا چاہتا تھا؟ اس نے خود دیکھا تھا کہ وزیرِاعظم کے سیکیورٹی انچارج نے اس کی ناکامی کے بعد اسے گولی مارنے کی کوشش کی تھی اور اگر عین وقت پر ایک دوسرا آدمی اسے چھاپ نہ لیتا تو اس کی جان جانا یقینی تھا۔ گرفتاری کے بعد اسے اس کی فردِ جرم سنانے والوں نے اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا تھا کہ بھارت میں اس کی پرورش خاص مقاصد کے تحت کی گئی تھی اس لیے وہ خود اپنے وطن اور ہم وطنوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ اسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس کی شخصیت کے نظروں میں آجانے کے بعد اسے اپنا کہنے والوں نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش فرمائی تھی۔ ادھر وہ وزیرِاعلیٰ کے مخالف سیاسی لیڈر کو گولی مار کر ہلاک کرتا، ادھر چیف سیکیورٹی آفیسر کے ذریعے اس کا کام تمام کردیا جاتا۔ بھارتیوں کے اس سفاکانہ رویّے نے اسے ذہنی طور پر بُری طرح الجھا دیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ دونوں ملکوں میں سے کسے صحیح سمجھے اور کسے غلط۔

اس نے انٹیلی جنس والوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اپنی زبان نہیں کھولی تھی اور مسلسل خاموش رہا تھا۔ اس خاموشی کے باوجود اسے جیل کی کال کوٹھری میں دھکیل دیا گیا تھا کیونکہ جاننے والے جانتے تھے کہ اس نے کوئی اور جرم چاہے نہ کیا ہو لیکن بھارت کا ایجنٹ تو وہ بہرحال ہے۔ سیلن زدہ تاریک کوٹھری میں اس کے دن بہت تکلیف میں گزر رہے تھے اور ابتدائی دو چار دن تو وہ انسانی شکل کیا، آوارہ کتوں کے لیے بھی ترس کر رہ گیا تھا۔ بس کوئی شخص چپکے سے کوٹھری کے دروازے کے نیچے سے کھانا، نمدہ سرکا دیتا تھا جسے وہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے کسی نہ کسی طور تھوڑا بہت کھا لیتا تھا۔ اسے اس اذیت سے جزوی طور پر کئی دن بعد نجات ملی اور اتنی اجازت دے دی گئی کہ وہ تفریح کے وقفے میں گھنٹا بھر کے لیے اپنی کوٹھری سے باہر کھلے میدان میں آسکتا ہے۔ گھنٹے بھر کی یہ چھوٹ اسے غنیمت معلوم ہوئی تھی لیکن اس ایک گھنٹے میں اس نے کبھی کسی کھیل میں حصہ لینے یا کسی دوسرے قیدی سے بات چیت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چند ایک قیدیوں نے خود سے اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کی بھی لیکن اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملنے پر وہ پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن یہ ایک شخص تھا جو کسی جونک کی طرح اس سے چمٹ کر رہ گیا تھا اور ہر روز تفریح کے اس وقفے میں اس سے بات چیت اور چھیڑ چھاڑ کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ الجھی ہوئی سوچوں میں گم رہنے والے سلو نے کبھی اس کی باتوں پر ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی وہ باز نہیں آتا تھا۔

"سنا ہے تو دہشت گردی کے الزام میں پکڑا گیا ہے لیکن تیری بھولی شکل دیکھ کر دل نہیں مانتا۔ سچ بتا، کچھ کیا بھی تھا یا ان سالے پولیس والوں نے تجھے ایسے ہی بھرتی کے لیے پکڑ لیا۔ یہ سالے بڑے... ہیں۔" اس نے ... گالی دی۔ "اصل مجرموں کے تو قریب جاتے ہوئے ان کی پتلونیں گیلی ہوجاتی ہیں لیکن نوکری بچانے کے چکر میں بے





گناہوں کو پکڑ کر گنتی پوری کر دیتے ہیں... کو اپنی کارکردگی بھی تو ظاہر کرنی ہوتی ہے۔" اس نے ایک بار پھر ایک موٹی سی گالی جلد پولیس اہلکاروں کو دی۔ سلو نے اس کی کسی بات کی تردید یا تصدیق کرنے کی کوشش نہیں کی اور یونہی خاموش رہا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس شخص کی باتیں نہ سن رہا ہو یا پھر اسے اس کی باتوں سے الجھن ہورہی ہو لیکن پھر بھی ... سے گریزاں تھا تو اس لیے کہ اسے شک تھا کہیں یہ شخص کسی خفیہ ادارے کے لیے جاسوسی کا کام نہ کررہا ہو۔ اسے معلوم تھا کہ جیلوں میں بعض قیدی ایسے بھی ہوتے ہیں جو جیل انتظامیہ یا پھر کسی اور ادارے کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ قیدی اس اعتبار سے بڑے خطرناک ہوتے ہیں کہ دوسرے قیدی انہیں اپنا ساتھی تصور کرتے ہوئے ان کے سامنے اپنے بہت سے راز اگل ڈالتے ہیں اور بعد میں یہ چیز ان کے لیے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔ سلو کا سینہ بہت سے رازوں سے بھرا ہوا تھا جنہیں کوئی نہیں اگلوا سکا تھا اس لیے اسے بجا طور پر شک تھا کہ اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملنے کے باوجود اگر یہ شخص زبردستی اس کے گلے پڑنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے تو یقیناً کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

"دیکھ بھائی! بات سن۔ تجھ پر جو الزام لگا ہے نا وہ ایسا نہیں ہے کہ تو دو چار سال کی جیل کاٹ کر آزاد ہوجائے۔ تیری تو ساری زندگی جیل میں سڑتے ہوئے گزر جائے گی یا اگر باہر نکلا بھی تو ایسی عمر میں نکلے گا کہ تیرے لیے اپنی روٹی کمانا بھی مشکل ہوجائے گا اور تو سڑکوں پر آوارہ کتوں کی طرح ایڑیاں رگڑتا ہوا پھرے گا۔" وہ غیر محسوس طور پر سلو سے بالکل قریب کھسک آیا تھا اور دھیمی آواز میں بڑی ہمدردی سے یہ سب کہہ رہا تھا۔

"تمہیں کیا غرض ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں؟" سلو نے پہلی بار اس کی کسی بات کا جواب دیا لیکن لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

"مجھے تیری بھری جوانی پر رحم آتا ہے۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے... بہت ہوا تو بیس اکیس کا ہوگا۔ سچ کہوں تو ابھی تیرے جینے کودنے اور عیش کرنے کے دن تھے اور تو آکر بیٹھ گیا ہے اس جیل میں، وہ بھی دہشت گردی کے الزام میں۔ ... بڑا دکھ ہوتا ہے تجھے دیکھ کر۔ دل چاہتا ہے کہ تیرے لیے کچھ کروں۔" اس کا لہجہ ہمدردی سے بھرا ہوا تھا۔

"تم کیا کرسکتے ہو میرے لیے؟" اس نے سوچ لیا تھا کہ آج اس شخص سے بات کرکے اس کی اصلیت جاننے کی کوشش کرنی چاہیے، چنانچہ گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

"کرنے کو تو میں بہت کچھ کرسکتا ہوں اور کرنا بھی چاہتا ہوں لیکن پتا نہیں تم اعتماد کے لائق ہو بھی یا نہیں؟"

اس کا انداز سلو کو بڑا معنی خیز محسوس ہوا لیکن یہ بات اپنے کسی انداز سے ظاہر نہ ہونے دی اور بےنیازی سے بولا۔ "یہ فیصلہ تو تمہیں خود کرنا ہوگا۔ میں بھلا تمہیں اپنے بارے میں کیا گارنٹی دے سکتا ہوں۔ میں تمہارے پاس مدد کی درخواست لے کر بھی نہیں آیا ہوں اس لیے تمہاری اپنی مرضی ہے کہ مجھ پر اعتماد کرو یا نہیں، میری طرف سے بہرحال کوئی اصرار نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اپنا دل بولتا ہے کہ تم پر اعتبار کروں۔" اس نے جواب دیا۔ اس بار سلو خاموش رہا۔ "یہ دیکھو، میرے پاس کیا ہے۔" اس نے سلو کا ہاتھ پکڑ کر بڑی رازداری سے اپنی جیب پر لگایا۔ سلو ہاتھ لگتے ہی بُری طرح چونک گیا۔ اس کے تربیت یافتہ مشاق ہاتھوں نے فوراً ہی بھانپ لیا تھا کہ اس کے ہاتھوں نے جس سخت چیز کو چھوا ہے، وہ کوئی ریوالور ہے۔ وہ سوالیہ نظروں سے اپنے ہمدرد کو دیکھنے لگا۔ "میں نے اور میرے کچھ ساتھیوں نے مل کر جیل سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں کھیل شروع ہو جائے گا۔ اگر تم چاہو تو موقع کا فائدہ اٹھا کر ہمارے ساتھ بھاگ سکتے ہو۔" اس کی پیشکش ایسی تھی کہ سلو ہکا بکا رہ گیا۔ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ صورت سے خطرناک لگنے والا یہ قیدی اسے ایسی پیشکش کرے گا۔

"تمہارے پاس زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں ہے۔ تمہیں ابھی فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمارے ساتھ یہاں سے بھاگو گے یا ساری زندگی اس جیل میں سڑتے ہوئے برباد کرو گے۔ وہ دیکھو... وہاں کھیل شروع بھی ہوگیا ہے۔" اس نے فٹ بال کھیلتے ہوئے قیدیوں کی سمت اشارہ کیا۔ ان کے درمیان کھیلتے کھیلتے اچانک ہی لڑائی شروع ہوگئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ لڑائی اتنی بڑھی کہ آپس میں گتھم گتھا کئی قیدی خونم خون ہوگئے۔ کسی کا سر پھٹا تو کسی کا ہونٹ، کسی کی ناک سے خون بہہ نکلا تو کوئی اپنے ہاتھ پیر سہلانے لگا۔ پہرے پر موجود سپاہیوں نے آگے بڑھ کر حالات کو سنبھالنے کی کوشش کی تو کچھ قیدیوں نے ان کی بندوقیں چھین لیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں فائرنگ شروع ہوگئی۔ ہر طرف ہاہاکار مچ گئی۔ قیدی ادھر سے ادھر بھاگنے لگے۔ سپاہیوں کی سیٹیاں اور چیختی ہوئی آوازیں سنائی دینے لگیں اور ان سب آوازوں پر سب سے بھاری آواز اس ایمرجنسی الارم کی تھی جو جیل میں بجا دیا

گیا تھا۔ سلو دم بخود سا کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ لمحوں میں جیسے سب کچھ الٹ پلٹ کررہ گیا تھا۔

”آؤ میرے ساتھ، یہ یہاں سے بھاگنے کا سب سے سنہری موقع ہے۔“ اس کے ساتھ کھڑے قیدی نے اس کا ہاتھ تھام کر تیز سرگوشی کی اور اسے ایک طرف کھینچنے لگا۔ انگشت بدنداں سلو کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس کے ذہن میں اس وقت ساتھی قیدی کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو وہ اسے سمجھا رہا تھا کہ اس پر جو الزامات ہیں، ان کے باعث وہ جیتے جی جیل کی زندگی سے نجات حاصل نہیں کرسکتا اور اگر اتفاق سے تیس چالیس سال بعد آزاد ہو بھی گیا تو اس حال میں نہیں ہوگا کہ زندگی سے کوئی لطف کشید کرسکے۔ اس کی ان باتوں میں حقیقت تھی اور خود وہ بھی قید کے ان چند دنوں میں اس نہج پر سوچتا رہا تھا اور اگر اب قسمت سے اسے زندگی کی طرف جانے کا ایک موقع مل رہا تھا تو وہ اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتا۔ آزاد فضاؤں میں سانس لینے کے لالچ نے اس کے قدموں میں پھرتی پیدا کردی اور وہ اپنے نجات دہندہ کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔

ان کا رخ جیل کی اس دیوار کی طرف تھا جہاں ان سے پہلے ہی کئی قیدیوں نے پہنچ کر کام دکھانا شروع کردیا تھا۔ ان قیدیوں کے ہاتھوں میں بیلچے، پھاوڑے اور کدالیں وغیرہ موجود تھیں جن سے پے درپے ضربیں لگا کر وہ دیوار میں شگاف پیدا کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ قیدیوں کے پاس اتنی بروقت ان چیزوں کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ منصوبہ بہت پہلے سے تیار تھا اور ابھی صرف موقع پیدا کیا گیا تھا۔ منصوبہ سازوں نے اتنی چالاکی سے کام لیا تھا کہ کئی سپاہیوں کی رائفلیں چھین کر انہیں بے بس کردیا تھا اور وہ دھواں دھار فائرنگ کرتے ہوئے دیوار توڑنے والوں کو کور دے رہے تھے۔ انہیں کوئی پروا نہیں تھی کہ اس فائرنگ سے پولیس والوں کے ساتھ ان کے ساتھی قیدی بھی زد میں آسکتے ہیں۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا اور موقع کا فائدہ اٹھا کر وہ بھی فرار کی کوشش میں تھے جو اس سازش میں شامل نہیں تھے۔

”ہم ادھر سے کمند ڈال کر باہر نکلیں گے ورنہ اگر اس دیوار تک جانے کی کوشش کی تو مارے بھی جاسکتے ہیں۔ دیوار مضبوط ہے جانے ٹوٹ بھی سکے یا نہیں۔ اوپر سے وہ لوگ دھواں دھار فائرنگ کررہے ہیں۔ ہمیں کوئی گولی بھی لگ سکتی ہے۔“ بھاگتے بھاگتے سلو کے ساتھی قیدی نے اس سے کہا اور پہلو کی دیوار کی طرف رخ موڑ لیا۔ سلو کیا کہتا، وہ تو اس کے رحم و کرم پر تھا اور آزادی کے لیے صرف اور صرف یہ چانس لے رہا تھا ورنہ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ منصوبہ کیا ہے اور کیا نہیں۔ اسے تو بس اس شخص پر ہی انحصار کرنا تھا۔

دونوں بھاگتے ہوئے کئی دوسرے قیدیوں سے ٹکراتے پہلو کی دیوار کے قریب پہنچے تو اس شخص نے اپنی قمیص اٹھا کر کمر سے بندھی ایک مضبوط رسی پھرتی سے کھول کر ہاتھ میں پکڑی۔ رسی کے سرے پر بڑا سا آنکڑا بندھا ہوا تھا۔ اس نے رسی گھما کر پوری قوت سے اس دیوار کی طرف اچھالی تو آنکڑا دیوار میں پھنس گیا۔

”چلو پہلے تم اوپر چڑھو۔“ اس نے سلو کو اشارہ کیا تو وہ پھرتی سے حرکت میں آگیا۔ رسی کی مدد سے بلند دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کودنا اس کے لیے بہت معمولی سی بات تھی اور اتنی آسانی سے آزادی حاصل ہونے کے خیال نے اس کے اندر جوش و ولولہ بھر دیا تھا۔ رسی کا سرا تھام کر وہ بندر کی سی پھرتی سے اوپر چڑھنے لگا۔ اسی وقت اسے رائفل چلنے کی زوردار آواز سنائی دی اور گولی شوں کی آواز سے اس کے بہت قریب سے گزری۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ دو قیدی ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں موجود رائفل سے دھواں نکل رہا تھا۔ دوسرے کی پوری کوشش تھی کہ اس سے رائفل چھین لے۔ اس کشمکش کے دوران ہی وہ بلند آواز سے چیخا۔

”سلیم او، بس اتر جاؤ۔ ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔“ سلو تذبذب میں مبتلا ہوگیا۔ چند فٹ کی دوری پر آزاد فضا تھی لیکن نیچے سے کوئی اسے پکار رہا تھا کہ اگر وہ نیچے نہ اترا تو مارا جائے گا۔ لمحہ بھر قبل ہی اس نے موت کو اپنے سے چند انچ کے فاصلے سے گزرتے دیکھا تھا اس لیے ٹھٹک گیا تھا۔ اس کا یہ رکنا محض چند سیکنڈ کا ہی تھا لیکن اس کی تیز نظروں نے فوراً ہی دیکھ لیا کہ اسے بھاگنے کی ترغیب دینے والے قیدی نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا ہے اور اس ریوالور کا رخ اسی کی طرف ہے۔ اب بھاگنے کا موقع نہیں تھا۔ نہ ہی وہ گولی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے باقی ماندہ فاصلہ طے کرسکتا تھا چنانچہ وہیں سے ریوالور بردار پر چھلانگ لگا دی۔ وہ اسے چھلانگ لگاتا ہوا دیکھ چکا تھا، اس نے فوراً ہی فائر ۔۔۔ فائر کی بلند آواز کے ساتھ ہی فضا میں ایک انسانی چیخ بھی بلند ہوئی اور دور تک پھیلتی چلی گئی۔

یہ پُرسچ وسسی حیرداستان جاری ہے

مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں



مشاغل اگر دلچسپ نوعیت کے ہوں تو وہ کبھی کبھی سود مند ثابت ہوجاتے ہیں... ایک سابق افسر کی دلچسپیاں... اسے ہر مرنے والے سے خصوصی انس تھا اور وہ ان کے انتقال پُرملال کے کالم بڑے شوق اور انہماک سے پڑھتا تھا...!

**...انداز و اطوار سے مزین ایک منفرد کہانی کے اتار چڑھاؤ**

# مفید مشغلہ

میمونہ عزیز

...نے کے کھانے کے بعد میں اور نتاشا آتش دان کے سامنے بیٹھے تھے۔ نتاشا نے جنگ کی سلائیاں سنبھال لی تھیں ...نے حسب معمول اخبار کا وہ صفحہ سنبھال لیا جس میں ...مرنے والوں کی خبریں چھپتی تھیں۔ یہ دلچسپی مجھے اپنی نوکری ...ہونے کے بعد ہوئی تھی ... کی پینتیس سالہ ... ہنگامہ خیز نوکری کرنے کے بعد جب میرا ... پُرسکون زندگی سے واسطہ پڑا تو میں ڈھلا گیا۔

سان فرانسسکو جیسے بڑے شہر کی ہنگامہ خیزیوں سے ...شاپ جیسے چھوٹے اور پُرسکون قصبے میں رہائش اختیار کرنے کے بعد زندگی کے ٹھہراؤ کا احساس کچھ زیادہ ہی ہونے لگا۔ یہ قصبہ سان فرانسسکو سے کوئی تین سو کلومیٹر مشرق میں ہے اور پہاڑوں کے درمیان ہے۔ آبادی زیادہ نہیں ہے، کوئی چار ہزار نفوس پر مشتمل ہوں گے۔ یہ بہت خوبصورت اور دولت مند لوگوں کا قصبہ ہے۔

میرا تعلق بھی بائی شاپ سے ہے اور نتاشا بھی یہیں کی رہنے والی ہے بلکہ دور رشتے میں میری دور کی کزن بھی لگتی ہے۔ کوئی بتیس سال پہلے میں چھٹیوں میں گھر آیا تو ایک تقریب میں نتاشا سے ملاقات ہوئی اور نظروں نے محبت کا تیر چلایا اور ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ شادی کر کے میں اسے سان فرانسسکو لے گیا۔ آنے والے بتیس سال تک ہم صرف چھٹیوں میں بائی شاپ آتے تھے۔ شادی کے آٹھ سال میں ہمارے چار بچے ہوئے، دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔

شروع میں میں ایمرجنسی فورس میں تھا پھر میں نے ہومی سائڈ میں تبادلہ کرا لیا کیونکہ اس میں ذرا سکون تھا۔ البتہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب کیس کی تفتیش جاری ہوتی تو چوبیس گھنٹے میں سے بہ مشکل چھ گھنٹے گھر میں گزارنے کا موقع ملتا تھا۔ میں ہومی سائڈ سے ہی ریٹائر ہوا تھا۔ اس دوران میں ہمارے بچے تعلیم مکمل کر کے اور جاب شروع کر کے اپنا گھر بسا چکے تھے۔ اس لیے ہم نے طے کر لیا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بائی شاپ منتقل ہو جائیں گے جہاں میرا آبائی گھر موجود تھا۔ ڈیڈ کے انتقال کے بعد یہ خالی پڑا تھا۔ میرے چار بہن بھائی اور ہیں لیکن ان کو اس مکان سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ سب میرے حق میں دست بردار ہو گئے اور یہ میرے نام ہو گیا۔ یہ اچھا بڑا دو منزلہ اور چار بیڈ روم کا مکان تھا۔ یعنی کوئی ہم سے ملنے آتا تو رہنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ نتاشا عام عورتوں کے برعکس کفایت شعار اور سلیقہ مند ہے۔ اس کی وجہ سے میں نے ملازمت کے دوران بہت کچھ بچایا تھا اور اس سے شیئرز لے لیے تھے۔ پھر مجھے سوشل سیکیورٹی پنشن بھی مل رہی تھی۔ شیئرز اور پنشن مل کر ہمارے گزارے کے لیے کافی سے زیادہ تھے۔ مکان کے ساتھ ایک چھوٹا سا باغ تھا جس میں پھل دار درخت لگے تھے اور یہاں ہم اپنے لیے سبزیاں اگا سکتے تھے۔ اس طرح مجھے اور نتاشا کو ایک مصروفیت مل جاتی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ہم نے اس پلان پر عمل کیا۔ سان فرانسسکو میں ہمارا جو گھر تھا، اسے ہم نے فروخت کر دیا۔ سامان بھی سارا نکال دیا اور صرف ضروری چیزیں ساتھ لے لیں۔ آبائی مکان فرنشڈ تھا اور یہ سارا فرنیچر ڈیڈی نے خود بنوایا تھا اور اس کی برابر دیکھ بھال کرتے رہے تھے اس لیے یہ بہت اچھی حالت میں تھا۔ مرمت اور رنگ کا کام میں نے خود کیا۔ اس کے بعد جب سب سیٹ ہو گیا اور کرنے کو کچھ نہیں رہا تو پہلی بار محسوس ہوا کہ ہم ایک سست رفتار زندگی میں آ گئے ہیں۔

اگرچہ ہم بور نہیں تھے لیکن کبھی کبھی سناٹا اور تنہائی چبھنے لگتی تھی۔ سان فرانسسکو میں آس پاس پڑوسی تھے اور یہاں نزدیک ترین پڑوسی بھی کوئی تیس گز کے فاصلے پر تھا۔ گزشتہ تیس سال میں موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے بائی شاپ میں بارشیں زیادہ ہونے لگی تھیں جس کی وجہ سے یہاں اب پیڑ درخت بھی پنپنے لگے تھے۔ ورنہ پہلے سبزے کی کمی تھی۔ ان درختوں کی وجہ سے قصبہ پہلے سے زیادہ خوب صورت دکھائی دینے لگا تھا۔

رفتہ رفتہ زندگی سیٹ ہونے لگی۔ سرما سے پہلے ہم باہر زیادہ جاتے تھے اور رشتے داروں سے مسلسل ملاقات کرتے تھے لیکن سرما میں شام کے بعد باہر نکلنا ممکن نہیں ہوتا تھا اس لیے ہمیں اندر وقت گزاری کے لیے کچھ نئے مشغلے تلاش کرنے پڑے۔ ان میں سے ایک اخبار میں انتقال پر ملال والا صفحہ پڑھنا بھی تھا۔ شروع میں تو وقت گزاری کے لیے پڑھتا تھا لیکن پھر مجھے اس سے دلچسپی ہو گئی۔ اب یہ حال ہے کہ مجھے اخبار کے کسی حصے سے اتنی دلچسپی نہیں ہے جتنی کہ اس صفحے سے ہے۔ جب میں نے یہ صفحہ پڑھنا شروع کیا تو نتاشا کو تعجب ہوا۔

''ہیرس! میں نے آج تک کسی کو ماتمی کالم پر غور سے پڑھتے نہیں دیکھا۔''

''میں نے بھی نہیں دیکھا۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''لیکن مجھے اس سے دلچسپی ہے۔''

''بھلا موت کی خبروں میں دلچسپی کہاں سے آ گئی؟ مجھے تو پڑھتے ہوئے کوفت ہوتی ہے۔'' نتاشا نے کہا۔

''نہیں... نہیں، یہ بڑی دلچسپ چیز ہے۔'' میں نے پرزور تردید کی۔ ''ایک ماتمی کالم میں آنے والی خبر ایک مرحوم کے ماضی کا تمام احوال سناتی ہے۔''

لیکن نتاشا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ البتہ ایک اچھی بیوی کی طرح اس نے مجھے بھی ماتمی کالم پڑھنے اور کسی خاص خبر پر تبصرہ کرنے سے منع نہیں کیا۔

بائی شاپ شمال سے زیادہ دور نہیں ہے اور پہاڑی قصبہ ہے اس لیے یہاں موسم سرما طویل ہوتا ہے۔ وسط نومبر سے لے کر مارچ کے آخر تک برف پڑتی ہے اور راتوں میں درجۂ حرارت اکثر منفی میں چلا جاتا ہے۔ ایسے میں سب سے اچھی جگہ آتش دان کے سامنے والی لگتی ہے۔ [illegible]

[illegible]

بہ غیر متوقع طور پر نومبر کے پہلے ہفتے میں ہی برف باری ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے شمال کی جانب سے تیز یخ ہوا چلتی رہی تھی۔ برف باری کے بعد شام کو دوبارہ ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی۔

میں نے آتش دان کے سامنے کرسی اور اخبار سنبھالا تو نتاشا نے ایک نظر مجھے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ اس نے میرے لیے برانڈی کا گلاس پہلے ہی تپائی پر رکھ دیا تھا۔ میں نے اس سے ایک گھونٹ لیا اور پھر اخبار کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ بائی شاپ پوسٹ تھا جس میں آس پاس کی تمام اہم خبریں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ سے بھی خبریں لیتا ہے جو میرے پسندیدہ اخبارات ہیں اس لیے میں نے اس اخبار کا انتخاب کیا۔ صبح کے اوقات میں میں اس کے دوسرے حصے پڑھتا تھا اور ماتمی کالم رات کے لیے سنبھال کر رکھ لیتا۔

میں نے مرحومین کا جائزہ لیا۔ گزشتہ روز کل چار اموات ہوئی تھیں۔ ان میں سے بائی شاپ میں صرف ایک وفات ہوئی تھی۔ مسٹر جان سنو دنیا سے گزر گئے تھے اور وہ کینسر کی وجہ سے دو سال سے شدید علیل تھے۔ باقی تین اموات بائی شاپ کے آس پاس کے قصبوں میں ہوئی تھیں۔ جان سنو کی خبر میں کوئی خاص بات نہیں تھی کیونکہ ایک تو میں اسے جانتا تھا اور دو دن بعد مجھے اس کی تدفین میں شامل ہونا تھا اور دوسرے اس کا ماضی بھی میرے سامنے کھلا ہوا تھا۔

باقی تین میں سے ایک وفات نوجوان لڑکے کی تھی جو تیز رفتاری کی وجہ سے بائیک پر قابو نہ رکھ سکا اور ایک گہری کھائی میں جا گرا تھا۔ تھامسن نامی اس نوجوان کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی اور وہ ہائی اسکول کے آخری سال میں تھا۔ اس بے چارے کا کوئی ماضی نہیں تھا کیونکہ وہ ابھی اتنی عمر کا نہیں ہوا تھا۔ اس کی خبر میں صرف ایک بات قابلِ توجہ تھی کہ اس نے دو دن پہلے ہی اپنی کلاس فیلو جیسی رائٹ ووڈ سے منگنی کی تھی۔ دونوں کا تعلق دولت مند گھرانوں سے تھا اس لیے امکان تھا کہ منگنی جلد شادی میں بدل جاتی۔ لیکن اس سے پہلے ہی موت نے تھامسن کی زندگی کا پتا گرا دیا۔ اس کی تدفین چار [illegible] وہ سارہ بوک کا رہنے والا تھا، یہ قصبہ بائی شاپ سے دو میل شمال میں ہے۔

باقی دو اموات بائی شاپ کے مغرب میں پہاڑی [illegible]

[illegible]



تھی اور تعلق میٹ ولا سے نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق ریڈ بفیلو نامی قصبے سے تھا جو سان فرانسسکو سے بارہ سو کلومیٹر شمال میں ہے۔ یعنی بائی شاپ سے کوئی چودہ سو کلومیٹر دور۔ نتاشا مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا تمہیں کوئی خاص خبر نظر آئی ہے؟'' نتاشا نے کہا۔ خبر سے مراد موت کی خبر تھی لیکن وہ موت کا لفظ کہنے سے گریز کرتی تھی۔

میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں، دو اموات قابلِ ذکر ہیں۔''

''اموات بھی قابلِ ذکر نہیں ہوتیں، یہ قابلِ فراموش ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے لوگ جلد انہیں بھول جاتے ہیں۔'' اس نے تبصرہ کرنے کے انداز میں اختلاف کیا۔

''لیکن کچھ لوگوں کی موت دلچسپ ہوتی ہے اور قابلِ ذکر بھی۔'' میں نے کہا۔ ''جیسے کہ یہ دونوں ان میں ایک صرف چالیس سال کی عمر میں مر گیا لیکن اس کی موت کی وجہ نہیں لکھی ہے۔ جان مورگن نامی یہ شخص پہلے پولیس میں تھا۔ اس کے بعد یہ ایک ہوٹل میں کام کرنے لگا۔ پھر اس نے بک شاپ کھولی اور آخر میں ایک پرنٹنگ پریس چلانے لگا۔ اس کی وفات پرسوں رات کسی وقت ہوئی تھی یعنی اتوار اور پیر کی درمیانی رات۔ موت کا وقت بھی نہیں لکھا ہے اور نہ ہی اس کے کسی رشتے دار کا حوالہ ہے۔ کل بدھ کے دن اس کی دعائیہ تقریب ہے اور کل ہی شام کو اسے دفن کر دیا جائے گا۔''

''اس میں کیا خاص بات ہے؟'' نتاشا نے اکتائے کے انداز میں کہا۔ اگرچہ وہ میرے تبصروں سے اختلاف کرتی تھی اور یوں ظاہر بھی کرتی تھی جیسے اسے ان سے کوئی دلچسپی نہ ہو لیکن میں جانتا تھا کہ وہ میرے اس مشغلے سے چڑنے کے باوجود میرے تبصروں میں دلچسپی لیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ میرا خیال جاننا چاہ رہی تھی۔

''خاص بات تو کوئی نہیں ہے لیکن اس شخص میں کچھ خاص بات یقیناً تھی۔ اس نے صرف چالیس سال کی عمر تک چار پیشے بدل لیے۔ اس نے پہلے پولیس کی ملازمت کی لیکن اس نے ریٹائرمنٹ یقیناً نہیں لی تھی۔ اس کی برطرفی کا ذکر بھی نہیں ہے۔ پھر اس نے ایک ہوٹل میں ملازمت کی۔ شاید وہ ڈیسک کلرک یا ہاؤس ڈیٹیکٹو بن گیا ہوگا۔ پھر اس نے یہ کام یا نوکری بھی کسی وجہ سے چھوڑ دی اور اپنی بک شاپ کھول لی۔ سب سے آخر میں اس نے اپنا پرنٹنگ پریس کھول لیا۔''

''اس میں کیا خاص بات ہے؟ لوگ اکثر اپنے پیشے بدلتے رہتے ہیں۔'' نتاشا نے کہا۔ ''یہ جان مورگن جوانی

میں یقیناً عام جوانوں جیسا ہی جوش ہوگا اس لیے اس نے پولیس فورس جوائن کرلی لیکن جلد اسے احساس ہوگیا ہوگا کہ وہ پولیس کی ملازمت کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اس لیے اس نے پولیس سے استعفا دے دیا۔ پھر اس نے ہوٹل میں ملازمت کی مگر یہاں بھی اس کی تشفی نہیں ہوئی اور اس نے محسوس کیا کہ وہ ادبی ذوق کا آدمی ہے اس لیے اس نے بک شاپ کھول لی۔ اسے کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے دکان نہیں چل سکی اور بالآخر اس نے بک شاپ سے متعلق ایک کام اختیار کرلیا یعنی پرنٹنگ پریس کھول لیا۔''

میں صبر و تحمل کے ساتھ اس کی رائے سن رہا تھا۔ جب وہ چپ ہوگئی تو میں نے کہا۔ ''اوّل تو اس نے پولیس ملازمت سے استعفا نہیں دیا تھا، اس صورت میں کالم میں اس کا ذکر لازمی ہوتا۔ اس خبر کا نہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ اسے فورس سے نکالا گیا تھا اور یہ بے عزتی کی بات ہوتی ہے۔ مرحومین کی سب عزت کرتے ہیں اس لیے اخبار میں اس کا تذکرہ کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ یقیناً وہ وجہ ایسی تھی کہ خود محکمۂ پولیس نے بھی اس کا ذکر مناسب نہیں سمجھا اور اسے خاموشی سے... برطرف کردیا کیونکہ اسے کوئی مناسب سرٹیفکیٹ نہیں ملا تھا اس لیے اسے کہیں معقول ملازمت بھی نہیں مل سکی۔ مجبوراً اسے کسی ہوٹل میں معمولی ملازمت کرنا پڑی۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ ملازمت معمولی تھی؟'' نتاشا نے اعتراض کیا۔ میں مسکرایا اور برانڈی کا ایک گھونٹ اور لیا۔

''اگر اس کی ملازمت اچھی تھی تو اسے چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ نہیں ڈیئر! ملازمت چھوڑنے کا مطلب ہے کہ وہ معمولی تھی اور اسی وجہ سے مورگن نے بک شاپ کھولی لیکن میرا اندازہ ہے یہ معمولی سرمائے سے کھولی گئی معمولی سی بک شاپ تھی اس لیے چل نہیں سکی اور اس نے پرنٹنگ پریس کھول لیا۔ اس میں اس کے ادبی ذوق کا دخل نہیں تھا کیونکہ اس نے کتابیں شائع کرنے والا نہیں بلکہ چھوٹی موٹی چیزیں جیسے پمفلٹس اور وزیٹنگ کارڈز یا پوسٹر چھاپنے کا کام شروع کیا ہوگا۔''

''چلو مان لیا کہ وہ ادبی ذوق نہیں رکھتا تھا۔'' نتاشا نے سلائیاں ایک طرف رکھ دیں کیونکہ آتش دان میں آگ کم ہو رہی تھی اور اب لکڑیاں ڈالنے کی باری اس کی تھی۔ ہم نے گھر کے کام آپس میں بانٹ لیے تھے تاکہ کسی ایک پر مکمل بوجھ نہ پڑے۔

''تم نے نوٹ کیا ہوگا۔ موت کی وجہ بیان نہیں کی گئی ہے، وہ نہ ہی ماتمی کالم میں کسی رشتے دار کا نام ہے۔ اس کا مطلب ہے مرحوم کسی ایسی بیماری کا شکار ہوا جس کا تذکرہ پسند نہیں کیا جاتا ہے۔''

نتاشا نے آتش دان میں لکڑیاں ڈالیں اور جلدی سے اپنی کرسی سنبھال لی۔ ''تمہارا مطلب ہے ایڈز؟''

''یقیناً... میرا اندازہ ہے وہ ہم جنس پرست تھا۔ اس وجہ سے اسے پولیس سے نکالا گیا تھا اور اس قسم کے بیماری تشہیر پسند نہیں کی جاتی۔ ایڈز کا مرض اسے ہم جنس پرستی کی وجہ سے لگا ہوگا اور یہی وجہ تھی کہ ہمیں ماتمی کالم میں اس کے بیوی بچوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی، اسے عورتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اپنے اس ذہنی و جسمانی رجحان کی بنا پر وہ ٹک کر کوئی کام بھی نہیں کرتا ہوگا۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ اس نے بیس برس کی عمر میں پولیس فورس جوائن کی تھی تو صرف چالیس برس کے عرصے میں چار یکسر مختلف پیشے اختیار کرنا اس کی غیر مستقل مزاجی کی نشان دہی کرتا ہے۔ نفسیاتی ماہرین ہم جنس پرستی میں مبتلا افراد کو سب سے زیادہ منتشر الخیال لوگوں میں شمار کرتے ہیں۔''

''اس کی اتنی جلد تدفین کی وجہ بھی یہی ہو سکتی ہے۔'' نتاشا قائل نظر آنے لگی۔

''ایسے لوگوں سے سب دور رہتا اور جلد از جلد جان چھڑانا چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

نتاشا نے سلائیاں سنبھال لیں، وہ میرے لیے سوئیٹر تیار کر رہی تھی۔ اس نے چند توقف کے بعد پوچھا۔ ''دوسری خبر کس کی ہے؟''

میں نے ایک بار پھر ایڈمنڈ سامسن کے بارے میں پڑھا اور بولا۔ ''یہ خبر قابل توجہ ہے۔ ایڈمنڈ نامی ستر سالہ شخص جس کا تعلق سان فرانسسکو سے بارہ سو کلومیٹر شمال میں ایک قصبے ریڈبلیو سے ہے اور وہ اپنے قصبے سے چودہ سو کلومیٹر دور میٹ ولا میں مرگیا۔ مرحوم صاحب حیثیت شخص تھا۔ اس کے پاس ایک وسیع باڑہ اور کئی ہزار ایکڑ زمین تھی۔ ساتھ ہی وہ ایک بینک کا نائب صدر، ایک تعلیمی ادارے کا چانسلر اور مویشی پالنے والوں کی تنظیم کا ایک ڈائریکٹر بھی تھا۔ لازمی بات ہے اس شخص کا معاشرتی حلقہ وسیع اور بااثر و رسوخ تھا۔ اس نے حال ہی میں دوسری شادی کی تھی اور ہنی مون منانے گیا تھا۔''

نتاشا نے حیرت سے کہا۔ ''ہنی مون منانے... اور وہ بھی؟''

''ہاں لیکن وہ یہاں ہنی مون منانے نہیں آیا تھا۔ یہاں...



میں اس کا سوتیلا بیٹا رہتا ہے، وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس کے پاس آیا تھا۔ بیوی کا نام مولی اور اس کے بیٹے کا نام ایرک ہے۔''

''کیا اس کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہے؟'' نتاشا نے ذرا تجسس سے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہے، خبر کے مطابق اس کا ایک بیٹا ہے جو نیویارک میں رہتا ہے اور ایک بیٹی ڈلاس میں قیام پذیر ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ ایڈمنڈ کا انتقال اتوار کی رات کسی وقت ہوا ہے۔''

''ہارٹ اٹیک۔'' نتاشا نے اندازہ لگایا۔ ''اس عمر اور دوسری شادی کے نتیجے میں یہ غیر متوقع نہیں ہے۔''

''اگر اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہوتا تو خبر میں اس کا ذکر ہوتا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اور یہ خبر نہیں بلکہ اشتہار ہے۔ اس میں پہلے مولی اور اس کے بیٹے ایرک کا ذکر ہے اور پھر نیویارک والے بیٹے ولیم اور ڈلاس والی بیٹی روز کا ذکر ہے۔ اتوار کی رات مرنے والے ایڈمنڈ کی دعائیہ تقریب کل ادا کی جائے گی اور پرسوں یعنی بدھ والے دن اسے اس کے آبائی قصبے یعنی ریڈبلیو میں دفنا دیا جائے گا۔''

''اتنی جلدی۔'' نتاشا چونکی۔ ''اس طرح تو اس کے بیٹے اور بیٹی کو دعائیہ تقریب میں شرکت کا موقع شاید ہی ملے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ فرض کیا جائے کہ ایڈمنڈ کے انتقال کا صبح تک علم ہوا۔ اس صورت میں اس کے بچوں کو دوپہر تک اطلاع ملی ہوگی اور یہاں سے نزدیک ترین ائیرپورٹ بھی سو میل کے فاصلے پر ہے جہاں دن میں مشکل سے چند پروازیں ہی آتی ہوں گی۔ اس طرح کم سے کم دعائیہ تقریب میں ان کی شرکت مشکوک ہے۔ ہاں، وہ تدفین میں شریک ہو سکتے ہیں۔ تدفین کے لیے وقت سہ پہر تین بجے مقرر کیا گیا ہے۔ اگر تابوت صبح یہاں سے کسی چھوٹے طیارے میں روانہ کیا جائے تو وہ کوئی چار گھنٹے میں اپنی منزل تک پہنچے گا۔ پھر ائیرپورٹ سے قبرستان تک پہنچنے میں بھی کچھ وقت لگے گا۔ آج کل سورج ساڑھے چھ بجے طلوع ہو رہا ہے اور چھوٹے طیارے روشنی ہونے کے بعد ہی پرواز کرتے ہیں۔ فرض کر لیا جائے کہ طیارہ یہاں سے نو بجے پرواز کرتا ہے تو وہ ایک بجے منزل مقصود تک پہنچے گا اور پھر قبرستان پہنچتے پہنچتے تابوت کو دو بج جائیں گے۔ اس کے بعد صرف ایک گھنٹہ رہ جائے گا جو آخری رسومات میں لگ جائے گا اور کسی کو چہرہ دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

''اس کے بچوں کو بھی نہیں؟''

''نہیں، ان کو دیکھنے کا موقع تو ملے گا لیکن یہ موقع یقیناً سرسری سا ہوگا اور دوسروں کو یہ موقع بھی نہیں ملے گا۔ اس طرح ایک عجلت کے عالم میں ایک شخص کی تدفین کردی جائے گی جو بہت دولت مند ہے اور اس کا حلقۂ احباب بھی بہت بڑا ہے۔ یقیناً ہزاروں افراد اس کی آخری رسومات میں شرکت کرنا چاہیں گے۔''

نتاشا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''اب تم یقیناً ایک پولیس والے کے ذہن سے سوچ رہے ہو۔ تمہارے خیال میں ایڈمنڈ کی موت مشکوک ہے اور اس کے پس پشت اس کی بیوہ مولی اور اس کے سوتیلے بیٹے ایرک کا ہاتھ ہے؟''

''کیا مجھے ایسا سوچنا نہیں چاہیے جبکہ اس خبر میں بہت ساری باتیں ایسی ہیں جو قابل غور ہیں۔''

''ہاں قابل غور تو ہیں لیکن یہ بہت زیادہ مشکوک نہیں ہیں۔''

''یقیناً ہیں۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''خاص طور سے موت کی وجہ نہ ہونا بہت زیادہ شکوک پیدا کر رہا ہے۔ اگر وہ طبعی موت مرا تھا تو اس کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟''

''ممکن ہے، اسے کینسر ہو اور عام طور سے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔''

''کینسر ہونے کی صورت میں اور وہ بھی آخری اسٹیج پر کوئی ہنی مون منانے کے لیے نہیں نکلتا اور اپنے سوتیلے بیٹے سے ملنے کی خاطر تو ہرگز نہیں آتا۔ نہیں، اس کی موت بالکل اچانک ہوئی ہے اور اس کی وجہ ہارٹ اٹیک بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ جس مرتبے کا آدمی تھا، باقاعدگی سے اپنا طبی معائنہ کراتا ہوگا اور اگر اسے دل کی بیماری ہوتی تو وہ یقیناً دوسری شادی اور ہنی مون کے طویل سفر سے گریز کرتا۔ چہ جائیکہ اپنے اصل روٹ سے ہٹ کر کئی سو کلومیٹر کا مشکل سفر کرکے اپنے سوتیلے بیٹے سے ملنے آتا۔''

''ممکن ہے معاملہ ایکسیڈنٹ کا ہو اور اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہو۔ سڑک پر موت یقیناً اذیت ناک ہوتی ہے۔''

''حادثے کی صورت میں اس کا ذکر تو کیا جانا چاہیے تھا کیونکہ ایک اور موت حادثے میں ہوئی ہے اور اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ خبر دینے والے نے جان بوجھ کر موت کی وجہ نہیں بتائی۔''

''ممکن ہے حادثے کی وجہ سے لاش مسخ ہوگئی ہو... ایرک سوتیلا بیٹا ہے اور اس کی ایڈمنڈ سے...

ذہنی قربت نہیں ہوگی کہ اسے حادثے کا بتاتے ہوئے افسوس ہو۔'' میں نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر ایسی بات ہوتی تو وہ بلا تکلف خبر میں ذکر کر سکتا تھا۔''

''لیکن اس نے ذکر نہیں کیا۔'' نتاشا نے مجھے یاد دلایا۔ ''اس کا مطلب ہے موت حادثاتی نہیں تھی۔''

''تب اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟'' اس بار میں نے سوال کیا کیونکہ وہ کئی سوال کر چکی تھی۔

''اس کا صاف مطلب ہے، موت حادثاتی نہیں بلکہ قدرتی ہے اور قدرتی اموات ضروری نہیں ہے صرف کینسر یا ہارٹ اٹیک سے ہوں بلکہ اس کے بے شمار اسباب ہو سکتے ہیں۔ آدمی الرجی سے بھی مر سکتا ہے، اس کا دماغ کسی وجہ سے کام کرنا چھوڑ سکتا ہے۔''

میں کالم کی خبر کو غور سے دیکھتے ہوئے نتاشا کی بات سن رہا تھا۔ اس کی بات میں وزن تھا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل اس بات کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ''تب تم تدفین اور دعائیہ تقریب میں اتنی عجلت کو کیا کہو گی؟ ایڈمنڈ کوئی لاوارث شخص نہیں ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ یقیناً اور بھی رشتے دار ہوں گے۔ ایک ایسے شخص کو اس طرح شکوک آمیز عجلت کے ساتھ دفنا دینا یقیناً اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ دوسرے اس کا آبائی قصبہ ریڈ بفیلو ہے، وہاں اس کی تدفین بھی وہیں ہوگی تو کیا یہ عجیب سی بات نہیں ہے کہ اس کی دعائیہ تقریب یہاں میٹ ولا میں ادا کی جا رہی ہے جہاں اسے کوئی تیسرا فرد نہیں جانتا ہے۔''

''تیسرا فرد؟'' نتاشا نے میری بات پر غور کیا۔

''ہاں، موبی اور اس کا بیٹا ایرک۔ ان کے علاوہ اسے یہاں کون جانتا ہے؟ اس لیے دعائیہ تقریب میں اس کا کوئی قریبی واقف کار مشکل سے ہی شامل ہوگا۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ کوئی غیر متعلق فرد ایڈمنڈ کا چہرہ نہیں دیکھ سکے گا۔ یہ تو تابوت بند کرو اور پیچھا چھڑاؤ والا معاملہ لگ رہا ہے۔''

''تم بلاوجہ مشکوک ہو رہے ہو۔ ستر برس عمر کم تو نہیں ہوتی ہے۔'' نتاشا نے ایک بار پھر مجھے جھٹلانے کی کوشش کی۔ حالانکہ دل میں وہ میرے نظریے سے متفق ہوتی جا رہی تھی۔

''میرے اب تک کے مشاہدے کے بارے میں تم کیا کہو گی؟''

وہ کسی قدر لاجواب ہوگئی لیکن فوراً ہی چہک کر بولی۔ [illegible] ہنی مون کی [illegible] تم [illegible] ہنی مون منا [illegible]؟

[illegible] نہیں [illegible] معاملے سے تعلق [illegible]

ہے اور مویشیوں کے کاروبار سے منسلک رہا ہے۔ ایسے لوگ عام طور سے جفاکش اور مضبوط ہوتے ہیں۔ یعنی وہ بوڑھا ضرور تھا لیکن اسے کمزور نہیں کہا جا سکتا۔ پھر کھاتا پیتا آدمی تھا اس لیے ستر سال کی عمر میں بھی اس نے خود کو سنبھال کر رکھا ہوگا اور ویسے بھی مغرب میں مردوں میں آخری عمر میں شادی کا رواج ہے۔ وہ صرف سوتیلے بیٹے سے ملنے کی خاطر تو اتنی دور نہیں آ سکتا۔ اگر ایسی بات تھی کہ اس کی ایرک سے ملاقات ضروری تھی تو اصولاً ایرک کو اس کے پاس آنا چاہیے تھا۔''

''لیکن ہنی مون منانے کے لیے میٹ ولا ہرگز بھی کوئی مناسب جگہ نہیں ہے۔'' نتاشا نے اعتراض کیا۔

''بالکل ٹھیک۔ لیکن اسے یوں دیکھو کہ وہ ہنی مون منانے لاس اینجلس یا لاس ویگاس گئے تھے اور وہاں سے واپسی پر اس نے بیوی کے اصرار پر اپنے سوتیلے بیٹے سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔''

''لیکن ہنی مون...''

''ڈیئر، ہنی مون کے سوا اور کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی جس کے لیے وہ اتنی دور آیا ہوگا۔''

''اور پھر اپنے اصل روٹ سے ہٹ کر سیکڑوں میل دور میٹ ولا تک چلا آیا۔''

''سیکڑوں میل آنا ممکن ہے، بہ نسبت ہزار میل کے۔'' میں نے دلیل دی۔

''اس خبر میں موبی کی عمر بتائی گئی ہے؟'' نتاشا اب پوری طرح متوجہ ہوگئی تھی۔ یعنی ظاہری طور پر بھی دلچسپی لے رہی تھی۔

''میرا اندازہ ہے کہ وہ ایڈمنڈ سے کم سے کم بیس سال چھوٹی ہوگی۔''

''اس کا مطلب ہے خبر میں موبی کی عمر نہیں ہے پھر تم نے کیسے معلوم کر لیا کہ وہ تقریباً پچاس برس کی ہے؟''

''اس کے لیے ہمیں کچھ مفروضات پر بات کرنا ہوگی۔ دیکھو، ایرک کمسن لڑکا نہیں ہے ورنہ وہ ماں کے ساتھ رہتا۔ وہ کم سے کم اٹھارہ سال کا تو ہے اور اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس سے بڑی عمر میں ماں بیٹے کا رشتہ [illegible] کمزور پڑ جاتا ہے اور وہ صرف اس سے ملنے [illegible] آنے اور اپنے شوہر کو بھی گھسیٹ [illegible] زیادہ [illegible] عمر ہونے کی صورت میں خود اس کے لیے بھی یہ سفر بہت مشکل ہوتا۔''

''ٹھیک ہے یہ بات بھی سمجھ میں آتی [illegible]

[illegible] یہاں آنے [illegible] بیٹے سے ملنے [illegible]



خاطر تو نہیں آ سکتا۔''

''اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک تھیوری ہے کہ ایرک اس شادی سے خوش نہیں تھا اور وہ اپنی ماں سے ناراض تھا۔ اس لیے موبی اور ایڈمنڈ اسے منانے آئے تھے۔ ایڈمنڈ کو اس کی نئی نویلی بیوی نے آنے پر آمادہ کیا ہوگا۔''

''اور وہ آمادہ ہو گیا؟'' نتاشا کے لہجے میں شک تھا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ بیوی شوہر کو کس طرح کسی کام کے لیے راضی کرتی ہے۔'' میں مسکرایا۔

''تم نے جو تجزیہ کیا ہے، اس کے مطابق ایڈمنڈ جو ایک انتہائی دولت مند انسان ہے اور ایک بھرپور معاشرتی زندگی گزارتا آیا ہے، وہ دو جوان اور خودمختار بچوں کا باپ ہے۔ اس نے حال ہی میں ستر برس کی عمر میں دوسری شادی کی۔ پھر وہ اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ ہنی مون منانے نکلا اور اس دوران وہ بیوی کے اصرار پر اپنے سوتیلے بیٹے ایرک سے ملنے میٹ ولا آیا۔ یہاں وہ اچانک موت کا شکار ہو گیا اور اب اسے عجلت میں دفنایا جا رہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس میں کون سی مشکوک بات ہے؟''

''یہی عجلت جو اس مرتبے کے آدمی کے شایانِ شان نہیں ہے۔'' میں نے برانڈی کا آخری گھونٹ لیا۔ ''آخر ایسی کیا آفت آن پڑی ہے کہ اسے یوں تیزی سے دفنایا جا رہا ہے؟''

''ممکن ہے اس کے بچے چارٹرڈ فلائٹ سے آ گئے ہوں۔''

''اس صورت میں بھی وہ اس کی دعائیہ تقریب ریڈ بفیلو میں کرتے نہ کہ میٹ ولا میں جہاں اسے کوئی جانتا تک نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ ابھی تک یہاں پہنچے ہی نہیں ہیں۔''

نتاشا میرے نقطۂ نظر سے قریب ہو رہی تھی لیکن اس نے منکر ہونے کا عمل بھی جاری رکھا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ موت میں کوئی مشکوک بات تھی تو پولیس نے اس پر توجہ کیوں نہیں دی؟''

''پولیس اس کیس میں لازمی شامل ہوئی ہوگی لیکن ممکن ہے اسے حادثہ باور کرایا گیا ہو۔ اپنے کیریئر کے دوران میں نے بے شمار قتل ایسے دیکھے ہیں جو پہلی نظر میں حادثہ لگتے تھے لیکن جب ان کی گہرائی میں جا کر تفتیش کی گئی تو پتا چلا کہ یہ قتل تھے۔ کوئی بھی سہل پسند پولیس افسر ظاہری شواہد کی بنا پر کیس [illegible] سمیٹ سکتا ہے۔



## افسر اور ماتحت

افسر (اپنے ماتحت سے)

ہم تمہاری شرافت، دیانتداری سے بہت خوش ہوئے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ تم اپنا کام ایمانداری محنت اور لگن سے کرتے ہو۔ تم اپنا کام دل لگا کر کرتے ہو اور تم میں فرض شناسی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ لہٰذا ہم تمہاری اس دیانتداری فرض شناسی اور محنت کے صلے میں تمہارے عہدے میں ترقی کرتے ہیں۔ آج سے تمہاری تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے ہے۔

ماتحت: اوہ ڈیڈی! آپ کتنے انصاف پرور ہیں آپ کا بہت بہت شکریہ!

(مسعود جاوید حمید، بلا)

''اگر ایڈمنڈ کے بچے یہاں نہیں آئے ہیں تو میں تمہاری تھیوری سے اتفاق کرتی ہوں۔''

''اس کے جاننے کی ایک ہی صورت ہے۔'' میں نے کہا اور فون کی طرف دیکھا تو نتاشا بھانپ گئی۔

''تم ہرگز فون نہیں کرو گے۔ وہ ابھی اپنے باپ سے محروم ہوئے ہیں۔''

''ضروری نہیں ہے، فون وہی ریسیو کریں۔ اس وقت ان کے گھر میں سوگوار رشتے داروں کا ایک ہجوم ہوگا۔'' میں نے کہا اور فون اٹھا کر خبر میں دیا گیا ایڈمنڈ کی رہائش گاہ کا نمبر ملایا۔ بدقسمتی سے فون ایڈمنڈ کی بیٹی روز نے اٹھایا۔ میں نے اپنا تعارف ایک ار[illegible] افسر کے طور پر [illegible]

"تمہاری طرف سے کیلیفورنیا آنے والی ایک پرواز کے پچاس ڈالرز واجب الادا ہیں۔"

"تمہارا دماغ درست ہے۔" وہ کھردرے لہجے میں بولی۔ "میں نے یا ہمارے خاندان کے کسی فرد نے کیلیفورنیا کا سفر نہیں کیا ہے۔"

اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ درست کہہ رہی ہے لیکن میں نے ایک اور زاویے سے کوشش کی۔ "ممکن ہے یہ نیویارک سے آنے والی پرواز کی رقم ہو جس سے ولیم سائمن نے سفر کیا ہے۔ یہ پرواز کیلیفورنیا سے رکتی ہوئی آئی تھی۔"

"میرے بھائی نے نیویارک سے براہِ راست پرواز لی ہے اور وہ کہیں بھی رکے بغیر آیا ہے۔" خاتون کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا۔

"تب میں بہت معذرت خواہ ہوں۔ یہ یقیناً ریکارڈ کی کوئی غلطی ہے۔" میں نے اس سے پُرزور معذرت کی اور فون بند کر کے فاتحانہ انداز میں نتاشا کی طرف دیکھا۔ "یہ ثابت ہو گیا کہ ایڈمنڈ کے بچے میٹ ولا نہیں آئے اور نہ ہی ان کے دعائیہ تقریب میں شرکت کا امکان ہے۔ وہ ریڈ بفیلو میں اپنے باپ کی میت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو دعائیہ تقریب کا میٹ ولا میں کوئی جواز ہی نہیں بنتا جبکہ ایڈمنڈ کی سگی اولاد ریڈ بفیلو میں موجود ہے۔"

نتاشا اب کچھ حیران تھی۔ "اگر اس معاملے میں کوئی گڑبڑ ہے تو وہ بہت مہارت سے کی گئی ہے۔ تب ہی مقامی پولیس اسے پکڑ نہیں سکی۔"

"میں نے کہا نا اکثر سہل پسند پولیس افسران قتل کے کیسز میں شواہد کو نظرانداز کر جاتے ہیں اور موت کو حادثہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مقامی پولیس نے ایڈمنڈ کی موت کے معاملے میں یہی کیا ہے۔"

"تب ممکن ہے موت حادثہ ہی ہو۔" نتاشا نے اپنی فطرت کے مطابق ایک بار پھر نکتہ نکالا۔ اسے قائل کرنا آسان نہیں تھا۔ "ہم یہاں بیٹھ کر مفروضات پر بات کر رہے ہیں جبکہ پولیس نے اسے عملی طور پر دیکھا ہوگا۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "اس سلسلے میں مجھے مزید کچھ تفتیش کرنا پڑے گی۔"

نتاشا نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "تفتیش... وہ کیوں؟"

"تاکہ معاملے کی تہ تک پہنچا جا سکے۔"

"خدا کے لیے ہیری! اب تم پولیس سے ریٹائر ہو چکے ہو ان چکروں میں مت پڑو۔"

لیکن میں نے اس کی بات نظرانداز کر کے ایک بار پھر فون اٹھایا اور اس بار میٹ ولا کے ایڈمنڈ میموریل ہسپتال کا نمبر ملایا۔ نمبر میں نے فون ڈائریکٹری سے لیا تھا۔ دوسری طرف ایک خاتون نے فون ریسیو کیا اور پیشہ ورانہ لہجے میں بولی۔ "ایڈمنڈ میموریل اسپتال، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"مجھے ایمرجنسی میں کسی سے بات کرنی ہے تاکہ مجھے تو رات میں مر جانے والے ایک آدمی کے بارے میں پتا چل سکے۔" میں نے کہا اور اپنا تعارف کیپلے انڈرٹیکر کے منیجر کی حیثیت سے کرایا۔

"اس وقت وہاں تمہیں معلومات فراہم کرنے کے لیے کوئی نہیں ملے گا۔" خاتون نے مجھے خبردار کیا۔

"پلیز! مجھے یہ معلومات ان صاحب کی موت کے سرٹیفکیٹ کے لیے درکار ہیں۔ اگر اس میں تاخیر ہوئی تو ان کی تدفین کا پروگرام متاثر ہو سکتا ہے۔ تدفین منگل کی صبح ہے۔" میں نے صاف جھوٹ کہا اور لہجے کو بھی ممکن حد تک پُرتاثیر بنا لیا تھا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ خاتون نے ایمرجنسی میں موجود ایک ڈاکٹر کو فون منتقل کر دیا۔ میں نے نئے سرے سے تعارف کرایا اور اپنی درخواست دہرائی۔ ڈاکٹر شریف آدمی تھا اور اس نے مجھ سے کہا۔

"مسٹر سائمن کو اتوار کی رات پانچ بجے ایمرجنسی میں لایا گیا۔ اس وقت تک وہ مر چکے تھے اور یہ موت ہمارے ہسپتال میں نہیں ہوئی۔"

اس کا انداز ایسا تھا جیسے میں اس پر قتل کا الزام لگانے والا تھا اور وہ اس کی تردید کر رہا تھا۔ اس کے لہجے سے لگا جیسے آج تک اس اسپتال میں کوئی شخص فوت ہی نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی تو یہ اس کی اپنی غلطی تھی، اس میں اسپتال کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے موت کا درست وقت درکار ہے۔"

"اس کے لیے تمہیں پولیس ڈیپارٹمنٹ سے رجوع کرنا چاہیے کیونکہ اس قسم کی ساری معلومات پولیس کے پاس ہوتی ہیں۔"

یہ تو مجھے بھی معلوم تھا کہ کسی حادثے یا قتل کے سبب میں مرنے والے کے بارے میں تمام معلومات [illegible] یا خود پولیس کے پاس ہوتی ہیں لیکن میں چاہتا تھا کہ مجھے پولیس کو کال نہ کرنی پڑے۔ ایک تو ان کو بےوقوف بنانا آسان نہیں ہوتا اور پھر جھوٹ بولنا مہنگا بھی پڑ سکتا ہے۔ میں نے فون بند کر کے ایک بار پھر اخبار کا معائنہ کیا۔ اس میں موت کو اسپتال میں ظاہر کیا گیا تھا۔





"موت اسپتال میں ہوئی ہے لیکن ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ جب ایڈمنڈ کو لایا گیا تو وہ پہلے ہی موت کا شکار ہو چکا تھا۔"

"ممکن ہے اس غلط بیانی کی وجہ سڑک پر حادثے اور ناگہانی موت کے ذکر سے گریز ہو۔ اسپتال میں بستر پر ہونے والی موت نسبتاً کم تکلیف دہ ہوتی ہے۔ خاص طور سے لواحقین کے لیے۔" نتاشا نے کہا اور آتش دان کی طرف دیکھا جس میں آگ کم ہو رہی تھی۔ اب لکڑیاں ڈالنے کی باری میری تھی۔ اس لیے میں نے اٹھ کر آتش دان میں مزید لکڑیاں ڈالیں اور پھر اپنے لیے برانڈی کا مزید ایک گلاس بنایا جس پر نتاشا نے مجھے گھورا کیونکہ ہمارے درمیان طے تھا کہ میں رات کھانے کے بعد برانڈی کے ایک گلاس سے زیادہ نہیں لوں گا۔ لیکن اس نے مجھے اس بے قاعدگی پر کچھ کہا نہیں۔ غالباً اس نے محسوس کر لیا تھا کہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ اپنی نشست پر بیٹھ کر میں نے نتاشا کی بات کا جواب دیا۔

"تم نے اچھا مفروضہ پیش کیا ہے لیکن حقیقتِ حال جاننے کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔"

"میرے خدا!... اب تم پولیس کو کال کرو گے۔" نتاشا نے سر تھام لیا۔ "دیکھو، کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور اگر ہوا بھی تو میں سابق پولیس افسر ہوں۔ اس قسم کے مسئلوں سے نمٹنا جانتا ہوں۔" میں نے کہتے ہوئے فون اٹھایا اور میٹ ولا پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا۔ فون سارجنٹ گبس نے اٹھایا اور اس نے نہایت خندہ پیشانی سے میرے سوالوں کے جواب دیے۔ یہاں بھی میں نے کیپلے انڈرٹیکر کے منیجر کی حیثیت سے تعارف کرایا تھا۔ اس نے کہا۔ "تم جو پوچھنا چاہو پوچھ سکتے ہو، مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔"

"مسٹر گبس! سب سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ موت کا وقت کیا تھا؟"

"جب اطلاع پولیس تک آئی تو وہاں جانے والوں میں، میں بھی شامل تھا۔ لاش سب سے پہلے میں نے دیکھی تھی لیکن وقت کا تعین نہیں کر سکا تھا۔ میری آمد کے دس منٹ بعد چار بج کر پینتیس منٹ پر طبی عملہ آ گیا تھا اور اس نے بتایا کہ مسٹر ایڈمنڈ نامی یہ شخص مر چکا ہے۔"

"اس سے موت کے وقت کا تعین نہیں ہوتا۔ پولیس نے اپنی رپورٹ میں موت کا کیا وقت لکھا ہے؟"

"چار بج کر پینتیس منٹ... تم چاہو تو اپنی رپورٹ میں یہی وقت لکھ سکتے ہو۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن میں یہی وقت لکھ دیتا ہوں۔" میں نے کہا اور بات بدل دی۔ "مجھے لاش نہیں ملی ہے لیکن اہلِ خانہ کا اصرار ہے کہ چہرہ کسی کو نہ دکھایا جائے... کیا وہ حادثے میں مسخ ہو گیا ہے؟"

"میں نے لاش کا چہرہ نہیں دیکھا کیونکہ جب میں وہاں پہنچا تو وہ منہ کے بل گری ہوئی تھی اور میں اس کی پوزیشن تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن سیڑھیوں سے منہ کے بل گرنے سے چہرے پر یقیناً شدید چوٹ آئی ہوگی۔"

نتاشا کی باتوں سے میں نے بھی ایسا سوچ لیا تھا کہ ایڈمنڈ دل کے دورے سے یا گھر سے باہر کسی ٹریفک حادثے میں ہلاک ہوا ہوگا۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کی ہلاکت گھر میں ہوئی ہوگی۔ وہ بھی سیڑھیوں سے گرنے سے۔ میرے لیے اپنے جوش پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا اور ساتھ ہی میں اس سے مزید معلومات لینے کی فکر میں تھا۔ حادثے کا مقام جاننا ضروری تھا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"حادثہ مسز ایرک کے گھر پر ہوا ہے جو ایڈمنڈ کی بیوہ کا بیٹا ہے؟"

"ہاں، ایڈمنڈ سائمن اپنی بیوی کے ہمراہ اسی روز پہنچا تھا۔ رات کسی وقت وہ اوپر واش روم سے نکل کر نیچے اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ اس کا پھٹے ہوئے قالین میں پاؤں الجھا اور وہ سر کے بل نیچے فرش پر آ گرا۔ ایڈمنڈ سائمن ایک ذی حیثیت آدمی ہے اور وہ یقیناً اس قسم کے پھٹے ہوئے قالین والے زینوں کا عادی نہیں ہوگا۔ اس کی بے پروائی سے اترنے کی کوشش اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔" سارجنٹ گبس نے تفصیل سے بتایا۔

"تمہارا اندازہ درست ہے سارجنٹ، ایڈمنڈ

سائمن بہت ہی امیر شخص تھا۔“ میں نے بہت امیر پر زور دیا۔
”ویسے تعجب ہے، ایسے شخص نے ایک عام سی عورت سے کیسے شادی کرلی؟“ سارجنٹ بولا۔ اس کے لہجے سے ایسا لگا جیسے وہ اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا چاہ رہا ہو۔ اس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔

”سارجنٹ! صاف ظاہر ہے کہ یہ حادثہ غفلت کی وجہ سے پیش آیا۔ اس سلسلے میں ہرجانہ طلب کیا جاسکتا ہے۔ اس مکان کا مالک کون ہے۔ ایرک یا کوئی اور؟“
”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ عمارت کئی سال پہلے مخدوش قرار دی جاچکی ہے لیکن اسے بدستور استعمال کیا جارہا ہے اور اس سلسلے میں نہ تو کسی کو مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی سے اس حادثے کا ہرجانہ طلب کیا جاسکتا ہے۔“ سارجنٹ کے لہجے میں بیزاری آگئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ مکمل بیزار ہوکر فون بند کردیتا، میں اس سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرلینا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے حد درجے حیرت کا اظہار کیا۔
”میرے خدا.. کیا یہ قانون کی خلاف ورزی نہیں ہے؟“

وہ میرا مطلب سمجھ گیا، اس نے کہا۔ ”اصل میں یہاں رہنے والے مسٹر ایرک اور اس کی گرل فرینڈ منشیات سے بحالی کے پروگرام کے تحت یہاں رہ رہے تھے اور اس پروگرام کا حکم ان کو عدالت نے دیا ہے۔ ان کے پاس نہ تو ملازمت ہے اور نہ وسائل اس لیے وہ یہاں رکنے پر مجبور ہوئے ہیں۔“
”یعنی دونوں منشیات کے مستقل عادی ہیں؟“
”طویل عرصے سے اور اگر ان کو منشیات سے باز نہ رکھا جاسکا تو یہ مر بھی سکتے ہیں۔“
”ایرک کی عمر کتنی ہے؟“
”بائیس سال ہے بلکہ وہ ابھی بائیس کا بھی پورا نہیں ہوا ہے۔“
میرے مفروضات ایک ایک کرکے پورے ہورہے تھے۔ اب مجھے موبی کی عمر جاننے کی فکر تھی۔ ”ایڈمنڈ کی بیوہ موبی کے بارے میں سنا ہے وہ پینتالیس سال کی ہے؟“
”نہیں، اس کی عمر اکتالیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ ویسے تم نے کس سے سنا ہے؟“
میں نے اس کا سوال نظر انداز کیا اور نتاشا کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”سنا ہے اس نے اس خبر کا شدید صدمہ لیا ہے... اور ابھی بے چاری کی شادی کو وقت ہی کتنا ہوا تھا کہ وہ پھر سے بیوہ ہوگئی۔“
”ہاں، اس کی حالت خراب ہے اور ڈاکٹرز اسے خواب آور دوا دے رہے ہیں۔“ سارجنٹ نے تصدیق کی۔
”وہ شکل و صورت کی کیسی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا وہ کافی حسین ہے اور...“
”وہ عام سی روکھے بالوں اور ستے ہوئے نقوش والی عورت ہے۔ اس میں معمولی سی دل کشی ہے لیکن اسے بہت خوب صورت نہیں کہا جاسکتا۔“ سارجنٹ نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”مسٹر کیلے! میں سمجھ رہا ہوں کہ تم یہ سوالات کیوں کررہے ہو۔ شاید تم اس حادثے میں قتل کی کوئی تھیوری تلاش کررہے ہو اور تمہیں مسٹر سائمن کے لواحقین نے چھان بین کے لیے کہا ہے کیونکہ وہ بھی موت کے بارے میں مشکوک ہوں گے اس لیے تم اس قسم کے سوالات کررہے ہو... لیکن دوست! جب معاملہ بہت بڑی وراثت کا ہو تو لواحقین کے ذہنوں میں الٹے سیدھے خیالات آتے ہیں۔“
اب سارجنٹ سے مزید بات کرنا خطرناک ہوسکتا تھا۔ وہ مجھ سے تفتیش پر اتر آتا تو میرے لیے مزید جھوٹ بولنا مشکل ہوجاتا اس لیے میں نے جلدی سے اس کا شکریہ ادا کرکے فون رکھ دیا اور نتاشا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ موبی کوئی غیر معمولی حسن رکھنے والی عورت ہوگی لیکن وہ تو ایک عام سی خستہ حال عورت نکلی تھی۔ ایسی عورت کو ایڈمنڈ جیسا کوئی دولت مند شوہر مل جائے تو وہ کسی صورت اسے گنوانا پسند نہیں کرتی۔ دوسری طرف اس کے بیٹے کا کردار اچانک غیر معمولی ہوگیا تھا۔ وہ کافی عرصے سے منشیات استعمال کررہا تھا اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ مستقل منشیات استعمال کرنے والے مجرمانہ ذہنیت کے حامل ہوجاتے ہیں۔ وہ چوری، ڈاکے اور قتل جیسا کوئی بھی کام کرسکتے ہیں۔
ایرک منشیات کی بحالی کے عمل سے گزر رہا تھا اور موبی کے پاس یقیناً شادی سے پہلے اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ اپنے بیٹے کو کوئی اچھی رہائش اور سہولیات فراہم کرسکے۔ اس وجہ سے وہ اور اس کی گرل فرینڈ اس مخدوش عمارت میں رہنے پر مجبور تھے کیونکہ موبی کی ایڈمنڈ سے شادی کو تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا اس لیے وہ فی الحال بیٹے کی مالی مدد سے قاصر تھی اور یقیناً کچھ عرصے بعد وہ اس کی مالی مدد کرسکتی تھی۔ اگر ایڈمنڈ کو شروع سے یہ سب معلوم نہیں تھا تو ... ہوگا اور اس نے شاید اسے پسند نہیں کیا ہوگا۔ اس صورت میں ممکن ہے اس کا موبی اور ایرک سے کوئی جھگڑا ہوا ہو جس نے تیزی اختیار کی ہو اور بالآخر یہ جھگڑا ایڈمنڈ کی پراسرار موت پر ختم ہوا۔ نتاشا غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔
”اب یہ بات طے ہوچکی ہے کہ ایڈمنڈ کی موت غیر طبعی ہے لیکن اسے قتل ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے۔“
”میرا اب بھی یہی موقف ہے، مقامی پولیس نے سہل پسندی کا ثبوت دیا ہے اور کیس کی باریک بینی سے تفتیش نہیں کی ہے۔“
نتاشا طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ”تو باقی کام تم مکمل کرو گے ہیرو؟“
میں نے شانے اچکائے اور برانڈی کے خالی ہوجانے والے گلاس کی طرف دیکھا۔ ”میں یہاں بیٹھے بیٹھے بہت کچھ معلوم کرچکا ہوں اور اگر مزید کوشش کروں تو پوری بات جان سکتا ہوں۔“
”تم بے شک پوری رات تفتیش کرتے رہو۔“ نتاشا نے تیز لہجے میں کہا۔ ”لیکن اب تم مزید برانڈی نہیں لو گے۔“
میں نے بادل ناخواستہ گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں پہلے ہی دو گلاس لے چکا تھا لیکن میں صرف برانڈی کی خاطر اس موت میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا بلکہ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ موت کی وجہ وہ نہیں ہے جو ظاہر کی جارہی ہے۔ لیکن کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے کے لیے مجھے مزید معلومات درکار تھیں۔ میں نے سوچا اور فون ڈائریکٹری میں ریڈفیلو میں انڈرٹیکر ادارے کا نمبر لیا۔ عام طور سے چھوٹے قصبات میں اس قسم کا ایک ہی ادارہ ہوتا ہے۔ میری توقع کے عین مطابق یہاں بھی ایک ہی ادارہ تھا جین اینڈ مین انڈرٹیکر۔ میں نے اس کا نمبر ملایا اور اس کے مالک جین نے کال ریسیو کی۔ میں نے اپنا تعارف کیلے انڈرٹیکر کے مالک کی حیثیت سے کرایا۔ پیشہ ور ہم آہنگی رنگ لائی اور اس نے ابتدائی سرد لہجے کے بعد مجھ سے گرم جوشی سے بات کی۔
”مسٹر جین! مسئلہ یہ ہے کہ مسٹر سائمن کو کفنانے کا ... میں نے کیا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہاں اس کے ... اس کے سوتیلے بیٹے ایرک کی مالی حالت ٹھیک نہیں ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ میرا بل مارا نہ جائے۔“
”اس صورت میں تمہیں اس کی بیوہ موبی کے دستخط لینے چاہئیں۔“ مسٹر جین نے خلوص سے کہا۔ ”یہاں تو سارا ... اس کا میتا و لیم دیکھ رہا ہے۔“
”مجھے تیاری کے لیے بھی بہت کم وقت دیا گیا ہے۔“

تمہارے ہزار ڈالر ضائع نہیں ہوں گے..... تربیت کے بعد تم آسانی سے اپنے حریف کے ہاتھ نہیں آؤ گے

میں نے شکوہ کیا۔ ”میں نے کس طرح مسٹر سائمن کی لاش کو روانگی کے لیے تیار کیا ہے میں ہی جانتا ہوں۔“
اس پر وہ پھٹ پڑا۔ ”مجھے یہاں اسے تابوت میں پیک کرکے روانہ کرنے کے لیے صرف چند گھنٹے ملے ہیں۔ نہ جانے یہ اتنی عجلت میں تدفین کیوں کررہے ہیں۔ ایڈمنڈ سائمن یہاں کا مشہور ترین آدمی ہے اور وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے جنازے میں قصبے اور علاقے کا ہر فرد شریک ہو۔“
”میں نے خود بھی یہی محسوس کیا ہے اور حیران کن طور پر دعائیہ تقریب یہاں میٹ ولا میں رکھی گئی ہے۔ بہرحال تمہارے تعاون کا شکریہ۔ میں تمہارے مشورے پر عمل کروں گا۔“ میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ نتاشا کان لگا کر ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ ”اب یہ بات تو ثابت ہوگئی ہے کہ موبی اور ایرک نے ایڈمنڈ کو کفنانے کا عمل بھی یہیں مکمل کرلیا ہے اور ریڈفیلو میں صرف اسے نئے تابوت میں ڈال کر اس کی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ کردیا جائے گا۔“
”کیا وہاں چہرہ دکھانے کی رسم نہیں ہوگی؟“
”ہوگی لیکن بہت محدود اور شاید کسی کو بالکل قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔
”اس کا مطلب ہے لاش کا چہرہ بہت خراب ہے یا اس پر کوئی ایسا زخم ہے جس کے بارے میں موبی اور ایرک نہیں چاہتے کہ دوسرے اس سے آگاہ ہوں۔“
”لیکن اس کا پتا کیسے چلے گا کہ لاش کے چہرے پر کیسا

زخم ہے؟"

"اس کا ایک طریقہ ہے۔" میں نے کہا اور دوبارہ ایڈگر میموریل اسپتال کا نمبر ملایا اور اپنا تعارف کیلیے کے طور پر ہی کرایا۔ بیزار خاتون نے مجھے پہچان لیا اور بولی۔ "کہو، میں پھر تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"مسز ایڈمنڈ سائمن کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر کس ڈاکٹر نے دستخط کیے تھے؟"

"یقیناً ڈاکٹر مورمن نے۔" اس نے بلا تامل کہا۔ "ہمارے اسپتال میں وہی کسی ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر دستخط کرنے کے مجاز ہیں۔"

"ان کا نمبر مل سکتا ہے؟"

"وہ گھر پر ہوں گے اور اس وقت..."

"پلیز! یہ بہت اہم معاملہ ہے۔" میں نے التجا کی۔

"ٹھیک ہے لیکن مہربانی کر کے میرا نام مت لینا۔" اس نے کہا اور فون نمبر دے دیا۔

"تم فکر مت کرو، یہ کسی راز کی طرح میرے سینے میں دفن رہے گا۔" میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے کال منقطع کی اور ڈاکٹر مورمن کا نمبر ملایا۔ وہ گھر پر تھا اور جاگ رہا تھا۔ میں نے تعارف کرایا اور اسے بتایا کہ میں ایڈمنڈ سائمن کی لاش تیار کر کے روانہ کر رہا ہوں لیکن اس معاملے میں مجھے اس کی مدد درکار ہے۔

"کیسی مدد؟"

"وارثوں نے جانے کی عجلت میں ڈیتھ سرٹیفکیٹ گم کیا ہے اور لاش ہوائی جہاز سے جا رہی ہے اس کے لیے ڈیتھ سرٹیفکیٹ لازمی ہے۔ اگر تم تصدیق کر دو کہ موت کس طرح ہوئی ہے تو میں خود ڈیتھ سرٹیفکیٹ دے دوں گا۔"

"کیوں نہیں۔" وہ فوراً تعاون پر آمادہ ہو گیا اور اس کے بعد اس نے ایڈمنڈ سائمن کی موت پر ایک لمبی تقریر کی جس میں لاتعداد پیچیدہ طبی اصطلاحات کی بھرمار تھی۔ میں ان میں سے ایک بھی نہیں سمجھ سکا لیکن اسے یقین دلا رہا تھا کہ میں اس کی تقریر لفظ بہ لفظ لکھ رہا ہوں۔ بالآخر میں یہ سمجھنے میں کامیاب رہا کہ ایڈمنڈ کی موت بلندی سے گرنے، سر اور گردن میں شدید ٹوٹ پھوٹ اور دماغی رگ پھٹنے سے واقع ہوئی ہے۔ زخموں کی نوعیت بہت شدید تھی لیکن اس قسم کے حادثات میں ایسی چوٹیں لگتی ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر مورمن نے حادثے کے بارے میں کسی شبہے کا اظہار نہیں کیا۔ اب میں اس فکر میں تھا کہ کسی طرح اس سے زخموں کی نوعیت سمجھ لوں۔ میں نے ایک چال چلی اور مبہم سے انداز میں کہا۔

"میں نے لاش کو دیکھا تو مجھے ایک چیز نے الجھن میں ڈال دیا۔ اس کے سر پر..." میں کہتے کہتے رک گیا اور میری توقع کے مطابق ڈاکٹر مورمن نے میری بات مکمل کر دی۔

"تم یقیناً اس کے سر کے عقبی زخم کی بات کر رہے ہو؟" اس نے کہا۔ "یہ بہت گہرا زخم ہے اور درحقیقت اسی نے ایڈمنڈ سائمن کی جان لی ہے۔ بالوں سے ڈھکا ہونے کی وجہ سے یہ زخم دکھائی نہیں دیتا ہے لیکن یہ باقاعدہ کسی دراڑ کی صورت میں ہے۔ جب لاش اسپتال میں آئی اور میں نے اس کے بال ہٹا کر دیکھے، تب مجھے یہ زخم دکھائی دیا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کی بیوہ موبی نے یہ زخم نہیں دیکھا ورنہ اس کی حالت مزید خراب ہو جاتی۔"

"لیکن ایڈمنڈ کے چہرے پر موجود زخم بھی تو ہیں۔"

"ہاں اور اسی وجہ سے اس زخم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ جب ایرک ڈیتھ سرٹیفکیٹ لینے آیا تو میں نے اس سے ذکر کیا تھا اور اس نے فوراً وضاحت کر دی تھی کہ زخم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر سے گرنے کی وجہ سے آیا ہے۔"

"تمہاری ایرک سے جان پہچان ہے؟"

"ہاں کیونکہ منشیات ترک کرنے کے سلسلے میں میں ہی اس کی اور اس کی گرل فرینڈ نوڈ کی مدد کر رہا ہوں۔ اب میں تقریباً ریٹائر ہو چکا ہوں اس لیے بہت کم مریض دیکھتا ہوں۔"

"تم نے گھر میں لاش دیکھی تھی؟" میں نے اپنی سنسنی پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"تھوڑی سی۔ اصل میں پولیس ڈاکٹر نے اس کی موت کی تصدیق کر دی تھی لیکن اس حادثے میں کسی کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا اختیار صرف مجھے ہے اس لیے میں بھی وہاں پہنچا تھا۔ اس وقت تک لاش اٹھائی جا رہی تھی اس لیے مجھے تفصیل سے دیکھنے کا موقع اسپتال میں ہی ملا۔"

"ایک شخصی سوال ہے، اگر تم برا نہ مانو تو... ایرک اور نوڈ کس قسم کا نشہ کرتے تھے؟"

ڈاکٹر ایک لمحے کے لیے چپ ہوا اور مجھے لگا کہ کہیں وہ میرے سوال کا جواب دینے سے انکار نہ کر دے۔ لیکن اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "وہ کوکین اور ایل ایس ڈی کا نشہ کرتے تھے۔ یہ دونوں مل کر بہت خطرناک ہو جاتے ہیں اور [illegible] میں سخت مشتعل اور تشدد کے رجحان کو ابھارتے ہیں۔"

"شکریہ ڈاکٹر، تمہارے تعاون نے میرا کام آسان بنا دیا ہے۔ ہاں، ایڈمنڈ سائمن کی بیوہ کو [illegible]"

"میں نے جب میں لاش دیکھی تھی [illegible]



بہت بُری ہو رہی تھی اور وہ نروس بریک ڈاؤن کے قریب تھی۔ اس لیے میں نے اسے تیز ٹرنکولائزر دے کر سلا دیا۔"

"ایک بار پھر شکریہ ڈاکٹر۔" میں نے کہا اور فون بند کر کے نتاشا کی طرف دیکھا۔ "آخر وہ نکتہ مل گیا جس کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ حادثہ نہیں بلکہ قتل ہے۔ پولیس کو ایرک نے بیان دیا ہے کہ ایڈمنڈ واش روم سے نکل کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پھنسنے ہوئے قالین میں پاؤں پھنسنے سے گرا ہے اور اس کے چہرے کی چوٹیں بھی اسی بات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر مورمن نے اسپتال میں ایڈمنڈ کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں ایک گہرا جان لیوا زخم دریافت کیا اور اس نے پولیس کو اطلاع دینے کے بجائے ایرک سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ ایڈمنڈ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے گرا ہے اس لیے زخم اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں آیا ہے۔"

"میرے خدا... لیکن اس قتل کی وجہ؟" نتاشا بولی۔

"کیونکہ شادی حال میں ہوئی ہے اور یقیناً ابھی ایڈمنڈ کو وصیت کا موقع نہیں ملا ہوگا اور امکان ہے اس کی پرانی وصیت برقرار ہوگی اس صورت میں..."

"اس کے لیے بھی میرے پاس ایک تھیوری ہے۔" میں نے کہا۔ "ایڈمنڈ ستر سال کا تھا اور بہت دولت مند تھا۔ وہ چاہتا تو اسے حقیقتاً جوان اور حسین عورت مل سکتی تھی۔ وہ پچیس برس تک کی عورت سے شادی کر سکتا تھا اور یہ یقیناً اتنی مشکل بھی نہیں لگتی لیکن اس نے ایک ڈھلتی عمر کی بھدی اور عام صورت عورت سے شادی کی۔ یہ شادی یقیناً جسمانی کشش سے زیادہ ذہنی کشش اور رجحانات کی بنا پر ہوئی۔ یعنی ایڈمنڈ نے موبی میں کچھ ایسی اندرونی خصوصیات پائیں جو وہ کسی عورت میں دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے بعد موبی کی جسمانی کشش اس کے لیے اتنی ضروری نہیں رہی۔ دوسرے کی محبت میں اتنی تیزی سے گرفتار ہوا کہ اس نے موبی کا ماضی جاننے کی کوشش نہیں کی اور عجلت میں اس سے شادی کر لی۔"

"اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا؟"

"یقیناً اور یہی اس قتل کی وجہ بنا۔ شادی کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے کو کتنا ہی چھپائیں، آخر کھل جاتے ہیں۔ جلد ہی ایڈمنڈ کو احساس ہونے لگا کہ وہ غلط فیصلہ کر بیٹھا ہے لیکن وہ پہلے کی طرح عجلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر موبی کے اصرار پر یا اپنی مرضی سے ہنی مون کے لیے تیار ہو گیا۔ موبی نے جان بوجھ کر لاس اینجلس یا اس کے آس پاس کسی جگہ کا انتخاب کیا ہوگا۔ ہنی مون سے واپسی پر اس نے ایڈمنڈ کو اپنے بیٹے ایرک سے ملانے اور اسے منانے پر اصرار کیا ہوگا کیونکہ وہ ماں کی شادی سے ناراض تھا۔ ایڈمنڈ مان گیا۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ اس طرح اسے موبی کا ماضی جاننے میں آسانی ہوگی۔ اس لیے وہ میٹ ولا چلا آیا۔"

"تمہارا مطلب ہے موبی اور ایرک نے پہلے سے سب طے کر رکھا تھا؟" نتاشا نے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔ شاید موبی اسے ایرک کی حالت دکھا کر اس کے لیے مدد حاصل کرنا چاہ رہی تھی اور اسی مقصد کے لیے اسے میٹ ولا لائی تھی۔"

"پھر یہاں کیا ہوا؟"

"یہاں ایڈمنڈ کا ردعمل موبی کی توقعات کے خلاف گیا۔ مدد پر آمادگی کے بجائے ایڈمنڈ یہ دیکھ کر اکھڑ گیا کہ ایرک ایک ناکارہ اور خطرناک نشوں کا عادی نوجوان ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے گرل فرینڈ بھی ایسی رکھی ہے جو نشہ کرنے میں اس کے ساتھ برابر کی شریک ہے۔ پھر ان کا معیار زندگی بتا رہا تھا کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایرک ایک ایسی عمارت میں مقیم تھا جسے کئی سال پہلے مخدوش قرار دیا جا چکا تھا اور یہاں کسی قسم کی کوئی سہولت نہیں تھی۔ اس بات کا پورا امکان ہے موبی نے خود کو اس کے معیار کی عورت بنانے کے لیے جھوٹ بولا ہو اور اب یہ جھوٹ کھل کر سامنے آنے لگا۔ اس لیے ایڈمنڈ کا برہم ہونا لازمی تھا۔

ممکن ہے اس سلسلے میں دونوں میاں بیوی میں کوئی جھگڑا ہوا ہو اور ایڈمنڈ نے موبی کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ ایڈمنڈ ایک ذہین کاروباری آدمی تھا۔ اس نے جذبات میں آ کر موبی سے شادی تو کر لی تھی لیکن جہاں تک اس کی دولت اور اثاثوں میں موبی اور اس کے بیٹے ایرک کی شرکت کا تعلق تھا تو اس نے یقیناً ایسا بندوبست کیا ہوگا کہ اس سے طلاق کی صورت میں موبی کو اس میں سے کچھ نہ ملے۔ جب اس نے طلاق کی بات کی ہوگی تو موبی اور اس سے بھی زیادہ اس کے نکمے اور نشئی بیٹے کے ہوش اڑ گئے ہوں گے جو اپنے سوتیلے باپ کی دولت پر عیش کرنے کے پروگرام بنا رہا ہوگا۔"

"اس نے ایڈمنڈ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا... یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا؟"

"نہیں، ایسا بھی نہیں ہے۔ ایڈمنڈ کی بیوہ کی حیثیت سے موبی کو کچھ نہ کچھ تو ملتا لیکن وہ اس سے طلاق لے لیتا تو اسے کچھ نہیں ملتا۔"

"پھر بھی ایرک کا یہ فیصلہ کچھ زیادہ ہی سخت نہیں لگ رہا ہے؟"

"اگر ایک عام آدمی یہ کام کرنا چاہتا تو یقیناً تعجب ہوتا لیکن ایرک ایل ایس ڈی اور کوکین کو ملا کر نشہ کرتا تھا اور میں جانتا ہوں یہ دونوں نشے مل کر آدمی کو کتنا خطرناک بنا دیتے ہیں۔ اس میں قتل کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایرک نے بڑی آسانی سے ایڈمنڈ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا کیونکہ اس کے پاس ایک ریٹائرمنٹ کے قریب ڈاکٹر بھی موجود تھا جو اس کا ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے بہ آسانی ڈیتھ سرٹیفکیٹ دے دیتا اور ایرک کی توقع پوری ہوئی۔ ڈاکٹر مورمن نے اسے آسانی سے بنا کسی شک کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ دے دیا۔"

"کیا اس کے متضاد بیانات کو پولیس نے نوٹ نہیں کیا؟"

"میرا خیال ہے اس کی خوش قسمتی کہ ڈاکٹر مورمن جائے وقوع پر ذرا تاخیر سے پہنچا اور اس نے لاش کی پوزیشن نہیں دیکھی تھی جو اوندھے منہ پڑی تھی اور بعد میں جب اس نے پشت والا زخم دیکھا، تب پولیس کو بتانے سے گریز کیا اور اس نے صرف ایرک سے کہا جس نے بڑی صفائی سے اسے مطمئن کر دیا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے ایرک نے سچ مچ قالین پھاڑ کر حادثے کا انتظام کیا تھا یا کچھ اور کیا تھا؟"

"میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ اس نے حادثے پر بھروسا کرنے کا فیصلہ کیا ہو گا اور اس کام کو اپنے طور پر پایہ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہو گا۔ اب ذرا تصور کرو کہ ایڈمنڈ باتھ روم سے نکل کر نیچے آ رہا ہے اور اوپر تاریکی ہے۔ اس تاریکی سے نکل کر ایرک کسی سخت ڈنڈے یا اسی قسم کی چیز سے ایڈمنڈ کے سر پر مہلک وار کرتا ہے۔ وہ سیڑھیوں کے کنارے ہے اور چوٹ کھا کر سیدھا منہ کے بل نیچے زمین پر جا گرتا ہے۔ ایرک نے جان بوجھ کر ڈنڈا سر پر وہاں مارا جہاں گھنے بال تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پولیس کے ڈاکٹر نے چہرے کی سخت چوٹیں دیکھنے کے بعد اس کی کھوپڑی کا معائنہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے خیال میں چہرے کی چوٹیں ہی جان لیوا تھیں اور وہ منہ کے بل گرا تھا اس لیے سر پر چوٹ نہیں آئی ہو گی۔"

ثناشا اب سوفی صد قائل ہو چکی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "اب تم کیا کرو گے۔ کیا پولیس کے پاس جاؤ گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا دماغ خراب ہے جو میں اس معاملے میں بلاوجہ کا فریق بنوں۔ یہ کام تو ایڈمنڈ کے اصل وارثوں یعنی ولیم ورروز کے کرنے کا ہے۔"

"تب تم ان کو کال کرو گے؟"

"بالکل۔۔ اور گمنام آدمی بن کر اپنے مفروضات پولیس کو خط کی صورت میں روانہ کروں گا۔"

"ولیم اور ررروز کو بھی خط بھیجو گے؟"

"نہیں، میں روز سے ایک بار پھر فون پر بات کروں گا، جب لاش ان تک پہنچ جائے گی۔ اس طرح ان سے پوسٹ مارٹم کرانا آسان ہو جائے گا۔ اگر یہ بات نہیں کھلی تو یہ ماں بیٹا اپنے جرم کا نشان مٹانے کے لیے یا تو لاش کے ساتھ کچھ چھیڑ چھاڑ کریں گے یا فرار ہو جائیں گے جبکہ میں چاہتا ہوں کہ یہ پکڑے جائیں اور اپنے جرم کی سزا پائیں۔"

میرے اگلے دو دن بہت مصروف گزرے۔ میں نے جو خط تیار کیے جن میں اپنی تفتیش کا تفصیلی احوال لکھا تھا، ان کی کئی کاپیاں بنا کر گمنام آدمی کے طور پر میٹ ولا اور ریڈ فیلو کی مقامی پولیس پھر یہی کاپیاں ان دونوں ریاستوں کے پولیس ہیڈ کوارٹرز اور ایف بی آئی کو بھی روانہ کر دیں۔ یہ کام کر کے میں نے ایک بار پھر ایڈمنڈ کے گھر کال کی اور روز سے بات کی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اس کے باپ کے ساتھ کیا ہوا تھا تو وہ فون پر ہی پھٹ پڑی اور اس نے روتے ہوئے کہا۔

"مجھے پہلے ہی ان ماں بیٹے پر شک تھا، اب میں انہیں چھوڑوں گی۔"

"خیال رکھنا، پولیس کی آمد سے پہلے ان سے کوئی بات مت کرنا ورنہ وہ فرار ہو جائیں گے۔" میں نے اسے ہدایت دے کر فون بند کر دیا۔ مجھے امید تھی کہ اول تو پولیس یا روز میرا سراغ نہیں لگا سکیں گے اور اگر لگا لیا تب بھی میرا شکریہ ہی ادا کریں گے کیونکہ میری وجہ سے قاتل پکڑے جائیں گے۔ دو دن بعد اخبارات نے بتایا کہ میری کوششیں رنگ لائی تھیں اور پولیس نے ایرک اور اس کی ماں کو ایڈمنڈ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ تفتیش کے دوران انہوں نے انکشاف کیا کہ یہ پہلا کیس نہیں تھا بلکہ مولی اس سے پہلے بھی چار مختلف دولت مندوں سے شادی کر کے ان کو حادثاتی موت کا شکار بنا چکی تھی۔ اس کے شکار سارے دولت مند عمر رسیدہ تھے ، کسی موقع پر بھی ان کی موت پر شک نہیں کیا گیا تھا۔

میں اب بھی موت کا کالم شوق سے پڑھتا ہوں اور ثناشا تبصروں میں میرا پورا ساتھ دیتی ہے۔ وہ متفق ہو گئی ہے کہ وقت گزارنے کے لیے یہ ایک اچھا مشغلہ ہے۔



# دیوانہ

جمال دستی

تیز رفتار دوڑتی بھاگتی۔۔۔ زندگی انسان کو اکتا دیتی ہے۔۔۔ اور پھر اسے ویرانے حسین لگنے لگتے ہیں۔۔۔ ایسے ہی میاں بیوی کی مشترکہ کاوش۔۔۔ جو اپنے شہری ماحول سے کٹ کر کچھ لمحے فطرت کے ساتھ گزارنے کے متمنی تھے۔۔۔

ایک [illegible] کی ڈرامائی آمد [illegible] والی دلچسپ کہانی

نکی پال اور رائن پال اگوستا سے روانہ ہوئے تھے۔ ان کی منزل شمال کی طرف کینیڈا کی سرحد سے کچھ پہلے ایک چھوٹا سا ساحلی قصبہ میک ٹاؤن تھا جہاں نکی کا باپ جون میسن رہتا تھا۔ وہ ماہی گیر تھا لیکن اب ریٹائر ہو گیا تھا۔ نکی سال میں دو بار اس سے ملنے جاتی تھی۔ ایک بار اپریل میں جب موسم بہار کا آغاز ہوتا تھا اور دوسری بار اکتوبر میں جب سرما کا آغاز ہوتا تھا۔ نکی اگوستا میں اسکول ٹیچر تھی۔ رائن

ڈراگی پورٹ پر کرین آپریٹر تھا۔ ان کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے۔ کوئی بچہ نہیں تھا لیکن وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھے۔ انہوں نے بچے کے حصول کی کوشش بھی نہیں کی تھی ورنہ شاید وہ صاحبِ اولاد ہوتے۔ نمی تقریباً تیس برس کی سنہری بالوں والی دلکش عورت تھی۔ خاص طور سے اس کی براؤن آنکھیں اور بے داغ جلد دیکھنے والے کو متوجہ کرتی تھی۔ رائن عمر میں اس سے پانچ سال بڑا تھا لیکن سامنے سے اڑ جانے والے بالوں کی وجہ سے خاصا بڑا لگتا تھا۔ اس کا جسم مضبوط اور شانے چوڑے تھے۔ گنج سے قطع نظر وہ صورت کا برا نہیں تھا۔ اس لیے ان کا کپل مناسب لگتا تھا۔

اس بار ان کی روانگی میں ذرا تاخیر ہوگئی۔ کرین سے اترتے ہوئے رائن کا پاؤں سلپ ہو گیا اور ٹخنے کا جوڑ متاثر ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اس پر دو ہفتے تک زور ڈالنے سے منع کیا تھا اس لیے اکتوبر کے آغاز میں ان کی روانگی ملتوی ہوگئی۔ وہ اکتوبر کے آخر میں میک ٹاؤن جانے کے لیے نکلے تھے، جب سردی کا موسم شروع ہو گیا تھا اور اس دن اگوسٹا میں بھی موسم کی پہلی برف باری ہو رہی تھی۔ ویسے پوری ریاست میں گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ شہر سے باہر ہائی وے پر آئے تو اکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔ برف ابھی اتنی نہیں گری تھی کہ راستہ خطرناک ہو جاتا اس لیے رائن بے فکری سے وین ڈرائیو کر رہا تھا۔ برف گرنے کے ساتھ شمال کی طرف سے جھکڑ بھی چل رہے تھے۔ ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے نمی کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں پانچ گھنٹے لگ سکتے ہیں۔“

میک ٹاؤن اگوسٹا سے تقریباً دو سو کلو میٹرز دور تھا اور ہائی وے پر یہ راستہ چار گھنٹے میں طے ہو جاتا تھا لیکن اس دن موسم خراب تھا اور برف بھی گر رہی تھی اس لیے رائن احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ صبح دس بجے روانہ ہوئے تھے۔ اگر پانچ گھنٹے لگتے تب بھی وہ تین بجے تک جون کے گھر پہنچ جاتے۔ نمی سیٹ سے ٹیک لگائے چپس کھا رہی تھی۔ اسے سفر میں بوریت ہوتی تھی جسے دور کرنے کے لیے وہ مختلف طریقے اختیار کرتی تھی جس میں کھانا پینا بھی شامل تھا۔ کافی کے تھرماس اور کولڈ ڈرنک کے ٹن سمیت وہ تمام چیزیں گھر سے لے کر نکلے تھے۔ راستے میں ان کو صرف گاڑی میں ایندھن بھروانے کے لیے کہیں رکنا پڑتا۔ نمی نے ذرا آگے ہو کر آسمان کی طرف دیکھا۔

”موسم بہت خراب ہے۔“

رائن نیویارک کا رہنے والا تھا اور وہ نمی سے شادی کے بعد یہاں منتقل ہوا تھا اس لیے اسے یہاں کے موسم کا پتا نہیں تھا۔ نمی یہیں پلی بڑھی تھی اور اسے معلوم تھا کہ کس وقت موسم کیا رخ اختیار کر سکتا ہے۔ رائن نے پوچھا۔ ”تمہارا مطلب ہے موسم اس سے بھی زیادہ خراب ہو سکتا ہے؟“

”بالکل، میرا یہی خیال ہے۔ بہتر ہوگا تم رفتار تیز رکھو۔ ممکن ہے کچھ دیر بعد یہاں برفانی طوفان آجائے۔ اس سے پہلے ہم جتنا فاصلہ طے کرلیں اتنا بہتر ہوگا۔“

انہیں اگوسٹا سے نکلے ہوئے ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ رائن نے ریڈیو لگایا۔ کچھ دیر بعد نمی کے خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ نیوز کاسٹر نے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر بننے والے ایک طوفان کی خبر دی تھی جو آنے والے دو گھنٹوں میں اس ریاست کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ رائن نے پہلے ہی رفتار تیز کر دی تھی۔ وہ اور نمی فکر مند ہو گئے۔ ممکن ہے اگر اس طوفان کی خبر انہیں روانہ ہوتے وقت مل جاتی تو وہ سفر ملتوی کر دیتے۔ ریاست کا بیشتر حصہ ناہموار قسم کے جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے جو چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ہائی وے ان جنگلات کے درمیان بل کھاتی جا رہی تھی۔ شہر کے پاس انہیں اکا دکا گاڑیاں نظر آ رہی تھیں لیکن جیسے ہی وہ دور نکلے سڑک تاحدِ نگاہ ویران نظر آنے لگی۔ دس پندرہ منٹ بعد بڑی مشکل سے کوئی گاڑی ان کو کراس کرتی تھی۔ رائن نے محسوس کیا کہ برف باری میں تیزی آ رہی تھی۔ اب سڑک کی سیاہی پر سفیدی غالب آتی جا رہی تھی۔

”اگر موسم اسی رفتار سے خراب ہوتا رہا تو ہمیں کہیں رکنا پڑے گا۔“

انہیں سفر کرتے ہوئے دوسرا گھنٹا ہونے والا تھا۔ نمی نے چند لمحے کے لیے اپنی طرف کی کھڑکی کھولی اور ہوا کی کیفیت محسوس کر کے رائن کی بات کی تصدیق کی۔ ”ہوا میں ایک طرح کا ہلکا پن ہے، لگ رہا ہے طوفان جلد یہاں پہنچ جائے گا۔“

وہ اس روٹ پر کئی بار سفر کر چکے تھے اس لیے انہیں معلوم تھا کہ کچھ آگے ایک قصبہ ملے گا اور وہاں پر کئی اچھے موٹیلز اور ریسٹوران تھے۔ وہ وہاں ٹھہر سکتے تھے اور انہیں کھانے کو بھی مل جاتا۔ لیکن ابھی وہ قصبے سے [illegible] دس کلو میٹر دور تھے کہ انہیں آگے کی طرف سے راستہ بند ملا۔ دو پولیس کاریں اس طرح کھڑی تھیں کہ کوئی گاڑی ان سے [illegible] آگے نہیں جا سکتی تھی۔ چند ایک پولیس والے بھی [illegible] تھے۔ رائن نے تشویش سے کہا۔

”یہ کیا ہے... راستہ کیوں بند ہے؟“



”تم معلوم کر کے آؤ۔“ نمی نے اسے مشورہ دیا۔

رائن وین روک کر نیچے اترا اور ڈپٹی شیرف کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے پوچھا۔ ”راستہ کیوں بند ہے؟“

”آگے پل ٹوٹ گیا ہے۔“ ڈپٹی شیرف نے جواب دیا۔

”اوہ۔“ رائن پریشان ہوگیا۔ ”ہمیں میک ٹاؤن جانا ہے۔ شمال مشرق کی طرف۔“

ڈپٹی شیرف نے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں تمہاری رہنمائی کر سکتا ہوں۔“ اس نے اپنی کار سے علاقے کا ایک تفصیلی نقشہ نکالا اور اسے بونٹ پر پھیلا دیا۔ اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”تم واپس جا کر بائیں طرف نکلنے والی اس سڑک پر چلے جاؤ گے۔ بعض مقامات پر سڑک خراب ہے لیکن سفر کے قابل ہے۔ یہاں سے گھوم کر تم دوبارہ ہائی وے پر آسکو گے۔“ اس نے راستے پر انگلی گھماتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس راستے پر دو مسئلے ہیں! ایک تو تمہیں ستر کلو میٹرز کا اضافی سفر کرنا پڑے گا۔“

رائن فکر مند ہوگیا۔ ستر کلو میٹرز کا مطلب تھا مزید کوئی گھنٹے کا سفر اور راستے کے بارے میں ڈپٹی شیرف پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ خراب ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”دوسرا مسئلہ کیا ہے؟“

”گزشتہ تین سال کے دوران اس سڑک پر سفر کرنے والے کئی افراد لاپتا ہو چکے ہیں اور بعد میں ان کی گاڑیاں سڑک پر یا جنگل میں کہیں لاوارث کھڑی ملی ہیں۔ پولیس کا خیال ہے یہاں کوئی گروہ سرگرمِ عمل ہے اور وہ یہ وارداتیں کر رہا ہے۔“

”اوہ تو پولیس نے اب تک کسی کو گرفتار نہیں کیا ہے؟“

”نہیں، ابھی تک یہاں ہمیں کوئی مشکوک آدمی نہیں ملا ہے۔ آخری واردات چھ مہینے پہلے ہوئی تھی جب سفر کرنے والے دو بھائی غائب ہو گئے۔ اس کے بعد سے کوئی واقعہ نہیں ہوا ہے۔“

”شاید وہ گروہ اب یہاں سے جا چکا ہو۔“ رائن نے [illegible]

”ہاں لیکن تم پھر بھی محتاط رہنا۔ بلا ضرورت کہیں گاڑی مت روکنا... اور کوئی ہتھیار ہے؟“

”ہاں، میرے پاس پستول ہے۔“ رائن نے کہا اور اس کا شکریہ ادا کر کے واپس وین میں آیا اور نمی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ لیکن اس نے سڑک پر غائب ہونے والے افراد کا ذکر نہیں کیا تھا ورنہ نمی خوف زدہ ہو جاتی۔

”اب تم بتاؤ کہ کیا کریں؟“

نمی اپنے باپ سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ اس دنیا میں اس کا واحد خون کا رشتہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا بوڑھا باپ سارے سال ان دنوں کا انتظار کرتا ہے جب اس کی بیٹی اس کے پاس آئے۔ وہ نکلنے سے پہلے اسے آگاہ کر چکے تھے۔ اگر وہ واپس چلے جاتے تو جون کو بہت مایوسی ہوتی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے رائن سے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں اتنی زیادہ مشکل بھی نہیں ہوگی۔“

رائن نیم دلی سے رضامند ہوگیا۔ شاید وہ واپس جانا چاہتا تھا مگر نمی کی بات نے اسے مجبور کر دیا۔ اس نے وین اسٹارٹ کر کے واپس موڑی۔ ”اتنی دیر میں ہمیں ایک بھی گاڑی نظر نہیں آئی ہے۔“

”ہاں لیکن پولیس سڑکوں پر موجود ہے، اس کا مطلب ہے راستے کھلے ہوئے ہیں۔“ نمی نے اصرار کیا تو رائن خاموش ہوگیا۔ اس نے راستہ ذہن نشین کر لیا تھا۔ ان کے پاس بھی نقشہ تھا لیکن وہ اتنا تفصیلی نہیں تھا جتنا ڈپٹی شیرف کے پاس تھا۔ رائن نے ڈیش بورڈ سے نقشہ نکالا اور نمی سے کہا۔

”ذرا اسے دیکھو، ہمیں کوئی بیس کلو میٹرز پیچھے جانا ہے اور پھر بائیں طرف ایک راستہ نکلے گا جو ہمیں گھما کر اسی ہائی وے پر لے آئے گا۔“

نمی نے نقشہ دیکھا۔ ”ہاں، اس میں راستہ ہے تو لیکن یہ اتنا واضح نہیں ہے۔“

رائن نے وین روک کر نقشہ دیکھا۔ بیس کلو میٹرز پہلے نکلنے والی سڑک پہاڑوں اور جنگلوں میں واضح نہیں تھی۔ خاص طور سے اس کے آخری حصے کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ رائن کو یاد تھا کہ ڈپٹی شیرف کے نقشے پر یہ بالکل واضح تھی۔ ان کے پاس موجود نقشہ کوئی چھ سال پرانا تھا اور امکان تھا کہ اس میں تبدیلی آ چکی ہے۔ رائن نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور اسے اپنی یادداشت پر بھروسا تھا۔ اس نے وین آگے بڑھا دی۔ ”ہمیں سفر میں دو گھنٹے اور لگ سکتے ہیں۔“

نمی کے لیے اتنا بھی غنیمت تھا کہ وہ شام تک گھر پہنچ سکتے تھے۔ برف باری میں کسی قدر تیزی آ گئی تھی اور اب سڑک تقریباً سفید ہو گئی تھی۔ اگر سڑک کے کنارے لکڑی کی ریلنگ نہ لگی ہوتی تو بعض مقامات پر سڑک اور زمین میں پہچان بھی مشکل ہو جاتی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ہائی وے پر اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں ذیلی سڑک نکل رہی تھی۔ رائن نے اس پر گاڑی موڑ دی اور فوراً ہی نمی کو سنبھل کر بیٹھنا پڑا کیونکہ

سڑک آغاز میں ہی خاصی خراب نکلی۔ گاڑی کو مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے اور سفر پہلے جیسا پُرسکون نہیں رہا تھا۔ رائن کی وین بہت اچھی حالت میں تھی۔ اگرچہ اسے تین سال پہلے لیا تھا لیکن یہ اب بھی تقریباً نئی جیسی تھی اگر وہ ویسی رفتار سے چلاتا تو اتنے جھٹکے نہیں لگتے لیکن رائن جلد از جلد اس سڑک سے نکل کر دوبارہ ہائی وے پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

ذرا آگے جا کر سڑک بہتر ہوگئی اور اب اتنے جھٹکے نہیں لگ رہے تھے۔ رائن تیس سے چالیس کلومیٹرز فی گھنٹے کی رفتار سے وین چلا رہا تھا۔ نینی نے ذرا جھک کر دیکھا۔ ''اس رفتار سے ہمیں دوبارہ ہائی وے تک پہنچنے میں ڈیڑھ گھنٹا لگ سکتا ہے۔''

''میرا بھی یہی اندازہ ہے۔'' رائن نے کہا۔ ''براو کرم اس وقت مجھ سے بات مت کرو، میں پوری توجہ سے ڈرائیونگ کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں میوزک سن لیتی ہوں۔'' نینی نے کہا اور ریڈیو پر ایک مقامی میوزک چینل ٹیون کیا۔ اس سے اچھے گانے نشر ہو رہے تھے۔ نینی گانے سننے لگی۔ کچھ دیر بعد گانے رک گئے اور ڈی جے نے اس علاقے میں سفر کرنے والوں کو خبردار کیا کہ موسم خراب ہو رہا ہے۔ آنے والے طوفان کی شدت میں تیزی آرہی ہے اس لیے احتیاطی تدابیر کرلیں۔ گھر سے بلا ضرورت نکلنے سے گریز کریں۔ اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کرلیں۔ جو لوگ اس وقت سفر میں ہیں، انہیں چاہیے کہیں پناہ حاصل کرلیں۔ نینی نے پریشان ہوکر رائن کی طرف دیکھا۔

''اب ہم کیا کریں؟''

''فی الحال ہم سفر کے سوا کچھ نہیں کرسکتے ہیں۔'' رائن نے جواب دیا۔ ''تم دیکھ رہی ہو، یہ بالکل ویران علاقہ ہے۔''

یہ سڑک کسی قدر بلند علاقے سے گزر رہی تھی اور یہاں پہلے ہی برف جمی ہوئی تھی۔ لگتا تھا یہاں موسم سرما کی برف باری کا آغاز پہلے ہی ہوگیا تھا۔ سڑک مزید بلندی کی طرف جا رہی تھی اور اب جنگل چھدرا ہو رہا تھا۔ نینی کو سردی لگ رہی تھی، اس نے عقب سے اپنی جیکٹ اٹھا کر پہن لی۔ رائن پہلے ہی اپنی جیکٹ پہن چکا تھا۔ اس کے باوجود انہیں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ نینی نے ریڈیو کی آواز کم کردی۔ اس نے رائن سے کہا۔ ''ہمیں کوئی جگہ تلاش کرنی چاہیے تاکہ طوفان شدت اختیار کرے تو ہم وہاں پناہ لے سکیں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' رائن نے جواب دیا۔ ''لیکن یہاں کچھ نظر ہی نہیں آرہا ہے۔''

دوپہر کے دو بج رہے تھے اور اب ہوا کے جھونکوں میں شدت آتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی برف کی مقدار بھی بڑھ رہی تھی۔ ونڈ اسکرین سے برف ہٹانے کے لیے رائن کو بار بار وائپر چلانے پڑ رہے تھے۔ آسمان تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک طوفان کی شدت میں اتنی تیزی آگئی کہ چند گز سے آگے سوائے برف کے اڑتے گالوں کے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ رائن نے وین کی رفتار بہت کم کردی۔ طوفان میں شدت آگئی تھی اور اب انہیں کہیں پناہ حاصل کرنی تھی لیکن یہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ رک بھی نہیں سکتے تھے۔ رکنے کی صورت میں اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وین کا انجن دوبارہ اسٹارٹ ہوتا بھی یا نہیں۔ اسے ذہنی شیرف کی وارداتوں سے متعلق وارننگ بھی یاد تھی اس لیے سست رفتاری سے ہی سہی مگر رائن وین چلا رہا تھا۔ ''اب کیا ہوگا؟'' نینی نے کہا۔

''فکر مت کرو، یہ سڑک بہت زیادہ طویل نہیں ہے۔ اگر ہمیں کہیں پناہ نہیں ملی، تب بھی ہم کم رفتار سے چلتے ہوئے ہائی وے تک پہنچ جائیں گے۔''

رائن کی بات سن کر نینی کی فکر کم ہوئی۔ وہ کسی قدر شرمندہ ہو رہی تھی، اسی کے اصرار پر رائن نے یہ سفر جاری رکھا تھا اور وہ اس مشکل میں پڑ گئے تھے۔ اچانک انہیں سامنے سڑک کے کنارے ایک کار کھڑی نظر آئی۔ اس سڑک پر سفر کے دوران یہ پہلی گاڑی تھی جو انہیں نظر آئی تھی۔ رائن نے وین کار کے ساتھ روک دی لیکن انجن بند نہیں کیا تھا۔ یہاں سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ کار میں کوئی ہے یا وہ خالی ہے۔ رائن نے نینی سے کہا۔

''تم یہیں رکو میں دیکھ کر آتا ہوں، ممکن ہے کسی کو مدد کی ضرورت ہو۔''

رائن اتر کر کار تک آیا۔ اس نے کھڑکی کے شیشے پر جم جانے والی کہر ہاتھ سے صاف کی اور اندر جھانکا لیکن کار اندر سے خالی تھی۔ اسے تعجب ہوا کہ کار والا یا والے کہاں گئے تھے۔ کار کی حالت سے صاف لگ رہا تھا کہ اسے یہاں رکے آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ کہیں کار کے مسافر کسی حادثے کا شکار تو نہیں ہوگئے تھے... [illegible] سفر کرنے والے کئی مسافر ہو چکے تھے [illegible] بعد میں صرف ان کی گاڑیاں ملی تھیں۔ اچانک نینی نے وین کا ہارن بجایا، رائن چونک کر واپس آیا۔ اس نے دروازہ کھول [illegible] پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''وہ دیکھو۔'' نینی [illegible] کے عقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہاں کوئی مکان ہے۔''

رائن نے مڑ کر دیکھا تو اسے تقریباً سو گز کے فاصلے پر [illegible] ہوئی ڈھلان پر ایک چھوٹا سا ہٹ نظر آیا۔ یہ بالکل سفید [illegible] کا تھا، اس لیے ماحول کا حصہ بن گیا تھا اور غور سے دیکھے [illegible] نظر نہیں آسکتا تھا۔ نینی نے اسے دیکھ لیا تھا۔ رائن نے پھر [illegible] وین میں ٹھہرنے اور دروازے اندر سے لاک کرنے کی [illegible] کی، پھر ہچکچا کر کہا۔ ''اگر کوئی خطرہ محسوس ہو تو پستول نکال لینا، ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے رکھا ہے۔''

نینی چونکی۔ ''کیسا خطرہ؟''

''اس سڑک پر گزشتہ تین سال سے سفر کرنے والوں کے غائب ہونے کے واقعات پیش آرہے ہیں۔ آخری بار چھ مہینے پہلے دو بھائی سفر کرتے ہوئے غائب ہوئے تھے۔''

''تم نے بتایا نہیں۔''

''ہاں، میں نہیں چاہتا تھا کہ تم ڈر جاؤ۔'' رائن نے کہا اور ہٹ کی طرف بڑھ گیا۔ نینی اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ مگر ابھی وہ کچھ دور تھا کہ ہٹ کے اندر سے ایک مرد برآمد ہوا۔ اس نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ شاید وین کا ہارن سن کر باہر آیا تھا۔ رائن اس کے پاس پہنچا۔ مرد تقریباً چالیس سال کا لیکن تومند اور صورت سے سخت نظر آنے والا شخص تھا۔ اس نے رائن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''میرا خیال ہے تم بھی پناہ کی تلاش میں ہو۔''

رائن نے سر ہلایا۔ ''یہ کار تمہاری ہے؟''

''میں اور میری گرل فرینڈ سفر کر رہے تھے کہ طوفان آگیا۔ خوش قسمتی سے ہمیں یہ ہٹ نظر آگیا۔''

''اور ہمیں تمہاری کار نظر آگئی۔'' رائن مسکرایا۔ ''میں رائن پل ہوں۔ میری بیوی نیچے وین میں ہے۔''

اس بار آدمی بھی خفیف سا مسکرایا۔ ''مجھے گریگ بوشر کہتے ہیں۔''

''ہٹ کس کا ہے؟''

گریگ نے شانے ہلائے۔ ''ابھی تو کچھ نہیں معلوم۔ یہ ہٹ آباد نہیں لگتا۔ اندر سامان ہے لیکن ایسا لگتا ہے کئی [illegible] سے کسی نے یہاں قدم بھی نہیں رکھا ہے مگر اچھی بات [illegible] آتش دان اور جلانے کے لیے لکڑیاں ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے ہم بھی یہاں پناہ لے سکتے ہیں؟'' رائن نے کہا۔

''بالکل۔'' گریگ نے آسمان کی طرف دیکھا جو [illegible] تاریک ہو چکا تھا۔ ''ایسا لگ رہا ہے کہ کم سے کم رات [illegible] یہاں رکنا پڑے گا۔''





رائن نے محسوس کیا کہ ابھی سے سردی کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ پاؤں شل ہو رہے تھے اگر رات ہو جاتی تو درجۂ حرارت یقیناً نقطۂ انجماد سے بہت نیچے گر جاتا اور اس صورت میں باہر کہیں اور آگ کے بغیر رات گزارنا ناممکن ہو جاتا۔ ان کے پاس اس ہٹ میں پناہ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے گریگ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں اپنی بیوی کو لے کر آتا ہوں۔''

اس نے نیچے آکر نینی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ''ہمارے پاس اس ہٹ کے سوا کوئی چوائس نہیں ہے۔''

نینی ہچکچائی۔ ''کیا یہ اچھی بات ہوگی... ہٹ بہرحال کسی اور کا ہے؟''

''صرف ہم نہیں بلکہ دو افراد اور پہلے ہی وہاں داخل ہو چکے ہیں۔ ہٹ بھی انہوں نے کھولا تھا اس لیے ہم پر الزام نہیں آئے گا۔'' رائن نے اسے تسلی دی تو نینی مان گئی۔ وہ نیچے اترے۔ رائن نے بعض ضروری چیزیں ایک چھوٹے بیگ میں ڈال کر ساتھ لے لیں اور وین کو بند کردیا۔ طوفان کے جھکڑوں میں تندی آگئی تھی اور وہ بہ مشکل ہی خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ رائن، نینی کو سہارا دے کر اوپر تک لایا۔ گریگ ہٹ کے دروازے پر ان کا منتظر تھا۔ ان کے آتے ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔ یہاں جھکڑ اتنے تیز تھے کہ دروازہ کھول نہیں سکتے تھے کیونکہ ذرا سی دیر میں تخ ہوا اندر کی ساری گرمی کھینچ کر لے جاتی۔ ان کے اندر آتے ہی گریگ نے دروازہ بند کردیا۔ ہٹ چھوٹا اور صرف دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک بیڈ روم تھا اور ایک لاؤنج تھا اور یہیں کچن بھی تھا۔ چاروں طرف کھڑکیاں تھیں جن پر شیشے تھے۔ دونوں کمروں میں آتش دان تھے۔ لاؤنج والے آتش دان میں آگ روشن تھی۔ اس کے اوپر دیوار پر ایک فیملی کی تصویر لگی تھی۔ یہ ایک آدمی، ایک عورت اور ایک دس بارہ سال کا بچہ تھا۔ یہ یقیناً اس ہٹ کے مالکوں کی تصویر تھی۔ ایک جوان اور خوب صورت عورت اس کے پاس بیٹھی جلتی لکڑیوں کو فولادی سلاخ سے کرید رہی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ لکڑیاں زیادہ تیزی سے جلیں تاکہ حرارت زیادہ ہو۔ ان کی آمد پر وہ کھڑی ہوگئی۔ اس نے جینز کے ساتھ چست سوئیٹر پہن رکھا تھا جس میں اس کے جسمانی خدوخال نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے مسکرا کر رائن اور نینی سے ہاتھ ملایا۔ گریگ نے تعارف کرایا۔

''بیٹریٹ گارسا۔''

''تم لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔'' وہ بولی۔ ''ویسے تم

چاہو تو مجھے ہیٹ کہہ سکتے ہو۔"

"شکریہ۔" رائن نے کہا اور آگ پر ہاتھ سینکنے لگا۔ نینی بھی آتش دان کے پاس کھڑی ہو گئی۔ وہ ہٹ کا معائنہ کر رہی تھی۔ لاؤنج میں ایک ٹو سیٹر صوفہ اور ایک کھانے کی میز تھی اس کے گرد چار کرسیاں رکھی تھیں۔ لیکن ان پر مٹی پڑی تھی جیسے عرصے سے کسی نے انہیں استعمال نہ کیا ہو۔ رائن نے گریگ کی طرف دیکھا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو، شاید یہ جگہ خالی پڑی رہتی ہے۔"

"میرا خیال ہے یہ کسی کا تفریحی ہٹ ہے۔" ہیٹ بولی۔ اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی لوچ تھی جو مردوں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نینی نے اسے پسند نہیں کیا۔ یہ چیز اس کے انداز سے عیاں تھی۔ اس نے ہیٹ سے زیادہ گرم جوشی نہیں دکھائی تھی۔ "اس کا مالک یہاں کم آتا ہے۔"

"ممکن ہے یہ شکار کے لیے مخصوص ہو۔" رائن نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ اس علاقے میں بارہ سنگھے کا شکار ملتا ہے اور یہاں ندیوں میں ٹراؤٹ بھی پائی جاتی ہے۔"

"ممکن ہے۔" گریگ نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ وہ کھڑکی کے پاس کرسی رکھے بیٹھا تھا۔ نینی کچن کا جائزہ لینے لگی۔ وہاں چولہے اور گیس سلینڈر تھا۔ اوپری شیلف میں معمولی قسم کے برتن اور ایک میں کافی کا ڈبا موجود تھا۔ اس نے دوسروں کی طرف دیکھا۔

"اگر ہم کافی بنا لیں تو میرا خیال ہے اس ہٹ کے مالک کو اعتراض نہیں ہوگا۔"

ہیٹ خوش دلی سے ہنسی۔ "بالکل بھی نہیں... وہ اس وقت کہیں دور اپنے گھر میں سکون سے بیٹھا ہوگا اور اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اس کے ہٹ میں کچھ لوگوں نے پناہ لے رکھی ہے۔"

نینی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور کافی تیار کرنے لگی۔ کیونکہ کریم یا شکر نام کی کوئی چیز نہیں تھی اس لیے انہیں صرف سیاہ اور تلخ کافی پر گزارہ کرنا تھا۔ لیکن اس موسم میں یہ بھی غنیمت تھا۔ اس نے مگوں میں ڈال کر سب کو کافی دی۔ رائن بیڈ روم میں جھانک کر آیا۔ اس نے اطلاع دی۔

"باتھ روم میں پانی آ رہا ہے لیکن بہت سرد ہے.... بیڈ روم میں خواتین سو سکتی ہیں لیکن ہمیں لاؤنج میں گزارہ کرنا ہوگا۔ خوش قسمتی سے یہاں کچھ کمبل بھی ہیں۔"

"یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔" گریگ نے کہا۔ "تم صوفے پر لیٹ جانا، میں نیچے آتش دان کے سامنے دری پر لوں گا۔"

رائن نے سر ہلایا۔ "دیکھیں گے لیکن اس وقت ہمیں لکڑی کی ضرورت ہے۔ یہاں جلانے کے لیے زیادہ لکڑی نہیں ہے۔"

چار بج چکے تھے اور باہر مکمل تاریکی چھا گئی تھی جس میں رہ رہ کے برف کے ذرّے چمک رہے تھے۔ نینی نے اس خیال کی مخالفت کی۔ "نہیں، اس موسم میں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جتنی لکڑی ہے، ہم اس سے گزارہ کر سکتے ہیں۔"

"لیکن یہ لکڑی اس آتش دان میں بھی چند گھنٹے سے زیادہ نہیں چلے گی۔" ہیٹ نے کہا۔ "ابھی رات ہونے میں بھی وقت ہے۔"

"ہمیں کم سے کم سولہ گھنٹے یہاں گزارنے ہیں۔" گریگ نے کہا۔

"اس مسئلے پر بعد میں غور کریں گے۔" رائن نے کہا۔ "فی الوقت کھانے کی بات کرو۔ تم لوگوں کے پاس کھانے کو کیا ہے؟"

"ہمارے پاس کچھ سینڈوچز اور دو عدد چیز برگر ہیں۔" ہیٹ نے کہا۔ "اس کے علاوہ چاکلیٹس اور ایک بوتل شیمپین کی ہے۔"

"ہمارے پاس کباب اور چپس ہیں۔" نینی بولی۔ "ساتھ میں کولڈ ڈرنکس ہیں۔"

"میرا خیال ہے ڈنر اچھا خاصا ہو جائے گا۔" رائن خوش ہو گیا۔

گریگ اور ہیٹ کا سامان ایک بڑے کاغذی شاپر میں تھا۔ گریگ نے اس میں سے شیمپین کی بڑے سائز کی بوتل نکالی تو رائن کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اور گریگ شراب نوشی کر رہے تھے اور خواتین ڈنر کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ پہلے انہوں نے کچن اور ڈنر ٹیبل کی صفائی کی، برتن نکال کر دھوئے۔ پانی سرد تھا لیکن اس سے بچاؤ کے لیے انہیں ربر کے دستانے مل گئے تھے۔ آگ کی وجہ سے [illegible] خوشگوار حد تک گرم ہو گیا تھا اس لیے انہوں نے [illegible] دی تھیں۔ گریگ نے بھی اپنا اوور کوٹ اتار کر ٹانگ دیا۔ سات بجے تک ڈنر تیار تھا۔ نینی نے سب کچھ گرم کر کے [illegible] اس نے ہیٹ کے ساتھ مل کر میز سجائی۔ [illegible] کر رہے تھے۔ گریگ اور اس نے کھانے سے پہلے [illegible] پی تھی اس کے باوجود بوتل میں شیمپین بچ گئی تھی۔ سب نے



بھوکے تھے اس لیے کھانا صاف ہو گیا۔ کھانے کے بعد ہیٹ نے سب کو چاکلیٹ دی اور نینی نے ایک بار پھر کافی بنائی۔ اب سب آسودہ اور خوش ہو گئے تھے اور اس وقت وہ باہر جاری طوفان کو بھی بھول گئے تھے۔ رائن اور گریگ کسی موڈ میں تھے اور بات بات پر ہنس رہے تھے۔ نینی اور ہیٹ صوفے پر ساتھ لیکن چپ بیٹھی تھیں۔

"اوہ۔" ہیٹ چونکی۔ "آگ کم ہو رہی ہے۔"

آتش دان کے پاس جلانے والی لکڑی رکھی تھی لیکن اس کے صرف دو ٹکڑے باقی رہ گئے تھے۔ یہ ایک گھنٹے کے لیے بھی ناکافی تھے۔ ہیٹ کی بات پر گریگ نے کہا۔ "ہمیں لکڑی لانی پڑے گی۔"

نینی نے مخالفت کی۔ "اس موسم میں باہر جانا مناسب نہیں ہوگا۔ ہم کمبلوں میں گزارہ کر سکتے ہیں۔"

نو بجے باہر مکمل تاریکی تھی۔ اس میں صرف طوفان کی آواز آ رہی تھی اور یہ آواز بتا رہی تھی کہ طوفان کی شدت میں کمی کوئی نہیں آئی ہے بلکہ اضافہ ہی ہوا ہے۔ رائن نے اس کی طرف دیکھا۔ "میرا اندازہ ہے درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے گر گیا ہے۔ صرف کمبل سردی سے بچاؤ کے لیے ناکافی ہیں۔ ہمیں ضروری آگ کی ضرورت پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے لیکن زیادہ دور مت جانا۔" نینی نے کہا۔ وہ رائن کی بات سمجھ گئی تھی۔ رائن اور گریگ باہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ انہوں نے جیکٹ، اوور کوٹ، مفلر اور دستانے پہن لیے تھے۔ رائن نے نینی سے کہا۔

"ہمارے جانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر لینا اور جب تک ہم میں سے کسی کی آواز نہ سنو، دروازہ مت کھولنا۔"

نینی نے سر ہلایا۔ جیسے ہی گریگ اور رائن باہر گئے، اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ہیٹ سکڑ سمٹ کر صوفے پر لیٹ گئی تھی۔ نینی نے بیٹھنے سے پہلے ہٹ کی کھڑکیوں کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ انہوں نے دیکھا نہیں تھا، ممکن تھا کہ ان میں سے کوئی کھلی ہوتی۔ ہٹ میں کل چھ کھڑکیاں تھیں۔ ان کے بیرونی مضبوط پٹ لگے تھے اور پٹوں میں چھوٹے چھوٹے شیشے تھے۔ ہر کھڑکی کو بند کرنے کے لیے اندر سے زنجیر لگی تھی۔ اگر کوئی شیشہ توڑ دیتا، تب بھی اسے نہیں کھول سکتا تھا۔ تمام کھڑکیاں اندر سے اچھی طرح بند تھیں۔ [illegible] بیڈ روم میں تھی۔ یہ ہٹ کا عقبی حصہ تھا جہاں سے جنگل صاف نظر آتا ہوگا لیکن ابھی سوائے تاریکی کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہٹ میں بجلی نہیں تھی لیکن دیواروں پر کیروسین لیمپ تھے۔ ان میں تیل تھا، انہوں نے لیمپ جلا لیے تھے۔

رائن وین سے جو سامان لایا تھا، اس میں دو عدد طاقت ور ٹارچیں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک ٹارچ رائن ساتھ لے گیا تھا اور ایک نینی کے پاس تھی۔ وہ بیڈ روم کی عقبی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اچانک اسے لگا جیسے برف کی گرتی چادر کے پیچھے کوئی حرکت کر رہا ہو۔ وہ ڈر کر پیچھے ہو گئی۔ پھر اس نے ہمت کر کے ٹارچ روشن کی تو اسے کھڑکی سے کوئی دس قدم دور ایک سایہ سا نظر آیا جو بہت تیزی سے پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن وہ واضح نہیں تھا۔ نینی سوچنے لگی کہ وہ سچ مچ کوئی سایہ تھا یا ہوا کے زور پر لہرا کر گرتی برف نے نظروں کو دھوکا دیا تھا۔ بیڈ روم ٹھنڈا ہو رہا تھا، وہ لاؤنج میں آ گئی جہاں آتش دان میں آخری لکڑیاں جل رہی تھیں۔

☆☆☆

کلہاڑی انہیں ہٹ سے مل گئی تھی اور وہ رائن کے پاس تھی۔ ٹارچ گریگ نے سنبھال رکھی تھی۔ ہوا کا زور اور شور اتنا تھا کہ انہیں بہ مشکل ہی دوسرے کی کہی بات سمجھ آ رہی تھی اس لیے وہ گفتگو سے گریز کر رہے تھے۔ ان کا رخ اوپری جنگل کی طرف تھا۔ کیونکہ ڈھلان پر صرف جھاڑیاں تھیں جن سے لکڑی ملنے کی امید نہیں تھی، لکڑی صرف اوپر جنگل میں مل سکتی تھی۔ یہ آباد علاقہ نہیں تھا اس لیے رائن کو امید تھی کہ انہیں یہاں خاصی مقدار میں جلانے کے لائق لکڑی مل جائے گی۔ کھلی جگہ میں وہ سر جھکائے اور خود کو ہوا سے بچاتے ہوئے چل رہے تھے لیکن جنگل میں داخل ہو کر انہیں کچھ سکون ملا۔ رائن نے کہا۔

"یہاں ہوا کا زور اتنا نہیں ہے۔"

"درست کہا۔" گریگ بولا۔ وہ ہانپ رہا تھا حالانکہ وہ اچھا خاصا صحت مند آدمی تھا لیکن اس وقت یوں سانس کھینچ رہا تھا جیسے اسے دمے کا مرض ہو۔ رائن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا... تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

"نہیں۔" وہ بے چینی سے بولا۔ "مجھے سانس کا مسئلہ ہوتا ہے اور دوا پیچھے گاڑی میں رہ گئی ہے۔"

"اوہ تب تم جا کر دوا لے آؤ۔" رائن نے ہمدردی سے کہا۔

"تم اکیلے رہ جاؤ گے۔" گریگ نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، ویسے بھی کلہاڑی ایک ہے اس لیے ہم میں سے ایک ہی لکڑی کاٹ سکتا ہے۔ ایسا کرو تم جا کر دوا

لے لو اور طبیعت ٹھیک ہو جائے تو یہاں آجانا ورنہ میں جا کر ان دونوں کو لے آؤں گا اور ہم لکڑی لے جائیں گے۔“

گریگ نے سر ہلایا اور ٹارچ اس کی طرف بڑھا دی۔ ”میرے پاس ایک چھوٹی ٹارچ ہے، میں اس کی مدد سے چلا جاؤں گا۔“

کچھ دیر بعد گریگ نیچے ڈھلان کی طرف غائب ہو گیا اور رائن جنگل میں گھوم کر لکڑی تلاش کرنے لگا۔ اس کا اندازہ درست نکلا تھا۔ یہاں لکڑی کی کمی نہیں تھی۔ کئی خشک ہو جانے والے درخت زمین پر گرے ہوئے تھے۔

☆☆☆

صوفے پر بیٹ کا قبضہ تھا اس لیے مجبوراً نینی کرسی لا کر آتش دان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی، رائن اور گریگ کو گئے ہوئے نصف گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ اس کے خیال میں اب تک انہیں واپس آجانا چاہیے تھا۔ وہ خود کو تسلی دے رہی تھی کہ ممکن ہے انہیں لکڑی نہ ملی ہو اور وہ اس کی تلاش میں دور نکل گئے ہوں۔ آتش دان کے ساتھ ہی عقب کی طرف کھلنے والی کھڑکی تھی۔ نینی بار بار اس کے شیشوں سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن ٹارچ کی روشنی میں چند گز سے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نینی کھڑکی کی طرف ہی دیکھ رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا باہر ایک سایہ سا گزرا ہے۔ وہ بے ساختہ کھڑکی کے پاس آئی اور ٹارچ کی روشنی میں باہر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اچانک ایک ہاتھ آ کر کھڑکی کے شیشے سے لگا اور شیشے پر اس کا نشان بن گیا جیسے ہاتھ خون آلود ہو۔ بس ہاتھ لگا اور پیچھے ہٹ گیا۔ نینی نے بے ساختہ چیخ ماری۔

”کک... کیا ہوا؟“ بیٹ ہڑبڑا کر اٹھی۔ وہ نیم غنودگی میں تھی۔

”بب... باہر کوئی ہے۔“ نینی نے خوف زدہ انداز میں کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

بیٹ نے شیشے پر بنا ہاتھ کا خون آلود نشان دیکھا تو وہ بھی ڈر گئی۔ پھر اسے خیال آیا۔ ”کہیں یہ گریگ یا رائن میں سے کوئی نہ ہو۔ وہ زخمی ہو گیا ہو۔“

”نہیں۔“ نینی تڑپ گئی۔ اس نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا اور رائن کو کال کرنے لگی۔ بیل جا رہی تھی لیکن کئی بیل بجنے کے بعد بھی رائن نے کال ریسیو نہیں کی۔ آخر بیل بج بج کر بند ہو گئی۔ نینی نے کہا۔ ”ہمیں باہر جانا ہوگا۔“

مگر بیٹ خوف زدہ تھی۔ ”نہیں، وہ نہ جانے کون ہے۔ اگر رائن یا گریگ میں سے ہوتا تو اس طرح کھڑکی پر ہاتھ مار کر نہ رہ جاتا۔ وہ دروازے سے اندر آتا۔“

بیٹ کی بات اس کے دل کو لگی اس لیے اس نے باہر جانے کا ارادہ تو ترک کر دیا لیکن ٹارچ لے کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ مگر کیبن کے چاروں طرف کوئی نہیں تھا۔ بیٹ بھی خوف زدہ سی اس کے ساتھ تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو دونوں اچھل پڑیں۔ بیٹ نے لپک کر آتش دان کی سلاخ اٹھا لی اور نینی نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں، دروازہ کھولو۔“ گریگ کی آواز آئی تو نینی نے سکون کا سانس لیا اور بیٹ نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ لیکن گریگ اکیلا ہی اندر آیا تھا۔ اس نے خود پر سے برف جھاڑتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

”رائن کہاں ہے؟“ نینی نے پوچھا۔

”وہ آیا نہیں؟“ گریگ نے تعجب سے کہا۔ ”دراصل میری طبیعت خراب ہو گئی تھی اور میں دوا لینے نیچے اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا تھا۔ پھر دوا لے کر کچھ دیر وہیں رہا۔ اب تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔“

”وہ نہیں آیا ہے۔“ نینی نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ ”اور نہ کال ریسیو کر رہا ہے۔“

”لیکن باہر کوئی ہے۔“ بیٹ بولی۔ ”یہ دیکھو، ہاتھ کا خون آلود نشان۔“

گریگ نے کھڑکی کے شیشے پر بنے اس نشان کو دیکھا تو وہ بھی پریشان نظر آنے لگا۔ ”ممکن ہے رائن کسی وجہ سے زخمی ہو گیا ہو اور یہ اس کے ہاتھ کا نشان ہو۔“

یہ سن کر نینی تڑپ گئی۔ ”نہیں.... پھر وہ اندر کیوں نہیں آیا؟“

”کیا کہہ سکتے ہیں؟“ گریگ نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ ”ممکن ہے وہ زیادہ زخمی ہو گیا ہو۔“

”میں اسے دیکھنے جا رہی ہوں۔“ نینی نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ گریگ نے اسے روکنا چاہا لیکن اس نے دروازہ کھول دیا اور فوراً ہی چیخ مار کر پیچھے ہٹی۔ سامنے ایک جوان آدمی اپنے سینے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا اور اس کا ہاتھ خون سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن کہنے کے بجائے وہ اوندھے منہ گر کر ساکت ہو گیا۔ اس بار نینی کے ساتھ بیٹ نے بھی چیخ ماری تھی۔ آنے والا آدھا دروازے کے اندر تھا اور آدھا باہر تھا۔ گریگ نے جلدی سے آگے آ کر اسے پورا اندر کھینچا اور دروازہ بند کر دیا کیونکہ اتنی دیر میں یخ بستہ ہواؤں نے ہٹ کو اندر سے [illegible]



گریگ بے ہوش آدمی کو کھینچ کر آتش دان تک لایا۔ اس نے صرف پینٹ شرٹ پہنی ہوئی تھی اور سردی سے اس کا رنگ نیلا پڑ گیا تھا۔ اس کی شرٹ سامنے سے خون آلود ہو رہی تھی۔ چہرے سے وہ خوش رو اور نرم مزاج آدمی لگ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ موٹے اور چہرے پر ہلکی سی شیو تھی۔ بیٹ نے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے یہی باہر تھا اور شیشے پر اسی کے ہاتھ کا نشان ہے۔“

”شاید۔“ نینی بولی۔ گریگ اسے اندر لا کر اب دور بیٹھا تھا، اس نے آدمی کو ہوش میں لانے یا اس کا زخم دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نینی رائن کے لیے پریشان تھی لیکن اسے اس آدمی سے بھی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ زخمی اور بے ہوش تھا۔ اسے طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس نے بیٹ کی طرف دیکھا۔ ”ہمیں اس کی مدد کرنا ہوگی۔“

”میں کچھ نہیں کر سکتی۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”مجھ سے خون برداشت نہیں ہوتا۔“

نینی کو غصہ آ گیا۔ ”تمہارے جسم میں بھی خون ہی دوڑ رہا ہے۔“

بیٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گریگ کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ گریگ بدستور گہرے سانس لے رہا تھا۔ نینی اندر گئی، اس نے باتھ روم میں دیکھا۔ وہاں اسے طبی مدد کا سامان اور زخم صاف کرنے والی دوا مل گئی۔ وہ چیزیں لے آئی۔ اس نے سب سے پہلے آدمی کی شرٹ کے بٹن کھولے۔ اس کی پسلی پر دل کے مقام سے ذرا نیچے کسی تیز دھار آلے کا کوئی چار انچ لمبا نشان تھا۔ کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔ خون تقریباً رک گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ زخم زیادہ گہرا نہیں۔ نینی نے زخم پر صاف کرنے والا لوشن انڈیلا تو وہ چیخ مار کر ہوش میں آ گیا۔

”اف... آہ۔“ وہ کراہا۔

”سب ٹھیک ہے۔“ نینی نے روئی سے زخم صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”معمولی زخم ہے، میں ابھی اس پر ٹانکے لگانے والی ہوں۔“

نینی نے کسی زمانے میں ابتدائی طبی مدد کا رضاکارانہ کورس کیا تھا۔ اس کا اندازہ درست تھا، زخم لمبا تھا لیکن زیادہ گہرا نہیں تھا۔ زخم صاف کر کے نینی نے اس پر ٹانکے لگائے اور خون خشک کرنے والا پاؤڈر چھڑک کر اوپر سے چپکنے والی ٹیپ سے چپکا دی۔ بیٹ نے اس دوران میں کافی تیار کر لی تھی۔ کافی کے چند گھونٹ لے کر آدمی کی حالت خاصی حد تک بہتر نظر آنے لگی۔ نینی اس کے لیے ہٹ میں موجود ایک کمبل لے آئی تھی۔ وہ اسے اوڑھ کر آتش دان کے پاس سمٹ کر بیٹھ گیا۔ گریگ اب تک خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے اچانک آدمی سے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے اور تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟“

آدمی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”میرا نام ڈیوڈ مائیکل ہے اور میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ میری گاڑی خراب ہو گئی۔“

گریگ اسے گھور رہا تھا۔ ”میں نے پوچھا ہے تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔ میں پناہ کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ بہت اندھیرا تھا اور اس نے اچانک ہی وار کیا۔ میں اس آدمی کو نہیں دیکھ سکا۔ اس کے پاس چاقو تھا۔ مجھے تکلیف ہوئی اور میں دہشت زدہ ہو کر بھاگ نکلا۔ میرا کوٹ ایک جھاڑی میں پھنس گیا تھا اور کسی صورت نہیں نکل رہا تھا اس لیے مجھے اسے چھوڑنا پڑا۔“

”یہ کہاں کی بات ہے؟“ نینی نے پوچھا۔

”اوپر جنگل کی۔“ ڈیوڈ نے ہٹ کے عقبی طرف اشارہ کیا۔

”میرے خدا۔“ نینی نے سسکی لی۔ ”رائن اور تم بھی اسی طرف گئے تھے۔“

”رائن کون ہے؟“ ڈیوڈ چونکا۔

”میرا شوہر۔“ نینی نے جواب دیا۔ ”وہ اور گریگ اوپر جنگل سے لکڑیاں لینے گئے تھے۔“

”لیکن وہاں تو مجھے کوئی نہیں ملا۔“ ڈیوڈ نے نفی میں سر ہلایا پھر گریگ کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں نہیں معلوم وہ کہاں ہے؟“

گریگ نے اسے بھی اپنی سانس کی بیماری اور دوا کے بارے میں بتایا جو نیچے گاڑی میں تھی۔ وہ ڈیوڈ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے شک زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”تمہاری گاڑی سڑک پر خراب ہوئی تو تم اوپر جنگل میں کیا کر رہے تھے؟“

”میرا خیال تھا کہ بلندی سے مجھے کوئی جگہ نظر آ جائے گی جہاں میں پناہ لے سکوں ورنہ طوفان مجھے ہلاک کر دے گا۔ مگر جنگل میں کسی نے مجھ پر حملہ کر دیا اور میں اس سے بچنے کے لیے بھاگا تو یہ ہٹ نظر آ گیا۔“

”تم کہاں سے آ رہے ہو؟“ گریگ بدستور مشکوک تھا۔

"اس جگہ سے کوئی تیس میل دور میرا گاؤں ہے۔"
ڈیوڈ پھیکے انداز میں بولا۔ "میں اس طرف جا رہا تھا۔"
"تمہارے پاس اپنی شناخت کے لیے کچھ ہے؟"
اس سوال پر ڈیوڈ کا چہرہ تن گیا۔ "کیا مطلب؟"
"پلیز۔" نمی بولی۔ "تم سوال جواب کرنے کے بجائے جا کر رائن کو نہیں دیکھ سکتے؟"
گریگ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اس موسم میں باہر نہیں جا سکتا۔ میری سانس اکھڑنے لگتی ہے۔"
"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" نمی کو غصہ آ گیا۔ "جب تم یہاں آئے تھے، تب تو تمہاری سانس بالکل ٹھیک تھی۔"
"یہ سچ کہہ رہا ہے۔" بیٹ نے گریگ کی طرف داری کی۔ "زیادہ سردی میں اسے سانس کا مسئلہ ہو جاتا ہے۔"
"تب اس نے رائن کے ساتھ باہر جاتے ہوئے کیوں نہیں کہا؟ اس کے ساتھ تو یہ چلا گیا تھا اور پھر اسے چھوڑ کر اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ اب یہ واپس آ گیا ہے لیکن رائن واپس نہیں آیا اور نہ اپنا فون اٹھا رہا ہے۔"
"ممکن ہے وہ راستہ بھٹک گیا ہو۔" گریگ نے دفاعی انداز میں جواب دیا۔
"تم بغیر روشنی کے راستہ نہیں بھٹکے اور وہ ٹارچ ہوتے ہوئے بھی راستہ بھٹک گیا؟" نمی کا لہجہ چبھتا ہوا ہو گیا۔
گریگ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" اس نے غرا کر کہا۔
"دیکھو اب تمہاری سانس بالکل نہیں چڑھ رہی ہے۔" نمی بولی اور موبائل پر رائن کو کال کرنے لگی۔ اس بار بھی بیل جا رہی تھی اور وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ گریگ اور بیٹ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر فکرمندی تھی۔ مایوسی کے عالم میں نمی نے کوشش ترک کر دی۔ "نہیں اٹھا رہا۔"
"اگر تم کہو تو میں باہر جا کر اسے دیکھوں۔" نمی کی پریشانی دیکھتے ہوئے ڈیوڈ نے پیش کش کی۔ "مجھے بھی تمہارے شوہر کی فکر ہو رہی ہے۔ باہر پتا نہیں کون ہے اور اس نے مجھ پر کیوں حملہ کیا؟"
"کہیں وہ رائن تو نہیں تھا؟" بیٹ نے نمی کو گھورتے ہوئے کہا۔
"تم بھول رہی ہو اس کے پاس چاقو نہیں کلہاڑی ہے۔" نمی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "البتہ گریگ کے پاس کیا ہے، میں نہیں جانتی۔"
"میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" گریگ غرایا۔ "اگر رائن کے ساتھ کچھ ہوا ہے تو اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"
"پلیز! آپس میں مت لڑو۔" اس بار ڈیوڈ نے [illegible] اٹھ کر کہا اور نمی کی طرف دیکھا۔ "میں باہر جاؤں گا [illegible] لیکن مجھے پہننے کے لیے گرم چیز چاہیے۔"
نمی نے گریگ کی طرف دیکھا اور خوف [illegible] ہو گیا۔ "ٹھیک ہے تم میرا اوورکوٹ پہن سکتے ہو۔"
"تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔" نمی نے ہچکچا کر کہا۔ "ابھی خون رکا ہے، کہیں پھر نہ بہنے لگے۔"
"میں احتیاط کروں گا۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "پلیز کوٹ پہننے میں میری مدد کرو۔"
نمی نے اسے اوورکوٹ پہنایا۔ ڈیوڈ نے [illegible] ٹارچ لی اور اپنے دفاع کے لیے اس نے کچن سے ایک چاقو بھی اٹھا لیا۔ نمی اب تک سوچ رہی تھی۔ اچانک اس نے ڈیوڈ سے کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"
"تم نہیں..."
"میں چلوں گی۔" نمی نے اپنی جیکٹ پہنتے ہوئے کہا۔ "دو آدمی ایک کے مقابلے زیادہ بہتر کام کر سکتے ہیں اور کسی خطرے کا مل کر سامنا کر سکتے ہیں۔"
"یہ مناسب نہیں ہے۔" گریگ نے بھی مخالفت کی۔
"تم چپ رہو۔" نمی نے اسے جھڑک دیا۔ "رائن تمہاری وجہ سے غائب ہوا ہے۔"
ڈیوڈ خاموش کھڑا تھا۔ جیسے ہی نمی تیار ہوئی، وہ باہر نکل آئے۔ گرم کپڑوں کے باوجود سردی کی شدت نے نمی کو لرزا دیا۔ ہوا جیسے کپڑوں سے گزر کر جسم میں اتر رہی تھی۔ نمی کانپتے ہوئے بولی۔ "میرے خدا! رائن اس موسم میں کتنی دیر سے باہر ہے۔"
ہواؤں کے جھکڑ بہت تیز تھے اور انہیں سنبھل سنبھل کر چلنا پڑ رہا تھا۔ وہ اوپر کے جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ درختوں میں آ کر انہیں کچھ سکون ملا۔ یہاں ہواؤں کا زور اتنا نہیں تھا اور شور بھی کم تھا۔ ڈیوڈ نے نمی سے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، گریگ اور بیٹ کیسے لوگ ہیں؟"
"میں نہیں جانتی... میں اور رائن ان سے ابھی چند گھنٹے پہلے ملے ہیں۔ طوفان میں ہم کسی پناہ کی تلاش میں تھے۔ اس سڑک پر ان کی گاڑی دیکھ کر رک گئے تھے۔"
ڈیوڈ چونکا۔ "کیا یہ پہلے سے یہاں موجود تھے؟"
"ہاں، یہ لوگ پہلے ہٹ تک پہنچے تھے۔" نمی نے کہا۔ وہ ٹارچ چاروں طرف لہرا رہی تھی۔



"کیا یہ مشکوک بات نہیں ہے؟ [illegible] ان کا پہلے سے موجود ہونا؟" نمی چونکی۔ "میرا [illegible] بھی یہاں سے گزر رہے تھے۔"
[illegible] ان کو ہٹ کیسے مل گیا جبکہ تم دونوں کو نظر نہیں آیا [illegible]"
ڈیوڈ کی بات نے نمی کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے [illegible] ہوئے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے، رائن کی گمشدگی [illegible] گریگ اور بیٹ کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"
"ممکن ہے نہ ہو۔" ڈیوڈ ایک درخت کے تنے سے [illegible] اس کا ہاتھ اپنے زخم پر تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ [illegible] بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی متعلق ہو۔ آخر مجھ پر کس نے [illegible] کیا؟"
"یہاں کوئی مسئلہ ہے۔ ہم میک ٹاؤن جا رہے تھے [illegible] ایک پل ٹوٹنے کی وجہ سے ہمیں اس طرف آنا پڑا۔ [illegible] افسر نے رائن کو بتایا تھا کہ اس علاقے میں سفر کرنے [illegible] لے غائب ہوتے رہے ہیں۔ بعد میں صرف ان کی [illegible] گاڑیاں ملتی ہیں۔"
"یہ تو میں نے بھی سنا ہے لیکن آج تک یہاں رکنے کا [illegible] اتفاق نہیں ہوا۔" ڈیوڈ نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "آج پہلی بار رکا اور مجھ پر کسی نے حملہ کر دیا۔"
نمی نے پھر موبائل سے رائن کو کال کی۔ بیل جا رہی [illegible] اچانک ڈیوڈ چونکا۔ اس نے نمی سے کہا۔ "تم نے [illegible]؟"
"کیا؟"
"مجھے ٹون سنائی دے رہی ہے۔"
نمی نے موبائل کان سے ہٹایا اور سچ مچ اسے بھی ٹون [illegible] دی۔ اس نے بے تابی سے کہا۔ "یہ رائن کے موبائل کی [illegible] ہے۔"
وہ ٹون کی راہنمائی میں آگے بڑھے۔ کچھ دیر بعد [illegible] رائن کا موبائل ایک درخت کی جڑ کے ساتھ پڑا مل گیا۔ [illegible] نے جھپٹ کر اسے اٹھایا پھر بے تابی سے رائن کو آوازیں [illegible] لگی۔ ڈیوڈ اس سے ٹارچ لے کر آس پاس دیکھنے لگا۔ [illegible] کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ گئی۔ نمی چونکی۔ "کک... [illegible]"
ڈیوڈ کانپ رہا تھا اور اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ [illegible] ایک طرف اٹھا ہوا تھا۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا [illegible] نمی نے زمین سے ٹارچ اٹھا کر اس طرف کی تو اس کے [illegible] سے ایک چیخ نکلی۔ سامنے رائن درخت سے اس طرح لگا

# اکسیر ایمان

آج مغربی تاریخ داں حیران ہیں کہ باشندگان عرب جو بکریاں چرایا کرتے تھے، قوموں اور ملکوں کے حکمران کیونکر بن گئے۔ بادیہ نشین تمدن و حضارۃ کے رموز کیسے پا گئے اور انہیں فتح و نصرت کا کون سا گر ہاتھ آ گیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کی باجبروت حکومتوں کے تختے الٹنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں اور وہ راز بھی زیادہ دیر تک راز نہیں رہا۔ بلکہ عریاں ہو چکا ہے۔ عربوں کی کایا پلٹ دینے والی چیز اکسیر ایمان تھا جس کے ذریعے پیغمبرؐ اسلام نے اپنے صحابہ کی زندگیوں میں محیر العقول انقلاب پیدا کیا۔ اسی اکسیر کی بدولت ان کے حالات میں تغیر رونما ہوا۔ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا پورا ڈھانچا تبدیل ہوا۔ بتوں کے پوجنے والے خداپرست بن گئے اور جاہلیت کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھانے والوں کے سینے نورِ ایمان سے منور ہو گئے۔

(مرسلہ: جمال یوسف، کراچی)

کھڑا تھا کہ کلہاڑی کا پھل پوری طرح اس کے سر میں اترا ہوا تھا۔ خون بہہ کر اس کے پورے چہرے اور لباس کو رنگین کر گیا تھا۔ "نہیں۔" نمی چلائی اور اس نے رائن کی لاش کی طرف جانے کی کوشش کی لیکن ڈیوڈ نے اسے پکڑ لیا۔
"نہیں، اسے مت چھونا۔" وہ بولا اور نمی کو سینے سے لگا لیا۔ "ہمیں پولیس کو کال کرنا ہوگی۔"
نمی بُری طرح رو رہی تھی لیکن ڈیوڈ کی غمگساری نے اسے سنبھال لیا۔ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ بالآخر اس کی حالت اتنی بہتر ہوئی کہ وہ پولیس کو کال کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے نائن ون ون ملایا۔ چند لمحے بعد آپریٹر لائن پر تھا لیکن جب نمی نے اسے بتانا چاہا کہ اسے پولیس کی مدد کی ضرورت ہے تو پتا چلا کہ طوفان کے شور کی وجہ سے آپریٹر کو اس کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ نمی نے چلا چلا کر آپریٹر کو بتانے کی کوشش کی مگر بے سود رہا۔ ڈیوڈ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
"ہمیں ہٹ میں جانا ہوگا۔"

نمی نے موبائل بند کر دیا۔ ''لیکن وہاں گریگ موجود ہے۔ مجھے بڑی حد تک یقین ہو گیا ہے کہ قاتل وہی ہے۔'' اس کا لہجہ ہیجانی ہو گیا۔ ''اس نے کسی وجہ سے رائن پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا اور خود معصوم بن رہا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، وہ ہمیں کال کرنے نہیں دے گا؟''

''میرا خیال ہے وہ ہمیں واپس ہٹ میں آنے نہیں دے گا اور ہم باہر ہی ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔''

نمی کی بات درست لگ رہی تھی کیونکہ چند منٹ میں ان کی حالت بُری ہو گئی تھی اور اگر وہ مزید آدھا گھنٹا باہر رہ جاتے تو ان کا بچنا مشکل تھا۔ ڈیوڈ نے نمی سے کہا۔ ''ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔''

مگر نمی کچھ اور سوچ رہی تھی۔ اس نے ڈیوڈ سے کہا۔ ''نیچے ہماری گاڑی موجود ہے، اگر ہم وہاں چلے جائیں تو پولیس کو کال کر سکتے ہیں اور گاڑی میں یہاں سے نکل بھی سکتے ہیں۔''

ڈیوڈ خوش ہو گیا۔ ''یہ ٹھیک رہے گا لیکن جلدی کرو۔ مجھے لگ رہا ہے میں کچھ دیر ایسے ہی رہا تو بے ہوش ہو جاؤں گا۔''

''گاڑی کی چابیاں۔'' نمی نے کہا۔ ''وہ رائن... کے پاس ہیں۔''

شاید نمی خود رائن کے پاس جانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ ڈیوڈ اس کا مطلب سمجھ گیا، اس نے کہا۔ ''ایک منٹ رکو، میں چابیاں لاتا ہوں۔''

نمی نے ٹارچ سے روشنی دکھائی اور ڈیوڈ نے رائن کی جیکٹ کی جیب سے چابیاں نکال لیں۔ نیچے آتے ہوئے نمی سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ دس منٹ میں کیبن سے ذرا دور سے ہوتے ہوئے نیچے پہنچ گئے۔ مگر جب نمی نے اپنی وین دیکھی تو اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ وین کے سارے شیشے مع ونڈ اسکرین توڑ دیے گئے تھے اور یہی حال گریگ کی کار کا تھا۔ ''میرے خدا! یہ کیا ہے؟''

''یہ اسی قاتل کا کام ہے۔'' ڈیوڈ بولا۔ ''وہ ہمیں یہاں سے بھاگنے سے روکنا چاہتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے گریگ کا کام ہے؟... ہاں وہ یہاں آیا تھا، یہ اسی کا کام ہے۔'' نمی خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''کیا وہ ہمیں بھی قتل کرنا چاہتا ہے؟''

''یقیناً، اگر یہ بات پولیس تک پہنچ گئی تو گریگ یا جو بھی قاتل ہے، وہ بچ نہیں سکے گا اس لیے اس کی کوشش ہوگی کہ ہم پولیس سے رابطہ نہ کر سکیں۔''

''یہ گریگ ہی کا کام ہو سکتا ہے۔'' نمی سوچتے ہوئے بولی۔ ''اسے معلوم ہے کہ ہم کار کے اندر بیٹھ کر پولیس کو کال کر سکتے ہیں اس لیے اس نے دونوں گاڑیوں کے سارے شیشے توڑ دیے۔''

''تم انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرو۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

کوئی بات نمی کے ذہن میں کھٹک رہی تھی لیکن وہ کیا بات تھی یہ واضح نہیں تھی۔ وین کے اندر شیشے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے سیٹ کو شیشوں سے صاف کیا اور سیٹ پر آ کر انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن اگنیشن بالکل خاموش رہا۔ ڈیوڈ نے بونٹ اٹھا کر دیکھا اور پھر اس نے نمی سے کہا۔ ''تم بیکار میں کوشش کر رہی ہو۔ یہاں تو تاریں ہی غائب ہیں۔ اس نے کوئی موقع نہیں چھوڑا ہے۔''

اس وقت نمی کے ہاتھ سیٹ کو ٹٹول رہے تھے۔ اس نے اتر کر دیکھا تو اس کے منہ سے بے اختیار گالی نکل گئی۔ پھر اس نے ڈیوڈ کی طرف دیکھا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

وہ اوورکوٹ میں بھی سکڑا سمٹا کھڑا تھا۔ ''ہمیں ہٹ میں جانا ہوگا، تب ہی ہم کچھ کر سکیں گے۔ ورنہ یہاں تو کچھ دیر میں ہماری لاشیں پڑی ہوں گی۔''

نمی نے بھی محسوس کیا کہ کچھ دیر بعد سردی انہیں کسی قابل نہیں چھوڑے گی۔ ہٹ میں جائے بغیر وہ اپنی جان نہیں بچا سکتے تھے اور نہ ہی پولیس کو کال کر سکتے تھے۔ لیکن وہاں گریگ موجود تھا اور اسے یقین تھا کہ وہی رائن کا قاتل ہے۔ وہ انہیں پولیس کو کال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ ذہن میں کھٹکنے والی چیز اب بھی اسے متوجہ کر رہی تھی۔ اس نے ڈیوڈ سے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی طرح سے گریگ اور بیٹ کو ہٹ سے باہر نکال دیا جائے؟''

ڈیوڈ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے تمہیں چھوٹا سا ڈراما کرنا پڑے گا۔''

''کیسا ڈراما؟''

ڈیوڈ اسے سمجھانے لگا۔ نمی غور سے سننے لگی پھر اس نے سر ہلا دیا۔ ''میں کر لوں گی۔''

☆☆☆

گریگ اور بیٹ صوفے پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ گریگ نے نمی اور ڈیوڈ کے جاتے ہی ہٹ کا دروازہ [illegible] سے بند کر دیا تھا۔ [illegible] بیٹھے ہوئے خاصی [illegible] اچانک بیٹ چونکی [illegible] اس نے [illegible] تیز انداز [illegible] دونوں ابھی تک نہیں آئے ہیں۔''

''ممکن ہے وہ رائن کو تلاش کرتے ہوئے دور نکل گئے ہوں۔'' گریگ نے بے پروائی سے جواب دیا۔ اس وقت بیٹ کا سانس درست چل رہا تھا اور اسے سانس لینے کے لیے زور نہیں لگانا پڑ رہا تھا۔

''لیکن اتنی دیر؟'' بیٹ کے انداز میں متفکر تیزی بڑھ گئی تھی۔ ''تم نے دیکھا، نمی نے اس شخص پر کتنی جلدی اعتماد کر لیا۔''

گریگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ نمی اور اس شخص ڈیوڈ کو گئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اچانک انہیں کھڑکی سے شیشہ بجانے کی آواز آئی۔ وہ دونوں اچھل پڑے۔ کھڑکی میں نمی تھی۔ وہ دہشت زدہ لگ رہی تھی اور اشارے سے باہر آنے کو کہہ رہی تھی۔ بیٹ نے کھڑکی کھولنا چاہی لیکن گریگ نے منع کر دیا۔ ''نہیں، میں باہر جا رہا ہوں۔''

اب نمی کھڑکی میں نظر نہیں آ رہی تھی، شاید وہ نیچے بیٹھ گئی تھی۔ بیٹ جھک کر اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ گریگ باہر جانے لگا تو بیٹ بھی اس کے پیچھے لپکی۔ گریگ نے اس وقت توجہ نہیں دی تھی۔ باہر بلا کی سردی تھی اور اس کا اوورکوٹ ڈیوڈ پہن گیا تھا۔ بیٹ شاید یہی بتانے کے لیے اس کے پیچھے آئی تھی۔ باہر طوفان کے جھکڑ چل رہے تھے۔ گریگ اور بیٹ گھوم کر ہٹ کے عقبی حصے میں آئے مگر وہاں نمی نہیں تھی بلکہ کوئی بھی نہیں تھا۔ گریگ نے کہا۔ ''یہ کہاں گئی... ابھی تو یہیں تھی؟''

''نمی۔'' بیٹ نے چلا کر کہا۔

مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ کچھ دیر تک وہ نمی کو پکارتے رہے۔ اس دوران میں سردی سے گریگ کی حالت خراب ہونے لگی۔ اس نے بیٹ سے کہا۔ ''ہمیں اندر جانا ہوگا۔'' بیٹ خود سردی سے کانپ رہی تھی۔ وہ ہٹ کے دروازے کی طرف آئے لیکن جب انہوں نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو اسے اندر سے بند پایا۔

☆☆☆

ڈیوڈ کی حالت خراب ہو رہی تھی اور اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اگر نمی نے اسے سہارا نہ دے رکھا ہوتا تو وہ گر ہی جاتا۔ نمی نے اسے ہٹ کی اس جگہ بٹھا دیا [illegible] سے دور تھی۔ پھر وہ عقبی حصے میں [illegible] گریگ اور بیٹ کو متوجہ کیا۔ اس کی کوشش تھی کہ [illegible] گریگ [illegible] وہ کامیاب رہی جب اس نے دونوں کو باہر جاتے دیکھا۔ متوجہ کر کے وہ چھپ گئی تھی۔ اسے صرف ایک خطرہ تھا کہ کہیں گریگ اور بیٹ ہٹ کے عقب میں آنے کے لیے اس طرف سے نہ آئیں جہاں اس نے ڈیوڈ کو بٹھایا تھا لیکن انہوں نے فطری طور پر سب سے مختصر راستہ اختیار کیا اور دوسری طرف سے پیچھے گئے۔ اس دوران میں نمی بھاگ کر ڈیوڈ کے پاس آئی اور اسے سہارا دے کر ہٹ کے اندر لے آئی۔ اس نے اندر آتے ہی سب سے پہلے دروازہ بند کیا۔ کنڈی لگا کر اس کی کلی بھی گرا دی، اب دروازہ کوئی نہیں کھول سکتا تھا۔ سردی اور زخم کی وجہ سے ڈیوڈ کی حالت بُری ہو رہی تھی۔ نمی نے اسے آتش دان کے قریب بٹھا دیا لیکن وہ فرش پر لڑھک گیا۔

''ڈیوڈ! کیا ہوا؟'' نمی نے اسے پکارا۔

مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی اثنا میں گریگ اور بیٹ لوٹ آئے تھے اور انہوں نے دروازہ بجایا۔ نمی نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ مگر اسے اطمینان تھا کہ دروازہ اتنا مضبوط تھا کہ گریگ اور بیٹ اسے کسی صورت نہیں توڑ سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد بیٹ کچن کی کھڑکی پر نمودار ہوئی اور اس نے شیشہ بجایا۔ وہ دروازہ کھولنے کو کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز اندر نہیں آ رہی تھی لیکن انداز بتا رہا تھا وہ کیا کہہ رہی ہے۔ نمی کھڑکی کے پاس آئی۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر بتایا کہ وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔ اس پر بیٹ اسے بُرا بھلا کہنے لگی پھر گریگ سامنے آیا۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا اور اس کی سانس تیز چل رہی تھی لیکن اب نمی اس کے دھوکے میں آنے والی نہیں تھی۔ وہ اپنے شوہر کی لاش دیکھ چکی تھی۔ اس نے چلا کر کہا۔

''تم میرے شوہر کے قاتل ہو۔ میں پولیس کو کال کرنے والی ہوں۔''

گریگ آگے آیا اور اس نے اشارے سے تھوڑی سی کھڑکی کھولنے کو کہا۔ نمی نے سوچا اور کھڑکی کو ذرا سا کھول دیا۔ گریگ نے جلدی سے کہا۔ ''پلیز! دروازہ کھولو، ورنہ ہم ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔''

''تم ہی قاتل ہو۔ تم نے رائن کو قتل کیا ہے۔''

''قتل...'' گریگ نے ناقابلِ یقین لہجے میں کہا۔ ''اسے کسی نے قتل کر دیا ہے؟''

''کسی نے نہیں، تم نے۔'' نمی نے کہا۔ ''میں پولیس کو کال کرنے والی ہوں۔''

''تم پولیس کو ضرور کال کرو لیکن ہمیں اندر آنے دو...'' بیٹ بولی۔

نہیں اندر آنے دوں گا لیکن مجھے بچی کی کر دو ہم نے ڈیوڈ کو بھی مارنے کی کوشش کی تھی۔"

"یہ جھوٹ کہتا ہے۔ اس کا زخم معمولی سا ہے اور اس کے علاوہ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی۔" گریگ نے تیز لہجے میں کہا۔ "اگر میں رائن کو مار دیتا تو اسے کیوں چھوڑتا؟"

"اس کی قسمت اچھی تھی۔" ممی نے کہا اور اپنا موبائل فون نکال لیا۔

گریگ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ممی! یہ جھوٹ کہہ رہا ہے، رائن کا قاتل یہ خود ہے۔"

"تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔" ممی بولی۔

"نہیں، یہ سچ کہہ رہا ہے۔" ممی کو عقب سے ڈیوڈ کی آواز آئی۔ وہ چونک کر گھومی آتش دان کے پاس ڈیوڈ بالکل ٹھیک ٹھاک اور چاق و چوبند کھڑا تھا۔ اس کے انداز میں کہیں کمزوری اور تکلیف نہیں تھی۔ ممی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ اسے دیکھتے ہی ممی کے ذہن میں کھٹکتی بات سامنے آگئی۔ اوّل... وہ اندر آیا تو اسے معمولی سا زخم تھا لیکن وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے اس کی حالت خراب ہو۔ اس کا کوٹ جھاڑیوں میں پھنس گیا تھا لیکن اس کا باقی لباس بالکل صاف ستھرا تھا۔ پھر وہ خود پر حملہ ہونے کے باوجود رائن کی تلاش میں باہر جانے کو تیار ہو گیا تھا۔ وہ ممی کو سیدھا وہاں لے گیا جہاں رائن کی لاش موجود تھی اور سب سے اہم بات جب ممی نے اسے وین کی چابی نکالنے کو کہا تو ڈیوڈ نے سیدھا اس جیب میں ہاتھ ڈالا جس میں چابی موجود تھی۔ گویا اسے معلوم تھا کہ چابی کس جیب میں ہے اور یہی بات ممی کے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔

"ڈیوڈ تم..." ممی نے بہ مشکل کہا۔

ڈیوڈ مسکرایا تو اس کے دانت کسی بھیڑیے کی طرح چمکنے لگے اور اس کے ہونٹوں سے رال گرنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے دیوانگی جھلک رہی تھی۔ "ہاں میں... میں نے ہی رائن کو قتل کیا ہے۔"

"مگر کیوں؟" ممی چلائی۔ وہ رونے والی ہو رہی تھی۔

"کیونکہ یہ میرے باپ کا گھر ہے۔ وہ راہب تھا اور یہ جگہ مقدس ہے۔" وہ بولا۔

"میرے خدا! تم پاگل ہو؟" بیٹ باہر سے بولی۔

"ہاں، میں پاگل ہوں۔" اس نے بلا جھجک اعتراف کر لیا۔ "میں آٹھ سال پاگل خانے میں رہا ہوں۔ میں نے اپنی ماں اور اس کے آشنا کو قتل کر دیا تھا۔ وہ اس جگہ کی حرمت کو پامال کرتے تھے۔ اس وقت میں پندرہ سال کا تھا۔ مجھے نفسیاتی مریض قرار دے کر پاگل خانے بھیج دیا گیا۔ پھر ڈاکٹروں نے مجھے ٹھیک قرار دے کر چھوڑ دیا۔"

"انہیں چھوڑ دیا اور تم لوگوں کو قتل کر رہے ہو۔" ممی بولتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگی۔

"ہاں، میں اس سے پہلے بھی کئی لوگوں کو مار چکا ہوں۔ ان کی لاشیں ہٹ کے آس پاس دفن ہیں۔" اس نے سر ہلایا۔ اس وقت وہ مکمل طور پر دیوانہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے منہ سے مسلسل رال بہہ رہی تھی۔ "میں نے قسم کھائی تھی، اس جگہ آنے والے کسی شخص کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اب تم تینوں کی باری ہے۔ تمہیں میں ماروں گا اور یہ دونوں باہر ختم ہو جائیں گے۔ پھر میں تمہیں زمین کھود کر دفن کر دوں گا اور تمہاری گاڑیاں کہیں دور چھوڑ آؤں گا اور کسی کو نہیں معلوم ہوگا کہ تم سب کہاں غائب ہو گئے۔" وہ کہتے ہوئے ممی کی طرف بڑھا۔

"ڈیوڈ! رک جاؤ۔"

لیکن وہ نہیں رکا۔ "تم اچھی عورت ہو، میں تمہیں زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔ صرف ایک وار اور تم بغیر کسی تکلیف کے مر جاؤ گی۔"

ممی پیچھے ہٹتے ہوئے کھڑکی سے جا لگی تھی۔ گریگ اور بیٹ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے سب سنا تھا۔ اچانک ممی نے اپنی جیکٹ سے پستول نکال لیا۔ "ڈیوڈ! رک جاؤ اور چاقو پھینک کر دروازہ کھول دو۔"

پستول دیکھ کر ڈیوڈ کے تاثرات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ورنہ تم مجھے مار دو گی۔"

"ہاں... میں کہہ رہی ہوں رک جاؤ۔" ممی چلائی۔ اس نے پستول سیدھا کر لیا تھا مگر ڈیوڈ نہیں رکا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پستول کو اہمیت نہیں دے رہا۔ شاید اسے مرنے کا خوف بھی نہیں تھا۔ جب وہ چند قدم رہ گیا تو ممی نے آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبانا شروع کر دیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی گولیاں چلائیں اور جب آنکھ کھولی تو ڈیوڈ فرش پر ساکت پڑا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کے کھلے ہونٹوں سے رال اور آنکھوں سے دیوانگی اب بھی جھلک رہی تھی۔ ممی سسکیاں لیتی ہوئی دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھی۔





# ٹیڑھی کھیر

سرور اکرام

انجانے راستوں پر چلتے ہوئے اکثر لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہر قدم پر خوف و دہشت کے زہریلے سانپوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے... ایسے ہی کرداروں کے گرد گھومتی پرتجسس کہانی جو بنا سوچے سمجھے اپنے آپ کو ایسے راستوں پر بھٹکا بیٹھے... جو منزل سے قطعی دور تھے... افسوس اس بات کا ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنی حماقت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب خوشی و آسودگی تو کجا... زندگی کا ساتھ بھی ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے اور خواہش و تمنا کے باوجود کوئی راہ نجات باقی نہیں رہتی...

**[illegible] کھڑکی کی کھڑکیاں جو ایک ٹیڑھے کی شکار کر رہا تھا...**

آنے والی گولی نے کمرے کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے تھے۔

اتفاق تھا کہ اس وقت وہ دونوں کھڑکی سے کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے اس لیے انہیں کوئی نقصان تو نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس حادثے نے دونوں کو بری طرح خوف زدہ کر دیا۔

دونوں میاں بیوی تھے۔ فیصل اور ستارہ۔ ان کی شادی کو ابھی صرف پندرہ دن ہوئے تھے اور ان پندرہ دنوں میں ان پر ہونے والا یہ تیسرا قاتلانہ حملہ تھا۔

اس وقت چلنے والی اچانک گولی نے کچھ دیر کے لیے انہیں حواس باختہ سا کر دیا تھا۔ پھر فیصل نے ستارہ کے شانوں کو تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی اور صوفے سے اٹھ کر آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس آ گیا۔

"کھڑکی کے سامنے مت آؤ فیصل۔" ستارہ نے اسے تنبیہہ کی تھی۔

"ہاں ہاں، میں ایک طرف ہٹ کر دیکھ رہا ہوں۔" فیصل نے کہا۔

دن کا وقت تھا۔ کھڑکی کے سامنے والی فٹ پاتھ اس وقت ویران نظر آ رہی تھی۔ ویسے بھی وہ عام طور پر ویران ہی رہتی تھی۔

شاہکار اپارٹمنٹ کا انتخاب دونوں نے اس لیے کیا تھا

کہ اس اپارٹمنٹ کے کرائے کم تھے۔ وہ اپارٹمنٹ شہری آبادی سے ذرا فاصلے پر بنایا گیا تھا۔

اس طرف اور بھی کئی عمارتیں کھڑی کی جارہی تھیں۔ شاہکار اپارٹمنٹس کے کئی فلیٹ ابھی بھی خالی پڑے ہوئے تھے۔ اسی لیے فیصل کو صرف پانچ ہزار ماہانہ پر ایک فلیٹ مل گیا تھا۔

دفتر آنے جانے کے لیے اس کے پاس ایک بائک تھی۔ ستارہ اس ویرانے کو دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی تھی۔

"فیصل! ہم لوگ یہاں کیسے رہ سکیں گے؟"

"مجبوری ہے جان۔" فیصل نے کہا۔ "اور ویسے بھی ہم یہاں نگاہوں میں نہیں آسکیں گے۔ پھر یہ کہ تمہیں باہر نکلنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ شام کے وقت جب میں دفتر سے آیا کروں گا تو قریبی مارکیٹ تک چلے جایا کریں گے۔"

"لیکن میں دن بھر اس ویرانے میں اکیلی کیسے رہوں گی؟"

"کوئی بات نہیں، اپارٹمنٹس اسی لیے محفوظ ہوتے ہیں۔" فیصل نے کہا۔ "گیٹ پر چوکیدار بیٹھا رہتا ہے جو باہر کے بندے کو آنے نہیں دیتا۔ اس لیے تم بالکل محفوظ ہو۔ ویسے بھی دونوں کے پاس موبائل ہے۔ ہم ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے رہیں گے۔"

لیکن یہاں آنے کے بعد ان پر یہ حملہ ہو چکا تھا۔ پہلے دو حملے شہر میں ہوئے تھے۔ لیکن ہر بار قسمت نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ ہر بار بچ نکلے تھے۔ تیسری بار بھی صرف کھڑکی کے شیشے ٹوٹے تھے۔

ستارہ نے رونا شروع کر دیا تھا۔

فیصل نے واپس آکر اسے خود سے چمٹا لیا۔ "ارے نہیں جان... روتے نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔ "ہمیں ہر حال میں حوصلہ قائم رکھنا ہے۔ جب ایک دوسرے کے ساتھ جینے مرنے کی قسم کھائی ہے تو پھر ہمیں خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ مقابلہ کرنا چاہیے۔"

"فیصل! ڈیڈ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" ستارہ نے کہا۔ "وہ ہمارا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"

"اس لیے کہ ہم نے اتنے بڑے، طاقتور اور دولت مند آدمی کی انا کو ٹھیس پہنچائی ہے۔" فیصل کے لہجے میں تلخی تھی۔ "اسی لیے وہ اپنا حساب برابر کرنا چاہتے ہیں۔"

"یعنی انہیں اس کی بھی پروا نہیں ہوگی کہ ان کی بیٹی مر جائے؟"

"ہاں، ایسے لوگوں کے نزدیک رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ چاہے وہ ماں ہو، بیوی ہو، بیٹی ہو، کوئی بھی ہو۔"

"ہم تو یہاں بھی محفوظ نہیں ہیں۔"

"ہاں، اس کے باوجود خدا ہماری حفاظت کر رہا ہے۔" فیصل نے کہا۔ "اور آئندہ بھی وہ ہماری حفاظت کرتا رہے گا کیونکہ نہ تو ہم مجرم ہیں اور نہ ہی ہم نے کوئی گناہ کیا ہے۔ صرف شادی کی ہے۔ قانون اور شریعت کے مطابق۔"

☆☆☆

فیصل ایک مجرم کی طرح ایک عالی مرتبت انسان کے سامنے گردن جھکائے کھڑا تھا۔

اس عالی مرتبت شخص کا نام سکندر تھا۔ ستارہ کا باپ۔ ایک بڑا صنعت کار، جاگیردار اور بادشاہ گر قسم کا آدمی۔ اس کی صرف ایک ہی اولاد تھی ستارہ۔ اور وہ بھی اس پھٹیچر انسان فیصل سے محبت کرنے لگی تھی جو اس کے سامنے اپنی گردن جھکائے کھڑا تھا۔

"تو تم میری بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" اس نے غراتے ہوئے پوچھا۔

"جی جناب۔"

بالکل فلمی انداز کا منظر تھا۔ لڑکی کا ظالم باپ اور لڑکی سے محبت کرنے والا ایک نوجوان۔ جس نے لڑکی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لیے آسمان سے ستارے توڑ کر لے آئے گا اور اس پر اپنی جان قربان کر دے گا، وغیرہ وغیرہ۔

اس فلمی مناظر کے جملے بھی تقریباً وہی تھے جو ایسی فلموں میں ہوا کرتے ہیں۔ لیکن فلمیں بھی تو زندگی سے کشید کی جاتی ہیں۔ وہ کہیں اوپر سے نہیں آتیں۔ جو کچھ معاشرے میں ہوتا ہے، وہی فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔

اور معاشرے میں یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی امیر لڑکی کسی غریب لڑکے سے محبت کرنے لگتی ہے۔ کیونکہ وہ لڑکی اپنے احساسات اور جذبوں میں صرف لڑکی ہوتی ہے۔ امیر یا غریب نہیں ہوتی۔

ستارہ بھی ایک امیر ترین باپ کی امیر ترین بیٹی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس ائرکنڈیشنڈ لگژری کار ہے جبکہ فیصل کے پاس ایک پرانی سی بائک ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس ایک بہت شاندار بنگلے ہے جبکہ فیصل کرائے کے ایک فلیٹ میں رہتا ہے۔ اس کے باوجود اس نے فیصل سے محبت کی تھی اور اس محبت کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانا چاہتی تھی۔

"تم جانتے ہو کہ تم ایک مفلس انسان ہو؟" سکندر کی آواز گونج رہی تھی۔ "تمہارے پاس ایک معمولی سی صورت کے علاوہ اور ہے کیا۔ تمہاری تنخواہ سے زیادہ تو میرے نوکروں کی تنخواہیں ہیں۔"

یہ باتیں بالکل وہی تھیں جو فلموں کے ذریعے معاشرے میں اور معاشرے کے ذریعے فلموں میں دہرائی جاتی ہیں۔ فیصل اچانک ہی بہت تلخ ہو گیا۔ اس نے اپنی جھکی ہوئی گردن اوپر اٹھائی اور سکندر کی طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں جناب کہ آپ کے نوکروں کی تنخواہیں میری تنخواہ سے کہیں زیادہ ہوں گی لیکن آپ اپنی بیٹی سے پوچھیں کہ وہ اسی بنیاد پر کسی نوکر سے محبت کر کے دکھا دے۔"

سکندر غصے سے لرز کر رہ گیا۔ اسے یہ گمان نہیں تھا کہ گردن جھکائے رکھنے والا یہ نوجوان اس طرح کا جواب بھی دے سکتا ہے۔ "خاموش رہو۔" وہ گرجا۔ "نکل جاؤ یہاں سے۔ بھول جاؤ کہ تم ستارہ سے شادی کر لو گے۔ اب تو تم اس کی صورت تک نہیں دیکھ سکتے.... نکلو ورنہ دھکے دے کر نکلوا دوں گا۔"

"جناب! میں جا رہا ہوں یہاں سے۔" فیصل نے کہا۔ "لیکن اتنا جان لیں کہ ستارہ میری ہے اور میں اسے ہر حال میں حاصل کر لوں گا۔"

وہ سکندر کا ردِعمل دیکھے بغیر اس کے شاندار ڈرائنگ روم سے... پھر اس کے خوب صورت اور عالی شان محل کے گیٹ سے باہر نکل آیا۔

اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ بڑی بڑی بات بول کر تو آگیا تھا لیکن یہ سب کس طرح ہو سکتا تھا؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

اسے ایک بات کا اندازہ تھا کہ اس نے اگر ستارہ کو حاصل چھوڑا تو اس کی زندگی میں دشواریاں ہی دشواریاں ہوں گی لیکن وہ اسے کیسے چھوڑ سکتا تھا؟

جب ستارہ خود اس کے لیے سب کچھ چھوڑ دینے کو تیار ہو چکی تھی تو وہ خود کیسے پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ ستارہ تو اس کی زندگی بن چکی تھی۔

وہ یہی سب سوچتا ہوا اپنے فلیٹ تک پہنچا تو ستارہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ "تم؟" وہ ستارہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"ہاں، بڑی مشکلوں سے چھپ کر آئی ہوں۔" ستارہ نے بتایا۔ "مجھ پر تو پابندی لگادی گئی تھی۔"

"آؤ، فلیٹ میں آؤ۔" فیصل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ستارہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس بھی لے آئی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" فیصل نے حیرت سے پوچھا۔

"اس میں میرے چند جوڑے ہیں۔" ستارہ نے بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "اور کچھ روپے بھی تاکہ کسی کام آجائیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں فیصل، میں اپنا گھر چھوڑ آئی ہوں۔" ستارہ نے فیصلہ کن لہجے میں بتایا۔

فیصل چند لمحوں تک کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ وہ اس لڑکی کی طرف دیکھتا رہا جس کی آنکھوں میں محبت کے چراغ جل رہے تھے۔ جس نے محبت کی خاطر اپنا آرام وہ محل چھوڑ دیا تھا۔ جس کے لیے زندگی صرف ایک لفظ بن کر رہ گئی تھی، پیار۔ جو اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتی تھی۔

"ستارہ! کیا تمہیں احساس ہے کہ تم کیا کر آئی ہو؟" فیصل نے پوچھا۔

"ہاں، اچھی طرح احساس ہے اور میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔" ستارہ نے کہا۔ "کیا تم یہ برداشت کر لو گے کہ تمہاری ستارہ کسی اور کی ہو جائے؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"تو بس، اب آگے کی سوچو کہ ہم کیا کریں۔" ستارہ نے کہا۔

دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس وقت دونوں ہی لرز کر رہ گئے تھے۔ آنے والا کوئی بھی ہو سکتا تھا... دوست، دشمن کوئی بھی۔

لیکن آنے والا دوست ہی تھا... شہزاد۔ دونوں کا مشترکہ دوست۔ جس کے مشورے ہمیشہ ان کے کام آیا کرتے تھے۔

وہ بھی ایک عام سا نوجوان تھا۔ وہ یونیورسٹی میں ستارہ اور فیصل کے ساتھ ہی ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے سے فیصل اور ستارہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے تھے جبکہ شہزاد ان دونوں کا رازدار تھا۔

وہ ستارہ کو فیصل کے فلیٹ میں دیکھ کر خوش ہو گیا۔ "چلو اچھا ہوا تم یہیں مل گئیں۔" اس نے کہا۔ "ورنہ میں تمہیں فون کر کے بلانے والا تھا۔ آج میرا حلیم کھانے کا موڈ ہو رہا تھا۔ سوچا تم دونوں پر بھی احسان کر دوں۔"

وہ دونوں بالکل خاموش رہے۔

"ارے، کیا ہوا تم دونوں کو؟" شہزاد نے پوچھا۔ "اتنا خاموش کیوں ہو؟"

فیصل نے اسے ساری صورتِ حال بتاتے ہوئے کہا۔ ”اب ستارہ اپنا گھر چھوڑ آئی ہے۔ اب بتاؤ کیا کیا جائے؟“

”اوہ۔“ شہزاد ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔“

”کیوں، برا کیوں ہوا؟“

”سامنے کے حقائق کچھ اور ہوتے ہیں۔“ شہزاد نے کہا۔ ”سکندر صاحب ایک طاقتور انسان ہیں۔ ان کے پاس بے شمار وسائل ہیں۔ فلموں اور کہانیوں تک تو اس قسم کی محبت چلتی رہتی ہے کہ امیر لڑکا اور غریب لڑکی یا غریب لڑکی اور امیر لڑکا۔ لیکن اصل زندگی میں اس میں بہت الجھنیں ہو جاتی ہیں۔ محبت کی حد تک درست ہے لیکن شادی نہیں کرنی چاہیے۔“

”بکواس نہیں کرو۔“ ستارہ برا سامنہ بنا کر بولی۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ تم ہمیں کوئی اور مشورہ دو۔“

”دوسرا مشورہ یہ ہے کہ کر لو شادی۔ چاہے کچھ بھی ہو۔“

”لیکن کیسے کریں؟“

”کورٹ میرج کر لو۔“ شہزاد نے بتایا۔ ”یہی ایک راستہ ہے۔ تم دونوں کی باقاعدہ شادی تو نہیں ہو سکے گی۔ صرف کورٹ میرج ہی کر سکتے ہو۔“

”لیکن اس کے انتظامات کیسے ہوں گے۔ کیا کرنا پڑتا ہے۔ یہ تو میں کچھ بھی نہیں جانتا۔“

”میں یہ بھی بندوبست کروا دوں گا۔“ شہزاد نے کہا۔ ”جب تم دونوں سے دوستی کر ہی لی ہے۔ تو یہ بھی بھگتنا پڑے گا۔“

”اور یہ شادی کب ہو سکے گی؟“ ستارہ نے پوچھا۔

”کل صبح... کورٹ کھلنے پر۔“ شہزاد نے بتایا۔ ”میری جان پہچان کا ایک وکیل ہے۔ میں اس سے ابھی جا کر بات کر لیتا ہوں۔“

”پلیز شہزاد! کوئی بندوبست کروا دو۔“ ستارہ نے کہا۔

”وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ شہزاد نے ایک گہری سانس لی۔ ”لیکن تم یہ رات گزارو گی کہاں؟“

”یہیں اسی فلیٹ میں۔“ ستارہ نے بتایا۔ ”اور میں کہاں جا سکتی ہوں؟“

☆☆☆

کورٹ میرج تک کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

شہزاد نے ایک وکیل کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس نے سارے مراحل طے کروا دیے۔ بہت عجیب شادی تھی۔ اس وقت فیصل کو پالینے کی خوشی میں ستارہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھی تھے اور دوسری طرف اپنے گھر اور والدین کو اس طرح چھوڑ دینے کا دکھ بھی تھا۔

کیسی شادی تھی جس میں کوئی شریک نہیں ہوا تھا۔ سوائے شہزاد کے۔ اسی نے دو گواہوں کا بندوبست کر دیا تھا۔ یہ دونوں کرائے کے گواہ تھے۔ جو دن بھر میں اس طرح کی نہ جانے کتنی شادیاں بھگتایا کرتے تھے۔ ان کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن فیصل اور ستارہ کے لیے بہت ہی خاص بات تھی۔

دونوں اپنے پرانے دنوں سے نکل کر اچانک نئی زندگی کے دروازے میں داخل ہو چکے تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس دروازے میں داخل ہونے کے بعد ان کے لیے جو راستہ آئے گا، وہ کیسا ہوگا؟

خوشیاں دینے والا یا اداس اور بے حال کر دینے والا...

شہزاد نے دونوں کے گلے میں ہار ڈال کر انہیں نئی زندگی کی مبارکباد دی اور وہ وکیل کی فیس ادا کر کے عدالت کے احاطے سے باہر آ گئے۔

کچھ دیر بعد وہ تینوں ایک چھوٹے سے ریستوران میں بیٹھے تھے۔ چائے اور کیک منگوائے گئے۔ یہ ٹریٹ شہزاد کی طرف سے تھی۔ بے خانماں قسم کی شادی کی پہلی تقریب... پہلی دعوت۔

اب کیا ہو؟ یہ ایک سوال تھا جو کسی تلوار کی طرح ان کے سروں پر لٹک رہا تھا۔ کیا سکندر یہ خبر سن لینے کے بعد ستارہ کو یونہی چھوڑ دے گا یا اس کی طرف سے کوئی ردِعمل سامنے آئے گا؟

اس کا جواب اسی وقت مل گیا جب وہ دونوں ٹیکسی سے اتر کر بلڈنگ کی طرف جا رہے تھے۔ شہزاد ہوٹل میں انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

ابھی دونوں گیٹ کے پاس بھی نہیں پہنچے ہوں گے کہ ایک گاڑی بہت تیزی سے لہراتی ہوئی ان کے برابر سے گزر گئی۔

صرف ایک لمحہ، صرف ایک ہی لمحہ تھا۔ جب فیصل نے ستارہ کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے چپکے کھڑے رہ گئے تھے۔



خوف نے ان کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ اور بھی کچھ لوگوں نے اس واقعے کو دیکھا تھا۔ وہ سب ان کے پاس ہمدردی کے اظہار کے لیے آ گئے تھے۔

”کیا ہوا بھائی، خیریت؟ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟ کم بخت نشے میں گاڑیاں چلاتے ہیں۔ کسی کا خیال نہیں کرتے۔ ایسے کم بختوں کو تو شوٹ کر دینا چاہیے۔“

طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ دونوں خاموشی سے فلیٹ میں آ گئے۔ ستارہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ جاتی۔

اس وقت ان کے ذہنوں میں صرف ایک بات تھی کہ یہ ایک حادثہ تھا۔ گاڑی ڈرائیور کے کنٹرول سے باہر ہو گئی ہو گی۔ لیکن جب شام کو شہزاد ان سے ملنے آیا تو اس نے ایک بھیانک امکان کی طرف اشارہ کیا۔

”ہو سکتا ہے کہ یہ تم دونوں پر قاتلانہ حملہ ہو۔“ اس نے کہا۔

”قاتلانہ حملہ؟“ دونوں ہی چونک پڑے۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”بہت ممکن ہے۔“ اس نے ستارہ کی طرف دیکھا۔ ”تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہارے ڈیڈ کو تمہاری اس شادی کی خبر نہیں ہوئی ہو گی؟“

”اتنی جلدی انہیں کیسے خبر ہو سکتی ہے؟“

”یہ مت بھولو کہ تمہارے ڈیڈ ایک پاورفل انسان ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”کورٹ میں بھی ان کے لوگ موجود ہیں۔ وکیل نے جب نکاح نامہ جمع کروایا ہو گا تو اس میں تمہارے والد کا نام درج تھا اور پورا پتا تھا۔ اس نے فوراً تمہارے ڈیڈ کو یہ خبر دے دی ہو گی اور انہوں نے تمہاری موت کے لیے اپنے بندے بھیج دیے ہوں گے۔ لیکن تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم دونوں بچ گئے۔“

”یار! تم تو خوف زدہ کرنے والی بات کر رہے ہو۔“ فیصل نے کہا۔

”خوف زدہ نہیں کر رہا، سچائی بتا رہا ہوں۔ تاکہ تم دونوں ذہنی طور پر تیار رہو۔“

شہزاد تو یہ سب بول کر چلا گیا لیکن ان کا سکون غارت ہو گیا تھا۔

”فیصل! مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ ستارہ نے کہا۔ ”اگر گاڑی والا واقعہ جان بوجھ کر کیا گیا تھا تو مجھے ڈیڈ سے ایسی امید نہیں تھی۔“

”لیکن اب تیار رہو۔ ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

وہ رات انہوں نے خوف کے عالم میں گزاری لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ دوسرا دن بھی یونہی گزر گیا۔

لیکن تیسری رات جب وہ دونوں مارکیٹ سے واپس آ رہے تھے تو ان پر گولی چلا دی گئی۔

☆☆☆

اور اب یہ تیسرا حملہ تھا۔

یہ حملہ ان کے فلیٹ پر کیا گیا تھا۔ خطرہ اب ان کے قریب بہت قریب آ چکا تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ رات ان کے لیے بھاری ہو جاتی۔

فیصل نے فون کر کے شہزاد کو بلا لیا تھا۔ وہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ ”اب بھگتو تم دونوں۔“ وہ آتے ہی شور کرنے لگا۔ ”میں نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ یہ ملاپ ستارہ کے ڈیڈ کو کسی طرح پسند نہیں آئے گا۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں اور دیکھ لو وہی ہو رہا ہے۔ تم دونوں کی زندگی خطرے میں ہے۔“

”لیکن یار! ہم نے ایک دوسرے سے محبت کی ہے۔“ فیصل نے کہا۔

”یہ سب پچھلی صدی کی باتیں ہیں۔ آج زمینی حقائق دیکھے جاتے ہیں۔“ شہزاد نے کہا۔ ”خود سوچو، جب سکندر صاحب تمہارا جینا دوبھر کروا دیں گے، جب تم نوکری سے نکال دیے جاؤ گے۔ جب ہر قدم پر موت کا خوف ہوگا تو اس وقت کیا اس محبت کو لے کر چاٹو گے۔“

”ہم دوسرے شہر چلے جائیں گے۔“ ستارہ بول پڑی۔

”شاید تم اپنے ڈیڈ کو اچھی طرح نہیں جانتیں۔“ شہزاد نے کہا۔ ”ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں...... ان کے آدمی ہر جگہ موجود ہیں۔“

”چلو وہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ اس وقت تو یہ خوف ہے کہ ہم یہ رات کہاں گزاریں؟ ہمیں تو یہ رات بھاری محسوس ہو رہی ہے۔“

”تم میرے یہاں رہ سکتے ہو۔“ شہزاد نے کہا۔ ”اگرچہ اس طرح خود میں بھی سکندر صاحب کے عتاب میں آ سکتا ہوں لیکن دوستی کے لیے اتنی قربانی تو دینی ہی ہو گی۔“

ستارہ نے ایک بکس میں جلدی جلدی کچھ چیزیں سمیٹ لی تھیں۔

”اب چلو، میں نے احتیاطاً اپنی گاڑی پچھلی طرف کھڑی کی ہے۔“ شہزاد نے بتایا۔

لیکن دیوار کی پچھلی طرف بھی ان کے لیے سکون نہیں تھا۔

شہزاد کی گاڑی سے کچھ فاصلے پر ایک اور گاڑی بھی تھی جو شہزاد کی گاڑی کے اسٹارٹ ہوتے ہی اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔

”میرے خدا!“ شہزاد نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم لوگ ہوشیاری سے بیٹھو۔ ہوسکتا ہے کہ ہم پر راستے میں حملہ ہوجائے کیونکہ ہمارا تعاقب شروع ہوچکا ہے۔“

☆☆☆

وہ ایک عجیب آدمی تھا۔

ایک شاندار پرانے طرز کی حویلی کا مالک۔ نہ جانے یہ حویلی کس زمانے میں اور کیوں بنوائی گئی تھی۔ یہ ہائی وے پر پکی سڑک سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر تھی۔

حویلی سے کچھ فاصلے پر ایک پوری بستی آباد تھی۔ یہ بستی اسی آدمی نے آباد کروائی تھی جو اس حویلی کا مالک تھا۔

اس کا نام رانا تھا۔ اس کے پاس بے پناہ دولت تھی۔ بہت سی زمینیں تھیں۔ شہر میں کئی شاپنگ سینٹرز تھے۔

وہ حویلی میں ملازمین کی پوری بٹالین کے ساتھ رہا کرتا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی یا لوگوں کے علم میں یہ بات نہیں تھی۔

اس کے مشغلے بہت دلچسپ تھے۔ وہ شکار کرتا اور اپنے ملازمین کو طرح طرح کی سزائیں دیا کرتا۔ ذرا ذرا سی غلطی پر سزا ملتی تھی لیکن اس کی سزاؤں میں تشدد شامل نہیں ہوتا بلکہ یہ انوکھی سزائیں ہوا کرتیں۔

اس وقت ایک ملازم کو سزا مل رہی تھی اور وہ سزا یہ تھی کہ اسے ایک سپاٹ درخت پر چڑھنا تھا۔ وہ بے چارہ اپنی کوشش سے کچھ دیر تک جاتا پھر پھسل کر نیچے گر پڑتا۔ دوسرے ملازمین یہ تماشا دیکھ دیکھ کر زور زور سے ہنسے جارہے تھے۔

رانا ان کی طرف دیکھتا۔ ”کم بختو! تم لوگ ہنس رہے ہو۔ میں تمہیں بھی یہ سزا دے سکتا ہوں۔“

اس کے انداز میں ایک طرح کا جو زنانہ پن تھا، ملازمین اس سے در بھی محظوظ ہوا کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ رانا صاحب مرد ہی نہیں ہیں اسی لیے انہوں نے شادی نہیں کی۔

رانا عورتوں کی طرح ہاتھ لچکا لچکا کر باتیں کیا کرتا تھا۔

اس حویلی میں ملازمین کو ہر طرح کی سہولتیں تھیں۔ اس لیے اپنی سزاؤں کے باوجود وہ رانا کی ملازمت چھوڑ کر کہیں نہیں جاتے تھے۔

رانا کبھی کبھی اپنے وسیع ڈرائنگ روم میں پیروں میں گھنگرو باندھ کر کلاسیکل رقص بھی کیا کرتا۔ اس وقت بھی ملازمین کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر اس کی طرف دیکھتے رہتے اور رانا رقص کرتے کرتے رک کر انہیں ڈانٹنا شروع کر دیتا۔

ملازمین کو اپنے انوکھے مالک سے محبت بھی تھی۔ وہ اسے کسی پریشانی میں دیکھ کر خود بھی پریشان ہوجاتے۔ عام طور پر رانا کی پریشانیاں بھی بے تکی ہوا کرتی تھیں۔

رانا کے کاروبار اور اس کی زمینوں کے حساب کتاب کے لیے تنویر نام کا ایک منیجر بھی اس حویلی میں رہا کرتا۔ اس کے گھر والے شہر میں رہتے تھے۔

وہ ایک سرد مزاج اور خاموش طبیعت انسان تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ اسے اس بات کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ رانا حویلی میں کیا کرتا پھر رہا ہے۔

وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ اپنی بے تکی حرکتوں اور زنانہ پن کے باوجود رانا کاروباری معاملات میں بہت تیز ہے۔ عقابی نگاہیں رکھتا ہے اور کسی کو بھی اتنا موقع نہیں دیتا کہ اس کے ساتھ دھوکا کر سکے۔

ملازم شاید آٹھویں بار درخت پر چڑھنے کی کوشش میں ناکام ہوکر ایک طرف آنکھیں بند کرکے لیٹ چکا تھا۔

رانا ہاتھ نچا کر بولا۔ ”بس آدھ گھنٹے تک پڑا رہ اسی طرح۔ اگر اس سے پہلے اٹھنے کی کوشش کی تو پھر سے درخت پر چڑھا دوں گا۔“

اسی وقت ایک ملازم باہر سے تقریباً دوڑتا ہوا اس کے پاس آگیا۔ ”سرکار! دو آدمی آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔“

”ہائے ہائے، کون ملنے آگیا؟ ان کو بتایا نہیں کہ سرکار کسی سے نہیں ملتے۔“

”میں نے بتایا تھا لیکن وہ ملنا چاہ رہے ہیں۔“ ملازم نے بتایا۔ ”ان دونوں کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔“

”تو کم بخت یہ پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ رانا پھٹ پڑا۔ ”کتنے دن ہوگئے کسی لڑکی کو دیکھے ہوئے۔ ہمیشہ تم منحوسوں کی صورت سامنے رہتی ہے۔“

ملازم نے ان تینوں کو حویلی کی شاندار بیٹھک میں بٹھا رکھا تھا۔ رانا جب لچکتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا تو وہ تینوں اس کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔

رانا گہری نظروں سے تینوں کا جائزہ لینے لگا۔



”چلو، اب جلدی جلدی بتاؤ کون ہو تم تینوں اور یہاں کیوں آئے ہو؟“ رانا نے کہا۔

”جناب! میرا نام فیصل ہے۔“ ایک نوجوان نے بتایا۔ ”اور یہ میری بیوی ہے ستارہ اور یہ ہمارے دوست ہیں شہزاد۔“

”چلو یہاں تک بات سمجھ میں آگئی۔ اب جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ اس طرف کیسے تشریف لے آئے؟“

فیصل نے شہزاد کی طرف دیکھا۔ شہزاد نے بتانا شروع کیا۔ ”جناب! قصہ کچھ یوں ہے کہ میرا دوست فیصل اور اس کی بیوی ستارہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور محبت کرتے ہیں۔ لیکن ستارہ کے باپ کو ان کی یہ محبت پسند نہیں ہے۔ وہ ایک دولت مند اور طاقتور انسان ہیں۔ ان دونوں نے ان سے چھپ کر کورٹ میرج کرلی ہے۔ اس کے بعد سے ان پر قاتلانہ حملے شروع ہوچکے ہیں۔“

”جی جناب!“ فیصل نے بات آگے بڑھائی۔ ”ہر حملہ بہت خطرناک تھا لیکن اللہ ہمیں بچاتا رہا۔ اس وقت بھی ہم حملہ آوروں سے بچ کر فرار ہورہے تھے کہ آپ کی حویلی دکھائی دی اور ہم یہاں آگئے۔“

”واہ واہ۔“ رانا تالیاں بجانے لگا۔ ”یہ تو بالکل فلمی کہانی ہے۔ ہیرو، ہیروئن اور ظالم باپ۔“

”جی جناب! ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔“ فیصل نے کہا۔ ”ہم سکندر صاحب کا مقابلہ نہیں کرسکتے اسی لیے اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے ہیں۔“

”سکندر کون؟“ رانا نے پوچھا۔

”میرے ڈیڈی۔“ ستارہ نے بتایا۔

”تمہارے ڈیڈی سلور انڈسٹری والے سکندر تو نہیں ہیں؟“ رانا نے دریافت کیا۔

”جی ہاں، کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟“

”بہت اچھی طرح۔“ رانا پرجوش دکھائی دینے لگا۔ ”اب مزہ آئے گا۔ سکندر سے تو میری بہت پرانی لڑائی چلی آرہی ہے۔ اب تم بے فکر ہوکر یہیں رہو۔ سکندر تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہائے کم بخت نے اپنی پھول سی بچی کا بھی خیال نہیں کیا۔ بھاڑ میں جائے اسکی دولت اور طاقت۔ دیکھتا ہوں وہ کتنا شہ زور ہے۔ میرا نام بھی رانا ہے... رانا۔“

ان لوگوں کے لیے یہ ایک نئی لیکن ان کے حق میں بہتر صورت حال تھی۔

رانا تالیاں بجا بجا کر رقص کیے جارہا تھا۔ ”ارے سکندر! بتا دوں گا سکندر... دیکھ لے کی دنیا تو ہے جھنجھو مری“

وہ تینوں حیرت سے رانا کی طرف دیکھے جارہے تھے۔

☆☆☆

گرو مہاویر نے جنگل میں اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ ٹھکانا کیا تھا۔ ایک چھوٹی سی کٹیا تھی پانی کے ایک چھوٹے سے سلسلے کے کنارے بنی ہوئی تھی۔ یہ ٹھکانا لوگوں کی نگاہوں سے بہت فاصلے پر تھا۔

مہاویر خود ان کی تلاش میں بھٹکتا رہتا تھا۔ گاؤں گاؤں، شہر شہر۔ ہر جگہ اس نے دلوں میں کھوٹ ہی دیکھے تھے۔

ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہوئے لوگ۔ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑے، فساد، خون ریزی۔ برداشت نہ رکھنے والے۔ لالچی، دھوکے باز اور نہ جانے کیا کیا۔

ایسے لوگوں کے درمیان اس کا گزارہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے وہ اپنا مرگ چھالا اور ایک لوٹا لیے بھٹکتا پھرتا۔ پھر یہ جنگل اسے راس آگیا۔

اوپر والے نے اس جنگل میں اس کے لیے پھلوں کے درختوں کی صورت میں رزق کا بندوبست بھی کر رکھا تھا اور پینے کے لیے صاف پانی بھی تھا۔ ایک انسان کو اس کے علاوہ اور کیا چاہیے۔ باقی تو سب دھوکا ہے۔ سراب ہے۔ ایک لنگوٹی، دو روٹیاں، باقی سب بکواس ہے۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ اس کا دھرم اور اس کا مذہب کیا ہے۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ ایک انسان ہے اور اسے پیدا کرنے والا پوری کائنات کا خالق ہے۔ وہ کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ سب سے روشن نور ہے۔

وہ کیڑوں کو بھی رزق دیتا ہے۔ مہاویر نہیں جانتا تھا کہ اسے یہ نام کس نے دیا۔ اس کے ماں باپ کون تھے۔ اس نے ایک دھرم شالا میں پرورش پائی تھی لیکن جب اسے شعور آیا تو وہاں کی فضاؤں سے اسے وحشت ہونے لگی۔ دیوی، دیوتاؤں کی باتیں تو ہوا کرتیں لیکن باتیں کرنے والے اندر سے کھوکھلے ہوا کرتے۔

وہ ایشور کی پوجا اسی طرح کرتے جیسے ایشور پر احسان کر رہے ہوں۔ جب اس کا دل نہیں لگا تو وہ وہاں سے نکل گیا۔

حالات نے اسے ایک مدرسے میں پہنچا دیا تھا۔ وہاں کے حالات بھی مختلف نہیں تھے۔ وہاں بھی یہی سب کچھ تھا۔ مہاویر یہ سوچتا رہا کہ ہندو ہیں، مسلمان ہیں لیکن انسان کہاں

ہیں؟ سورج کی روشنی تو سب کے لیے ہوتی ہے۔ بارش تو ہر ایک کو نہال کر دیتی ہے۔ پھر یہ لوگ خدا کو مذہب کے خانوں میں قید کر کے کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔

مدرسے میں بھی جب اس کا دل نہیں لگا تو وہ وہاں سے بھی نکل گیا۔ اب اس کے چہرے پر بلا کا نور اور تقدس نمایاں ہونے لگا تھا۔ وہ جدھر سے گزرتا، لوگ اسے احترام سے دیکھا کرتے۔

بہت سے لوگ اپنے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس کے پاس آیا کرتے۔ کسی کو صحت کی ضرورت تھی۔ کسی کو محبت کی۔ کسی کو دشمنوں سے خطرہ تھا۔ کسی کو دولت چاہیے تھی۔ کوئی اولاد کے لیے تڑپ رہا تھا۔ سب نے اسے ہر مرض کی دوا سمجھ رکھا تھا۔

ان لوگوں کو دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ یہ کیسے لوگ تھے۔ یہ سب مہاویر سے صرف مہاویر کے لیے نہیں ملا کرتے بلکہ اپنے اپنے مقصد کے لیے ملا کرتے تھے۔

جس طرح ہندو اور مسلمان خدا کی عبادت صرف خدا کے لیے نہیں کرتے تھے بلکہ جہنم اور جنت کے لیے کیا کرتے تھے۔

یہ سب دیکھ دیکھ کر مہاویر کا دل اوب چکا تھا۔ شہروں میں منافقت تھی اور جنگل میں سچائی تھی۔ یہاں کے درخت اور پودے میٹھے تھے۔ یہاں کے پرندے اور جانور سچے تھے۔ اسی لیے مہاویر کو یہ جنگل پسند آ گیا تھا۔ یہاں اسے تنگ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اپنی مرادیں مانگنے والا کوئی نہیں تھا۔ بس وہ تھا، تنہائی تھی اور اس کی ذات تھی جس نے کائنات بنائی ہے۔

مہاویر کا اب سارا رشتہ اسی سے تھا۔

☆☆☆

ان تینوں کو اس حویلی میں کمرے دے دیے گئے تھے۔ رانا ان کے لیے ایک حیرت انگیز آدمی ثابت ہوا تھا۔ تالیاں بجاتے رہنا، عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا کر اور لچک کر باتیں کرنا لیکن اپنے معاملات میں بے پناہ کنٹرول۔

اتنے بڑے کاروبار اور زمینوں کی دیکھ بھال۔ یہ سب حیران کر دینے والی باتیں تھیں۔

اس وقت وہ تینوں ایک ہی کمرے میں بیٹھے ہوئے صورت حال پر باتیں کر رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ ہمارے لیے یہ جگہ بھی مناسب نہیں ہے۔" ستارہ نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ یہ آدمی ڈیڈ سے دشمنی رکھتا ہے اور اس چکر میں وہ یہ بتا سکتا ہے کہ ہم لوگ اس کی حویلی میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ اپنی برتری جتانے یا ڈیڈ کو بلیک میل کرنے کے لیے۔"

"ہاں، یہ ممکن ہے۔" فیصل نے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہم خود کو بچا کر بھاگ تو نکلے ہیں لیکن کہاں تک اور کب تک بھاگتے رہیں گے۔ زندگی اس طرح تو نہیں گزرے گی کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتے رہیں۔ کوئی کب تک پناہ دیتا رہے گا؟"

"اسی سوال کا جواب تو تلاش کر رہی ہوں۔" ستارہ نے کہا۔ "میرے ذہن میں صرف ایک بات آ رہی ہے کہ کیوں نہ ہم خود ہی ڈیڈ کے سامنے پیش ہو جائیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" فیصل نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں معاف کر دیں۔" ستارہ نے کہا۔ "میں ان کی اولاد ہوں۔ انہیں کچھ تو خیال ہوگا۔ پھر ہم نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ شادی کی ہے۔"

"لیکن میں اس تجویز کے خلاف ہوں۔" شہزاد اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ تم ان کی اولاد ہو اور وہ تمہیں معاف کر دیں گے تو ایسا نہیں ہوگا۔ اگر ایسا ہونے والا ہوتا تو وہ تم دونوں پر بھی قاتلانہ حملے نہیں کرواتے۔"

"تو پھر کیا کریں؟" فیصل پریشان ہو گیا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم کبھی نارمل زندگی گزار ہی نہیں سکتے۔"

"صرف ایک طریقہ ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "بشرطیکہ ستارہ اس پر راضی ہو جائے۔"

"وہ کیا ہے؟" ستارہ نے پوچھا۔

"وہ یہ ہے کہ ستارہ میرے ساتھ سکندر صاحب کے پاس چلی چلے۔" شہزاد نے کہا۔ "اور انہیں یقین دلایا جائے کہ ستارہ نے فیصل کو چھوڑ دیا ہے۔"

"یہ کیسی بے تکی ترکیب ہے؟" فیصل غصے سے بولا۔

"سنتے تو رہو، میں کیا کہہ رہا ہوں۔" شہزاد نے کہا۔ "ہمیں چاہیے کہ ہم فوری طور پر ان کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔ اور ستارہ وہیں ان کے پاس رہنے لگے.... آہستہ آہستہ میں کسی طرح سکندر صاحب سے بات کر کے انہیں راضی کر لوں۔"

"اور اگر وہ راضی نہیں ہوئے تو؟" فیصل نے خدشہ ظاہر کیا۔



"ضرور ہوں گے۔" شہزاد نے کہا۔ "اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ تم لوگ زندگی بھر رانا صاحب کے مہمان بن کر تو نہیں رہ سکتے۔"

شہزاد کی تجویز معقول تھی لیکن فیصل کا کیا ہوگا؟ وہ کیا کرتا؟ اس کا حل بھی شہزاد نے نکال تھا۔ "ایسا کرو کہ فیصل کو یہیں رہنے دو۔" اس نے کہا۔ "سکندر صاحب کے آدمی اس کو جانتے ہیں۔ شہر میں دیکھتے ہی اسے گولی مار دیں گے۔"

یہ بات بھی درست تھی۔ فیصل خود بھی اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ فوری طور پر شہر جانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

☆☆☆

جب یہ بات رانا کو معلوم ہوئی تو وہ تالیاں بجا بجا کر شور کرنے لگا۔ "سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ارے اس سکندر سے کیا ڈرنا۔ تم لوگ زندگی بھر یہاں رہو۔ دیکھتا ہوں کون مائی کا لال تم لوگوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"رانا صاحب! آپ کی اس محبت کا بہت شکریہ۔" فیصل نے کہا۔ "لیکن ہم سب کے لیے بہتر ہوگا کہ ہم خود سکندر صاحب کے سامنے پیش ہو جائیں۔ فی الحال تو ستارہ ان کے سامنے جائے گی۔ پھر وہ سکندر صاحب کو آہستہ آہستہ رام کرنے کی کوشش کرے گی۔"

"وہ ایک نمبر کا ضدی ہے۔" رانا نے کہا۔ "وہ نہیں مانے گا، یہ لکھ لو۔"

"اگر وہ نہیں مانا تو پھر ہم کوئی راستہ نکال لیں گے۔"

"تو پھر بھیج دو دونوں کو۔ لیکن تمہیں یہیں رہنا ہے۔" رانا نے کہا۔ پھر تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔ "غارت ہو جائیں ایسے لوگ۔ کم بخت محبت کی قدر ہی نہیں کرتے۔"

کچھ دیر بعد شہزاد اور ستارہ شہزاد ہی کی گاڑی میں شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ فیصل حسرت بھری نگاہوں سے ستارہ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

شہزاد کی پلاننگ تو اچھی تھی لیکن کیا ضروری تھا کہ سکندر مان ہی لیتا۔ اگر وہ اپنی ضد ہی پر اڑا رہتا تو کیا ہوتا؟ پھر تو وہ ستارہ کی صورت بھی دیکھنے کو ترس جاتا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس نے کورٹ جا کر ستارہ سے باقاعدہ شادی کی تھی لیکن وہ سکندر جیسے طاقتور آدمی کے سامنے کیا کرتا؟

سکندر کے آدمی فیصل کو زبردستی اٹھا کر سکندر کے سامنے لے جاتے اور فیصل کو مجبور کر دیا جاتا کہ وہ ستارہ کو طلاق دے دے۔

یہ ایک امکان تھا اور دوسرا امکان یہ تھا کہ سکندر، ستارہ کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ وہ اپنے آدمیوں سے ستارہ کو مروا بھی سکتا تھا۔ اس نے قاتلانہ حملے اسی لیے تو کروائے تھے۔ اور ستارہ اور فیصل کی مدد کے جرم میں شہزاد کو بھی ٹھکانے لگا دیا جاتا۔ سب کی کہانی ختم ہو جاتی۔ فیصل کو اب ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ستارہ کو بھیج کر اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اب وہ رانا کی حویلی میں رہ کر سوائے انتظار کے اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

رانا بھی اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ زنانہ نما اس شاندار سے شخص کا کردار کیسا عجیب تھا۔ فیصل ملازمین کے ساتھ رانا کا رویہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتا۔

وہ رانا سے خوف زدہ بھی رہتے اور اس سے محبت بھی کرتے تھے۔ فیصل کو ایک دو ملازمین سے رانا کے بارے میں بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ انہوں نے بہت دلچسپ باتیں بتائی تھیں۔

"بادشاہ آدمی ہیں صاحب، بادشاہ آدمی۔ ہم لوگوں کو سزائیں بھی دیتے ہیں اور ہم سے پیار بھی کرتے ہیں۔"

"اور شادی... کیا رانا صاحب نے شادی نہیں کی؟"

"نہیں، سنا ہے ایک بار شاید نکاح ہوا تھا۔ لیکن اس لڑکی نے ان کی حرکتیں دیکھ کر ان کو چھوڑ دیا.... آپ سمجھ رہے ہیں نا صاحب؟ رانا صاحب جس طرح کے ہیں۔ عورت کو تو مرد چاہیے نا صاحب۔ اور یہ تو... لیکن کچھ بھی ہو۔ ان کا دل سونے کا ہے۔ بہت پیار کرنے والے آدمی ہیں۔ ہماری ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو جاتے ہیں۔"

ملازمین سے ہی معلوم ہوا کہ رانا کو پیروں میں گھنگرو باندھ کر رقص کرنے کا بھی شوق ہے۔ اتنے شاندار نظر آنے والے آدمی کا یہ حال تھا۔

ایک دن گزر گیا۔

فیصل نے دونوں کو تاکید کی تھی کہ شہر اور سکندر صاحب کے پاس پہنچتے ہی اسے اپنی خیریت کی اطلاع دیں لیکن کوئی فون نہیں آیا تھا۔ حالانکہ راستہ صرف تین چار گھنٹوں کا تھا۔ اتنی دیر میں تو ان کے فون آ جانے چاہیے تھے۔ پھر کیا ہو گیا تھا؟

اس نے اپنے موبائل سے شہزاد سے رابطہ کیا۔ بیل جا رہی تھی لیکن دوسری طرف سے جواب نہیں دیا جا رہا تھا۔ اس نے دوبارہ نمبر ملایا لیکن دوسری طرف سے شہزاد کا موبائل بند ہو چکا تھا۔

فیصل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ کہاں جائے؟ کیسے معلوم کرے کہ وہ دونوں سکندر

کے پاس پہنچ چکے ہیں یا نہیں؟

☆☆☆

لیکن وہ نہیں پہنچ سکے تھے۔

راستے ہی میں انہیں گھیر لیا گیا تھا۔ انہیں گھیرنے والے کچھ اجنبی لوگ تھے جو اپنے حلیوں اور رویوں ہی سے خون خوار دکھائی دے رہے تھے۔

شہزاد کی گاڑی نے ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ہائی وے کے ایک ویران مقام پر انہیں گھیر لیا گیا۔ انہیں گھیرنے والے دو گاڑیوں میں تھے۔ ان کی تعداد سات آٹھ تھی اور وہ سب کے سب مسلح تھے۔

ستارہ کی رگوں میں خون جیسے جم کر رہ گیا۔ وہی حال شہزاد کا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھیرنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہماری گاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلے آؤ۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "کوئی ہوشیاری کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ہم یہیں بھون کر رکھ دیں گے۔"

"شہزاد! یہ کون لوگ ہیں؟" ستارہ کانپنے لگی۔

"نہ جانے کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔"

"اوئے ساتھ ساتھ چلو۔" ایک کرخت آواز گونجی۔ "راستے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا ایک بندہ تمہارے ساتھ بیٹھے گا۔"

ایک مسلح شخص ان کی گاڑی میں بھی بیٹھ گیا۔

اب یہ سفر کسی انجان منزل کی طرف تھا۔ یہ منزل شاید عام راستے سے ہٹ کر تھی۔ ان کی گاڑیاں دھول اڑاتی چلی جا رہی تھیں۔ نہ جانے کس طرف؟

ہائی وے دور، بہت دور رہ گیا تھا۔ انہیں ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ راستے میں ایک دوسرے سے بات نہیں کریں گے۔ اس دھمکی نے دونوں کو خوف زدہ کر رکھا تھا۔ ورنہ ان کے پاس درجنوں سوالات تھے۔ کون لوگ ہیں یہ؟ کیا چاہتے ہیں؟ کیوں لے جا رہے ہیں؟ اور ان کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے؟

لیکن وہ خاموش تھے۔ ستارہ نے شہزاد کا بازو اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ اس کی انگلیاں شہزاد کے گوشت میں اترتی جا رہی تھیں۔

کیا قسمت تھی اس کی۔ پہلے باپ کے خوف سے فرار ہونا، اس کے بعد یہ نئی مصیبت۔ وہ سوچ رہی تھی کہ فیصل کتنا پریشان ہو رہا ہوگا۔ اسے ان کے فون کا انتظار ہوگا۔ لیکن وہ کس طرح بتاتے؟ ان کے موبائل تو ان سے لے لیے گئے تھے۔ اپنی دنیا سے ان کا رابطہ ختم ہو چکا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر کے سفر کے بعد وہ ایک جگہ رک گئے۔ اونچے اونچے ٹیلوں کے درمیان بنی ہوئی یہ جگہ بہت ہی دہشت ناک دکھائی دے رہی تھی۔

یہاں کئی کچے مکانات تھے۔ ستارہ نے ڈاکوؤں کی بستیوں کے بارے میں سن رکھا تھا۔ کئی فلمیں دیکھ رکھی تھیں۔ ان میں بھی ڈاکوؤں کے اڈے اسی طرح کے ہوا کرتے تھے۔

"چلو اترو۔" ایک نے کہا۔

دونوں گاڑیوں سے نیچے اتر آئے۔ اس بستی میں بھی بیس پچیس آدمی تھے۔ مسلح، خوں خوار قسم کے جن کے چہروں پر درشتی اور وحشیانہ پن لکھا ہوا تھا۔

انہیں ایک خوں خوار شکل کے آدمی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ جس کے تیور ہی دیکھ کر ستارہ پر لرزہ طاری ہو گیا۔

"کیوں بھائی... شہر بھاگنے کی بہت جلدی ہو رہی تھی؟" اس ڈاکو نے پوچھا۔

"تم ہم دونوں کو کیوں پکڑ کر لائے ہو؟" شہزاد نے پوچھا۔

"اوئے بہت بھولا بن رہا ہے۔" وہ غصے سے بولا۔ "کیا تجھے نہیں معلوم کہ ہم بندوں کو کیوں پکڑتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"لیکن ہم تو عام سے لوگ ہیں۔" شہزاد نے کہا۔

"عام سے لوگ؟" وہ ہنس پڑا۔ "ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم کتنے عام سے لوگ ہو۔" اس نے ستارہ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جس آدمی کی بیٹی ہے، وہ ارب پتی بندہ ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟" شہزاد نے پوچھا۔

ڈاکو ہنس پڑا۔ "بے وقوف انسان! یہ پورا علاقہ ہمارا ہے۔ اس طرف اڑ کر آنے والا پرندہ بھی اپنے بارے میں بتا کر یہاں سے کہیں اور جاتا ہے۔ تم لوگوں نے اس زنانے رانا کی حویلی میں پناہ لی تھی۔ اس لڑکی نے کسی سے شادی کی تھی۔ پھر اس کا باپ دونوں کو مارنے کے چکر میں پڑ گیا۔ اور تم لوگ بھاگ کر اس علاقے میں آ گئے۔ رانا کی حویلی میں پناہ لی۔ اس لڑکی کا شوہر تو وہیں رہ گیا اور تم دونوں اس وقت ہمارے قبضے میں ہو۔"



"کمال ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "تمہیں اتنی باتیں کیسے پتا چل گئیں؟"

"سامنے کی بات ہے۔ رانا کی حویلی میں بھی میرے آدمی موجود ہیں۔" اس نے بتایا۔ "اب آ گئی سمجھ میں؟"

"ہاں، سمجھ میں آ گیا... لیکن اب تم کیا چاہتے ہو؟" ستارہ نے پوچھا۔

"صرف دس کروڑ۔" ڈاکو نے بتایا۔ "دس کروڑ مل جائیں تو تم دونوں یہاں سے چلے جانا۔"

"لیکن کون دے گا دس کروڑ؟"

"تمہارا باپ اور کون؟"

"جب تمہیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ میرا باپ میرا دشمن ہو گیا ہے، مجھے مارنے کی کوشش کر رہا ہے پھر وہ دس کروڑ کیوں دینے لگا؟"

"شاید تو کسی باپ کی فطرت نہیں جانتی۔" وہ ہنس پڑا۔ "وہ یہ تو گوارا کرلے گا کہ تجھے جان سے مار دے لیکن یہ برداشت نہیں کرے گا کہ اس کی بیٹی طوائف بنا دی جائے۔ دو دو کوڑی کے لوگ اس کے پاس آتے رہیں۔"

"نہیں، نہیں۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔" ستارہ نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔

"اگر دس کروڑ نہیں ملے تو ایسا ہی ہوگا۔" اس نے کہا پھر اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ "بند کر دو ان دونوں کو۔ ان سے بعد میں بات کروں گا۔"

☆☆☆

مہاویر کو دو دنوں سے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ گیان اور دھیان میں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ بظاہر ایسی کوئی بات بھی نہیں تھی جو اسے پریشان کر سکتی۔ جنگل تو ہمیشہ کی طرح پُرسکون تھا۔ پھر اسے ایسا کیوں لگ رہا تھا؟ اس کے من میں ایسی ہلچل کیوں مچی ہوئی تھی؟

اس نے اپنے من میں جھانک کر معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ایسا اس کے ساتھ پہلی بار ہو رہا تھا۔

وہ اپنی کٹیا سے باہر آ کر بیٹھ گیا۔ دور دور تک کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف ویرانی تھی۔ لیکن نہیں۔ کوئی تھا... کوئی انسان جو تھکے قدموں چلتا ہوا اس کی کٹیا ہی کی طرف آ رہا تھا۔

مہاویر نے آنے والے پر اپنی نگاہیں جما دیں۔ کون ہو سکتا تھا یہ؟ اس جنگل کی طرف تو کسی کا آنا جانا ہی نہیں تھا۔ پھر کون تھا؟

آنے والا قریب آتا چلا گیا۔ وہ مہاویر کی کٹیا کے پاس آ کر رک گیا۔ مہاویر اب بھی اسے پہچان نہیں پایا تھا۔ وہ کوئی اجنبی تھا۔

"مہاراج!" آنے والے نے احترام میں اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔ "میں بھولا ناتھ ہوں۔ پاس والی بستی میں رہنے والا۔"

"کیا بات ہے بھولا ناتھ؟" مہاویر نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "تم اس طرف کیسے آ نکلے؟"

"میں آپ ہی سے ملنے آیا ہوں مہاراج!" بھولا ناتھ نے بتایا۔ "میں جانتا تھا کہ آپ نے یہاں رہنا شروع کر دیا ہے۔ میں آپ کو بہت دنوں سے دیکھتا آیا ہوں لیکن آپ سے بات پہلی بار ہو رہی ہے۔"

"کہنا کیا ہے تمہیں؟" مہاویر نے پوچھا۔ "میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں؟"

"مہاراج! معاف کر دیں اگر میں کچھ الٹی سیدھی بات بول جاؤں۔" بھولا ناتھ نے کہا۔ "بھگوان نے انسان کو انسان کا دکھ درد دور کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا ہے۔ وہ اس لیے نہیں آیا ہے کہ کسی جنگل میں دھونی رما کر بیٹھ جائے یا کسی پہاڑ کے غار میں جا کر رہنے لگے۔ نہیں مہاراج! اصل کام تو انسان کی مدد ہے۔"

"کھل کر کہو بھولا ناتھ! تم مجھے کیا سمجھانا چاہ رہے ہو؟" مہاویر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

"مہاراج! آپ کو معلوم نہیں کہ ہماری بستی پر کیسی بپتا آ پڑی ہے۔ نہ جانے کتنی کنواری لڑکیاں راتوں رات غائب ہو چکی ہیں۔"

"کیا؟" مہاویر یہ سن کر بے چین ہو گیا۔ "کہاں غائب ہو چکی ہیں؟"

"ہمیں تو پتا نہیں چل رہا مہاراج! آپ ہی اپنی شکتی سے کام لیں جو بھگوان نے آپ کو دی ہے۔ آپ نیک انسان ہیں۔ آپ کی طرف گاؤں والوں کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ کیا ہندو کیا مسلمان۔ سب ہی مدد کے لیے آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ جگائیں اپنی قوتوں کو۔ اپنے لیے نہیں، غریبوں کی بھلائی کے لیے۔ بستی والوں کی عزتوں کے محافظ بن جائیے۔ مہاراج! بس میں یہی بتانے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

مہاویر خاموش ہو کر بھولا ناتھ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنے اندر جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اپنے آپ کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہت

دیر بعد اس نے گردن اٹھا کر بھولا ناتھ کی طرف دیکھا۔ ”ٹھیک ہے بھولا ناتھ۔ تم نے میرے پاس آ کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں ضرور مدد کروں گا۔ ضرور آؤں گا بستی میں۔ ضرور آؤں گا۔“

☆☆☆

فیصل ایک بار پھر مجرم کی طرح سکندر کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

”کیا بکواس کر رہا ہے؟“ سکندر غصے سے دہاڑا۔ ”میں اپنی بیٹی کا حساب تجھ سے لوں گا۔ تو نے اس کو بہکا کر اس سے کورٹ میرج کرلی تھی۔ اس کے بعد اس کو قتل کر کے تو نے اس کی لاش کہیں ٹھکانے لگا دی ہے اور میرے پاس ایک کہانی لے کر آ گیا ہے۔“

”سکندر صاحب! خدا کے لیے مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔“ فیصل جلدی سے بولا۔ ”میں نے ستارہ سے محبت کی تھی اور اس محبت کے بعد اس سے شادی کرلی۔ وہ میری بیوی ہے۔ میری عزت ہے۔ اس کورٹ میرج پر آپ اتنے غصہ ہوئے کہ آپ نے کئی بار ہم دونوں پر قاتلانہ حملہ کروا دیا۔ ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہم ہر بار بچ گئے۔“

”کیا بکواس کر رہا ہے؟ ہم نے کوئی حملہ نہیں کروایا۔“ سکندر نے کہا۔

”سکندر صاحب! ہم پر تین چار بار حملہ ہو چکا ہے۔ گولیاں برسائی گئیں ہمارے اوپر۔“ فیصل نے کہا۔ ”اس لیے ہم خوف زدہ ہو کر شہر سے باہر بھاگ گئے تھے اور رانا مجید کی حویلی میں پناہ لی تھی۔“

”جھوٹ ہے یہ سب۔“ سکندر دہاڑا۔ ”مجھے یہ پتا چل گیا تھا کہ اس نے تیرے ساتھ کورٹ میرج کرلی ہے۔ اس کے بعد میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تا کہ خود ہی بھگتے اور تو حملے کی کہانی سنا رہا ہے۔“

”یہ بالکل سچ ہے سکندر صاحب! بالکل سچ۔“ فیصل نے کہا۔ ”اگر آپ چاہیں تو میں اپنی بلڈنگ کے چوکیدار سے اس کی گواہی بھی دلوا سکتا ہوں۔“

سکندر سوچ میں پڑ گیا۔ ”اگر تو سچ کہہ رہا ہے تو پھر یہ کیا ہے؟ کس نے تم دونوں پر حملے کروائے ہوں گے اور وہ خود کہاں غائب ہو گئی؟“

”اس کے ساتھ شہزاد بھی غائب ہے سکندر صاحب!“ فیصل نے بتایا۔ ”میں پہلے اس کے گھر گیا تھا۔ انہیں بھی کچھ نہیں معلوم۔ وہ بھی بہت پریشان ہیں۔“

”تو پھر یہ کوئی لمبی سازش ہے۔“ سکندر نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں نے ستارہ کو اس کے حال پر تو چھوڑ دیا تھا لیکن اب اس کے غائب ہونے کی خبر نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“

”میں اسی لیے آپ کے غصے اور ناراضگی کے باوجود آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔“ فیصل نے کہا۔ ”کیونکہ آپ ہی ان دونوں کا پتا چلا سکتے ہیں۔“

”جب تک تمہاری پوزیشن کلیئر نہیں ہو جاتی، تم اسی گھر میں قید رہو گے۔“ سکندر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے منظور ہے سکندر صاحب! مجھے اپنی تکلیفوں سے کہیں زیادہ ستارہ کی فکر ہے۔ آپ مجھے قید میں رکھ سکتے ہیں۔ خدا کرے کہ ستارہ خیریت سے ہو۔“

☆☆☆

لیکن ستارہ خیریت سے نہیں تھی۔

اس پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ سکندر کو دس کروڑ کے لیے فون کرے لیکن وہ انکار کرتی رہی۔ ”میں کس منہ سے ڈیڈ کو فون کر سکتی ہوں۔ میں نے گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی۔ اس کے بعد خود ڈیڈ میرے دشمن ہو گئے تھے۔ وہ مجھے قتل کروا دینا چاہتے تھے۔ وہ تو میری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ پھر وہ میرے لیے دس کروڑ کیوں دینے لگے؟“

”تم ان سے بات تو کر کے دیکھو۔“ شہزاد نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ مان جائیں۔ ورنہ دوسری صورت میں یہ وحشی ڈاکو ہم دونوں کو مار دیں گے۔“

اس وقت اس کوٹھری میں صرف شہزاد اور ستارہ ہی تھے۔ ڈاکوؤں کے سردار نے شہزاد کو بلا کر اس سے کہا ہو گا کہ وہ ستارہ کو فون کرنے کے لیے کہے۔ اس لیے شہزاد اس پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

”ستارہ! کم از کم تم میری جان تو چھڑوا دو۔ میں تو تم لوگوں کی ہمدردی میں پھنس گیا ہوں۔“

”شہزاد! تم تو ایسا کہہ رہے ہو جیسے سب کچھ میرے اختیار میں ہے۔“ ستارہ نے کہا۔ ”تم خود دیکھ لو۔ تمہارے ساتھ میں بھی یہ دکھ برداشت کر رہی ہوں۔“

دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سردار کوٹھری میں داخل ہوا۔ اس وقت اس کے تیور بہت سخت ہو رہے تھے۔ اس نے ستارہ کو مخاطب کیا۔ ”او چھوکری! کیوں ہمارا ٹائم برباد کر رہی ہے۔ اگر نہیں مانتی تو تیرے اس ساتھی کو گولی مار دی جائے گی۔ اس کے بعد تیری باری ہو گی۔ بول کیا کہتی ہے؟“

”خدا کے لیے مجھے بچا لو ستارہ۔“ شہزاد کانپنے لگا۔ ”میں نے کیا قصور کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ستارہ نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں فون کر رہی ہوں لیکن مجھے کامیابی کی امید نہیں ہے۔“

”یہ سب چھوڑ... تو فون کر۔“ ڈاکو نے ستارہ کا چھینا ہوا موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”اس پر نمبر ملا کر اپنے باپ سے بات کر۔“

ستارہ نے نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے سکندر ہی نے اٹھایا۔ ”کہاں دفن ہو گئی ہے جا کر؟“ سکندر دہاڑا۔

”ڈیڈ پلیز! دو منٹ کے لیے میری بات سن لیں۔“ ستارہ نے کہا۔ ”مجھے اور شہزاد کو اغوا کر لیا گیا ہے۔“

”جہنم میں جاؤ تم دونوں۔“

”ڈیڈی، پلیز!“ ستارہ رونے لگی۔ ”یہ مجھے اور شہزاد کو گولی مار دیں گے۔“

سردار نے ہاتھ بڑھا کر ستارہ سے موبائل چھین لیا۔ ”سنو! میری بات سنو۔“ اس نے سکندر سے کہا۔ ”تمہاری بیٹی اور اس کا دوست ہمارے قبضے میں ہیں۔ صرف دس کروڑ کی ڈیمانڈ ہے۔ سوچ کر بتا دینا۔“

موبائل آف کر کے وہ کوٹھری سے باہر چلا گیا۔ ستارہ گم صم دروازے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

”اب کیا ہو گا؟“ شہزاد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ ستارہ نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ڈیڈی مان جائیں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صاف انکار کر دیں کیونکہ وہ اس ٹائپ کے انسان ہیں۔“

☆☆☆

رانا رقص کرتے کرتے رک کر مہاویر کو دیکھنے لگا جو نہ جانے کس طرف سے اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔

”اوہو مہاراج!“ رانا نے تالیاں بجائیں۔ ”تم کدھر سے آ گئے؟“

”تمہاری حویلی کے گیٹ سے اندر آیا ہوں۔“ مہاویر نے جواب دیا۔

”کسی نے تمہیں روکا نہیں؟“

”نہیں کیونکہ یہاں کے سب لوگ مجھے مان دیتے ہیں۔“ مہاویر نے کہا۔ ”وہ جانتے ہیں کہ میں ایک بے ضرر سا انسان ہوں۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔“

رانا خود ہی مہاویر کو جانتا تھا۔ وہ کئی بار مہاویر کو دور سے دیکھ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بستی کے لوگ اس سادھو کا کتنا احترام کرتے ہیں۔ اس کو آسمانی مخلوق کہتے ہیں۔ کیا ہندو کیا مسلمان... سب ہی اس کے عقیدت مند ہیں لیکن مہاویر کا اس طرح اس کے پاس آ جانا اسے حیران کر رہا تھا۔

”بیٹھ جائیں مہاراج!“ رانا نے اشارہ کیا۔ ”اور بتائیں میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟“

”رانا! یہ گاؤں تیرا ہے۔ یہ بستی تیری ہے۔ پھر کیوں آہیں سمیٹ رہا ہے۔ دیکھ اپنی جھولی کی طرف... کتنے لوگوں کے آنسو جمع کر رکھے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں مہاراج۔“

”اس بستی سے لڑکیاں غائب ہو رہی ہیں۔“ مہاویر نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے۔ جوان اور معصوم لڑکیاں۔“

”ہاں مہاراج! میں نے بھی سنا ہے لیکن پتا نہیں چلتا۔ میں تو خود پریشان ہوں۔“

”اپنے بڑوں کے کھنڈروں کو آواز دے۔ شاید ان کے پاس تیرے سوال کا جواب ہو۔“ مہاویر نے کہا۔ ”اب اس سے زیادہ کچھ مت پوچھنا۔ میں بھگوان کے اشارے پر اپنا جنگل چھوڑ کر اس بستی کی طرف آیا ہوں۔ تلاش کر ان کو اور آنکھیں بند کر کے بھول جا سب کچھ۔“

رانا خوف زدہ نگاہوں سے مہاویر کی طرف دیکھتا رہا۔ ”میں کوشش کروں گا مہاراج کہ ان کا پتا چل جائے۔“ رانا نے کہا۔

”تیرے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ یہ کھنڈر زنجیریں بن کر بولنے لگیں گے۔“

مہاویر پُروقار انداز میں اوم اوم کہتا ہوا رانا کے ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رانا نے ملازمین کو پکارنا شروع کر دیا۔ ”کم بختو! کہاں مر گئے سب کے سب۔ کیا موت آ گئی۔“

سارے ملازمین دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے۔

”کم بختو! تم لوگوں نے اس ہندو سادھو کو اندر کیوں آنے دیا؟“ اس نے غصے سے پوچھا۔

”کس سادھو کو سرکار؟“

”ارے، میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ کیا نام ہے اس کا، مہاویر۔“

”نہیں تو سرکار! کوئی نہیں آیا۔ ہم سب تو پوری طرح چوکس کھڑے ہیں۔“

رانا اپنا سر تھام کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

☆☆☆

یہ لمحے فیصل کے لیے بہت کربناک ہو گئے تھے۔

"لڑکی! تیری جان بچ گئی۔ تیرا باپ دس کروڑ دینے کو راضی ہو گیا ہے۔"

یہ ایسی خبر تھی جس نے ستارہ اور شہزاد دونوں کو حیران کر دیا تھا۔ زندگی ایک بار پھر ان کے قریب آنے والی تھی۔ وہ ایک بار پھر یہاں سے نکل کر اپنی زندگی شروع کر سکتے تھے۔

ڈاکوؤں کا سردار یہ خبر سنا کر کوٹھری سے باہر چلا گیا۔

"مبارک ہو۔" شہزاد نے ستارہ کی طرف دیکھا۔ "یہ بہت بڑا مرحلہ تھا جو طے ہو گیا ہے۔"

"لیکن یہ سب کیسے ہوگا؟" ستارہ نے پوچھا۔ "ڈیڈ ان لوگوں کو رقم کس ذریعے سے پہنچائیں گے اور ہم لوگوں کو کب چھوڑا جائے گا؟"

"یہ سب اس سردار سے معلوم کرنا ہوگا۔" شہزاد نے کہا۔ "میں اس سے پوچھتا ہوں کہ اس نے ہمارے لیے کیا سوچا ہے؟"

ستارہ اس خبر کو سن لینے کے بعد بھی الجھی ہوئی تھی۔ اسے اپنے اس باپ کا احسان لینا پڑا تھا جو اس کی موت چاہتا تھا۔ اگر وہ موت ہی کا خواہاں تھا تو پھر وہ اتنی بڑی رقم دینے پر راضی کیوں ہو گیا؟

دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا یہاں سے رہائی کے بعد وہ اپنے باپ کے پاس جا سکے گی؟ فیصل کا کیا ہوگا؟ ابھی تک صرف الجھنیں تھیں۔

کچھ دیر بعد شہزاد پھر اس کے پاس آ گیا۔ "ستارہ! ہم کل صبح یہاں سے جا رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "سردار کا آدمی شہر میں سکندر صاحب سے پیسے وصول کر کے ان لوگوں کو انفارم کر دے گا۔ اس کے بعد یہ ڈاکو ہمیں جانے کی اجازت دے دیں گے۔"

"لیکن میں نہ جانے کیوں ابھی تک مطمئن نہیں ہوئی ہوں۔" ستارہ نے کہا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ڈیڈی اتنی آسانی سے کس طرح مان گئے؟ وہ تو صاف انکار کر رہے تھے۔"

"ہو سکتا ہے کہ بیٹی کی محبت جوش میں آ گئی ہو۔" شہزاد مسکرا کر بولا۔

"شاید!" ستارہ دھیرے سے بولی۔ "سب سے پہلے ہم رانا کی حویلی میں جا کر فیصل کو وہاں سے نکالیں گے۔ اس کے بعد ہم دونوں کہیں اور نکل جائیں گے۔ کسی اور طرف۔ کسی اور شہر میں۔"

"ہاں، اس چکر میں تمہیں ایک افسوسناک خبر تو دینا بھول گیا۔" شہزاد نے کہا۔

"کیسی خبر؟"

"فیصل رانا کی حویلی سے نکل کر سکندر صاحب کے پاس پہنچ گیا تھا۔" شہزاد نے بتایا۔

"پھر... پھر کیا ہوا؟" ستارہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ "بتاؤ اس کے بعد کیا ہوا؟"

"سکندر صاحب نے فیصل کا خون کروا دیا ہے۔ وہ بے چارہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔" شہزاد نے بتایا۔

☆☆☆

ایک بڑا سا کمرا تھا۔

کمرا کیا اچھا خاصا ہال تھا۔ اس کے فرش پر دریاں اور چاندنی بچھی ہوئی تھیں۔ رانا پیروں میں گھنگرو باندھے ایک جنون کی کیفیت میں رقص کیے جا رہا تھا۔

اس کمرے کی دیواروں کے ساتھ چار نوجوان اور خوب صورت لڑکیاں بھی تھیں جو بہت حیرت اور خوف سے رانا کو دیکھ رہی تھیں۔

رانا رقص کرتے کرتے رک گیا۔ اس نے ان لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ "ناچو، تم بھی ناچو... یہاں آنے والی ہر لڑکی ناچتی ہے۔ تم بھی ناچو۔"

"رانا صاحب! ہمیں جانے دیں۔" ایک لڑکی نے رونا شروع کر دیا...

"خاموش۔" رانا دہاڑا۔ "میرے پاس آنے کے بعد رونا منع ہے۔ یہاں صرف ہنسا جاتا ہے۔ ہنسو اور موج کرو۔"

رانا اس وقت بالکل مختلف انسان دکھائی دے رہا تھا۔ مختلف اور بھیانک۔ اس کا زنانہ پن نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اب اس کے لہجے میں بھی مردانگی تھی اور اس کے انداز میں وحشیانہ پن تھا۔

وہ جھومتا ہوا اس لڑکی کے پاس آ گیا۔ اس نے لڑکی کے بال تھام کر زور زور سے جھٹکے دینے شروع کر دیے۔ "یہاں روتے نہیں ہیں، سمجھیں۔ تجھے رونے کے لیے نہیں اٹھوایا ہے۔ اپنا دل خوش کرنے کے لیے اٹھوایا ہے۔ میرا دل خوش کر اور چلی جا یہاں سے۔"

"رانا صاحب! آپ ہمیں چھوڑ دیں گے نا؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ تمہارا چارہ تو ہمیں ڈالنا ہے۔"



اسے ایک کمرے میں قید کر دیا گیا تھا۔ سکندر کا غصہ کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ پھر جب سکندر نے اسے بتایا کہ ستارہ اور شہزاد کی رہائی کے لیے دس کروڑ مانگے گئے ہیں تو فیصل کے ہوش اڑ گئے۔

"سکندر صاحب! دس کروڑ۔" فیصل نے کہا۔ "کس نے مانگے ہیں؟"

"جس نے ان دونوں کو اغوا کیا ہے۔" سکندر نے بتایا۔

"پھر... پھر آپ نے کیا سوچا؟"

"مجھے کچھ نہیں سوچنا۔ تو اس کا شوہر ہے۔ تو ہی اس کے لیے سوچتا رہ۔"

"نہیں، یہ آپ نہیں کر سکتے۔ وہ آپ کی بیٹی ہے۔ اولاد ہے آپ کی۔ اس کی زندگی اور عزت خطرے میں ہے۔"

"ہوا کرے۔ اب وہ میری بیٹی کہاں رہی۔ اس سے تو اسی دن رشتہ ختم ہو گیا تھا جب اس نے تجھ سے کورٹ میرج کر لی تھی۔ اب تو جانے اور تیرا کام۔ اور ہاں، تجھے یہاں روکے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تو بھی چلا جا یہاں سے۔ ڈاکوؤں کو پیسے دے یا نہ دے، مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔"

"سکندر صاحب! خدا کے لیے۔" فیصل گڑگڑانے لگا۔

"میں نے کہا نا جا یہاں سے۔" سکندر دہاڑا۔ "اب کسی سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

"پھر تو وہ اسے مار دیں گے۔"

"مار دیں۔ اس نے جیسا کیا ہے، اس کی سزا تو بھگتنی ہے نا۔"

سکندر کمرے سے باہر چلا گیا۔ دروازہ پہلے کی طرح بند نہیں کیا گیا تھا بلکہ کھلا رکھا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فیصل کو جانے کی آزادی تھی۔

سکندر دوسرے کمرے میں ایک آدمی سے کہہ رہا تھا۔ "میں نے اس کو جانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ وہ چلا جائے گا۔ لیکن تمہیں سائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہنا ہے۔"

"سرکار! کیوں نہ کوٹھی سے باہر نکلتے ہی اس کی کہانی ختم کر دی جائے۔" اس آدمی نے کہا۔

"نہیں، اس طرح پتا نہیں چلے گا کہ اس نے ستارہ کو کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ یہ ان دونوں کی سازش ہے۔ ستارہ کہیں چھپ گئی ہے۔ اس کنگال کے پاس پیسے تو ہیں نہیں تو دونوں نے اغوا کا ڈراما رچا کر مجھ سے رقم وصول کرنے کی سازش کی ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی سرکار! اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔"

"اب تم گیٹ سے باہر چلے جاؤ اور جیسے ہی وہ نکلے، اس کا پیچھا شروع کر دینا۔"

☆☆☆

ستارہ کو وہ دن یاد آ رہے تھے جب زندگی پُرسکون ہوا کرتی تھی۔

لیکن اب کہاں تھا سکون۔ ہر پل بھیانک موت یا شرمناک بے عزتی اس کی جانب بڑھتی آ رہی تھی۔ ان ڈاکوؤں کے تیور خطرناک ہوتے جا رہے تھے۔

اس کے ڈیڈ نے ابھی تک تاوان کی رقم دینے پر آمادگی ظاہر نہیں کی تھی۔ شاید وہ دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے شاید ستارہ سے اپنا رشتہ ہی ختم کر لیا تھا۔

بہت ہی وحشت ناک دن تھا۔ اسے جس کوٹھری میں رکھا گیا تھا، اس میں صرف ایک کھڑکی تھی اور کھڑکی کی دوسری طرف کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ وہ اس طرف سے کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔

شہزاد کو اس کی کوٹھری سے الگ شاید کسی اور کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ اسے کبھی کبھی ستارہ کے پاس اس لیے بھیجا جاتا کہ وہ ستارہ پر دباؤ ڈالے کہ وہ سکندر سے دس کروڑ کی بات کرتی رہے۔

اس شام جب شہزاد اس کی کوٹھری میں آیا تو بہت جھلایا ہوا تھا۔ "ستارہ! تمہارے ڈیڈ نے کیا لگا رکھا ہے۔ ان کے لیے دس کروڑ کی کیا حیثیت ہے۔ پھر وہ اتنی دیر کیوں کر رہے ہیں؟ کیوں ٹالتے جا رہے ہیں؟ کیا انہیں تمہاری زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

"اب یہ تو انہی سے جا کر پوچھو۔" ستارہ بھی چڑ گئی۔

"جانتی ہو اگر کل صبح تک پیسے نہیں ملے تو یہ ڈاکو ہم دونوں کو مار دیں گے۔" شہزاد نے بتایا۔

ستارہ پریشان ہو گئی۔ "تو پھر بتاؤ میں کیا کروں؟ کس طرح دباؤ ڈالوں؟"

"تم ایک بار پھر ان سے بات کرو۔"

"میں بات کر کے دیکھ چکی ہوں۔ اب کتنی بار بات کروں؟"

اسی وقت ڈاکوؤں کا سردار کوٹھری میں داخل ہوا۔ وہ بہت گہری نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی بندوق کو تھپتھپاتے ہوئے ستارہ سے کہا۔

تمہیں رکھ کر کیا کرنا ہے۔ چلی جانا اپنے گھر۔ رانا اتنا بُرا آدمی نہیں ہے۔"

جس لڑکی کے بال رانا کے ہاتھ کی گرفت میں تھے، وہ آہستہ آہستہ کھڑی ہو گئی۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں بہت پُرکشش تھیں۔

رانا اسے کھڑے ہوتے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ "واہ، تو تو ناچنے کے لیے تیار ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی رانا صاحب۔"

"وہ گھنگرو باندھ لے۔" رانا نے ایک طرف رکھے ہوئے گھنگروؤں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ لڑکی اس طرف بڑھی اور اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔ رانا کا چہرہ غصے سے بگڑ گیا۔ وہ دروازے کے پاس آ کر دہاڑا۔ "کون ہے کم بخت؟"

"سرکار! میں ہوں۔" دوسری طرف سے اس کے منیجر کی آواز سنائی دی۔

رانا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ کوئی خاص بات ہی ہو گی کہ اس کے منیجر نے دروازے پر دستک دینے کی ہمت کی تھی۔

اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ اس کا منیجر خوف زدہ سی صورت بنائے سامنے کھڑا تھا۔ "کیوں موت آ گئی تجھے؟ کیوں آیا ہے؟"

"سرکار! وہ غائب ہو گیا ہے۔" منیجر نے بتایا۔

"کون غائب ہو گیا ہے؟"

"مہاویر۔" منیجر نے بتایا۔ "میرے دونوں آدمی ناکام ہو کر واپس آ گئے ہیں۔ وہ جنگل والی کٹیا میں بھی نہیں ہے۔"

رانا کا نشہ ہرن ہونے لگا۔ "کہاں غائب ہو سکتا ہے؟"

"ہمیں تو نہیں معلوم سرکار۔" منیجر نے بتایا۔ پھر دبی زبان سے بولا۔ "سرکار! میرا مشورہ مانیں تو اس کو نہ چھیڑیں۔ وہ کسی اور دنیا کا بندہ ہے۔ سادھو، مہاراج وغیرہ ٹائپ کی چیز ہے۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ہو سکتے ہیں۔"

رانا مسکرا دیا۔ "بے وقوف انسان! گولیوں کے سامنے سب دھرا رہ جاتا ہے۔ جاؤ تلاش کرو اس کو۔ وہ جنگل میں ہی چھپا ہوا ہو گا۔ اتنی سی بات بتانے کے لیے میرے پاس دوڑے چلے آئے۔"

منیجر ادب سے سر جھکا کر واپس چلا گیا۔

رانا کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ اس نے منیجر سے تو کچھ اور کہا تھا لیکن مہاویر کی اس خبر نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

مہاویر پُراسرار طاقتوں کا انسان تھا۔ اس کا ایک مظاہرہ وہ خود بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ لڑکیاں کمرے میں موجود تھیں لیکن اب لڑکیوں کی طرف سے اس کا دھیان ختم ہو چکا تھا۔

☆☆☆

رات گہری ہو چلی تھی۔

جب ستارہ کو محسوس ہوا کہ کوئی خاموشی سے اس کی کوٹھری میں داخل ہوا ہے۔ فیصل کی موت کی خبر کے بعد وہ اپنے ہوش میں نہیں رہی تھی۔ اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس کے ظالم اور بے رحم باپ نے اس کی محبت چھین لی تھی۔ اس کا شوہر چھین لیا تھا۔ اگر وہ زندہ رہی تو وہ اپنے باپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔

لیکن اب اسے زندہ رہ کر کرنا ہی کیا تھا۔ اس کا محبوب، اس کا شوہر تو مارا جا چکا تھا۔ اس کا باپ اس کا دشمن تھا پھر اسے کیوں زندہ رہنا تھا؟ کس کے لیے زندہ رہنا تھا؟

اس کا ذہن سُن ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود اسے احساس تھا کہ کوئی خاموشی سے اس کی کوٹھری میں گھس آیا ہے اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اگرچہ روتے روتے اسے نیند آ گئی تھی۔ اس کے باوجود اس کی چھٹی حس نے اسے بیدار کر دیا تھا۔ کون ہو سکتا تھا؟ ڈاکوؤں کا سردار یا کوئی اور؟

آنے والا اس کے پاس آ گیا۔ اس نے ستارہ کے شانے پر ہاتھ رکھا تو ستارہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "کک... کون ہے؟" اس نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"میں ہوں شہزاد۔" شہزاد کی آواز سنائی دی۔

"شہزاد! تم اس وقت کیوں آئے؟ خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں، خیریت ہے۔ میں تو تمہیں حاصل کرنے آیا ہوں۔" شہزاد نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں بے وقوف نہیں ہوں کہ ساری زندگی تمہارے لیے تڑپتا رہوں... اور تم فیصل سے شادی کر کے بیٹھ جاؤ۔"

"شہزاد! کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ تم کیا بکواس کیے جا رہے ہو؟"

"سننا چاہتی ہو تو سنو کہ میں تمہیں پسند کرتا تھا۔" شہزاد نے کہا۔ "لیکن تم نے کبھی میری طرف دھیان نہیں



دیا۔ تمہیں فیصل کے ساتھ دیکھ کر میرے سینے پر سانپ لوٹتے تھے لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر تم نے فیصل سے شادی کر لی۔ اس وقت میرا جنون اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ میں نے قسم کھائی کہ تم چاہے کسی سے بھی شادی کرو، میں تمہارے اس خوب صورت جسم کو حاصل کر کے رہوں گا۔"

"خاموش۔" ستارہ غصے، دکھ اور حیرت سے کانپ رہی تھی۔

"دھیمی رہو میری جان۔" شہزاد کی ہنسی اس اندھیری کوٹھری میں گونج رہی تھی۔ "تم دونوں نے شادی کر لی اور میں نے تمہارے خلاف ایک سازش کی۔ ایک طرف تو تمہیں تمہارے ڈیڈی کی طرف سے بدگمان کر دیا اور دوسری طرف یہ کوشش کی کہ تم دونوں خوف زدہ ہو کر شہر چھوڑ جاؤ۔"

"ذلیل! کیا مطلب ہے تیرا، کیا کیا تو نے؟"

"شہر میں تم پر جتنے بھی حملے ہوئے، وہ سب میں نے کرائے تھے۔" شہزاد نے بتایا۔ "وہ میرے آدمی تھے۔ تمہارے ڈیڈ کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اسی لیے اتنے حملوں کے باوجود تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ تم صرف خوف زدہ ہوتے چلے گئے اور یہی میرا مقصد تھا کہ تم لوگ خوف زدہ ہو کر شہر سے بھاگ لو۔ میں فیصل کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ میرے لیے بہت آسان ہوتا کہ میرے آدمی اسے گولی مار دیتے۔ تم بیوہ ہو جاتیں اور میں تمہاری ہمدردی حاصل کر کے تم سے شادی کر لیتا۔ تم اپنے ڈیڈ کی طرف بھی نہیں جا سکتی تھیں کیونکہ پلاننگ کے تحت میں تمہیں ان سے بدگمان تو کر ہی چکا تھا۔"

"میرے خدا! اتنی بڑی سازش۔" ستارہ غصے سے بولی۔

"میں نے محبت کی ہے میری جان... جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔" شہزاد نے ستارہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "اب تم میری ہو۔ آج کی رات ہماری ہے۔ یہاں تمہارا چیخنا چلانا بالکل بیکار ہو جائے گا کیونکہ ان ڈاکوؤں کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ میں تم سے کیا سلوک کر رہا ہوں۔"

اس اندھیرے میں شہزاد کو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ستارہ کا ہاتھ رینگتے ہوئے لوہے کے اس وزنی لوٹے کو گرفت میں لے چکا ہے جو ستارہ کے پاس ہی رکھا رہتا تھا۔

"بس اب تم نخرے ختم کرو اور میری ہو جاؤ۔" شہزاد نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی ستارہ کا ہاتھ ایک جھٹکے سے بلند ہوا اور اس نے وہ وزنی لوٹا پوری قوت کے ساتھ شہزاد کے سر پر دے مارا۔

شہزاد ایک مکروہ چیخ کے ساتھ ساکت ہو گیا۔

ستارہ کے پاس اب وقت نہیں تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جس کے باہر ایک راستہ تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے بھرا ہوا سہی، لیکن راستہ تو تھا۔

☆☆☆

رانا وہ رانا نہیں تھا جو خود کو ظاہر کرتا تھا۔

اس کے دو روپ تھے۔ ایک روپ زنانہ انداز میں باتیں کرنے اور رقص کرنے والا۔ جو یہ ثابت کر سکتا تھا کہ عورتوں کے معاملے میں وہ ایک بے ضرر قسم کا انسان ہے۔ وہ مکمل مرد ہی نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے شادی نہیں کی جبکہ اس کا دوسرا روپ کچھ اور تھا۔

وہ عورتوں کے لیے بھیڑیا تھا۔ انہیں نوچ کر رکھ دیا کرتا اور جب کوئی عورت اس کے چنگل سے کسی طرح نکل کر فریاد کرتی تو کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ رانا تو ایک بے ضرر قسم کا آدمی ہے۔

اس زنانے روپ نے اسے بہت فائدہ پہنچایا تھا۔ شہر میں بھی اور گاؤں میں بھی۔ خواتین بے جھجک اس کے پاس آ جایا کرتیں اور وہ انہیں برباد کر دیتا۔

اس راز سے صرف اس کا منیجر واقف تھا جس کو ہر ماہ بہت معقول تنخواہ ملا کرتی۔ وہ رانا کو عورتوں کے حصول کے مختلف راستے بھی بتایا کرتا کیونکہ بعد میں وہی عورتیں رانا سے برباد ہو کر اس کے حصے میں آ جایا کرتیں۔

نہ جانے کتنے برسوں سے یہ گھناؤنا کھیل جاری تھا کہ اس بستی میں مہاویر نام کا ایک مہاراج آ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ رانا کسی سے خوف زدہ ہوا تھا۔

اس نے کچھ لوگوں سے مہاویر کی پُراسرار طاقتوں کے بارے میں سن رکھا تھا۔ ایک دو بار مہاویر سے اس کا آمنا سامنا ہو چکا تھا۔ اسی وقت مہاویر کی نگاہیں اسے اپنے بدن میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں جیسے وہ اس کے اندر ٹٹول کر دیکھ رہا ہو۔

اور ایک بار یہاں پر اچانک اس کے کمرے میں نمودار ہو گیا تھا... جبکہ وہ اس طرح آیا تھا کہ کسی کو اس کے آنے جانے کی خبر بھی نہیں ہو سکی تھی۔

وہ دبے لفظوں میں رانا کو تنبیہ کر گیا تھا۔ اس کے بعد ہی رانا نے اس کا قصہ ختم کرنے کے لیے کچھ لوگ اس کے پیچھے لگا دیے تھے لیکن وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

رانا نے منیجر کے سامنے تو بے پروائی کا مظاہرہ کیا تھا

لیکن اس کے اندر بہت توڑ پھوڑ ہو چکی تھی۔ رانا کے لیے اب یہی راستہ تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے شہر منتقل ہو جائے۔

اس نے اپنے منیجر کو ہدایت کی کہ وہ گاؤں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ منیجر اس کے اس طرح چلے جانے کے فیصلے سے پریشان ہو گیا۔ ”سرکار! آپ تو چلے جائیں گے لیکن یہاں کا کیا ہوگا؟“

”دیکھو، اگر وہ مہادیو کچھ بگاڑنے کی قوت رکھتا ہے تو وہ مجھے نقصان پہنچائے گا... تمہارا کیا ہوتا ہے۔“

”سرکار! ان چاروں لڑکیوں کا کیا کیا جائے؟“ منیجر نے پوچھا۔

”وہی جو اب تک لڑکیوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔“ رانا نے کہا۔

ان لڑکیوں کو ٹھکانے لگانے کے دو طریقے تھے۔ جب رانا کا دل ان سے بھر جاتا تو ان کو یا تو دوسرے شہروں میں فروخت کر دیا جاتا یا ٹھکانے لگا دیا جاتا۔

منیجر کو ان دونوں کاموں میں اچھی خاصی مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ اب رانا کی طرف سے ہدایت مل چکی تھی کہ ان چاروں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو پہلے والی لڑکیوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ چاروں لڑکیاں دس بارہ دنوں کے لیے اس کے تصرف میں آسکتی تھیں۔

رانا شہر کی طرف جانے کے لیے اپنی شاندار گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ منیجر مودب کھڑا تھا کہ اسی وقت منیجر کا ایک آدمی دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور منیجر کے کان میں سرگوشی کی۔

منیجر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”کیا بات ہے؟“ رانا نے پوچھا۔

”سرکار! یہ آدمی بتا رہا ہے کہ وہ چاروں لڑکیاں کہیں غائب ہو چکی ہیں۔“

”کیا؟“ رانا گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا۔ ”کہاں جا سکتی ہیں۔ تلاش کرو ورنہ... اور ہاں، میں بھی اب شہر نہیں جا رہا۔ اگر ان لڑکیوں کے غائب ہونے میں مہادیو کا ہاتھ ہے تو ہمیں پہلے اس خطرے کو دور کرنا ہوگا۔“

☆☆☆

ستارہ کا پورا بدن جیسے زخمی ہو گیا تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں نے اسے پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس نے کھڑکی کے باہر چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرف صرف کانٹے دار جھاڑیاں ہیں جن کا سلسلہ نہ جانے کتنی دور تک چلا گیا ہے۔ اسی لیے ڈاکوؤں نے اس طرف پہرے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس طرف سے کوئی فرار ہونے کی ہمت نہیں کرے گا۔

لیکن وہ بھاگ نکلی تھی۔ صرف اس لیے کہ اس کی عزت خطرے میں تھی اور یہ خطرہ شہزاد کی طرف سے تھا۔ وہ شہزاد جس پر فیصل اور ستارہ دونوں ہی بھروسا کرتے تھے۔ جس کے لیے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ چل سکتی تھی۔ جس نے خود کورٹ جا کر فیصل اور ستارہ کی شادی کرائی تھی۔

وہی شخص اس کی عزت کا طلب گار ہو گیا تھا۔ ایک تو فیصل کی موت کی خبر نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا، دوسری طرف یہ شہزاد۔

زندگی اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی تھی اور اسی بے معنی شے کو بچانے کے لیے وہ کانٹوں بھری جھاڑیوں کے درمیان دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی عزت بھی خطرے میں تھی اور اس کے نزدیک زندگی عزت سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔

رات بہت گہری تھی۔

بہت بھیانک۔ اور یہ جنگل نہ جانے کیسا تھا جس میں صرف کانٹے دار جھاڑیاں ہی اگی ہوئی تھیں۔ اس کا بدن لہولہان ہو رہا تھا لیکن وہ دوڑتے رہنے پر مجبور تھی۔

کسی نہ کسی طرف تو اسے نکلنا ہی تھا۔

وہ کئی بار لڑکھڑا کر رکی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہر دم یہی اندیشہ تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہوگا۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ شہزاد زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے۔

ستارہ نے پوری قوت سے اس کے سر پر وار کیا تھا۔ کم از کم وہ بری طرح زخمی تو ضرور ہو گیا تھا۔

ایک بار پھر وہ کسی چیز سے الجھ کر گری۔ ایک کربناک اور تکلیف دہ چیخ کے ساتھ اور اسی وقت کسی نے اسے تھام لیا۔ کوئی تھا جس نے اندھیرے میں اسے پکڑ لیا تھا۔

خوف نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ اس جدوجہد کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ وہ کہاں تک بھاگ سکتی تھی۔ تعاقب کرنے والے بہرحال اس تک پہنچ ہی گئے تھے۔

لیکن اسے ہاتھ سے پکڑنے والے کا لمس سخت نہیں تھا بلکہ وہ بہت نرمی اور ہمدردی کے ساتھ سہارا دے کر اسے اٹھا رہا تھا۔ ”شاباش اٹھ جاؤ۔“ کسی نے کہا۔ ”تم شاید زخمی بھی ہو۔“

یہ شخص ان بے رحم لوگوں میں سے تو نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کوئی اور ہی تھا جس کا لہجہ بہت نرم تھا۔ اس نے ستارہ کو کھڑا کر دیا تھا۔ ستارہ ٹھیک سے کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔





”میں چل نہیں سکتی۔“ ستارہ نے بتایا۔ ”میں بہت زخمی ہوں۔“

”اوہ۔“ اٹھانے والے نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم دو منٹ یہیں کھڑی رہو۔ صرف دو منٹ۔ گھبراؤ نہیں۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

شاید وہ اندھیرے ہی میں کسی طرف چلا گیا۔ وہ ستارہ کے لیے اجنبی تھا۔ گھپ اندھیرے میں وہ ٹھیک سے اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکی تھی۔ اس کے باوجود اسے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ ایک طرح کا اطمینان ہو رہا تھا۔

وہ اسی جگہ کھڑی رہی۔ کچھ دیر بعد لالٹین کی روشنی دکھائی دی۔ اس روشنی میں اس نے تین چار لڑکیوں یا عورتوں کو دیکھا جو اس کے پاس آکر رک گئی تھیں۔

وہ لالٹین کی روشنی میں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”اوہ، یہ تو بہت بری طرح زخمی ہے۔“ ایک نے بتایا۔

”چلو بے چاری کو سہارا دے کر لے چلو۔“

دو عورتوں نے اسے سہارا دیا اور اسی وقت ستارہ کی ہمت نے جواب دے دیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

جب بہت دیر تک کوٹھری کا دروازہ نہیں کھلا اور دستک دینے والے دستکیں دے دے کر تھک گئے تو ڈاکوؤں کے سردار نے دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔

ذرا سی دیر میں دروازہ توڑ دیا گیا۔

شہزاد ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ خون بہہ بہہ کر اس کے چہرے پر جم چکا تھا جبکہ کمرے میں قید لڑکی غائب ہو چکی تھی۔

”کہاں چلی گئی وہ؟“ سردار دہاڑا۔ ”اس کو دیکھو۔ یہ کہیں مر تو نہیں گیا؟“

”نہیں سردار! یہ ابھی زندہ ہے۔“ شہزاد کا معائنہ کرنے والے نے بتایا۔ ”صرف بے ہوش ہوا ہے۔“

”اس کی مرہم پٹی کر کے ہوش میں لاؤ اور میرے پاس لے آؤ۔“

سردار آرڈر دے کر اپنے اڈے پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے ستارہ کی تلاش میں اپنے آدمی دوڑا دیے تھے۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کھڑکی کے راستے فرار ہوئی ہوگی۔

لیکن دوسری طرف جھاڑیوں والے راستے تھے۔ انتہائی خطرناک کانٹے دار جھاڑیاں۔ شاید وہ زیادہ دور نہ جا سکی ہو۔ شاید راستے میں کہیں زخمی حالت میں مل جائے۔

اس کے دو ساتھی زخمی شہزاد کو سہارا دے کر اس کے پاس لے آئے تھے۔ وہ پوری طرح ہوش میں تھا۔ اس کے سر پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔

”ہاں اب بتا، کیا ہوا تھا تیرے ساتھ؟“ سردار نے شہزاد سے پوچھا۔

”سردار! اس کم بخت نے دھوکے سے مجھ پر حملہ کر کے بے ہوش کر دیا تھا۔“ شہزاد نے بتایا۔

”اور تو اتنا نازک ہے کہ وہ تجھے بے ہوش کر کے بھاگ گئی؟“

”سردار! میں نے بتایا نا کہ یہ حملہ اندھیرے میں ہوا تھا۔“ شہزاد نے کہا۔ ”میں تو خود اس کی وجہ سے پریشان ہوں۔ وہ کہاں جا سکتی ہے۔ اگر وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی اور اس نے اپنے باپ کو ساری کہانی سنا دی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”اور اگر وہ نہیں ملی تو پھر میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔“ سردار نے کہا۔

شہزاد سہم کر رہ گیا۔ ”سردار! خود سوچ، اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ اس نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ ”اس نے تو مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔“

”کیوں کیا تھا بے ہوش؟ لگتا ہے تو نے اس کے ساتھ کوئی الٹی سیدھی حرکت کی ہوگی۔ اسی لیے وہ تجھ سے اپنی جان بچا کر بھاگی ہے۔“

شہزاد نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن اس وقت سردار کا غصہ اپنے عروج پر تھا اور اسی وقت اس کے آدمیوں نے واپس آکر یہ خبر بھی سنا دی کہ بھاگنے والی کا کوئی پتا نہیں چل سکا ہے۔

سردار نے اپنے آدمیوں سے شہزاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لے جا کر بند کر دو اس کو۔ اب میں دس کروڑ خود اس سے وصول کروں گا۔“

☆☆☆

ستارہ کو جب ہوش آیا تو وہ کسی کٹیا یا جھونپڑی میں تھی۔

اس کے پورے جسم پر مرہم نما کسی چیز کا لیپ لگا دیا گیا تھا۔ کانٹوں کی سوزش اب نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔

اس کے پاس دو لڑکیاں بھی تھیں جو بہت ہمدردانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ستارہ نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایک لڑکی بول پڑی۔ ”ابھی نہیں، ابھی اسی طرح لیٹی رہو۔ تمہارا بہت خون ضائع ہوا ہے۔ کمزور ہو گئی ہو تم۔“

"لیکن میں ہوں کہاں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟" ستارہ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"مہاراج مہاویر تمہیں اپنی کٹیا میں لے آئے ہیں۔" اسی لڑکی نے بتایا۔ "تم ان کو جنگل میں ملی تھیں۔"
"ہاں۔" ستارہ نے ایک گہری سانس لی۔ "میں اپنی عزت اور جان بچانے کے لیے بھاگ نکلی تھی۔"
"نام کیا ہے تمہارا؟" اسی لڑکی نے پوچھا۔
"ستارہ... اور تم؟"
"پدمنی۔" اس نے بتایا۔ "اور یہ سلمٰی ہے۔" اس نے دوسری کی طرف اشارہ کیا۔ "دو اور ہیں۔ فریحہ اور اسما۔"
ستارہ اٹھ بیٹھی۔ "لیکن تم لوگ ہو کون؟ اور یہ جگہ کون سی ہے؟" اس نے پوچھا۔
ایک طرف سے جو شخص داخل ہوا، ستارہ اسے دیکھ کر چونک اٹھی۔ وہ کوئی ہندو جوگی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک بے نیازی اور سکون کی کیفیت تھی۔
ستارہ کے پاس بیٹھی ہوئی دونوں لڑکیاں آنے والے کو دیکھ کر مؤدب ہو گئی تھیں۔ "یہ ہیں مہاراج مہاویر۔" پدمنی نے بتایا۔ "یہی تمہیں جنگل سے لے کر آئے تھے اور ہمیں بھی انہوں نے پناہ دی ہے۔"
مہاویر ستارہ کے پاس آ گیا تھا۔ "بیٹی! ویسے تو تمہارا دکھ اور تمہاری کہانی تمہارے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ لیکن وہ کون مورکھ ہے جس کے خوف سے تم اس جنگل میں بھاگ رہی تھیں؟"
مہاویر کا لہجہ اتنا نرم اور اتنا محبت سے بھرا ہوا تھا کہ ستارہ نے رونا شروع کر دیا۔ مہاویر نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ نرمی سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔
اس نے ستارہ کی بھڑاس نکل جانے دی تھی۔ ستارہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے ہچکیوں کے درمیان اپنی پوری کہانی سنا دی۔ اس نے مہاویر سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ فیصل سے کورٹ میرج، پھر قاتلانہ حملے اور شہر سے فرار ہو کر رانا کی حویلی میں پناہ۔ وہاں سے شہزاد کے ہمراہ شہر کی طرف روانگی۔ راستے میں ڈاکوؤں کا ملنا، اس کی قید، پھر شہزاد کا اس پر مجرمانہ حملے کرنے کی کوشش... پھر ستارہ کا فرار۔ اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔
مہاویر اس کی کہانی سن کر بہت دیر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے ستارہ کی طرف دیکھا۔ "بہت ناانصافی ہو چکی، بہت ظلم ہو چکا... بھگوان جانے انسان کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے عورت کو کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ ہر طرف دوہرے چہروں کے لوگ، منافق۔ بیٹی! تم جانتی ہو، تم جانتی ہو تم جس رانا کی بات کر رہی ہو، یہ لڑکیاں اسی کی قید میں تھیں۔ میں انہیں اس شیطان کی قید سے نکال کر لایا ہوں۔"
"مہاراج... وہ... وہ... تو...؟" ستارہ نے کچھ کہنا چاہا۔
"نہیں، اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔" مہاویر نے بتایا۔ "وہ ایک مکمل اور وحشی مرد ہے۔ اس نے زنانے پن کا روپ دھار رکھا ہے تاکہ اس پر کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔"
"او خدا! وہ ایسا آدمی ہے۔" ستارہ کانپ گئی۔
"ہاں، مہاراج ٹھیک کہہ رہے ہیں ستارہ۔" ایک لڑکی نے کہا جس کا نام سلمٰی تھا۔ "میں بھی اسی شیطان کی قید میں تھی۔ وہ کم بخت اپنے اس بہروپ کے ذریعے نہ جانے کتنی لڑکیوں کو تباہ کر چکا ہے۔"
"اب تم بتاؤ، تم نے کیا سوچا ہے؟" مہاویر نے ستارہ سے پوچھا۔ "ویسے ابھی رانا جیسے لوگوں کا حساب باقی ہے۔ میں حساب کر چکا ہوتا لیکن وہ شہر فرار ہو گیا ہے۔"
"مہاراج! وہ ایک پیسے والا آدمی ہے۔" ستارہ نے کہا۔ "اس کے تعلقات بھی ہوں گے۔ پھر اس کے بے شمار ملازم ہیں جو اس کے ایک اشارے پر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں گے۔ اس لیے آپ اس کی مخالفت نہ لیں۔ وہ آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔"
"تم ٹھیک کہتی ہو، وہ نقصان پہنچا سکتا ہے لیکن میں بھی کمزور نہیں ہوں۔" مہاویر نے کہا۔ "میرے پاس بھی بہت بڑی طاقت ہے۔ یہ طاقت نیکی اور سچائی کی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں کوئی بہت بڑا اوتار ہوں۔ نہیں، میں بھی ایک عام سا انسان ہوں۔ لیکن میں نے سچ اور نیکی کے ہاتھ تھام لیے ہیں۔ یہ دونوں طاقتیں ہر وقت میرا ساتھ دیتی رہی ہیں۔ اس جنگ میں بھی مجھے انہی ہتھیاروں سے کام لینا ہے۔ برائی ہمیشہ بھاگ جانے کے لیے ہوتی ہے۔ جس طرح رانا بھاگ گیا ہے جس طرح وہ ڈاکو اور تمہارا وہ شہزاد بھاگ جائے گا۔ کیونکہ وہ برائیوں کی ریتیلی زمین پر کھڑے ہیں جو آہستہ آہستہ ان کے پیروں کے نیچے سے کھسکتی جا رہی ہے۔"
"مہاراج!" ستارہ ایک عزم کے ساتھ بولی۔ "میں اگرچہ ایک کمزور اور مجبور سی لڑکی ہوں لیکن اگر یہ کوئی جنگ ہے تو اجازت دیں۔ میں اس جنگ میں آپ کا ساتھ دینا چاہتی ہوں۔"



مہاویر کے ہونٹوں پر ایک شفقت بھری مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "کیوں نہیں، ہم میں سے ہر ایک کو یہ جنگ لڑنا چاہیے۔"
"اب آپ یہ بتائیں کہ میں اس جنگ کی ابتدا کہاں سے کروں؟" ستارہ نے پوچھا۔
"رانا کی حویلی سے۔" مہاویر نے بتایا۔
"کیا؟" ستارہ حیران رہ گئی۔ "رانا کی حویلی؟"
"ہاں، اسی مکار آدمی کی حویلی سے۔" مہاویر نے کہا۔ "سچائی اور بھلائی کی جنگ میں کبھی کبھی ایسی چال بھی چلنی ہوتی ہے جو دشمن چل رہا ہو۔ تم اسے جنگی حکمت عملی کہہ سکتی ہو۔ تم وہاں پہنچ جاؤ۔ میں بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔"

☆☆☆

ستارہ آنسوؤں کے درمیان اپنی کہانی سنا رہی تھی۔
"رانا صاحب! آپ کی پناہ، آپ کی حویلی میرے لیے بہت کچھ تھی۔ آپ کے سامنے وہ شہزاد ڈیڈ سے معافی دلوانے مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ آپ تو جانتے ہیں نا؟"
"ہاں ہاں۔" رانا تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔ "ارے، وہ تو ایک نمبر کا چھچھورا لگ رہا تھا۔ لیکن میں کیسے روکتا۔ تم اس کے ساتھ چلی گئیں اور تمہارا شوہر یہیں رہ گیا۔"
"بس رانا صاحب! یہی ہوا میرے ساتھ۔" ستارہ نے کہا۔ "میں اس کے ساتھ جا رہی تھی کہ ہماری گاڑی کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ انہوں نے ہمیں قید کر دیا۔ ان کا مطالبہ دس کروڑ کا تھا۔ میں نے ڈیڈی سے بھی بات کی لیکن ڈیڈی نے رقم دینے سے انکار کر دیا۔ پھر شہزاد نے بتایا کہ میرے شوہر فیصل اب اس دنیا میں نہیں رہے۔"
"ہائے، وہ بے چارہ تو کچھ دنوں کے بعد ہی تمہارے ڈیڈ سکندر سے ملنے کے لیے یہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ اس بے چارے کی موت اسے کھینچ کر لے جا رہی ہے۔"
"کل رات مجھے موقع مل گیا اور میں ڈاکوؤں کی قید سے بھاگ نکلی۔" ستارہ نے بتایا۔
اس نے بہت کچھ چھپا لیا تھا۔ شہزاد کی حرکت پھر مہاویر کا ملنا اور اس کو اپنے ساتھ لے جانا۔ یہ سب اس نے مہاویر کے کہنے پر رانا سے چھپا لیا تھا۔
رانا بہت گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مہاویر کے خوف سے شہر چلا گیا تھا لیکن جب اس کے آدمی اسے مسلسل یہی بتاتے رہے کہ مہاویر ان علاقوں میں کہیں دکھائی نہیں دے رہا، وہ شاید کہیں اور چلا گیا ہے تو پھر مہاویر کی طرف سے مطمئن ہو کر رانا اپنی حویلی واپس آ گیا تھا۔
واپس آتے ہی ستارہ کی صورت میں ایک خوب صورت اور شاندار تحفہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح خود ہی اس کے سامنے آ گرا تھا۔ جس وقت اس نے پہلی بار اس لڑکی کو دیکھا تھا، اسی وقت اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکی کو بھی اپنے تہ خانے کی سیر ضرور کرائے گا۔
لیکن اس سے پہلے کہ اس کی پلاننگ کامیاب ہو سکتی، وہ لڑکی شہر جا چکی تھی۔ اپنے شوہر کو چھوڑ کر، اپنے باپ کے پاس۔
رانا افسوس ہی کرتا رہ گیا تھا۔ لیکن اب وہ دوبارہ اس کے پاس آ گئی تھی۔ اب اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ نہ اس کا شوہر اور نہ ہی وہ دوست۔ وہ اکیلی تھی۔
"رانا صاحب! اب بتائیں میں کیا کروں؟" ستارہ نے پوچھا۔ "میں کہاں جاؤں... کس کے پاس جاؤں؟"
"کوئی بات نہیں۔" رانا نے کہا۔ "یہ بہت اچھا ہوا کہ تم میرے پاس آ گئی ہو۔ ارے، وہ تمہارا باپ میرے سامنے چوں بھی نہیں کر سکتا۔ تم دو چار دن یہیں رہو۔ رانا خود تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔"
"آپ کی بڑی مہربانی ہو گی رانا صاحب۔"
"بس اب تم آرام کرو۔ اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
رانا کے جانے کے بعد ایک ملازمہ اس کے لیے کھانا لے کر آ گئی۔ اس نے ٹرے ایک طرف رکھ کر ستارہ سے کہا۔ "بی بی! ہو سکتا ہے کہ آپ آج رات ہی اس کمرے سے غائب ہو جاؤ۔"
"ہاں، مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" ستارہ نے کہا۔ "لیکن تم تو چوکس ہو نا۔"
"جی ہاں، آپ فکر نہ کریں۔ میں پوری طرح چوکس ہوں۔" ملازمہ دانت پیس کر بولی۔ "اس خبیث رانا کو جہنم تک پہنچانے کے لیے میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔"
"لگتا ہے تمہیں اس سے بہت نفرت ہے؟" ستارہ نے پوچھا۔
"بہت زیادہ۔ اگر میرا بس چلے تو تڑپا تڑپا کر ماروں۔" ملازمہ نے کہا۔ "اس بدبخت نے میری پھول جیسی بیٹی کو برباد کر کے رکھ دیا۔ وہ اس پورے علاقے کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔ نہ جانے کس طرح رانا کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس نے راتوں رات اپنے آدمیوں کے ذریعے

اس معصوم کو اٹھوالیا اور اپنے شیطانی تہ خانے میں پہنچا دیا۔ جہاں اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا۔ پھر کسی طرح وہ بھاگ نکلی۔ اس نے واپس آکر گاؤں والوں کو رانا کے بارے میں بتا دیا۔ لیکن کیا ہوا، کچھ بھی نہیں۔ کسی کو بھی رانا کے بارے میں یقین نہیں آیا۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ رانا ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ وہ بے چارہ تو مرد ہی نہیں ہے۔"

ستارہ حیرت اور دکھ کے تاثرات کے ساتھ اس عورت کی باتیں سن رہی تھی جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"بی بی! اس پورے علاقے میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو رانا کے خلاف جائے۔" وہ بتا رہی تھی۔ "سب اس سے ڈرتے ہیں۔ فرض کریں اگر رانا کی سچائی کا پتا بھی چل جائے تو بھی کیا ہوگا؟ کچھ نہیں۔ کون اس کا کیا بگاڑ سکے گا؟ ہم بہت غریب لوگ ہیں۔ ہماری کوئی شنوائی نہیں ہے۔ ہمیں سہارا دینے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر یہ سوامی ہمارے درمیان آگئے اور ہم مظلوموں نے ان کا دامن تھام لیا۔"

"کیا گاؤں کے دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ ہیں؟" ستارہ نے پوچھا۔

"ہاں، سب ہی ان کے ساتھ ہیں۔" اس نے بتایا۔ "کیا ہندو کیا مسلمان؟ سب ہی ان کی عزت کرتے ہیں۔ ان کا احترام کرتے ہیں۔ مہاویر صاحب جس دن پہلی بار اس حویلی میں آئے اور رانا کو تنبیہ کر کے چلے گئے اس دن سب نے مہاویر صاحب کے لیے رانا کو یہ بتایا کہ وہ تو حویلی میں آئے ہی نہیں تھے۔"

"کیوں، اس سے کیا فائدہ ہوا؟" ستارہ نے پوچھا۔

"اس سے یہ ہوا کہ رانا ان کے رعب میں آگیا۔" اس نے بتایا۔ "وہ یہ سمجھنے لگا کہ مہاویر صاحب کے پاس پُراسرار قوتیں ہیں۔ اسی لیے وہ کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر اس کے کمرے میں پہنچ گئے تھے جبکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس دن سے رانا ان سے ڈرنے لگا ہے اور ہم سب کو رانا کے اسی خوف سے فائدہ اٹھانا ہے۔"

ستارہ سوچنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے اس عورت کی طرف دیکھا۔ "میں بھی مہاویر صاحب کے ساتھ یہی سوچ کر شامل ہوئی ہوں کہ اب میری زندگی میں اس کے سوا کچھ نہیں رہ گیا ہے۔"

☆☆☆

اس جنگل میں ایک اور دوڑ ہو رہی تھی۔

اس بار شہزاد بھاگ رہا تھا اور اس کے پیچھے ڈاکو تھے جو ہر حال میں اسے پکڑنا چاہتے تھے۔ یہ وقت بھی دن کا تھا اس لیے شہزاد اپنی جان بچانے کے لیے ادھر اُدھر چھپ بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ کئی ڈاکو تھے اور اسے ہر حال میں زندہ پکڑ لینا چاہتے تھے۔ ورنہ ان کے لیے شہزاد کو مار گرانا کوئی مشکل نہیں تھا۔

وہ ہر وقت ان کی بندوقوں کے نشانوں کی زد پر تھا۔ اس کے باوجود وہ اس پر گولیاں نہیں چلا رہے تھے۔ سردار کا حکم تھا کہ اسے ہر قیمت پر زندہ پکڑا جائے۔

آخرکار شہزاد ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گرا اور ڈاکوؤں نے اسے جھاپ لیا۔

بے پناہ خوف نے اس کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ ڈاکو اسے دھکے دیتے ہوئے دوبارہ اپنے اڈے پر لے آئے۔

سردار کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ "تو نے بھاگنے کی ہمت کس طرح کی؟" اس نے گرجتے ہوئے پوچھا۔

"سردار! میں کیا کرتا؟" شہزاد باقاعدہ رونے لگا۔ "میں کس طرح تمہارے عتاب سے بچتا۔ اس لڑکی کا باپ میرے لیے تو دس کروڑ نہیں دے گا۔ میرا اس سے واسطہ ہی کیا ہے اور وہ لڑکی بھی اب قبضے میں نہیں رہی۔ وہ بھی بھاگ چکی ہے۔ اسی لیے سردار... خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"کیا تو نے اس لڑکی کے باپ کو بتا دیا ہے کہ وہ اب ہمارے قبضے میں نہیں ہے؟"

"نہیں سردار! میں کس طرح بتا سکتا ہوں۔" شہزاد نے کہا۔ "میرے پاس تو کوئی موبائل بھی نہیں ہے۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔" سردار مسکرا دیا۔ "اس کے باپ کو پھر پیسوں کے لیے فون کر کے بتاؤ کہ ڈاکوؤں نے اب اس کی بیٹی پر تشدد شروع کر دیا ہے۔ وہ اس وقت بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ اگر رقم نہیں ملی تو وہ اسے جان سے بھی مار سکتے ہیں۔"

"کیا وہ اس بات پر یقین کرے گا؟"

"اسے یقین کرنا ہی پڑے گا اور یہ یقین تم دلاؤ گے۔ یہ لو موبائل۔" سردار نے ایک موبائل اس کی طرف اچھال دیا۔

شہزاد نے دھڑکتے دل کے ساتھ سکندر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سکندر ہی نے کال ریسیو کی۔ "ہاں کہو، کیا بات ہے؟"



شہزاد نے وہی سب کچھ دہرا دیا جو سردار نے اسے بتایا تھا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اس نے موبائل آف کرتے ہوئے سردار کی طرف دیکھا۔ اس بار اس کا لہجہ بہت پُرجوش ہو رہا تھا۔ "سردار! ستارہ کا باپ ہمیں دس کروڑ دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔"

"بہت خوب۔" سردار بھی خوش ہو گیا۔ "کب دے رہا ہے؟"

"کل شام کو۔" شہزاد نے بتایا۔ "اس نے کہا ہے کہ پیسے کہاں پہنچانے ہیں، جگہ بتا دو۔"

"جگہ کل شام ہی کو بتاؤں گا۔" سردار نے کہا۔

"ویسے سردار! کیا وہ اپنی بیٹی کی طرف سے اطمینان کیے بغیر اتنی بڑی رقم دے دے گا؟"

"تو اس کی فکر مت کر۔ یہ میرا کام ہے۔ بس ایک بار وہ پیسے لے کر آجائے پھر دیکھ لیں گے۔"

☆☆☆

ستارہ اور رانا ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

ستارہ بُری طرح خوف زدہ بھی تھی اور اسے امید بھی تھی کہ مہاویر اور اس کے ماننے والے عین وقت پر آکر اسے بچا لیں گے۔

سب کچھ وہی ہوا جس کے بارے میں اندیشہ تھا۔

ستارہ کو اسی رات اس کے کمرے سے غائب کر کے تہ خانے میں پہنچا دیا گیا تھا اور اب رانا اپنے اصل روپ میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا زنانہ پن نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ اب وہ ایک مختلف انسان تھا۔ مختلف اور بھیانک۔

"یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟" ستارہ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے خاص کمرے میں۔" رانا ہنستے ہوئے بولا۔ "پریشان مت ہو، تمہیں واپس کر دوں گا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی ناکارہ آدمی ہوں۔ نہیں بلکہ میں سیکڑوں مردوں کے برابر ہوں۔"

"بکواس مت کرو ذلیل انسان! جانے دو مجھے۔"

"اونہوں جو یہاں آجائے وہ واپس نہیں جاتی۔" رانا نے ... "تم کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اور جب تم کہو گی، تمہارے ڈیڈی کے پاس تمہیں پہنچا دوں گا۔"

"میں کہتی ہوں جانے دو مجھے۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" رانا ہنس پڑا۔ "جو یہاں آگیا، وہ آگیا۔"

ستارہ نے ایک طرف دوڑ لگانے کی کوشش کی لیکن رانا نے جست لگا کر اسے دبوچ لیا۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ ستارہ پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ رانا نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

اسی وقت کمرے کے ایک کونے سے آواز آئی۔

"رک جاؤ بدمعاش۔"

یہ آواز مہاویر کی تھی جو نہ جانے کس طرح اس کمرے میں نمودار ہو گیا تھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔

ستارہ نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا تھا۔ وہ اس کا باپ تھا سکندر! اور دوسرے شاید پولیس والے اور اس علاقے کے لوگ تھے۔

رانا بُری طرح بوکھلا گیا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے؟ کون ہو تم لوگ؟ میرے کمرے میں کیسے آگئے؟"

"رانا! تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔" مہاویر نے کہا۔ "تمہارے دونوں روپ اب ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ گاؤں کی بہت سی لڑکیاں یہ جان کر خوش ہوں گی کہ تم اپنے انجام کو پہنچ گئے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" رانا دہاڑا۔ "میں رانا ہوں، اس گاؤں کا مالک۔ تم لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"رانا صاحب! ہم تمہارے لیے ہتھکڑیاں لے کر آئے ہیں۔" ایک پولیس آفیسر نے آگے آکر کہا۔ "شرافت سے خود کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"مر گئے رانا کو لے جانے والے۔" رانا نے اچانک اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔

لیکن گولی چلانے کی حسرت ہی رہ گئی۔ سکندر نے پھرتی کے ساتھ اپنا پستول نکال کر رانا کو نشانہ بنا لیا۔ اس کی چلائی ہوئی دونوں گولیاں رانا کے سینے پر لگیں۔ وہ ایک مکروہ چیخ کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔

ستارہ دوڑتی ہوئی سکندر کے سینے سے جا لگی۔

☆☆☆

ستارہ نے مہاویر کو اپنی پوری کہانی سنا دی تھی۔

اپنے ڈیڈ سکندر کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ستارہ کو رانا کی حویلی میں پہنچانے کے ساتھ ہی مہاویر نے سکندر سے رابطہ کر کے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔

سکندر کو اطمینان ہو گیا تھا کہ ستارہ اب ڈاکوؤں کی قید میں نہیں ہے۔ جس وقت اسے شہزاد کا فون موصول ہوا، اس وقت سکندر اور مہاویر کے درمیان گفتگو ہو چکی تھی۔

ستارہ کو رانا کی حویلی تک پہنچنے کے ساتھ ہی مہاویر نے پولیس کے بڑے افسران سے رابطہ کرلیا تھا۔ وہ بھی بستی میں غائب ہونے والی لڑکیوں کی وارداتوں سے بہت پریشان تھے۔

وہ چاروں لڑکیاں بھی بہت خاموشی کے ساتھ پولیس افسران کے سامنے پیش ہوگئی تھیں جنہیں رانا نے اغوا کرا کے اپنے تہ خانے میں رکھا ہوا تھا۔

رانا سے ایک غلطی یہ ہوئی تھی کہ اس نے جس بستی سے لڑکیوں کو غائب کروایا تھا، اسی بستی کے کچھ لوگوں کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا تھا۔

وہ سب کے سب رانا کے خلاف مہاویر کا ساتھ دے رہے تھے۔ اسی لیے کمرے سے ستارہ کے غائب ہوتے ہی مہاویر کو یہ خبر پہنچا دی گئی تھی۔

مہاویر نے اسی وقت پولیس افسران اور بستی کے کچھ لوگوں سے رابطہ کرلیا تھا۔ پھر ان سب کو حویلی کے ملازمین نے تہ خانے کی راہ دکھا دی۔ اس طرح رانا رنگے ہاتھوں پکڑا جا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی زندگی کے دن ختم ہوچکے تھے۔ وہ سکندر کے ہاتھوں مارا بھی گیا تھا۔

رانا کی کہانی ختم ہوچکی تھی۔ لیکن ابھی ایک اور مرحلہ باقی تھا شہزاد کا اور ان ڈاکوؤں کا جو ابھی تک دس کروڑ کی امید لگائے بیٹھے تھے۔

اس وقت گاؤں کے ایک مکان میں یہ سب جمع تھے۔ آئندہ کی پلاننگ کی جا رہی تھی۔ سکندر کا خیال تھا کہ ستارہ کی بازیابی اور رانا کی موت کے بعد یہ باب ختم ہوچکا ہے۔ اسے اسی طرح رہنے دیا جائے لیکن ستارہ اس تجویز کے حق میں نہیں تھی۔

''نہیں ڈیڈ! اس آدمی کو سزا ضرور ملنی چاہیے جس نے میری توہین کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''ایسے آدمیوں کو سزا دینے کا صرف ایک طریقہ ہے۔'' مہاویر نے کہا۔ ''اس کو ان ڈاکوؤں کے ہاتھوں اپنی سزا کو پہنچنے دیا جائے۔''

''وہ کس طرح؟''

''جب ڈاکوؤں کا فون آئے تو انہیں یہ بتا دیا جائے کہ ستارہ اب تمہاری قید میں نہیں ہے۔ وہ بھاگ چکی ہے اور یہ خبر شہزاد ہی نے ہم تک پہنچائی ہے۔ اس کے بعد وہ ڈاکو خود ہی اس سے نمٹ لیں گے۔''

''ہاں، یہ بہت اچھا طریقہ ہے۔'' سکندر نے بھی تائید کی۔ ''ڈاکو خود اس کے دوغلے پن پر اس کی ایسی کی تیسی کردیں گے۔''

''مہاراج! یہ تو خالص سیاسی چال ہے۔'' پولیس آفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات آپ کے ذہن میں کیسے آگئی؟''

''اس لیے کہ اب اس دنیا کو برے لوگوں سے پاک ہو جانا چاہیے۔'' مہاویر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''وہ ایک مکار شخص ہے اور ایسے شخص کی سزا مکاری ہی ہوسکتی ہے۔''

''ہمیں اس پر بہت بھروسا تھا مہاراج!'' ستارہ نے کہا۔ ''میں اور میرے مرحوم شوہر فیصل اس سے بہت پیار کرتے تھے۔''

''مرحوم شوہر؟'' سکندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کس کے لیے کہہ رہی ہو؟''

''فیصل کے لیے ڈیڈ!''

''کیا پاگل ہوگئی ہو؟ فیصل تو زندہ ہے۔'' سکندر نے بتایا۔ ''تم سے کس نے کہہ دیا کہ فیصل مرچکا ہے؟''

''اسی شہزاد نے بتایا تھا ڈیڈ۔''

''جھوٹ بولا تھا اس نے۔ فیصل کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ وہ اسپتال میں تھا لیکن اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔''

''او خدا!'' ستارہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے۔ ''اس مکار شخص نے یہ جھوٹ اس لیے بولا ہوگا کہ میں بالکل ٹوٹ جاؤں اور اس کے رحم و کرم پر ہو جاؤں۔''

''پھر تو اس کو اور کڑی سزا ملنی چاہیے۔'' مہاویر نے کہا۔

''سزا تو اسے مل ہی جائے گی مہاراج!'' پولیس آفیسر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

☆☆☆

وہ ایک طویل روڈ تھی جو لہراتی بل کھاتی ہوئی شہر کی طرف چلی گئی تھی۔

سکندر نے اسی جگہ آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ دس کروڑ کی رقم لے کر آیا تھا۔ سارے معاملات طے پاچکے تھے۔ سردار کو صرف یہ کرنا تھا کہ وہ خود یا اس کا کوئی آدمی مقررہ مقام پر جا کر کھڑا ہو جاتا۔

لیکن اس سے پہلے شہزاد، سردار سے الجھ پڑا تھا۔ ''سردار! وعدے کے مطابق تم مجھے اس میں سے پانچ کروڑ تو دے دو گے نا؟''

''پانچ کروڑ؟'' سردار ہنس پڑا۔ ''کیا پاگل ہوگئے ہو؟ یہ وعدہ تو اسی وقت ختم ہوگیا تھا جب تو یہاں سے بھاگنے کی کوشش کررہا تھا۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔ تم ایسا نہیں کرسکتے۔'' شہزاد پر ایک



کیفیت طاری ہو چلی تھی۔ ''تمہیں معلوم ہے میں نے خطرہ مول لیا تھا۔ فیصل اور ستارہ سے بے وفائی کی۔ دولت کے لیے... ایک پلاننگ کے تحت ان پر حملے کرائے۔ ان کو خوف زدہ کیا۔ تمہیں اطلاع بجھوائی کہ ہم جگہ سے گزریں گے۔ ہم دونوں کو پکڑ لینا۔ دس کروڑ کی رقم کا مطالبہ تم نے میرے مشورے پر کیا تھا۔ ہمارے درمیان یہ طے ہو چکا تھا کہ تم مجھے پانچ کروڑ دو گے۔ پھر کیوں دھوکا کررہے ہو؟''

سردار ہنس پڑا۔ ''بے وقوف انسان... جب تو اپنے دوستوں کے ساتھ دھوکا کرسکتا ہے تو کیا میں تیرے ساتھ دھوکا نہیں کرسکتا؟''

شہزاد کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔

اسی وقت شہزاد کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ ''دیکھ، کس کا فون ہے؟'' سردار نے کہا۔

''اسی سکندر کا۔'' شہزاد کی آواز لرز رہی تھی۔

''لا ادھر۔'' سردار نے موبائل اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ''ہیلو۔'' اس نے فون کرنے والے کو مخاطب کیا۔ ''ہاں، کتنی دیر میں آرہے ہو؟ کیا، نہیں... بکواس بند کرو۔''

اس نے موبائل اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ اب اس کی آنکھیں آگ برسانے لگی تھیں۔ ''دھوکے باز، ذلیل انسان... تو نے لڑکی کے باپ کو بتا دیا کہ لڑکی ہمارے قبضے سے نکل چکی ہے؟''

''نن... نہیں تو...'' شہزاد کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ ''میں اسے کیوں بتانے لگا؟''

''جھوٹ مت بول۔'' سردار دہاڑا۔ ''اب میں تجھے دیتا ہوں پانچ کروڑ۔''

''نہیں سردار... نہیں۔'' شہزاد لرزتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

سردار نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور اس جنگل میں گولیوں کی آوازیں گونج اٹھیں۔ ایک اور کہانی بھی ختم ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شہزاد کی لاش جنگل کے ساتھ گزرنے والی سڑک پر ملی تھی۔

پتا نہیں یہ کہانی دولت کی تھی، ہوس کی یا یونہی ایک کہانی کی ابتدا ہوئی اور ختم بھی ہوگئی۔

بہت سے لوگ ایک جگہ جمع تھے۔ سکندر، ستارہ، فیصل شہر سے آگیا تھا۔ گاؤں کے لوگ، پولیس کے افسران اور سوامی مہاویر۔

یہ سب ایک جگہ جمع تھے۔ سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا کہ آخر یہ سب کیوں کیا؟ کس نے کیا حاصل کیا؟ شہزاد نے کیا پایا؟ کچھ بھی نہیں۔

محبت کی ایک سیدھی سادی کہانی نے کیسے کیسے اتار چڑھاؤ دیکھ لیے تھے۔

''میرے دوستو! جو کچھ ہوا وہ یونہی نہیں ہوا۔'' مہاویر کی آواز گونجی۔ ''اوپر والے نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فتنہ بنایا تھا۔ اگر شہزاد یہ سب نہیں کرتا تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ رانا کا ظلم اسی طرح چلتا رہتا۔ وہ عورت بن کر سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتا رہتا۔ گاؤں کی لڑکیاں برباد ہوتی رہتیں۔ لیکن شہزاد کی سازش، محبت کرنے والوں کو رانا کی حویلی تک کھینچ لائی اور وہ اپنے اس انجام کو پہنچ گیا جو انجام اس کے لیے لکھ دیا گیا تھا۔

سب خاموش ہوکر مہاویر کی باتیں سنتے رہے۔ وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔

''اس کہانی کا ایک اور روپ بھی ہے۔'' مہاویر نے کہا۔ پھر اس نے سکندر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور یہ پہلو تمہارے لیے ہے کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ محبت کی طاقت بھی بہت کچھ ہوا کرتی ہے۔ تم نے خود دیکھ لیا ہوگا کہ ان محبت کرنے والوں نے اس بات کی پروا نہیں کی کہ تم کتنے طاقتور اور کتنے دولت مند ہو۔''

''یہ بات تو ہے مہاراج۔'' سکندر نے اعتراف کیا۔ ''میں غلط فہمی میں تھا۔''

''اور اس کہانی کا تیسرا اور سب سے بڑا سبق خود میرے لیے ہے۔'' مہاویر نے کہا۔ ''اور وہ یہ ہے کہ اصل عبادت یا پوجا یہ نہیں ہے کہ جنگل میں جا کر دھونی دے کر بیٹھ جاؤ بلکہ اصل عبادت انسان کے ساتھ رہ کر اس کی سیوا کرنے میں ہے جس کا مجھے پتا چل گیا ہے اور احساس ہوگیا ہے کہ میری برسوں کی ریاضت ایک طرف اور تم لوگوں کے کسی کام آنا ایک طرف۔ اب میں جنگل نہیں جا رہا۔ بستی میں میری جو کٹیا ہے، مجھے اب وہیں رہنا ہے۔ بستی والوں کے ساتھ۔ تم لوگ اپنی اپنی محبتوں کے ساتھ زندہ رہنا۔ بس میں یہی چاہتا ہوں۔''

مہاویر ان لوگوں سے اجازت لے کر رخصت ہوگیا لیکن اس کے الفاظ کی بازگشت بہت دیر تک فضا میں قائم رہی۔

ستارہ نے فیصل کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ گرد چھٹ چکی تھی اور ایک نئی صبح کا نیا سورج افق سے جھانکنے لگا تھا۔
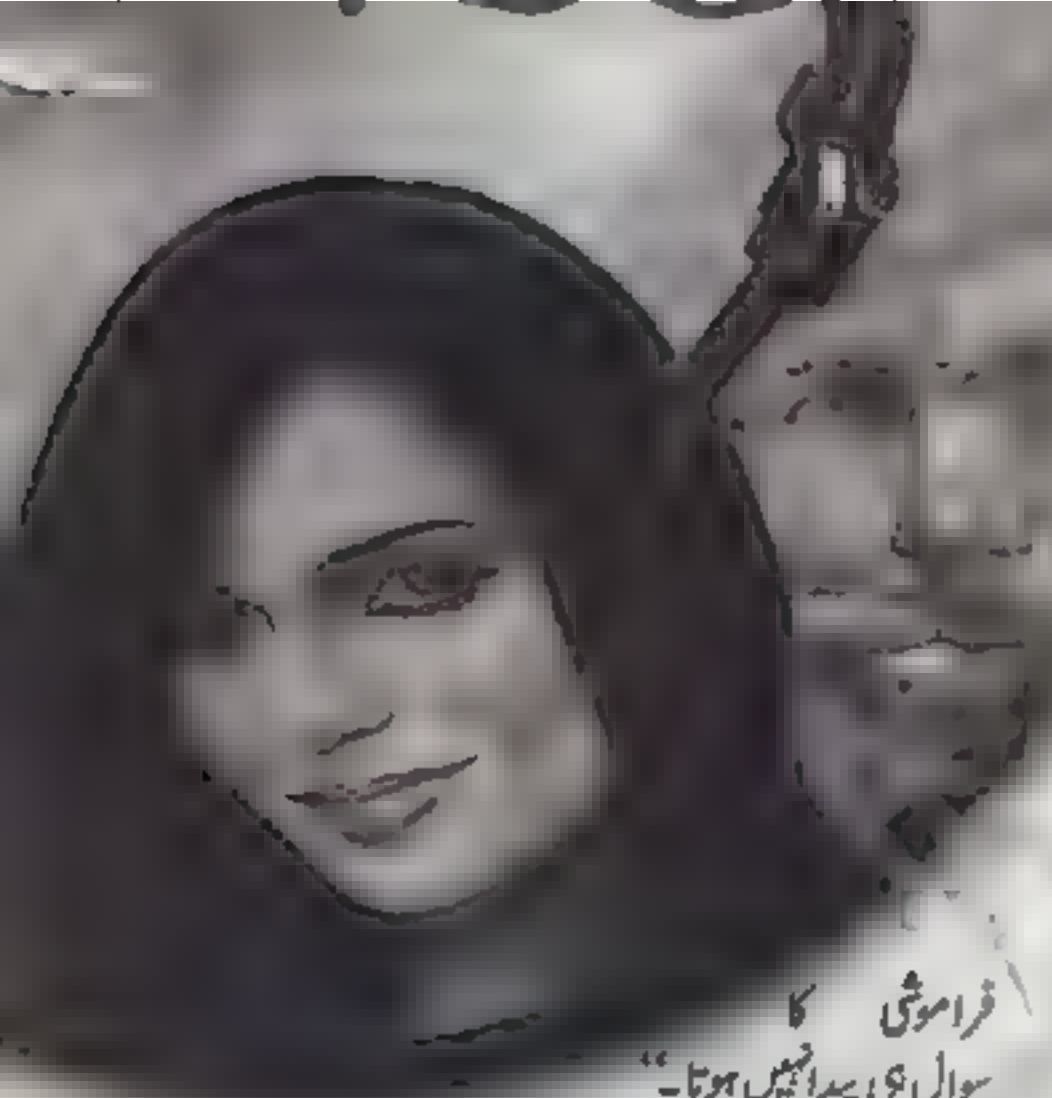
✖

**سال کا آخری سرورق مریم کے خان کے قلم سے**

# تخلیق

مریم کے خان

بے لگام خواہشات و تمناؤں کے حصول کی جنگ بڑی گھناؤنی ہوتی ہے.... عیش و عشرت کے لوازمات سے بھرپور زندگی اور بلندیوں کو چھونے کی خواہش میں انسان وہ کچھ کرتا چلا جاتا ہے.... جس کا تہذیب و شائستگی.... انسانیت اور دلوں کی بستی سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا.... شوبز کی کہکشاؤں میں چمکتے دمکتے ستاروں کی روشنیوں میں چھپی تاریکیوں کا احاطہ کرتی تحریر.... جس کا ہر ستارہ بام عروج پر تھا.... مگر ان کی زندگیاں.... سکون قلب سے محروم تھیں....

**ہوس کی آگ میں جلتے ایک شاہ پرست... کی فطرت کی ہنگامہ خیزیاں...**

عامر شیرازی سیٹی پر نیم دراز تھا۔ اس کے ہاتھ میں جام تھا جس میں طلائی رنگ کا سیال ہلکورے لے رہا تھا۔ ایسے ہی ہلکورے اس کی آنکھوں میں بھی تھے اور وہ رل حیات کے جان لیوا حد تک پرکشش وجود پر جمی ہوئی تھیں۔ رل حیات شیشے کی دیوار کے سامنے کسی بت کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کے مرمریں بدن پر ڈھلکتا اور سرسراتا ہوا ریشمی لبادہ اس کے وجود کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ وہ اس کے ترشے بدن کے تمام زاویے اور پیچ و خم بہ خوبی واضح کر رہا تھا۔ شیشے کی دیوار کے پار سمندر بہت دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ساحل کے ساتھ ایک کثیر المنزلہ عمارت کا بارھواں فلور تھا۔ رل کا پرتعیش اور خوب صورت اپارٹمنٹ صرف ڈیڑھ کروڑ روپے مالیت کا تھا۔ اس اپارٹمنٹ میں تین شاندار بیڈ رومز، ایک ڈرائنگ روم اور بہت بڑا لاؤنج تھا۔ دو اطراف ٹیرس نما بالکونیاں تھیں اور ہر بیڈ روم کے ساتھ لاؤنج کی بیرونی دیوار بھی شیشے کی تھی۔ شیرازی کی نظر کسی ماہر سرفر کی طرح رل کے وجود پر پھسل رہی تھی۔ حالانکہ رل کا وجود اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ اسے بار ہا دیکھ اور برت چکا تھا۔ رل نے اچانک مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم جانتے ہو، میں نے یہ مقام کیسے حاصل کیا ہے؟"

شیرازی نے سر ہلایا۔ "ہاں... کیونکہ میں ہی تمہیں اس مقام تک لایا ہوں۔"

رل نے گویا اسے یاد دلایا۔ "تم نے مجھے تلاش کیا اور پہلی بار مجھے کام دلایا۔"

"یہ درست ہے۔ میں نے تمہیں کام دلایا۔ صرف کام ہی نہیں دلایا بلکہ تمہیں تراشا اور نکھارا۔ تمہارے لیے وہ سب کیا جو میں نے کسی دوسری ماڈل کے لیے کبھی نہیں کیا۔"



رل مسکرائی تو اس کے پرکشش نقوش جگمگا
ے۔ اس کی ہلکی سرمئی آنکھوں میں جیسے ستارے
ب رہے تھے۔ اس کی دل کشی میں کوئی شبہ نہیں
۔ اس وقت اس کا شمار ٹاپ ماڈلز میں ہوتا تھا۔
کی ماڈل معاوضے اور مقبولیت کے لحاظ سے اس کا
مقابلہ نہیں کر سکتی تھی... "یہ سب درست ہے۔" وہ
ے۔

شیرازی نے بلوری جام سے ایک گھونٹ لیا۔
"لیکن یہ اختتام نہیں ہے میں تمہیں اس سے بھی آگے
لے جاؤں گا اور یہ معاہدہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔" اس
نے سامنے گلاس ٹیبل پر رکھی فائل کی طرف سر ہلا کر اشارہ
کیا۔ رل نے فائل کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ پھر باہر کی
طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

"شیرازی! گزشتہ پانچ سال میں تم نے مجھے بہت سپورٹ کیا اور مجھے بہت کچھ دیا۔ مجھے اس مقام تک پہنچا دیا ہے لیکن اب میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس..." وہ اس کی طرف مڑی اور مسکرا کر بات مکمل کی۔ "مجھے دینے کے لیے مزید کچھ نہیں ہے۔"

شیرازی کو اس کی بات سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ پہلے اس کے تاثرات بدلے اور پھر وہ اٹھ بیٹھا۔ "کیا مطلب؟"

رل نے میز سے فائل اٹھائی اور اسے ایک کونے میں رکھے برقی ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ ڈسٹ بن نے خودکار انداز میں فائل کو لمحوں میں جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ شیرازی اچھل پڑا۔ اس نے دہاڑ کر کہا۔ "یہ کیا کیا تم نے... تم جانتی ہو یہ دس کروڑ کا معاہدہ تھا۔"

"مجھے اب تمہاری عنایات اور دس کروڑ کے اس کی معاہدے کی ضرورت نہیں ہے۔" رل کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اب وہاں ایک سخت تاثر تھا۔ "جب میں سستی اور تمہاری عنایات مہنگی تھیں، تب میں انہیں قبول کرنے پر مجبور تھی۔ لیکن شیرازی... اب میں مہنگی ہوں، تمہاری عنایات سستی ہو چکی ہیں اس لیے مجھے کوئی مجبوری نہیں ہے۔"

شیرازی نے دانت پیسے۔ "تم احسان فراموش ہو..."

"تم جو چاہے، کہہ سکتے ہو۔" رل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "کیونکہ تمہیں نقصان ہوا ہے لیکن تم اب مجھے کسی کام کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ تم نے میرے لیے جو کیا ہے، کیا میں نے اس کا پورا پورا معاوضہ ادا نہیں کیا؟ اس لیے احسان فراموشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

شیرازی کے تاثرات تیزی سے بدل رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس وقت اسے رل کی ضرورت ہے۔ یہ معاہدہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا معاہدہ تھا جو اس نے کسی ماڈل کے لیے کرایا تھا۔ گلف کی ایک کمپنی نے رل کو آنے والے ایک برس کے لیے صرف اپنی پروڈکٹس کی ماڈلنگ کے لیے مخصوص کرنے کا معاہدہ کیا تھا اور رل کو ابتدائی طور پر دس کروڑ روپے ادا کیے جاتے۔ بعد میں اس معاوضے میں اضافہ بھی ہو سکتا تھا۔ شیرازی کو بھی کم سے کم پانچ کروڑ ملتے۔ یہ معاہدہ اس کی بے پناہ کوششوں کے نتیجے میں ہوا تھا اور اسے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے، یہ وہی جانتا تھا۔ اور رل نے ایک لمحے میں اس کی ساری محنت اور کوشش جلا کر خاکستر کر دی تھی۔ مگر معاہدے کی فائل دوبارہ بن سکتی تھی۔ اصل مسئلہ رل کی رضامندی کا تھا۔ اس نے لہجہ بدل کر کہا۔

"رل جان پلیز... ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں۔ ہمارے درمیان حساب برابر ہو گیا ہے۔ اگر میں نے تمہارے لیے کچھ کیا تھا تو تم نے اس کا پورا صلہ دے دیا ہے مگر تم اس معاہدے کو یوں مسترد نہیں کر سکتیں۔ بی پروفیشنل ڈیئر۔"

رل دوبارہ مسکرائی۔ "تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اب مکمل پروفیشنل بن چکی ہوں اور اسی وجہ سے میں نے یہ معاہدہ مسترد کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

جواب میں رل نے ایک طرف رکھے لیدر بیگ سے

ایک فائل نکالی اور شیرازی کی طرف بڑھا دی۔ یہ ایک معاہدے کی مکمل نقل تھی۔ رل نے گلف کی اسی کمپنی سے معاہدہ کرلیا تھا اور اس میں اسے دگنا معاوضہ دیا جارہا تھا۔ یہی نہیں اسے دبئی میں اپارٹمنٹ بھی دیا جارہا تھا اور وہاں مستقل رہائش کا ویزا بھی تھا۔ شیرازی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ مضبوط نقوش، سانولی رنگت اور گٹھے ہوئے جسم والا شخص تھا۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر تھی لیکن وہ اپنی عمر سے کم کا لگتا تھا۔ بلا کا موقع شناس اور ذہین شیرازی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے شوبزنس سے متعلق کئی طرح کے کورس کر رکھے تھے۔ اس کا باپ ایک چھوٹی سی ایڈورٹائزنگ کمپنی چلاتا تھا۔ تقریباً پندرہ سال پہلے شیرازی نے باپ کی جگہ سنبھالی تو اس نے آنے والے دور کا ادراک کرتے ہوئے کمپنی کا سیٹ اپ بدلا۔ یہ بات اس کے باپ کو پسند نہیں آئی جو شوبزنس میں بھی وضع داری نبھاتا آیا تھا اس لیے وہ خاموشی سے کمپنی سے الگ ہوگیا۔

یوں شیرازی کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ اس نے سب سے پہلے روشن خیال آمریت کی دی ہوئی آزادی کا فائدہ اٹھایا جبکہ شوبزنس سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگ اس وقت ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ان سے کہیں آگے نکل گیا۔ ذہانت کے ساتھ وہ بلا کا تخلیقی ذہن رکھتا تھا اور اس نے کچھ ایسے رجحانات متعارف کرائے جنہوں نے آنے والے چند برسوں میں شوبزنس کا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ اسے شوبزنس کنگ کہا جانے لگا۔ وہ جو کام کرتا اور جو چہرہ متعارف کراتا تو اسے قبولیتِ عامہ حاصل ہوجاتی۔ شوبزنس میں نئی آنے والی لڑکیاں تو اس کی ایک نگاہِ التفات کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار رہا کرتی تھیں۔ پہلے سے فیلڈ میں موجود ماڈلز بھی شیرازی کے آگے پیچھے ہوتی تھیں کہ وہ انہیں پروموٹ کرے۔ مگر شیرازی پرانی ماڈلز پر کم ہی توجہ دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ کسی نئی ماڈل کو متعارف کراتا۔

وہ بہت چھان کر لڑکی لیتا پھر اسے پالش کرتا، اسے شوبزنس کے رنگ ڈھنگ سکھاتا، اس کی ظاہری شخصیت اور زبان و لہجے کو درست کرتا۔ اس کی چال ڈھال اور جسمانی پیچ وخم میں کمی یا زیادتی کو ٹھیک کراتا اور پھر اسے کسی دھماکے کی طرح شوبزنس میں متعارف کراتا۔ عام طور سے اس کی ماڈل اپنے اولین کام سے ہی چھا جاتی تھی۔ شیرازی چنتا ہی انہیں تھا جو چھا جانے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ جب تک ماڈل اس کی مٹھی میں رہتی، وہ اس سے کام لیتا اور جب وہ اس کی مٹھی سے نکلنے لگتی تو شیرازی صرف مٹھی نہیں کھولتا تھا بلکہ اسے دور بھی پھینک دیتا اور اس کے بعد وہ کبھی اس ماڈل سے دوبارہ کام نہیں لیتا تھا۔ اس کا اولین اصول یہ تھا کہ پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔ جو گزر گیا ہے اس کے بجائے جو آگے ہے اس کی فکر کرو۔

لیکن رل کی بات کچھ اور تھی۔ جب شیرازی نے اسے پہلی بار دیکھا تو وہ ایک ڈری سہمی ہوئی اور شوبزنس کی دنیا سے انجان لڑکی تھی۔ اس کے گھر میں ایک بوڑھی ماں اور ایک چھوٹی بہن تھی۔ اس کا باپ دو سال پہلے اپنی موٹر سائیکل کی ورکشاپ میں نامعلوم افراد کی فائرنگ سے ہلاک ہوگیا تھا اور ورکشاپ بند ہوگئی اور گھر کی آمدنی بھی بند ہوگئی۔ رل کی ماں نے کمر کسی اور ایک گارمنٹ فیکٹری میں ملازمت کرنے لگی۔ مگر تین انسانوں کا پیٹ بھرنا پھر مکان کا کرایہ اور بل ادا کرنا ممکن نہیں تھا۔ رل ان دنوں انٹر کرچکی تھی۔ اس نے بھی ماں کا ہاتھ بٹانے کا سوچا اور ملازمت کے لیے نکلی۔ اس وقت اس نے سوچا نہیں تھا کہ اس کا حسن اس کے لیے آفت بن جائے گا۔ وہ جہاں جائے گی، اس کے حسن پر رال ٹپکانے والے تو بے شمار مل جائیں گے لیکن کوئی اسے عزت کے ساتھ نوکری دینے والا نہیں ملے گا۔ اس نے کئی جگہوں پر کام کیا اور ہر جگہ سے اسے مجبوراً نکلنا پڑا۔ ایسے کئی تجربات کے بعد اسے خیال آیا کہ بالآخر اسے کسی کی خواہشوں کے سامنے جھکنا پڑے گا تو کیوں نہ وہ اپنی مرضی سے جھکے اور اپنی مرضی کی قیمت وصول کرے۔

اوائل جوانی سے اسے احساس تھا کہ وہ بے پناہ حسین ہے۔ حالانکہ اس کے ماں باپ عام سے لوگ تھے۔ جوانی میں اس کی ماں کسی قدر خوب صورت رہی بھی ہوگی مگر غربت اور سخت زندگی نے اسے قبل از وقت ہی بوڑھا کردیا تھا۔ رل نے فیصلہ کیا کہ شوبزنس ہی ایک ایسی فیلڈ ہے جس میں وہ اپنی صحیح قیمت وصول کرسکتی ہے۔ اس نے کئی جگہوں پر جا کر دیکھا لیکن وہاں موجود افراد اسے خود اناڑی لگے تھے جو صرف دولت اور تعلقات کے بل بوتے پر یہاں تک آگئے تھے۔ رل کسی ایسے شخص کے لیے کام کرنا چاہتی تھی جو اسے سچ مچ بہت اوپر تک لے جائے۔ اس نے دل پر جبر کرکے بکنے کا فیصلہ کیا تھا اس لیے وہ بہت مہنگے داموں بکنا چاہتی تھی۔

جب اس نے شیرازی کو دیکھا اور جس طرح شیرازی نے اسے دیکھا تھا، وہ اسی لمحے جان گئی کہ یہی شخص ہے جو اسے شوبزنس کی بلندیوں پر لے جاسکتا ہے۔ اب تک دیکھنے والے اسے ایک بہت حسین عورت سمجھ کر دیکھتے تھے اور ان کی آنکھوں میں سوائے ہوس اور ناآسودہ خواہشات کے کچھ



نہیں ہوتا تھا لیکن شیرازی نے اسے یوں دیکھا جیسے کوئی نقاد آرٹ کے کسی شہ پارے کو دیکھتا ہے۔ جس طرح اس نے شیرازی کو پہچان لیا تھا اسی طرح اس نے بھی رل کے اندر چھپے ٹیلنٹ کو بھانپ لیا تھا۔ شیرازی اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ ایک شہ پارہ خام حالت میں اس کے سامنے ہے اور جب مکمل ہوگا تو اپنی چکاچوند سے ایک دنیا کی آنکھیں خیرہ کرے گا۔ اس نے رل سے مختصر سا انٹرویو کیا اور اسے اپنا کارڈ دے دیا۔ ”آج شام اس پتے پر آجاؤ۔“

رل ذہنی طور پر پہلے سے تیار ہوکر آئی تھی۔ اسے پتا تھا کہ شیرازی اسے وہاں کیوں بلا رہا ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں رات دیر تک نہیں رک سکتی۔“

وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ”اوہ، میں بھول گیا... تم ایک غریب لیکن عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔“

”اب تک یہ بات درست بھی ہے۔“ رل نے کوئی اثر لیے بغیر جواب دیا۔ ”مجھے آج تک کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔“

شیرازی شرمندہ ہوا بھی تو اس نے ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس نے رل کی خاطر اسے شام کے بجائے دوپہر میں بلالیا۔ ایک پوش علاقے میں یہ چھوٹا سا اسٹوڈیو اپارٹمنٹ اس نے اسی مقصد کے لیے لے رکھا تھا۔ ڈیفنس میں اپنے بنگلے پر وہ صرف معروف عورتوں کو بلاتا تھا، کسی نئے چہرے کو پہلی بار یہاں لاتا تھا۔ جب کوئی طیارہ ہوا میں بلند ہونے کے لیے رن وے پر دوڑتا ہے تو اسے اوپر جانے کے لیے بہت بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے اور بہت زور لگانا پڑتا ہے۔ لیکن ایک بار ہوا میں بلند ہونے کے بعد کام آسان ہوجاتا ہے۔ ایسا ہی رل کے ساتھ ہوا۔ اس شام اس نے خود پر جبر کیا۔ اس پہلے جبر کے بعد اس کی منزل خود بہ خود آسان ہوتی چلی گئی۔ ان پانچ سالوں میں اس نے آگے جانے کے لیے شیرازی کی ہر خواہش کے سامنے سرِ تسلیم خم کرکے رکھا۔ لیکن اب رل کو اس کی ضرورت نہیں تھی، وہ خود آگے جاسکتی تھی۔ شیرازی اسے جتنی بلندی تک لاسکتا تھا، لے آیا تھا۔ اس سے آگے اسے خود جانا تھا اور اپنے زورِ بازو پر جانا تھا۔ یہ معاہدہ اس کا ثبوت تھا کہ اسے اپنا زورِ بازو استعمال کرنا آگیا تھا۔ ایک سال پہلے رل کی ماں کا بھی انتقال ہوگیا تھا اور وہ اب دنیا میں تقریباً اکیلی تھی۔

شیرازی دم بہ خود نظروں سے فائل دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے فائل ایک طرف پھینک دی اور سرد لہجے میں بولا۔ ”تم نے ٹھیک نہیں کیا۔“

”تم نے غلط کیا ہے؟“ رل [illegible] کا لہجہ استہزائیہ ہوگیا۔ ”یہ وہی کچھ تو ہے جو تم آج تک دوسروں کے ساتھ کرتے آئے ہو۔“

شیرازی اسے گھور رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کھیل ختم ہوگیا ہے۔ رل نے عین موقع پر اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ وہ نہایت مہارت سے اسے بے وقوف بناتی آئی تھی۔ وہ گزشتہ چھ مہینے سے اس معاہدے کے لیے بھاگ دوڑ کررہا تھا اور جب وہ کمپنی کو رضامند کرچکا تھا تو رل نے اپنا داؤ کھیلا اور اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک دیا۔ وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ دانت پیس رہا تھا پھر وہ رل کی طرف بڑھا تو اس نے اپنے لبادے میں نہ جانے کہاں چھپا ایک چھوٹا سا پستول نکال لیا اور جارحانہ انداز میں بڑھتا شیرازی جھٹکے سے رک گیا۔ رل مسکرائی۔ ”مجھے معلوم تھا کہ سب سے آخر میں تمہیں اپنی مردانگی آزمانے کا خیال آئے گا۔“

شیرازی کچھ دیر کھڑا ہونٹ کاٹتا رہا پھر جھٹکے سے مڑ کر باہر جانے لگا تو رل نے عقب سے پکارا۔ ”مسٹر شیرازی! ابھی حساب پورا نہیں ہوا ہے۔ یہ اس کی پہلی قسط ہے۔“

”کتیا... دیکھ لوں گا تجھے۔“ شیرازی نے زیرِ لب کہا اور رل کے اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔ اس کی کار کمپلیکس کے گیٹ سے نکلنے لگی تو مستعد گارڈ آگے آیا اور اس نے جھک کر شائستگی سے کہا۔

”سر! میڈم نے آرڈر کیا ہے کہ آئندہ آپ ان سے ملنے نہ آئیں۔ اگر آپ آئے تو اندر آنے کی اجازت نہیں ملے گی۔“

شیرازی وہاں سے نکلا تو اسے لگا جیسے بغیر کپڑوں کے گھر سے نکل آیا ہو۔ اتنا بے عزت اس نے خود کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہے ورا بھی اس کی آنکھ کھلے گی تو سب ہمیشہ کی طرح ٹھیک ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی اسے معلوم تھا کہ یہ خواب نہیں اس کی زندگی کی سب سے تلخ حقیقت ہے۔ اگر رل پستول نہ نکالتی تو شاید وہ اسے قتل کردیتا اور اس لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ رل کے پاس پستول تھا ورنہ وہ پکڑا جاتا اور اس کا کیریئر بھی تباہ ہوجاتا۔ اب اس کے پاس موقع تھا کہ وہ سکون سے رل سے انتقام لے سکے۔ ایسا انتقام جو وہ مرتے دم تک نہ بھول سکے۔

☆☆☆

رل نے شیرازی کے جانے کے بعد پستول ایک طرف

پھینک دیا اور خود صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ وہ شیرازی کے سامنے خود کو سنبھالے ہوئے تھی لیکن اس کے جانے کے بعد اس کے چہرے پر تفکر چھا گیا تھا۔ وہ پریشان تھی کیونکہ وہ شیرازی کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ بہت خطرناک آدمی تھا مگر اسے یہ قدم اٹھانا ہی تھا۔ وہ کب سے تڑپ رہی تھی کہ شیرازی کے چنگل سے نکل سکے مگر اسے آج سے پہلے موقع ہی نہیں ملا تھا۔

پھر چھ مہینے پہلے گلف سے زین شاہ نامی شخص نے اس سے رابطہ کیا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے ایڈورٹائزنگ کے شعبے میں اہم عہدے پر تھا۔ اس نے رل کو بتایا کہ شیرازی اس کے لیے اس ملٹی نیشنل کمپنی کا معاہدہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر یہ معاہدہ ہو جاتا ہے تو تقریباً آدھی رقم شیرازی ہتھیا لے گا۔ رل نے جواب دیا۔

”تب میں کیا کر سکتی ہوں؟ وہ میرا پروموٹر ہے۔“

”تم خود اپنی پروموٹر بن سکتی ہو۔“ زین شاہ نے ترغیب دینے والے انداز میں کہا۔ ”اصل حیثیت تو تمہاری ہے۔ اگر تم آج شیرازی کو چھوڑ دو تو تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

رل سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے زین شاہ سے کہا۔ ”میں سوچ کر جواب دوں گی۔“

”ہاں، سوچ لو۔ ابھی تمہارے پاس وقت ہے۔ کمپنی نے معاہدے کی منظوری نہیں دی ہے۔ جیسے ہی معاہدے کی منظوری دی جائے گی، تب تم اپنے کارڈز کھیل سکتی ہو۔“

”وہ کیسے؟“

”یہ میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب معاہدہ او کے ہو جائے گا۔“

”تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

”یہ بھی تمہیں اسی وقت بتاؤں گا۔ لیکن یاد رکھنا، شیرازی کو اس گفتگو کی ہوا بھی مت لگنے دینا ورنہ وہ تمہیں اپنے جال سے نکلنے نہیں دے گا۔“

رل نے ذرا چالاکی سے کام لیا تھا اور اپنے موبائل کا وائس ریکارڈر آن کر لیا تھا۔ اس لیے اس گفتگو کا بیشتر کارآمد حصہ ریکارڈ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر زین شاہ اس کے کام نہیں آیا تو وہ اس ریکارڈنگ کو استعمال کرے گی۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ جیسے ہی ملٹی نیشنل کمپنی نے رل سے معاہدے کی منظوری دی، زین شاہ نے رل حیات سے رابطہ کیا۔ ”کیا تم شیرازی سے چھپ کر دبئی آسکتی ہو؟“

”کیوں نہیں۔“ رل حیات نے کہا۔

”بس تو تم فوراً آجاؤ۔۔۔ تاخیر کی تو شیرازی بازی لے جائے گا۔“

اس دوران میں رل نے سوچ لیا تھا کہ اسے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ کب سے شیرازی کے خلاف انتقام اور نفرت کی آگ سینے میں دبائے بیٹھی تھی۔ اس کے خیال میں یہ موقع آیا تھا کہ وہ شیرازی سے کچھ حساب برابر کر سکے۔ تین دن بعد وہ دبئی میں تھی اور زین شاہ نے اسے براہ راست کمپنی کے متعلقہ حکام سے ملوایا اور انہوں نے براہ راست رل سے معاہدہ کر لیا۔ انہیں رل اپنی کمپنی کی پروڈکٹس کے لیے ماڈل کے طور پر درکار تھی۔ چاہے وہ شیرازی کے توسط سے ملتی یا خود ان سے معاہدہ کرتی۔ رل نے اپنی مرضی کا معاوضہ مانگا جو قبول کر لیا گیا۔ ساری کارروائی دبئی میں ہوئی تھی اور رل واپس آئی تو معاوضے کی اولین قسط اس کے اکاؤنٹ میں آچکی تھی۔ اگلی صبح اس کی دبئی کے لیے فلائٹ تھی اور اسے چھ مہینے تک واپسی کا موقع نہیں ملتا۔ وہ اسی لیے آج صبح خاصا وقت ایمل کے ساتھ گزار کر آئی تھی جو اس دنیا میں اس کا واحد رشتہ رہ گئی تھی۔

☆☆☆

شیرازی اپنے بنگلے میں تھا۔ وہ شام سے پی رہا تھا اور وسکی کی پوری بوتل خالی کر چکا تھا۔ اس کے باوجود اسے صرف نشہ ہوا تھا۔ وہ ہوش و حواس سے مکمل بیگانہ نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک صوفے پر ڈھیر تھا اور رل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ آج تک کامیابیاں ہی سمیٹتا آیا تھا۔ عورت اس کے نزدیک کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ ان سے حسب مرضی کھیلتا اور جب اس کا دل بھر جاتا انہیں بے پروائی سے ایک طرف پھینک دیتا تھا۔ اب تک وہ دوسروں کو استعمال کرتا آیا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کسی نے اسے استعمال کیا اور کام نکل جانے کے بعد دھتکار دیا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی اور یہ آگ رہ رہ کر اس کے منہ سے گالیوں کی صورت میں برآمد ہو رہی تھی۔

”میں تجھے دیکھ لوں گا۔۔۔ تو سمجھتی کیا ہے خود کو۔۔۔ میں شیرازی ہوں۔ میں کسی کو بنا بھی سکتا ہوں اور بگاڑ بھی سکتا ہوں۔۔۔ تو کیا چیز ہے، میں چاہوں تو کسی بھکارن کو بھی شوبزنس اسٹار بنا سکتا ہوں۔۔۔ شیرازی دوسروں کو بناتا اور بگاڑتا ہے۔۔۔ تو دیکھے گی وہ کیا کرتا ہے۔“

اس کے منہ سے بے ترتیب الفاظ نکل رہے تھے لیکن اس کے ذہن میں موجود عزائم واضح تھے۔ رل سے انتقام کی خواہش رفتہ رفتہ ایک منصوبے کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔



☆☆☆

الجھے ہوئے بال، کسی قدر پھیلی ناک اور پتلے ہونٹوں کے ساتھ رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اسے قطعی ناقابل کشش بنا رہی تھیں۔ صرف اس کی شفاف ہلکی سرمئی آنکھیں اور صاف رنگت قابل توجہ تھی۔ اس کے باوجود بیس برس کی نینا کریم ایسی لڑکی نہیں تھی جس کی طرف نوجوان توجہ دیتے۔ جسم بھی استخوانی تھا۔ وہ بچپن سے بیمار رہی تھی اور اس پر ماس چڑھا ہی نہیں تھا۔ نینا کا تعلق ایک خانہ بدوش قبیلے سے تھا۔ ان کی عورتیں گھروں میں کام کر کے کچھ کما لیا کرتی تھیں اور مرد بندر اور ریچھ کا تماشا دکھا کر کماتے تھے لیکن زیادہ تر مردوں کو بیٹھ کر کھانے کی عادت تھی اس لیے انہوں نے کچھ ایسے راستے تلاش کر لیے تھے جن سے انہیں رقم مل جاتی تھی۔ ان میں سے ایک اپنی لڑکیاں فروخت کرنا بھی تھا۔ یہاں لڑکیوں کے اچھے خریدار مل جاتے تھے جو معاوضہ بھی اچھا دیتے تھے۔

لڑکی جتنی خوب صورت ہوتی تھی، اس کا باپ اتنا ہی خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔ قبیلے میں شادی کے لیے بھی لڑکی کا باپ لڑکے سے ایک خاص رقم طلب کرتا تھا اور جب لڑکا کسی طرح سے رقم جمع کر کے دیتا، تب ہی مطلوبہ لڑکی سے اس کی شادی ہو سکتی تھی۔ نینا کے بارے میں اس کی ساتھی لڑکیوں کا خیال تھا کہ کوئی اسے مفت میں بھی نہیں لے گا۔ خود نینا کا اپنے بارے میں یہی خیال تھا۔ مگر جلد ہاشم علی نے اس کا خیال بدل دیا۔ ہاشم ایک عام صورت کا لڑکا تھا مگر جب نینا کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسند کا جذبہ نظر آیا تو وہ نینا کو دنیا کا سب سے خوب صورت مرد لگنے لگا۔ اس نے نینا کو محبت کی نظر سے دیکھا تھا اس لیے وہ اسے اچھی لگی۔ یہی محبت نینا کے اندر بھی جاگ اٹھی۔

ہاشم کو بندر نچانا اور مداری بن کر روزی کمانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے ایک ٹرسٹ اسکول سے میٹرک کیا اور پھر سولہ سال کی عمر سے مزدوری کرنے لگا۔ ان دنوں وہ شہر میں ایک نئی بننے والی بڑی عمارت میں کام کر رہا تھا۔ یہ بہت بڑا کام تھا جو کئی مہینوں تک چلتا اور معاوضہ بھی اچھا مل رہا تھا۔ بس وہ جگہ قبیلے کی رہائش سے دور پڑتی تھی اس لیے ہاشم کام والی جگہ پر رہتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار چھٹی والے دن قبیلے میں آتا تھا۔ نینا اس دن کا بے تابی سے انتظار کرتی تھی۔ نینا اور ہاشم دونوں کا خیال تھا کہ ان کا رشتہ آسانی سے ہو جائے گا لیکن جب ہاشم نے نینا کے باپ کریم سے بات کی تو اس نے شرط رکھ دی۔ ”ہاشو دو لاکھ روپے دے گا تو میں اس کی شادی نینا سے کروں گا۔“

یہ سن کر ہاشم کے ہوش اڑ گئے۔ وہ مزدور پیشہ آدمی تھا۔ اس کے لیے دو لاکھ بہت بڑی رقم تھی۔ وہ گزشتہ چھ سال سے محنت مزدوری کا کام کر رہا تھا اور اب تک وہ مشکل سے تیس ہزار روپے جمع کر سکا تھا۔ دو لاکھ روپے مزید جمع کرنے میں اسے نہ جانے کتنا عرصہ لگ جاتا۔ نینا کے باپ نے ہاشم سے صاف کہہ دیا کہ وہ دو سال میں دو لاکھ روپے جمع کر سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ نینا کی شادی کہیں اور کر دے گا۔ وہ دراصل چالاکی سے کام لے رہا تھا۔ اسے تو یہ توقع بھی نہیں تھی کہ کوئی مفت میں نینا سے شادی کے لیے تیار ہوگا۔ ایسے میں ہاشم امیدوار بن کر سامنے آیا تو چالاک کریم نے فوراً دو لاکھ کی شرط رکھ دی۔ اسے قطعی فکر نہیں تھی کہ ہاشم پیچھے ہٹ گیا تو اس کی بیٹی گھر بیٹھی رہ جائے گی۔

ہاشم نے یہ سن کر ایک فیصلہ کر لیا۔ ملک میں رہ کر اس کے لیے اتنا کمانا ناممکن تھا۔ اس کے چند ساتھی کسی کمپنی کے توسط سے مڈل ایسٹ جا رہے تھے۔ لے جانے والا آدمی ہر فرد سے پچاس ہزار لے رہا تھا۔ وہاں پندرہ سو درہم تنخواہ کے ساتھ کھانا پینا، رہائش اور میڈیکل کمپنی کے ذمے تھا۔ کافی بچت ہو سکتی تھی۔ اگر وہ کوشش کرتا تو ایک سال سے پہلے ہی دو لاکھ روپے جمع کر سکتا تھا۔ جب نینا کو اس کے فیصلے کا پتا چلا تو وہ تڑپ کر رہ گئی۔ ”ہاشو! مت جا، مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”ڈر کس بات کا؟ تیرا بابا کہہ چکا ہے کہ میرے پاس دو سال ہیں۔ میں ایک سال سے پہلے ہی دو لاکھ روپے اسے دے کر تجھے اپنا بنا لوں گا اور جب واپس آؤں گا تو ہم کسی اور جگہ اپنی زندگی گزاریں گے۔“

نینا جانتی تھی کہ یہاں ہاشم کسی صورت دو لاکھ روپے دو سال میں جمع نہیں کر سکتا اس لیے اس نے دل پر پتھر رکھ کر ہاشم کو جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن ابھی ہاشم کو گئے ہوئے ایک مہینا ہی ہوا تھا کہ ایک دن نینا کی ماں نے اسے اطلاع دی۔ ”نینا! تیرے باپ نے تیرا رشتہ کر دیا ہے۔ تیار ہو جا، آج تیرا نکاح ہے۔“

☆☆☆

نینا۔۔ شاندار گاڑی سے اتری اور اس وسیع و عریض مکان کو دیکھ۔ وہ حیران ہوئی کہ لوگ اتنے بڑے گھروں میں رہتے ہیں۔ جب اس کے باپ نے اسے چھوڑ کر اس آدمی کی گاڑی میں دھکیلا تھا تو وہ سارے راستے روتی آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی زندگی کا سودا ہو گیا ہے وہ اب

ہاشم سمیت کوئی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ واپس نہیں جاسکتی تھی۔ اسے اپنے باپ کے ساتھ اس شخص سے بھی نفرت ہورہی تھی جس نے اس کا سودا کیا تھا۔ وہ شیرازی تھا لیکن اس وقت نینا اس کا نام نہیں جانتی تھی۔ سارے راستے وہ اندر ہی اندر سہمی رہی۔ گاڑی سے اتر کر شیرازی نے نینا کی طرف دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔ ”اندر چل...“

وہ اسے اندر لاؤنج میں لایا اور اپنے لیے شراب نکالی پھر وہ نینا کے سامنے صوفے پر آبیٹھا۔ وہ یوں نینا کا جائزہ لے رہا تھا جیسے قصائی بھیڑ کا جائزہ لیتا ہے کہ اس میں سے کتنا گوشت نکلے گا۔ نظروں کی کاٹ سے مجبور ہوکر وہ خود میں سمٹنے لگی۔ نینا جانتی تھی کہ یہ شخص اسے خرید کر لایا ہے اب اس سے اپنی پوری قیمت وصول کرے گا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا لیکن اپنا حال اسے خراب ہی نظر آرہا تھا۔ وہ پچھتانے لگی۔ کاش ماں سے سنتے ہی کہ اس کا باپ اس کا سودا کررہا ہے گھر سے بھاگ جاتی۔ اس شخص کے ساتھ نہ آتی۔ ہاشم کے دل پر کیا گزرے گی، جب وہ سنے گا کہ نینا ہمیشہ کے لیے اس سے چھن گئی ہے۔ اس کی خاطر وہ باہر گیا تھا۔ شیرازی بہ غور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا اور اس کی دلی کیفیت بھی سمجھ رہا تھا۔ اس نے اچانک کہا۔

”تیرا نام نینا ہے؟“

اس کے اقرار پر شیرازی بولا۔ ”ڈر مت یہاں کوئی تجھے کچھ نہیں کہے گا۔ تو محفوظ رہے گی لیکن تجھے وہی کرنا ہوگا جو میں تجھ سے کہوں گا۔“

نینا حیران ہوئی۔ جب اس شخص نے اسے کچھ کہنا نہیں تھا تو اس طرح نکاح کر کے لایا کیوں تھا؟ شیرازی اب اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ”میں نے تیرے بدلے تیرے باپ کو پورے پانچ لاکھ روپے دیے ہیں اور جواب میں مجھے کیا ملا ہے۔“ اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر لہرایا۔ ”یہ نکاح نامہ... کاغذ کا ٹکڑا... لیکن اصل چیز تو ہے... تو ہاشم سے محبت کرتی ہے نا؟“

”ہاں۔“ نینا نے بے ساختہ کہا۔

شیرازی مسکرایا۔ ”میں تیرے بارے میں سب جانتا ہوں۔“

”پھر بھی تم نے مجھے خرید لیا؟“ نینا دکھی لہجے میں بولی۔ ”پانچ لاکھ میں تمہیں بہت خوب صورت لڑکی مل جاتی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے پانچ لاکھ میں بہت خوب صورت لڑکی مل جاتی مگر مجھے تم ہی درکار تھیں۔“

”پر کیوں؟“

”یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تو جیسا میں کہوں، تمہیں ویسا ہی کرنا ہے۔ اور اگر تم نے بالکل ویسا ہی کیا تو میرا وعدہ ہے تین سال بعد تمہیں آزاد کردوں گا اور تم دوبارہ اپنے ہاشم کے پاس جاسکو گی۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے پاس آئی ہو... ان چھوئی۔“

☆☆☆

نینا کا سانس پھول رہا تھا لیکن ابھی وقت پورا نہیں ہوا تھا اس وقت تک اسے ایکسر سائز کرنا ہی تھی۔ اسے اس کوٹھی میں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پانچ لاکھ روپے خرچ کر کے اسے لانے والا عامر شیرازی اس سے کیا چاہتا ہے۔ اس نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اس کے بجائے اس نے اسے رشنا کے سپرد کر دیا تھا۔ رشنا تقریباً چالیس سال کی مردوں جیسی جسامت رکھنے والی عورت تھی۔ پہلے وہ پولیس میں تھی لیکن پھر اس نے پولیس کی ملازمت چھوڑ دی مگر اس کی شخصیت میں سفاکی برقرار رہی۔ وہ فراٹے سے مردانہ گالیاں دیتی تھی اور غصے میں ہاتھ چھوڑ دیتی تھی۔ یہاں آنے کے بعد نینا دوبار اس سے مار کھا چکی تھی۔ شیرازی نے اسے رشنا کے حوالے کیا اور ان دونوں کو شہر کے مضافات میں ایک نئی لیکن پوش آبادی میں واقع ایک چھوٹی کوٹھی میں منتقل کر دیا۔ یہاں کئی پارکس تھے اور سڑکوں اور گھروں کے ساتھ سبزہ تھا۔ نینا کو یہ جگہ دو وجوہات کی بنا پر بہت پسند آئی تھی۔ ایک تو اپنی خوب صورت اور خاموش لوکیشن کی وجہ سے اور دوسرے شیرازی یہاں موجود نہیں تھا۔

نینا نے رشنا سے پہلی مار اس وقت کھائی جب شیرازی نے انہیں دوسری کوٹھی میں منتقل کیا۔ اس کوٹھی میں تیسری فرد ایک ملازمہ تھی۔ وہ کھانا بنانے اور صفائی ستھرائی پر مامور تھی۔ شیرازی کے جاتے ہی رشنا اسے ایک کمرے میں لائی اور کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ نینا نے انکار کیا تو رشنا نے اسے مارا اور زبردستی اس کے کپڑے اتار دیے۔ نینا اسے برا بھلا کہتے ہوئے رو رہی تھی اور وہ سکون سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ جہاں ضرورت محسوس کرتی، وہ ہاتھوں سے ٹٹول کر بھی دیکھتی تھی۔ نینا کی مزاحمت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ زبردستی کی وجہ سے نینا کے خستہ حال کپڑے پھٹ گئے تھے۔ اپنا کام مکمل کر کے رشنا نے اسے ایک جوڑا دیا۔ ”یہ پہن لو۔“

یہ جدید قسم کا شلوار سوٹ تھا۔ نینا نے آج تک روایتی قسم کے کپڑے پہنے تھے جو اس کے قبیلے میں رائج تھے یا پھر لنڈے سے پہلے ہونے یا خیرات میں ملے چھوٹے بڑے کپڑے پہنے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے ڈھنگ سے سلا ہوا نئے انداز کا سوٹ پہنا تھا۔ اس کمرے میں ایک طرف دیوار کے ساتھ بڑا سا آئینہ لگا تھا۔ نینا نے اس میں خود کو دیکھا تو اسے اپنا آپ بہت اچھا لگا۔ اگرچہ اس کا رنگ میلا ہو رہا تھا اور بال الجھے ہوئے اور بدرنگ تھے۔ رشنا اسے سجے سجائے کمرے میں لائی جس کی ہر چیز نینا کے لیے خواب و خیال جیسی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اسے ایسی جگہ رہنے کا موقع ملے گا۔

”یہ تمہارا کمرا ہے۔“ رشنا نے کہا اور اسے چیزوں کے بارے میں بتانے لگی۔ اس نے الماری کھول کر دکھائی، اس میں مختلف اقسام کے ریڈی میڈ سوٹ تھے۔ پھر رشنا نے اسے باتھ روم دکھایا جو چمکتے ٹائلوں اور بہترین سینیٹری سے مزین تھا۔ اس میں ایک بڑا سا باتھ ٹب بھی تھا۔ رشنا نے سب چیزوں کے استعمال کے بارے میں بتایا۔ نینا غور سے سن رہی تھی کیونکہ رشنا نے اسے دھمکی دی تھی کہ اسے جو بتایا جا رہا ہے اگر وہ اس نے یاد نہیں کیا تو اسے سزا ملے گی۔ نینا کو تھوڑی سی دیر میں اس عورت سے ڈر لگنے لگا تھا۔ رشنا نے اسے چیزوں کے استعمال کے بارے میں بتایا پھر اس کے فوائد...... بتانے لگی۔ وہاں کئی طرح کے سوپ، شیمپو، کنڈیشنر اور لوشن تھے۔ رشنا اسے بتا رہی تھی کہ کون سی چیز کس طرح، کتنی مقدار میں اور کیسے استعمال کی جاتی ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھا کر باہر جاتے ہوئے بولی۔ ”اب تم نہالو... میں باہر موجود ہوں۔ کوئی چیز سمجھ میں نہ آئے تو مجھے آواز دے لینا۔“

نینا بہت ساری چیزوں کے استعمال سے واقف تھی لیکن اس نے ڈر کر رشنا کو ٹوکا نہیں۔ ان کا قبیلہ خیموں میں رہتا تھا اور انہیں پانی جیسی عام سی چیز بھی مشکل سے ملتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نینا کو بعض اوقات ہفتہ دس دن بعد جا کر نہانے کا موقع ملتا تھا اور پانی کی کمی کی وجہ سے وہ مکمل کر نہا بھی نہیں پاتی تھی۔ آج اسے پہلی بار موقع ملا تھا۔ رشنا کے جانے کے بعد وہ اچھی طرح نہائی دھوئی۔ وہ باہر آئی تو رشنا نے ڈرائیر سے اس کے بال خشک کیے۔ شیمپو اور کنڈیشنر کے استعمال سے اس کے روکھے سرمئی بالوں میں رونق اور چمک آگئی تھی۔ میل کچیل اتر جانے سے رنگ نکھر آیا تھا۔ رشنا اسے ڈائننگ روم میں لائی۔ وہاں میز پر کھانا لگ گیا تھا اور یہ بہت سادہ سا کھانا تھا۔ بغیر آمل کے بھنی ہوئی چکن کے چند ٹکڑے، براؤن بریڈ اور ایک گلاس دودھ۔

نینا نے کبھی اس قسم کا کھانا نہیں کھایا تھا پھر اسے بھوک بھی نہیں تھی۔ مگر رشنا اس کے سر پر موجود تھی اور اس کا حکم تھا کہ وہ یہ سب ختم کرے۔ مجبوری میں اسے یہ سب زہر مار کرنا پڑا۔ کھانے کے بعد وہ اسے اس کے کمرے میں لائی۔ اسے نائٹ سوٹ نکال کر دیا۔ ”یہ پہن کر سونا اور رات کو باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔“

نینا کا بیڈروم کوٹھی کے سامنے والے حصے میں اوپری منزل پر تھا۔ کوٹھی کے نچلے حصے میں نشست گاہ، ڈائننگ روم اور کچن تھا۔ کچن کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں ملازمہ رہتی تھی۔ اوپر دو بیڈروم تھے اور دوسرا رشنا کا تھا۔ وہ اس کی نگرانی کے لیے اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ نینا فرار ہوکر کہاں جاتی، اس کے اپنے باپ نے اسے بیچ دیا تھا۔ اس کے باوجود رشنا پوری طرح اس کی نگرانی کررہی تھی۔ نینا کے بیڈروم کے ساتھ وسیع ٹیرس میں کئی طرح کی ورزش کرنے والی مشینیں تھیں۔ ریشم جیسا نرم لباس پہن کر اے سی کی خنکی میں وہ بستر پر لیٹی تو اس کی آنکھیں خود بہ خود بند ہوتی چلی گئیں۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ عامر شیرازی نامی یہ شخص اسے کسی اور مقصد سے یہاں لایا ہے۔ اسے نینا کے جسم و جوانی سے دلچسپی نہیں تھی۔ صبح رشنا نے آکر بیڈروم کے پردے سمیٹے اور اسے بیدار کیا۔ ”اٹھ جاؤ، بہت سو لیں۔“

اس نے دیکھا باہر سورج نکلے خاصی دیر ہوگئی تھی۔

”مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“

”آج پہلا دن ہے اس لیے تمہیں چھوٹ ملی ہے۔ کل سے تمہیں ایک ایک منٹ کے حساب سے اپنے معمولات کی پابندی کرنی ہوگی۔“

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”تمہیں پتا چل جائے گا۔“ رشنا کھردرے لہجے میں بولی لیکن اس کے لہجے میں نینا کے لیے فرق آگیا تھا۔ اب وہ تو کے بجائے تم سے بات کررہی تھی اور الفاظ بھی مہذبانہ ہوتے تھے۔ ناشتے کے بعد وہ اسے گاڑی میں لے کر نکلی۔ ایک گاڑی میں بیٹھ کر سفر کرنے کا کیا مزہ ہوتا ہے، یہ نینا نے اس دن جانا۔ اس کا دکھ وقت گزرنے کے ساتھ کم ہورہا تھا۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں نے ویسے ہی اس کا کوئی جذباتی رشتہ نہیں تھا۔ صرف ہاشم کی یاد آتی تو اس کے دل میں درد جاگ اٹھتا۔ رشنا اسے ایک درمیانے درجے کے شاپنگ سینٹر میں لائی۔ وہاں اس نے ایک بوتیک سے نینا کے لیے کوئی درجن بھر سوٹ لیے۔ پھر اس کے لیے جوتوں، چپلوں اور

دوسری چیزوں کی شاپنگ کی۔ دو گھنٹے میں وہ ڈھیر ساری چیزیں لے کر روانہ ہوئے۔ نینا کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا جب رشنا نے تیس ہزار سے زیادہ کی رقم ادا کی تھی۔ اس کے لیے تو تیس روپے بھی بڑی رقم تھی اور اس عورت نے دو گھنٹوں میں تیس ہزار روپے خرچ کر دیے تھے۔ نینا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں ہو رہا ہے۔ اسے قطعی خوش فہمی نہیں تھی کہ وہ اتنی حسین ہے کہ کوئی اس پر عاشق ہو جائے۔ وہ بہ مشکل قبول صورت تھی۔ اس نے رشنا سے پوچھا۔

"شیرازی مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

رشنا ہنسی۔ "وہ نہیں چاہتا جو تم سمجھ رہی ہو۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے اور اسے حسین عورتوں کی کمی نہیں ہے۔"

نینا خوب صورت نہیں تھی لیکن لڑکی تو تھی۔ اسے غصہ آگیا۔ "اگر اسے مجھ سے کوئی مطلب نہیں ہے تو اس نے مجھے کیوں خریدا ہے؟"

"یہ تو اسی سے پوچھنا۔" رشنا بے نیازی سے بولی۔ "مجھے یہ سب نہیں معلوم۔ تم اس چکر میں کیوں پڑ رہی ہو؟ وہ اب تمہارا مالک ہے، جو چاہے کرے۔ تمہارا کام اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ اس میں چوں چرا کی گنجائش نہیں ہے۔"

اس بات کا مطلب نینا کی سمجھ میں اس وقت آیا جب اگلے روز رشنا نے اسے ایکسرسائز کرانا شروع کیں اور ان میں سے بعض اتنی مشکل تھیں کہ اس نے انکار کر دیا۔ خاص طور سے رننگ مشین پر دوڑنا اسے بہت ہی مشکل لگ رہا تھا۔ وہ دو بار گری تو اس نے دوبارہ مشین پر چڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس پر رشنا نے بیدردی سے اسے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گرایا اور ایک ہاتھ سے اسے قابو کر کے اس کی کمر پر لاتیں مارنے لگی۔ اس کا پاؤں بھی بھاری بھرکم تھا اور کسی گرز کی طرح نینا کی کمر پر لگ رہا تھا۔ چند ضربوں کے بعد وہ چلانے لگی مگر وہ اس کی چیخوں کی پروا کیے بغیر اسے مارتی رہی۔ جب نینا بالکل بے دم ہو گئی تو رشنا نے اسے چھوڑا اور پھر بالوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور ایک زوردار تھپڑ رسید کر کے بولی۔ "اب سمجھ میں آگیا کہ انکار کی کیا سزا ملے گی؟"

اس مار نے نینا کو اتنا خوف زدہ کر دیا تھا کہ پھر اس نے رشنا کو کسی کام سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کی۔ چاہے وہ اسے کتنا ہی مشکل کیوں نہ لگ رہا ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے یہ سب کیوں کرایا جا رہا تھا۔ ایکسرسائز کے بعد اسے زور کی بھوک لگتی تھی۔ تب رشنا اسے نپا تلا کھانا دیتی تھی اور یہ بالکل سادہ اور پھیکا ہوتا تھا۔ کھانے کے بعد اسے کئی طرح کی رنگ برنگی گولیاں بھی کھانی پڑتی تھیں۔ اس کے لیے لازم تھا کہ وہ دن میں دو بار غسل کرے۔ اس سے پہلے رشنا کسی خاص لوشن سے گردن سے پاؤں تک اس کا مساج کرتی تھی۔ نینا نے محسوس کیا کہ اس مساج سے اس کا رنگ نکھرنے لگا تھا۔ دو ہفتے میں اس کا جسم کسی قدر بھر گیا۔ رنگت گلابی مائل سرخ ہو گئی تھی۔ مستقل نگہداشت سے اس کے بالوں میں چمک اور ریشم جیسی نرمی آگئی تھی۔ رشنا ایک الگ قسم کے لوشن سے اس کے چہرے کا مساج بھی کرتی تھی۔ دو ہفتے بعد وہ اسے ایک اعلیٰ درجے کے بیوٹی پارلر میں لے گئی جہاں اسے کئی قسم کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس کے ہاتھ پیروں سے رواں صاف کیا گیا۔ نینا کو یہ سب عجیب لگ رہا تھا لیکن اس میں اعتراض کی جرأت نہیں تھی۔

اسے صبح سے شام تک مصروف رہنا پڑتا تھا اور صرف چند گھنٹے اس کے اپنے ہوتے تھے۔ لیکن ایک دن جب وہ ایکسرسائز کے بعد مساج اور غسل کے مرحلے سے گزر کر آرام کر رہی تھی، رشنا اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے نینا کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ وہ اٹھ گئی۔ "کیا کہیں جانا ہے؟"

"نیچے ایک عورت آئی ہے۔" رشنا نے کھردرے لہجے میں کہا۔

نینا تیار ہو کر نیچے آئی تو ڈرائنگ روم میں ایک خوش پوش اور خوب صورت ادھیڑ عمر عورت اس کی منتظر تھی۔ وہ گرم جوشی سے نینا سے ملی۔ "میرا نام سامی ہے اور میں تمہیں کچھ سکھانے آئی ہوں۔"

☆☆☆

رل مختصر لباس میں دبئی کے ساحل پر موجود تھی لیکن وہ یہاں تفریح کرنے نہیں آئی تھی بلکہ ایک اشتہار کی شوٹنگ جاری تھی۔ کاسمیٹکس کا ایڈ تھا اور وہ ڈائریکٹر کی ہدایات کے مطابق کام کر رہی تھی۔ گرمی اور تھکن سے اس کا برا حال تھا کیونکہ یہ شوٹنگ صبح سے جاری تھی۔ خدا خدا کر کے شوٹنگ میں وقفہ آیا اور وہ گاؤن پہن کر ایک طرف موجود چھاتے کے نیچے کرسی پر آبیٹھی۔ ایک آدمی نے اسے یخ بستہ لیمن جوس کا گلاس پیش کیا۔ اسی لمحے زین شاہ اس کے سامنے آبیٹھا۔ وہ اس ملٹی نیشنل کمپنی کے مقامی افسران میں شامل تھا۔ پبلسٹی کا شعبہ اس کے پاس تھا اس لیے وہ یہاں شوٹ پر موجود تھا۔ رل ایک ہفتہ پہلے دبئی منتقل ہوئی تھی اور آج اس کی پہلی شوٹنگ تھی۔ زین کی اس سے کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں لیکن اس نے اب تک رل کو نہیں بتایا تھا کہ اسے رل سے یہ ہمدردی ہے یا شیرازی سے کیا دشمنی ہے؟ ایک بار رل نے اس سے پوچھا بھی لیکن وہ اسے ٹال گیا۔

"شیرازی کا کیا ردعمل تھا جب تم نے اسے معاہدہ دکھایا؟"

رل مسکرائی۔ "بہت شاک لگا تھا اور اگر میرے پاس پسٹل نہ ہوتا تو شاید وہ مجھے قتل کر دیتا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی تمہارے خلاف انتقامی منصوبے بنا رہا ہوگا۔"

"بناتا رہے۔" رل نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ اس شخص کو اتنا ہلکا مت لو۔ وہ زہریلا سانپ ہے اور اس وقت زخمی بھی ہے۔"

"فی الحال میں یہاں ہوں اور وہ یہاں کچھ نہیں کر سکتا ہے۔" رل نے کہا۔ "ہاں جب واپس جاؤں گی تو پھر بہت محتاط رہوں گی۔"

"اگر تم کہو تو میں شیرازی کی نگرانی کراؤں؟"

"کیا یہ ممکن ہے؟"

"ہاں، میرے کچھ روابط اب بھی ہیں وہاں۔" زین نے کہا تو رل نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ ماضی میں شیرازی سے تمہارا تعلق رہا ہے؟"

"تمہارا خیال درست ہے۔" زین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ تقریباً پچاس برس کا عام سی شکل و صورت کا شخص تھا۔ رل کو بالکل یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی کسی سے زین کا ذکر سنا ہو یا اس کی کوئی تصویر دیکھی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اگر کبھی شوبزنس میں تھا بھی تو کسی ناقابلِ ذکر پوزیشن پر تھا۔ "میں دیکھتا ہوں شیرازی کی نگرانی کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

زین کے جاتے ہی ڈائریکٹر نے اسے پکارا۔ "آخری شاٹ تیار ہے... آر یو ریڈی؟"

رل جوس کا گلاس رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

"ایسے نہیں چلنا ہے۔" سامی نے کہا۔ "یوں چلنا ہے۔" سامی نے اسے عملی طور پر چل کر دکھایا۔ ان دونوں نے نہایت چست لباس پہن رکھا تھا جس میں ان کے جسم نمایاں تھے۔ نینا کو شرم آرہی تھی لیکن وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کوٹھی کے ایک چھوٹے کمرے میں تھے جس میں چاروں طرف بڑے بڑے آئینے لگے تھے۔ نینا نے غور سے دیکھ رہی تھی پھر اس نے دوبارہ چلنے کی کوشش کی۔ سامی خوش ہو گئی۔

"بالکل اسی طرح... اب میں تمہیں اس طرح چلنے کی آسان ترکیب بتاتی ہوں۔ دیکھو، اپنی ایڑی دوسرے پاؤں کے انگوٹھے کے سامنے رکھو اور پاؤں کا رخ باہر کی طرف رکھو۔ پھر دیکھنا تمہاری چال خود بہ خود ایسی ہو جائے گی۔"

نینا نے پھر غور کیا اور اس بار زیادہ کامیابی سے سامی کی نقل کی۔ اس نے خوش ہو کر نینا کے رخسار پر پیار کیا تو وہ شرما گئی۔ رشنا کے برعکس سامی سے اس کا تعلق دوستی کا تھا۔ وہ اس سے فوراً گھل مل گئی تھی۔ نینا کو اس کے ساتھ رہنا اچھا لگتا تھا۔ وہ اسے سکھاتی تھی کہ کپڑے کیسے پہنتے ہیں۔ بال بنانا، میک اپ کرنا، اپنے حسن کا خیال رکھنا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا کیسے کرنے چاہئیں۔ وہ صبح ناشتے کے بعد آتی تھی اور شام تک نینا کے ساتھ رہتی تھی۔ رشنا نے ایکسرسائز کا پروگرام بھی سامی کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ اس کی بھی ماہر تھی بلکہ اسے بہت اچھا ڈانس بھی آتا تھا۔ نینا نے سکون کا سانس لیا۔ رشنا کی موجودگی اس کے اعصاب پر بوجھ ہوتی تھی اور وہ مستقل سہمی رہتی تھی کہ کب اس سے غلطی ہو جائے اور اسے رشنا کی سختی کا سامنا کرنا پڑے۔ حالانکہ رشنا نے دوسری بار کے بعد پھر نہیں مارا تھا لیکن نینا اس کی وہ مار نہیں بھولی تھی۔

سامی اس سے بہت پیار اور نرمی سے پیش آتی تھی۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لگی رہتی لیکن ایک بار بھی اس کے ماتھے پر شکن نہیں آتی تھی۔ بعض اوقات اسے نینا کو کوئی معمولی سی چیز سکھانے میں سارا دن لگ جاتا تھا۔ ایک مہینے میں نینا نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ یہ تبدیلی اتنی زیادہ تھی کہ جب وہ اپنی ایک مہینے پہلے والی حالت کا سوچتی تو اسے حیرت ہوتی تھی کہ وہ اس حد تک بدل گئی ہے۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور چلنے کا انداز سب کچھ بدل گیا تھا۔

اس کے جسمانی معائنے کا کام سامی نے سنبھال لیا تھا۔ وہ اس کے جسم پر موجود بعض دھبوں سے غیر مطمئن تھی۔ ایک روز وہ اسے ایک بیوٹی کلینک لے گئی اور وہاں نینا کی لیزر تھراپی ہوئی۔ اس تھراپی کے بعد دھبے ختم ہو گئے۔ دوسرے مہینے ایک نوجوان لڑکا فراز آنے لگا۔ وہ نینا کا نیا استاد تھا اور اس کے ذمے نینا کی زبان درست کرنا اور اسے آج کے دور کے مطابق بولنا اور الفاظ استعمال کرنا سکھانا تھا۔ نینا سب سیکھ رہی تھی اور اتنی تیزی سے سیکھ رہی تھی کہ خود اسے تعجب ہوتا تھا کہ کیا اس میں اتنی صلاحیت ہے؟ اسے معمولی پڑھنا لکھنا آتا تھا۔ بچپن میں اس نے ٹرسٹ اسکول میں کچھ وقت گزارا تھا۔ وہاں اس نے اردو لکھنا اور پڑھنا کسی حد تک سیکھ لیا تھا اور یہ چیز اب اس کے کام آرہی تھی۔ فراز نے اسے

انگریزی سکھانے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اس کے بجائے وہ اسے انگریزی کے الفاظ سکھانے لگا اور یہ بھی کہ ان کا درست استعمال کیسے کرتے ہیں۔ وہ اسے اردو میں لکھ کر دیتا تھا اور نیما کو روز دس الفاظ درست تلفظ اور معنی کے ساتھ یاد کرنے پڑتے تھے۔ یہ اس کے لیے اتنا مشکل نہیں تھا کیونکہ اس کے سوا وہ جو کرتی تھی، وہ اسے بہت مشکل لگتا تھا۔

دو مہینے بعد وہ اتنی بدل چکی تھی کہ آئینے میں خود کو دیکھتی تو ایک لمحے کو ٹھٹک جاتی۔ جسم کی طرح اس کا چہرہ بھی بھر گیا تھا اور پہلے رخساروں کی ہڈیاں فاقہ زدہ انداز میں ابھری ہوتی تھیں، اب وہ دلکشی میں بدل گئی تھیں۔ البتہ اس کی ناک کا بھدا پن برقرار تھا اور نچلا لب بھی بہت پتلا تھا۔ ایک دن سامی اسے لے کر نکلی تو اس کا خیال تھا کہ وہ کہیں گھومنے جا رہے ہیں۔ سامی اکثر اسے اعلیٰ درجے کی تفریح گاہوں میں لے جاتی تھی جہاں وہ براہِ راست اونچی طبقے کے طور طریقوں کا مشاہدہ کرتی تھی۔ لیکن اس بار سامی اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لائی۔ ڈاکٹر شہاب الدین کاسمیٹک سرجن تھا۔ اپائنٹ منٹ پہلے سے طے تھا اور شہاب الدین تک نیما کی تصاویر بھی پہنچ چکی تھیں۔ اس نے مختلف زاویوں سے نیما کے چہرے کی مزید تصاویر لیں۔ اس کے بعد وہ تقریباً نصف گھنٹے تک اس کے چہرے کا معائنہ کرتا رہا۔ آخر میں اس نے نیما کے چہرے کا سی ٹی اسکین کیا۔ کلینک سے واپسی پر نیما نے سامی سے پوچھا۔

”تم مجھے ڈاکٹر کے پاس کیوں لے کر گئی تھیں؟“

”اس کے لیے۔“ سامی نے اس کی ناک کو انگلی سے چھوا اور پھر نچلے لب کو چھوا۔ ”اس کے لیے۔“

”کیا مطلب؟“

”جلد سمجھ جاؤ گی گڑیا۔“ سامی نے کہا۔ ”کیا خیال ہے، آج میں تمہیں ڈانس کے کچھ اسٹیپ سکھاتی ہوں۔“

مطلب نیما کی سمجھ میں ایک ہفتے بعد آیا جب اس کے چہرے سے پٹی کھلی۔ دو دن پہلے وہ ڈاکٹر شہاب الدین کے کلینک میں داخل ہوئی اور اس کی ناک اور نچلے لب کی سرجری کی گئی تھی۔ نیما ایک آئینے کے سامنے بیٹھی تھی اور نرس اس کے چہرے سے پٹیاں ہٹا رہی تھی۔ جب اس کا چہرہ سامنے آیا تو وہ سحر زدہ رہ گئی۔ اس کی ناک کی بناوٹ ہی بدل گئی تھی۔ اب وہ بہت خوب صورت اور ستواں ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی اس کا نچلا لب کسی قدر گداز ہو گیا تھا اور اب اس کا چہرہ مجموعی طور پر بے حد دلکش ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی ناک کو چھونا چاہا لیکن نرس نے روک دیا۔ ”ابھی اسے بالکل نہ چھوئیں جب تک ٹانکے نہ کٹ جائیں... اسے پانی سے بھی بچانا ہے۔“

ٹانکے اتنے باریک تھے کہ مشکل سے نظر آ رہے تھے۔ ناک کو محفوظ رکھنے کے لیے نرس نے اسے پٹی سے ڈھانپ دیا۔ نیما کو مزید ایک ہفتے بہت احتیاط سے کام لینا پڑا۔ اس دوران میں زخم مکمل طور پر بھر گئے تھے۔ اس کے ہونٹ کی سلیکون تھراپی کی گئی تھی اس لیے اس پر زخم نہیں آیا تھا۔ پہلے تو نیما کا حلیہ بدلا تھا اور اس میں بھی وہ اپنی پچھلی والی زندگی سے بہت مختلف نظر آتی تھی۔ مگر ناک اور ہونٹ کی سرجری کے بعد تو وہ اتنی بدل گئی تھی کہ اگر ہاشم اسے دیکھتا تو وہ بھی پہچان نہ پاتا۔ بہت دنوں بعد اسے ہاشم کا خیال شدت سے آیا تھا اور وہ تڑپ کر رہ گئی۔ وہ اس سے بے خبر کہ نیما اس سے دور کر دی گئی ہے، کسی صحرا میں خون پسینا ایک کر رہا تھا۔

ابتدائی ایک مہینے کے بعد شیرازی نے آنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ جب آتا، نیما کے دل و دماغ پر ایک خوف طاری ہو جاتا۔ اسے رہ رہ کر اس نام نہاد نکاح نامے کا خیال آتا جس کی مدد سے اس کے باپ نے اسے فروخت کیا تھا اور یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کب شیرازی اپنا حق جتانے آ جائے۔ وہ اسے روک بھی نہیں سکتی تھی مگر جب اس نے آنا بند کیا تو نیما نے سکون کا سانس لیا تھا۔ دو مہینے میں ایک بار بھی اسے شیرازی کی صورت دیکھنے کو نہیں ملی تھی۔ بعض اوقات تو وہ بھول جاتی تھی کہ وہ یہاں کسی خاص مقصد کے تحت موجود ہے اور جلد یا بدیر وہ مقصد اس کے سامنے آنے والا ہے۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ اپنی مرضی سے یہاں رہ رہی ہے۔ سامی اور فراز کے آنے کے بعد اسے اپنی زندگی اچھی لگنے لگی تھی۔

فراز کا رویّہ بھی اس کے ساتھ دوستانہ تھا اور وہ بے تکلفی کے باوجود بھی ایک حد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ اس نے کبھی اسے مردانہ نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی مدد سے نیما کی زبان حیرت انگیز طور پر صاف ہو گئی تھی۔ وہ اردو میں انگریزی کے الفاظ ملا کر اتنی روانی سے بولنے لگی تھی جیسے شروع سے اسی طرح بات کرتی آئی ہو۔ پھر سامی سارا دن اس سے جو گفتگو کرتی تھی، اس سے بھی اس کی تربیت ہوتی تھی۔ وہ روزانہ دو تین گھنٹے مختلف ٹی وی چینلز دیکھتی تھی۔ ان سے بھی وہ شوبزنس اور نئی چیزوں کے بارے میں سیکھتی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اب وہ دل سے سب کرتی اور سیکھتی تھی لیکن ایک دن اس کی خوشی غارت ہو گئی جب اسے معلوم ہوا کہ شیرازی نے اسے اپنی کوٹھی میں طلب کیا ہے۔

☆☆☆

بڑے سائز کی اسکرین پر رِل کے مختلف شوٹ چل رہے تھے۔ یہ سارے شوٹ دبئی اور دنیا کے مختلف حصوں میں تیار ہوئے تھے۔ اکثر شوٹس میں رِل نے نہایت مختصر لباس پہنا ہوا تھا اور پوری بے باکی سے اپنے آپ کو عیاں کر رہی تھی۔ شیرازی صوفے پر نیم دراز تھا اور نزدیک ہی نیما بیٹھی تھی۔ وہ مجبوراً اسکرین پر نظر جمائے ہوئے تھی کیونکہ یہ شیرازی کا حکم تھا کہ وہ غور سے ٹی وی دیکھتی رہے۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے شوٹس تھے۔ شوٹس ختم ہوئے تو شیرازی نے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا۔ نیما نے سکون کا سانس لیا۔ اسے وحشت ہو رہی تھی۔ آج دو مہینے بعد وہ شیرازی کی کوٹھی میں آئی تھی۔ رشنا نے اسے بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے لیکن اس کے باوجود کوٹھی پر نظر پڑتے ہی وہ سارے خوف اور خدشات جو دب گئے تھے، پوری شدت سے ابھر آئے۔ شیرازی لاؤنج میں اس کا منتظر تھا۔ اس نے نیما کو اپنے نزدیک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر ٹی وی آن کر دیا۔ جب شوٹس ختم ہوئے تو شیرازی نے ٹی وی بند کر کے نیما کی طرف دیکھا۔ ”تم جانتی ہو میں نے تمہیں پانچ لاکھ روپے خرچ کر کے تمہارے باپ سے خریدا ہے؟“

”جی۔“ نیما نے بہ مشکل کہا۔

”تم میری بیوی بھی ہو... کیا تم اس سے انکار کر سکتی ہو؟“

”نہیں۔“ اس بار بھی اس نے مشکل سے کہا۔

”گڈ! تم خاصی سمجھ دار ہو گئی ہو۔“ شیرازی پہلی بار مسکرایا۔ ”نیما! تمہارے پاس دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تو وہ ہے جو تم نے ابھی ٹی وی پر دیکھا ہے۔ تمہیں اسی طرح کام کرنا ہے جیسے رِل کر رہی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اور اچھا کام کرنا ہے۔ اس صورت میں میں بھول جاؤں گا کہ تم میری بیوی ہو۔ تمہیں تین سال تک میرے لیے کام کرنا ہوگا۔ جیسے میں کہوں ویسے کرنا ہوگا، چاہے تمہیں اچھا لگے یا نہ لگے۔ بولو منظور ہے؟“

”میں یہ نہیں کر سکتی۔“ نیما نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ شیرازی نے گہری سانس لی۔

”میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم انکار کر دو گی۔ اب میں تم سے وہ سب وصول کروں گا جو میں نے تم پر خرچ کیا ہے۔ قانوناً تم میری بیوی ہو لیکن تم کبھی یہ درجہ حاصل نہیں کر سکو گی اور جب میرا دل بھر جائے گا تو میں تمہیں تمہارے باپ کے حوالے کر دوں گا۔“ شیرازی کے لہجے سے زیادہ اس کے الفاظ ہولناک تھے۔ خاص طور سے باپ کے حوالے کرنے کا سن کر وہ کانپ گئی۔ ”ابھی تمہارا باپ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرا وعدہ ہے تین سال بعد جب میں تمہیں آزاد کروں گا، تب بھی تمہارے باپ کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا... اب بولو؟“

”نہیں۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”تب پہلی بات مان جاؤ۔“

نیما نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ اس کے پاس کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ اس نے بے بسی سے سر ہلایا تو شیرازی کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے سرخوشی کے عالم میں کہا۔ ”نیما! یقین کرو تم اس فیصلے پر کبھی پچھتاؤ گی نہیں۔“

☆☆☆

دبئی سے آنے والی فلائٹ کے مسافروں میں رِل حیات بھی شامل تھی۔ اس کے ساتھ اس کی سیکریٹری مہناز بھی تھی۔ اسے بعض ضروریات کی وجہ سے دبئی میں ہی اپائنٹ کیا گیا تھا۔ مہناز کو زین شاہ نے تلاش کیا تھا۔ وہ بہت اچھی سیکریٹری ثابت ہوئی تھی۔ اس نے رِل کو بہت ساری ذمے داریوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔ زین، شیرازی کی نگرانی کا کام نہیں کرا سکا تھا رِل نے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ البتہ بعض دوسرے ذرائع سے اسے اطلاع ملی تھی کہ شیرازی نے ایک نئی ماڈل متعارف کرائی ہے جس نے آتے ہی بہت زیادہ کامیابی حاصل کی تھی اور اسی طرح دھوم مچا دی تھی جس طرح رِل نے اپنے ابتدائی دنوں میں مچائی تھی۔ وہ لاؤنج میں آئے تو ایک طرف بڑے سائز کے ٹی وی پر ایک نیوز چینل آ رہا تھا۔ نیوز میں وقفہ آیا تو اشتہار چلنے لگے۔ ایک موبائل کمپنی کے اشتہار میں نئی ماڈل جلوہ گر تھی۔ اس کا حسن، اس کے ناز و ادا اور اعتماد دیکھنے والا تھا۔ اشتہار بہت اچھے انداز میں بنایا گیا تھا لیکن ماڈل نے اپنے وجود اور اداکاری سے اس میں جان ڈال دی تھی۔ رِل کچھ دیر غور سے دیکھتی رہی پھر مہناز نے اسے آواز دی۔ ”میڈم! سامان آ گیا ہے۔“

کچھ دیر بعد وہ سامان سمیت باہر گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ اسی فلائٹ کے اکانومی کیبن سے ہاشم بھی اترا۔ اس کا نمبر خاصی دیر میں آیا اس لیے وہ نکلا بھی دیر سے تھا۔ اس کے پاس صرف ایک چھوٹا سا بیگ تھا اور وہ ٹرمنل سے باہر آ کر پیدل ہی سڑک کی طرف چل پڑا جہاں اسے بس مل جاتی۔ یہاں تو ٹیکسی والے منہ کھول کر بیٹھے تھے اور باہر سے آنے والوں سے منہ مانگا کرایہ وصول کر رہے تھے۔ وہ اپنی خون پسینے کی کمائی ان لوگوں کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ صرف دو دن کے لیے آیا تھا اور اس کے پاس دو

لاکھ روپے کی رقم تھی۔ وہ نینا کے باپ کو یہ رقم دے کر نینا کو ہمیشہ کے لیے اپنے نام کر لیتا۔ اس نے دو لاکھ کی رقم جمع... کرنے کے لیے دن رات محنت کی تھی اور ایک ایک پیسا بچایا تھا۔ وہ پیدل ہی باہر مین روڈ کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی نظر ایک بل بورڈ پر گئی۔ اس پر ایک ماڈل نئے موبائل فون سے زیادہ اپنی نمائش کر رہی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ ہاشم ایک لمحے کو ٹھٹک گیا۔ وہ کچھ دیر اسے غور سے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ ماڈل کو دیکھ کر اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اسے نینا کا خیال آیا پھر وہ ہنس دیا۔ اس ماڈل اور نینا میں کوئی مماثلت نہیں تھی پھر اسے کیوں نینا کا خیال آیا تھا؟

ایک گھنٹے بعد وہ اپنے قبیلے کے ڈیرے کے سامنے بس سے اترا۔ شہر سے باہر جانے والی اس بڑی شاہراہ کے کنارے ایک غیر آباد سوسائٹی کی زمین پر قبیلے نے دو برس سے ڈیرا ڈال رکھا تھا لیکن وہ خود یہاں نہیں آئے تھے بلکہ ایک قبضہ مافیا نے انہیں یہاں بٹھایا تھا اور ان کی آڑ میں یہ قبضہ مافیا لوگوں سے ان کے پلاٹ اونے پونے داموں خرید رہی تھی۔ اب تک وہ ستر فیصد پلاٹ خرید چکی تھی اور جیسے ہی وہ تمام یا نوے فیصد پلاٹ بھی حاصل کر لیتی تو خانہ بدوشوں کو یہاں سے اٹھا کر کہیں اور منتقل کر دیا جاتا اور سوسائٹی کی زمین پر اپنی مرضی سے کسی نئے پروجیکٹ کا آغاز کر دیا جاتا... یا نام بدل کر دوبارہ سے زمین لوگوں کو فروخت کی جاتی۔ ہاشم بچپن سے دیکھتا آیا تھا، اس کے قبیلے والوں کو شہر کے پاس ٹھکانا مل جاتا تھا اور قبضہ کرانے والے کچھ رقم بھی دیتے تھے، دوسرے کاموں میں بھی ان کی مدد کرتے تھے۔

جیسے ہی وہ ڈیرے میں داخل ہوا، اس کی آمد کی اطلاع آگ کی طرح پھیل گئی۔ سب سے پہلے اسے اس کا دوست سیدو ملا۔ وہ ہاشم کو دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔ "ہاشم! تو کہاں چلا گیا تھا؟ اپنی کوئی خیر خبر بھی نہیں بھیجی۔"

ہاشم اس کا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ "کیا ہوا، خیر تو ہے؟"

"خیر نہیں ہے۔" سیدو نے جواب دیا۔ "تیرے جاتے ہی نینا کے باپ کریم نے اس کا سودا کر دیا تھا۔"

ہاشم کو لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو اور اس کی دنیا آن واحد میں تباہ ہو گئی ہو۔ اس نے بے اختیار سیدو کا گریبان پکڑ لیا۔ "بکواس کرتا ہے تو۔"

"میرا یقین نہیں ہے تو بڈھے سے پوچھ۔ اس نے نینا بیچ کر یہ پیسا بھی اڑا دیا ہے۔"

ہاشم کریم کے پاس آیا تو وہ نشے میں دھت پڑا ہوا تھا۔ ہاشم کے جھنجوڑنے پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اتنا مشتعل تھا کہ شاید اس کا گلا دبا دیتا لیکن سیدو اور چند دوسرے لوگوں نے ہاشم کو قابو کیا۔ جب اس کے حواس ذرا ٹھکانے آئے تو اس نے سب سے پہلے نینا کے بارے میں پوچھا لیکن اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے لے جانے والا کون تھا۔ شام کو جب کریم کسی قدر ہوش میں آیا تو ہاشم نے اس سے پوچھا۔ وہ الٹا اس کے سر ہو گیا۔ "تو کیا دے رہا تھا مجھے؟ دو لاکھ روپے... اس بابو نے مجھے پانچ لاکھ دیے تو میں نینا کا بیاہ اس سے کیوں نہ کرتا...؟"

"تو نے اسے بیچ دیا ہے۔" ہاشم نے تلخی سے کہا۔

کریم قہقہہ مار کر ہنسا۔ "پاگل کے بچے... تو کیا تجھے نہیں بیچ رہا تھا۔ جب بیچنا ہی تھا تو زیادہ قیمت کیوں نہ لیتا۔"

ہاشم ضبط سے کام لے رہا تھا کیونکہ اسے نینا کا معلوم کرنا تھا مگر کریم کو بھی نہیں معلوم تھا کہ شیرازی نامی بندہ نینا کو بیاہ کر کہاں لے گیا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور کریم نے پوچھا بھی نہیں کیونکہ اسے رقم مل گئی تھی۔ اس کے بعد اس کی بلا سے وہ نینا کو کسی جہنم میں لے جاتا۔ مشکل سے چھ مہینے میں اس نے پانچ لاکھ کی رقم نشے اور جوئے میں اڑا دی تھی۔ ہاشم کو یقین نہیں تھا کہ وہ نینا کے موجودہ پتے سے ناواقف ہے۔ اس نے بڈھے کا گلا پکڑ لیا۔ اس بار بھی لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا۔ ہاشم پاگل ہو رہا تھا۔ قبیلے کے سردار نے اسے سرزنش کی کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے اپنے طور پر فیصلہ کیوں کر رہا ہے۔ ہاشم اس پر بھی چڑھ دوڑا۔

"تم کیا کر لو گے... جب تمہیں پتا تھا کہ یہ نینا کے لیے مجھے زبان دے چکا ہے تو تم نے اسے روکا کیوں نہیں؟"

"اس نے خاموشی سے کام کیا تھا۔" سردار نے صفائی پیش کی۔ "بعد میں، میں نے اسے برا بھلا کہا لیکن پھر کیا ہو سکتا تھا۔"

ہاشم جانتا تھا کہ سردار بھی اس سودے میں شامل ہو گا۔ یہ ناممکن تھا کہ قبیلے میں اس قسم کی کوئی سودے بازی ہو اور سردار کو علم نہ ہو۔ اگر کریم نے یہ سودا اس کی لاعلمی میں کیا ہوتا تو وہ بعد میں کریم کی کھال اتار لیتا۔ ہاشم بے بس تھا۔ وہ سارے قبیلے سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ اسے ان سب سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا کوئی جذباتی رشتہ بھی نہیں تھا۔ ماں بچپن میں مر گئی تھی اور باپ نے دوسری شادی کی تو اس کے لیے جیتے جی مر گیا تھا۔ باقی بہن بھائی تو سوتیلے تھے ہی...





اتنی بڑی دنیا میں اگر اس نے کسی کو اپنا جانا تھا تو وہ نینا تھی اور اب وہ بھی اس سے چھین لی گئی تھی۔ وہ کسی اور کی ہو گئی تھی لیکن ہاشم نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک بار اسے تلاش ضرور کرے گا۔ وہ ان بے حس اور انسانیت سے عاری لوگوں پر ہمیشہ کے لیے لعنت بھیج کر نکل گیا۔

☆☆☆

رل اپنے اپارٹمنٹ میں تھی۔ اس نے آنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ زین کو کال کی۔ "میں واپس آ گئی ہوں۔"

"تم نے اچھے موقع پر کال کی ہے۔ میرے پاس کچھ خاص اطلاعات ہیں۔"

"اگر تمہاری اطلاعات اس نئی ماڈل کے بارے میں ہیں جسے شیرازی سامنے لایا ہے تو میں اسے دیکھ چکی ہوں۔" رل نے سرد لہجے میں کہا۔

رل نے اپنا سیل فون بند کر کے بیڈ کی طرف اچھال دیا۔ مہناز اس کے ساتھ آئی تھی۔ رل یہاں اکیلی رہتی تھی اور دو بیڈ روم خالی تھے اس لیے اس نے مہناز کو اپنے ساتھ رکھنے کی پیشکش کی تو وہ خوش ہو گئی۔ مہناز کی پوری فیملی بیرون ملک ہی آباد تھی۔ یہاں اس کے کچھ دور پرے کے رشتے دار تھے۔ اسے مجبوراً کہیں اکیلے رہنا پڑتا لیکن رل نے اس کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ رل اپنے لیے کھانا خود بناتی تھی اور وہ سادہ کھانے کی عادی تھی۔ اسے کسی قسم کے نشے کی علت نہیں تھی۔ وہ کافی اور چائے بھی بہت کم پیتی تھی۔ اپنا وزن کم رکھنے کے لیے وہ اورنج اور لیمن جوس زیادہ پیتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سپر ماڈل کی زندگی بہت کم ہوتی ہے۔ چار پانچ سال یا زیادہ سے زیادہ سات آٹھ سال اور اس دوران میں وہ جو کماتی، وہی اس کے کام آتا۔

رل کے پاس اب زیادہ وقت نہیں تھا۔ آنے والے تین چار سال میں اسے خود کو اسی طرح اسمارٹ اور تر و تازہ رکھنا تھا۔ اس نے شوبزنس میں آنے کے بعد دوسری ماڈلز کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا بغور مشاہدہ کیا تھا اور اس نے کامیابی کا گر اپنی گرہ میں باندھ لیا تھا کہ جب تک وہ حسین اور فٹ رہے گی، اس کا عروج جاری رہے گا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہر قسم کے نشے سے گریز کرے۔ سادہ غذا استعمال کرے اور خود کو فٹ رکھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ملک کی کامیاب ترین ماڈل تھی۔ وہ اتنا کما چکی تھی کہ چاہتی تو کسی بڑے بنگلے میں منتقل ہو جاتی لیکن اسے یہ اپارٹمنٹ اور اس سے زیادہ، اس کی لوکیشن پسند تھی۔ ویسے بھی اس کی نظر اب بین الاقوامی شوبز پر تھی جس کا مرکز گلف بنتا جا رہا تھا۔

اس کے شوٹ نہایت کامیاب رہے تھے اور کمپنی نے خوش ہو کر اسے معاہدے کا چالیس فیصد بونس دینے کا فیصلہ کیا تھا اور ساتھ ہی ایسے اشارے بھی مل رہے تھے کہ معاہدے میں مزید ایک سال کی توسیع بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن رل نے فی الحال اس اشارے پر کوئی توجہ نہیں دی تھی کیونکہ ایک اور ملٹی نیشنل کمپنی کے نمائندے نے اس سے رابطہ کیا تھا اور اسے ایک سال کے لیے اس سے دگنے معاوضے کی پیشکش کی تھی۔ ان کی شرط بھی یہی تھی کہ وہ اس دوران میں کسی اور کمپنی کی پروڈکٹ کے لیے ماڈلنگ نہیں کرے گی۔ رل نے اس نمائندے کو بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ابھی اس معاملے میں غور کرنا چاہتی تھی۔ ابھی تک یہ کام شیرازی کرتا آیا تھا۔ اس کے سارے معاملات وہی طے کرتا تھا۔ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا مگر اب رل کو اپنے تمام فیصلے خود کرنے تھے اس لیے وہ بہت پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہی تھی۔

چھ مہینے کے مسلسل شوٹنگ سیشن کے بعد اسے ایک مہینے کا آرام دیا گیا تھا۔ کمپنی نے اسے ورلڈ ٹور کی پیشکش کی تھی لیکن رل نے اپنے ملک میں آرام کو ترجیح دی تھی۔ وہ بہت تھک گئی تھی اور اس نے چھ مہینے کے دوران میں دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر کر لیا تھا۔ اسے مزید کسی ورلڈ ٹور کے بجائے آرام کی ضرورت تھی۔ نئی ماڈل نینا کے بارے میں اسے بیرون ملک ہی میں بھنک مل گئی تھی۔ پھر اس نے اسے ٹی وی اور انٹرنیٹ پر بھی دیکھ لیا تھا۔ اسے شیرازی پروموٹ کر رہا تھا۔ شوبزنس کے حلقے نینا کو شیرازی کی ایک اور دریافت قرار دے رہے تھے اور بعض کا کہنا تھا کہ وہ رل سے بہتر اور خوب صورت ماڈل ثابت ہو گی۔ ائرپورٹ پر اس کا ٹی وی ایڈ دیکھ کر رل فکرمند ہو گئی تھی۔ مگر ساتھ ہی اسے اطمینان تھا کہ ابھی نینا خاصی پیچھے تھی اور پھر نینا اس کی طرح کی ایک ماڈل ہی تو تھی۔ جو کامیابی وہ اب حاصل کر رہی تھی، وہ رل پہلے ہی حاصل کر چکی تھی۔ اس کی فکر کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پیچھے شیرازی تھا۔ وہ باتھ روم سے نہا کر نکلی تو اس کے سیل فون کی بیل بج رہی تھی۔ کال شیرازی کی تھی۔ اس نے سوچا اور کال ریسیو کر لی۔ "مبارک ہو۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"شکریہ۔" شیرازی نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔ "تم نے نینا کو دیکھ لیا ہو گا؟"

"ہاں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "اچھی لڑکی ہے۔"

"صرف اچھی نہیں، بہت اچھی لڑکی ہے۔" شیرازی

نے کہا۔ ''یہ بہت آگے جائے گی۔ بہت سارے لوگوں سے آگے نکل جائے گی۔''

''ممکن ہے... ویسے تم نے اسے حاصل کہاں سے کیا ہے؟''

''حاصل۔'' شیرازی نے قہقہہ لگایا۔ ''میں نے اسے تخلیق کیا ہے۔''

''لگتا ہے اب تم خدائی دعوے پر اتر آئے ہو۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' شیرازی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''کچھ عرصے رک جاؤ، میں اسے ثابت بھی کردوں گا۔''

''کیا تم نے مجھے یہی بتانے کے لیے کال کی ہے؟''

''نہیں، ایک مشورہ بھی دینا تھا۔ بہتر ہے جہاں سے آئی ہو وہیں لوٹ جاؤ۔ یہاں اب تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''مشورے کا شکریہ، میں اپنی بہتری خود سمجھتی ہوں۔'' رل نے تلخی سے کہا اور کال منقطع کردی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ کیا شیرازی نے اسے دھمکی دی تھی؟

☆☆☆

نیتا نیلے رنگ کی دیوار کے سامنے کھڑی مختلف پوز دے رہی تھی۔ اس نے زعفرانی رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ فوٹو گرافر نے اسے کیمرے کی آنکھ سے دیکھا اور اسے ساڑی کا پلو ذرا سرکانے کا اشارہ کیا۔ نیتا ہچکچائی کیونکہ بلاؤز مختصر سا تھا مگر اسے اشارے پر عمل کرنا ہی تھا۔ اس نے پلو نیچے کیا اور فوٹو گرافر نے مطمئن ہو کر کیمرے کا بٹن دبانا شروع کیا۔ وہ دائرے کی صورت میں گھوم رہا تھا اور بٹن دبا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ نیتا بھی پوز بدل رہی تھی۔ یہ فوٹو سیشن ایک معروف فیشن میگزین کے لیے تھا۔ یہ بین الاقوامی میگزین تھا اور اس کے فوٹو سیشن کے لیے ماڈلز مری جاتی تھیں کیونکہ اس فوٹو سیشن کے بعد وہ یکایک ساری دنیا میں جانی پہچانی ہو جاتی تھیں۔ نیتا کے لیے اس فوٹو سیشن کی آفر خود میگزین کی طرف سے آئی تھی۔ چند اشتہارات میں کام کر کے وہ سب کی نظروں میں آگئی تھی۔ اس کے کام کے ساتھ اس کا حسن اور دلکشی بھی اس کا سبب تھی۔ ساڑی کا سیشن ختم ہوا تو وہ ڈریسنگ روم میں آئی جہاں اسے اگلے سیشن کے لیے لباس بدلنا تھا۔ میگزین کی وارڈ روب اسسٹنٹ اس کی مدد کے لیے موجود تھی۔ اس نے منی شرٹ کے ساتھ منی اسکرٹ نیتا کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' نیتا نے پوچھا۔

''اب اس کا سیشن ہوگا۔'' اسسٹنٹ لڑکی نے کہا۔

اب تک نیتا نے جو لباس پہنے تھے، وہ بھی عام لباس نہیں تھے اور تقریباً سارے لباس اسے نمایاں کر رہے تھے لیکن یہ تو بہت چھوٹا لباس تھا۔ اگرچہ شیرازی نے اسے بتایا تھا کہ اسے ہر طرح کی ایکسپوزنگ کے لیے تیار رہنا ہے لیکن اس نے اس قسم کا لباس پہننے کا نہیں سوچا تھا۔ اس نے سرد آہ بھری۔ وہ انکار نہیں کرسکتی تھی۔ مجبوراً وہ لباس بدلنے لگی۔ فوٹو سیشن دو دن سے جاری تھا اور شاید ایک دن اور سیشن ہوتا۔ فوٹو سیشن ساحل کے پاس ایک بنگلے میں جاری تھا۔ چھ مہینے تک وہ اسی کوٹھی میں رہی تھی جہاں شیرازی نے اسے بھیجا تھا لیکن جیسے ہی اسے شو بزنس میں متعارف کرایا گیا، اسے ایک چھوٹے لیکن خوب صورت بنگلے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ بنگلا شیرازی نے کرائے پر حاصل کیا تھا اور نیتا یہاں رشنا اور سامی کے ساتھ رہتی تھی۔ سامی اس کی سیکریٹری تھی۔ رشنا اس کے لیے بظاہر محافظ اور ڈرائیور تھی لیکن درحقیقت وہ اس کی نگران بھی تھی۔

نہ صرف گھر میں بلکہ گھر سے باہر بھی وہ مسلسل رشنا کی نامحسوس نگرانی میں رہتی تھی۔ وہ اسے کسی بھی شخص سے زیادہ گھلنے ملنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس کی تمام مصروفیات پہلے سے طے شدہ ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ اگر کہیں کوئی غیر متوقع ملاقات پیش آتی یا کوئی پرستار نیتا کے پاس آنے کی کوشش کرتا تو رشنا نہایت مہارت سے اسے نیتا سے دور کر دیتی تھی۔ شوٹ سیٹ پر سامی موجود ہوتی تھی۔ اگرچہ اس نے کبھی نیتا کو نگرانی کا تاثر نہیں دیا تھا لیکن جب کوئی نیتا سے غیر ضروری طور پر فری ہونے کی کوشش کرتا تو سامی رشنا کا کردار ادا کرتی تھی۔ دکھاوے کے لیے نیتا کے پاس موبائل بھی تھا لیکن وہ سامی کی تحویل میں رہتا تھا اور نیتا نے آج تک اس سے صرف شیرازی کی آواز سنی تھی۔ سامی نے اسے کمپیوٹر استعمال کرنا بھی سکھایا تھا۔ اس کے لیے ایک جدید لیپ ٹاپ لیا گیا تھا مگر اس کی مدد سے بھی وہ کسی سے رابطہ نہیں کرسکتی تھی اور وہ رابطہ بھی کس سے کرتی؟ وہ کسی کو جانتی ہی نہیں تھی۔ اس کے باوجود شیرازی اینڈ کمپنی اسے کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ان کی نگرانی مکمل اور روزِ اول کی طرح سخت تھی بلکہ اس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوا تھا۔

ان چھ مہینوں میں نیتا نے جو سیکھا اور کیا تھا، اپنی سابقہ زندگی میں اس نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسے رقص کرنا آگیا تھا۔ وہ مختلف انداز سے چلنے پر قادر ہوگئی تھی۔ اس کا استخوانی بدن پیچ و خم سے آراستہ ہوگیا تھا۔ اس کا رنگ نکھر





گیا تھا۔ اس کی ناک اور ہونٹ سرجری سے گزر کر بالکل بدل گئے تھے۔ وہ آئینہ دیکھتی تو اسے شک ہوتا تھا کہ وہ وہی نیتا ہے جس کی طرف سوائے ہاشم کے اور کوئی متوجہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ہاشم نے بھی اس کی صورت یا جسم نہیں دیکھا تھا، وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ لیکن اب اس کے دیوانوں کی تعداد نامعلوم ہو چکی تھی۔ جب وہ شوٹنگ یا فوٹو سیشن کراتی تو موقع پر موجود ہر مرد کی نظریں اس کے وجود سے جیسے چپک جاتی تھیں۔ یہ نظریں اسے بتاتی تھیں کہ وہ کیا سے کیا ہوگئی ہے مگر اسے یہ نظریں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ وہ ان کی عادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ ان نظروں سے بچ کر کہیں دور چلی جائے۔

شیرازی نے اس کے لیے لاکھوں خرچ کیے تھے۔ اسے دنیا کی بہترین آسائشیں دی تھیں۔ اس کی رہائش، خوراک، لباس اور گاڑی سب بہترین تھی۔ اسے اپنے کام اور معمولات کے علاوہ انگلی بھی نہیں ہلانی پڑتی تھی۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ جو کر رہی ہے، اس سے شیرازی کیا حاصل کر رہا ہے۔ رقم کے معاملات اس کے علم میں نہیں تھے۔ تمام لین دین شیرازی ہی کرتا تھا اور نیتا کو صرف کاغذات پر دستخط کرنے ہوتے تھے۔ اس دوران میں آہستہ آہستہ اسے شو بزنس کی دنیا میں متعارف کرایا جا رہا تھا۔ اس کے کئی انٹرویوز ہو چکے تھے اور ان تمام انٹرویوز سے پہلے اسے ان کی مکمل ریہرسل کرائی جاتی تھی کہ اسے کس سوال کے جواب میں کیا کہنا ہے۔ اسے اپنے پس منظر کے بارے میں بتانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے ایسے ہر سوال کا جواب معنی خیز خاموشی سے دینا سکھایا گیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اس کے بارے میں سنسنی آمیز تجسس پھیل گیا تھا اور میڈیا میں اس کے بارے میں افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ اس کا تعلق کسی قدامت پرست گھرانے سے ہے اس لیے وہ اس بارے میں لب کشائی سے گریز کر رہی ہے۔ اس کے حسن و دلکشی اور اس کے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ اس کا تعلق کسی بہت اچھی اور مہذب فیملی سے ہے۔ جب نیتا یہ سنتی تھی تو ہنستی... اگر یہ لوگ جان جائیں کہ اس کا تعلق اصل میں کہاں سے تھا اور چند مہینے پہلے وہ کیا تھی تو شاید کوئی اس پر یقین نہ کرے اور اس سچ کو گپ قرار دے گا۔ شیرازی اس سے بہت خوش تھا اور جب اس نے نیتا کو بتایا کہ وہ آغاز میں ہی چھا گئی ہے تو اسے یقین نہیں آیا تھا۔ اسے سب عام سا اور معمول کے مطابق لگتا تھا مگر شیرازی اس دنیا کا آدمی تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ

نیتا بہت تیزی سے اوپر آئی ہے۔ یہ اس کی توقع سے بھی زیادہ تھا۔

تقریباً دس مہینے پہلے شیرازی نے نیتا کی تصویر ایک سوشل میگزین میں دیکھی تھی۔ رپورٹر نے شہر میں پائے جانے والے خانہ بدوشوں پر ایک رپورٹ لکھی تھی۔ اس نے کچھ تصاویر بھی لی تھیں اور ان میں ایک تصویر نیتا کی بھی تھی جو اس کی بے خبری میں لی گئی تھی۔ وہ ایک خیمے کے ساتھ کھڑی خالی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ، اس کے تاثرات اور نگاہوں کے خالی پن نے شیرازی کو متاثر کیا تھا۔ اس نے رپورٹر سے رابطہ کر کے اس سے اس تصویر کے بارے میں پوچھا۔ رپورٹر اس کا واقف کار تھا۔ اس نے اسے بتادیا کہ خانہ بدوشوں کا یہ قبیلہ کہاں پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد شیرازی خود وہاں گیا تھا۔ اس نے نیتا کو دیکھا اور اسی وقت فیصلہ کرلیا۔ اس کے بعد اس نے بڑی احتیاط سے نیتا کے باپ سے رابطہ کیا۔ خاموشی سے سامنے آئے بغیر اس نے یہ ساری کارروائی کی۔ اسے سوائے نیتا کے باپ کے اور کسی نے نہیں دیکھا تھا بلکہ اس نے بھی صرف وہ رقم دیکھی تھی۔ پانچ لاکھ کی رقم اس کے تصور سے بھی زیادہ تھی اس لیے اس نے آنکھ بند کر کے یہ پیشکش قبول کرلی۔ نیتا کی طرف سے نکاح نامے پر دستخط بھی اس نے خود کر دیے تھے۔ اس کے بعد وہ خود اسے شیرازی کی گاڑی تک لایا تھا اور اسے گاڑی میں دھکیل کر فوراً واپس چلا گیا۔

شروع میں شیرازی، رل پر طیش کھا رہا تھا لیکن جیسے جیسے اسے احساس ہوتا گیا کہ اس نے اصل میں اس کے ساتھ کیا کیا ہے، اس کا طیش گہری نفرت میں بدلتا گیا۔ وہ آج تک ماڈلز بناتا آیا تھا۔ وہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتا تھا۔ ان سے تسکین حاصل کرتا اور ان سے کماتا تھا۔ جب اس کا دل بھر جاتا اور ماڈل اس کے قلب و نظر سے اتر جاتی تو وہ بے پروائی سے اسے چھوڑ دیتا اور پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ وہ آج تک دوسروں کو چھوڑتا آیا تھا۔ کسی ماڈل میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ شیرازی کو چھوڑ سکے۔ یہ جسارت پہلی بار رل نے کی۔ شیرازی اسے اپنی سب سے بہترین کاوش سمجھتا تھا۔ اسے سنوارنے اور آگے لانے کے لیے اس نے انتھک محنت کی تھی۔ لیکن رل نے کیا کیا؟ اس نے سمجھ لیا وہی سب کچھ ہے اور اسے بنانے اور اس مقام تک لانے میں شیرازی کا کوئی خاص کردار نہیں ہے۔ وہ اس کے بغیر بھی کامیابی حاصل کرسکتی ہے۔ اس نے جو معاہدہ دھوکا دے کر کیا تھا، وہ اصل میں شیرازی کی محنت کا نتیجہ تھا۔ رل

اس کے بغیر کسی صورت پہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے شیرازی کی ذات کی نفی کر دی تھی، جب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ رل کو عملی طور پر دکھائے گا کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔

نینا نے اسے متاثر کیا تھا۔ اس کی آنکھیں بے حد تاثر انگیز تھیں اور ایک ماڈل کی کامیابی میں اس کی آنکھیں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن وہ اتنی باصلاحیت ثابت ہوگی، یہ شیرازی نے بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ جیسا چاہتا تھا، نینا نے اس سے بڑھ کر کیا تھا۔ اسے جسمانی طور پر نکھارنے کا منصوبہ شیرازی کا تھا لیکن اس کا ذہنی نکھار خود اس کی ذہانت کا ثبوت تھا۔ اس نے آغاز میں ہی سب کو متوجہ کر لیا تھا اور پھر اس کی پُراسرار شخصیت نے پبلسٹی میں اہم کردار ادا کیا۔ دو مہینے میں وہ شوبزنس میڈیا کا ہاٹ ٹاپک بن چکی تھی۔ سب اس کے بارے میں جاننا چاہتے تھے، اسے دیکھنا چاہتے تھے اور اس کے بارے میں سننا اور پڑھنا چاہتے تھے۔ نینا کا میگزین فوٹو شوٹ آؤٹ بھی نہایت کامیاب رہا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ بین الاقوامی سطح پہ پہچانی جانے لگی تھی۔ شیرازی کے پاس اس کے لیے کچھ آفرز آئی تھیں لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ صبر سے انتظار کر رہا تھا، اس آفر کا جو نینا کو ایک ہی بار میں رل کے برابر لے جا کر کھڑا کر دے۔ نینا کو جس طرح پذیرائی ملی تھی، اس سے لگ رہا تھا کہ وہ وقت زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے رل کو مزہ بھی چکھانا تھا۔

شیرازی نینا کی نگرانی اور اس کے ماضی کے بارے میں بہت محتاط تھا۔ اس نے نینا کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنے ماضی کے بارے میں کسی کو نہ بتائے۔ حتیٰ کہ رشنا اور سامی کو بھی نہیں بتائے گی۔ نینا نے اس کی ہدایت پر پورا عمل کیا تھا۔ رشنا نے اس کا ابتدائی حلیہ دیکھا تھا لیکن اس کے پس منظر سے وہ بے خبر تھی۔ نہ تو اس نے کبھی رشنا کو اپنے بارے میں بتایا اور نہ رشنا نے کبھی اس سے اس کے پس منظر کے بارے میں پوچھا۔ سامی نے بھی کبھی اس سے اس کے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ کام اور معمولات کے علاوہ نینا کا وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا جہاں اس کے لیے ایک بڑے سائز کا ٹی وی اور مخصوص چینل کا سیٹلائٹ پیکیج تھا جس میں زیادہ تر شوبزنس کے چینلز آتے تھے۔ شیرازی کی طرف سے حکم تھا کہ وہ ان چینلز کو باقاعدگی سے دیکھتی رہے اور سیکھتی رہے کہ شوبزنس میں کیا ہو رہا ہے۔ تقریباً سارے چینلز انگریزی کے تھے اور جو مقامی تھے ان میں بھی زیادہ تر انگریزی ہی بولی جاتی تھی لیکن فراز کی شاگردی اور سامی کی تربیت نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اب اسے انگریزی سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی تھی۔

☆☆☆

رل کار خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ عام طور سے وہ اپنی سیکریٹری مہناز کے ساتھ ہی کہیں جاتی تھی لیکن آج وہ اکیلی جا رہی تھی۔ اس کا رخ شہر کے ایک پُرسکون حصے کی طرف تھا۔ اس نے ایک خاموش نظر آنے والی پرانی طرز کی کوٹھی کے سامنے کار روکی اور اتر کر اندر آگئی۔ شہر کے رواج کے برعکس نہ تو گیٹ مقفل تھا اور نہ اس پر کوئی چوکیدار تھا۔ البتہ اندر ایک خوفناک نظر آنے والے کتے نے دم ہلا کر رل کا استقبال کیا۔ وہ اس کے پاس آیا تو رل نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ ”جیکی بوائے... ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟“

جیکی کوٹھی کی طرف منہ کر کے ہلکا سا بھونکا۔ یہ اشارہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اندر موجود ہیں۔ وہ برآمدے تک آئی۔ دستک کے جواب میں ڈاکٹر افتخار احمد کی بیگم خود نکل آئیں۔ انہوں نے رل کو گرم جوشی سے گلے لگایا۔

”گڑیا! کتنے دن بعد آئی ہو... بے بی روز پوچھتی ہے۔“

”میں ملک سے باہر تھی۔ آپ کیسی ہیں؟ ڈاکٹر صاحب کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں لیکن کلینک میں مصروف ہیں۔ اگر تم بے بی کو دیکھنا چاہتی ہو تو اس کے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں تمہارے لیے گرین ٹی لاتی ہوں۔“

وہ کوٹھی کے عقبی خوب صورت لان کی طرف واقع کمرے میں داخل ہوئی تو ایک نوجوان لڑکی راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے لان میں رکھے پرندوں کے پنجروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ کھل اٹھی اور تیزی سے اس کے گلے لگ گئی۔ وہ رل کی بہن ایمل تھی۔ اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔ ”کتنے دن بعد آئی ہیں۔ میں آپ کو روز ٹی وی پر دیکھتی ہوں۔“

”میں کام کے لیے باہر گئی تھی۔“ رل نے اسے پیار کیا اور ایک بڑا سا شاپر اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ ”دیکھو تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔“

ایمل نے شاپر کھول کر دیکھا۔ اس میں اس کے لیے سوٹ اور بہت ساری دوسری چیزیں تھیں۔ وہ خوش ہوگئی۔ ایک ایک چیز اٹھا کر اس کی تعریف کر رہی تھی۔ پھر اچانک ہی وہ اداس ہوگئی۔ اس نے بہن سے کہا۔ ”میں اب آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“

رل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”میری جان! میری بھی یہی خواہش ہے۔ لیکن جب تک ڈاکٹر انکل اجازت نہیں دیں گے، تم میرے ساتھ نہیں جا سکتی ہو۔“

”میں ڈاکٹر انکل سے کہتی ہوں، وہ مجھے اجازت دے دیں گے۔“ ایمل نے یقین سے کہا۔ ”اب مجھے ڈر نہیں لگتا ہے اور خواب بھی نہیں آتے ہیں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ رل بولی۔ ”میں ڈاکٹر انکل سے بات کرتی ہوں۔“

مسز افتخار گرین ٹی اور ساتھ میں اپنے بنائے کچھ لوازمات لے آئی تھیں۔ کچھ دیر ایمل کے پاس بیٹھ کر رل کلینک والے حصے میں آگئی۔ اتفاق سے آخری مریض بھی جا چکا تھا اور ڈاکٹر افتخار احمد فارغ تھے۔ انہوں نے گرم جوشی سے رل کا استقبال کیا۔ ”کیسی ہو، بہت دن بعد آئیں؟“

”آپ تیسرے فرد ہیں جو یہ بات کہہ رہے ہیں۔“ رل ہنسی۔ ”میں واقعی دیر سے آئی ہوں۔“

کچھ دیر گپ شپ کے بعد وہ اصل موضوع پر آگئی۔ ”ایمل کی حالت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے... چند مہینے سے اس نے خاصا امپروو کیا ہے۔“

”اگر میں اسے ساتھ لے جانا چاہوں تو؟“

”اسے تبدیلی کی ضرورت ہے لیکن اگر یہاں سے نکل کر اسے پرانا ماحول نظر آیا تو ممکن ہے اس کے الٹ ہو جائے۔ اسے مکمل تبدیلی کی ضرورت ہے۔ دوسرے اسے تمہاری مکمل توجہ کی بھی ضرورت ہوگی۔ اکیلے رہنا اس کے لیے ٹھیک نہیں ہوگا۔“

رل نے بے بسی سے کہا۔ ”یہ میری مجبوری ہے۔ مصروفیت اتنی زیادہ ہے کہ مجھے بہ مشکل سونے اور کھانے کا وقت ملتا ہے۔ ان دنوں میں چھٹی پر ہوں۔“

ڈاکٹر افتخار نے سر ہلایا۔ ”اس صورت میں بہتر ہے کہ اسے یہیں رہنے دو۔ وہ تمہاری آنٹی کے ساتھ خوش رہتی ہے۔ فائزہ اسے اپنے ساتھ لگائے رکھتی ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے گھر میں بھی کچھ رونق رہتی ہے ورنہ ہم دو ہی تو میاں بیوی ہیں۔“

”اسی وجہ سے میں ایمل سے اتنی بے فکر ہوں۔ میں نے تو کوئی ایسی نیکی نہیں کی جس کے صلے میں خدا نے آپ جیسے لوگوں سے ملوایا۔“

”ڈونٹ بی سلی۔“ ڈاکٹر افتخار احمد شفقت سے بولے۔ ”تمہیں جلدی تو نہیں ہے؟ آج کا دن ایمل کے ساتھ گزارو اور دوپہر کا کھانا بھی ہمارے ساتھ کھاؤ۔“

”میں نے بتایا نا کہ میں چھٹی پر ہوں۔“ رل نے جواب دیا اور ایک چھوٹا سا لفافہ نکال کر ڈاکٹر افتخار احمد کی طرف بڑھا دیا۔

”اس کی ضرورت تو نہیں ہے، خیر غریبوں کے کام آئے گا۔ اب مریضوں میں ایسے لوگ بھی آنے لگے ہیں جن کے پاس ایک وقت کے کھانے کو بھی نہیں ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر افتخار احمد ماہر نفسیات تھے اور اس کوٹھی میں اپنا کلینک چلا رہے تھے۔ غریبوں کا مفت علاج کرتے تھے اور ان کے چند دولت مند مریض اور دوست تھے جن کے عطیے سے ان کا کلینک چل رہا تھا۔ ذاتی طور پر دونوں میاں بیوی بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ اتنی بڑی کوٹھی میں صرف ایک ملازم تھا اور باقی سارا کام وہ خود کرتے تھے۔ وہ شام تک وہاں رہی۔ وہ بھی خوش تھی اور ایمل اس سے زیادہ خوش تھی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ ان لوگوں کا مزید وقت نہیں لینا چاہتی تھی۔ شام کو وہ واپس جانے کے لیے نکلی۔ اس کا ذہن ایمل کے بارے میں سوچ رہا تھا اس لیے جب وہ سیاہ کار اچانک سامنے آئی تو رل کو بریک لگانے کا موقع تاخیر سے ملا اور کار رکتے رکتے بھی سیاہ کار سے ٹکرا گئی۔ چھناکے سے اس کی سامنے والی ہیڈ لائٹس بکھر گئیں۔ جھٹکے سے سنبھل کر اس نے سامنے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایک حادثہ ہے۔ مگر فوراً ہی کار سے اتر کر دو نقاب پوش اس کی طرف لپکے تو رل کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے پھرتی سے بٹن دبا کر تمام دروازے سینٹرل لاک کر دیے۔

خوش قسمتی سے انجن چل رہا تھا ورنہ انجن بند ہو جاتا تو آٹومیٹک سسٹم بھی کام نہیں کرتا۔ جیسے ہی اس نے کار کو ریورس گیئر میں ڈالا، ایک نقاب پوش نے کہنی کے وار سے اس کی طرف کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا اور ایک اسپرے بوتل سامنے کی۔ ایکسلریٹر دباتے ہوئے رل نے چہرہ گھما لیا تھا اس لیے اسپرے سے نکلنے والی پھوار اس کے چہرے پر براہ راست نہیں آسکی تھی۔ لیکن اسپرے کا کچھ حصہ اس کی گردن اور دائیں رخسار کے نچلے حصے پر آیا۔ رل کو لگا جیسے اس پہ تیزاب اسپرے کیا گیا ہے۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ جلن ناقابل برداشت تھی۔ اسپرے کا زیادہ حصہ اسٹیئرنگ اور ڈیش بورڈ پہ گیا تھا۔ وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ جلنے جیسی اور تیز کڑوی بو آ رہی تھی۔ یہ تیزاب ہی تھا۔

تکلیف اور بدحواسی میں ریورس کرتے ہوئے کار عقب میں ایک کیاری میں گھس گئی۔ اس نے گیئر بدلنے کی کوشش کی تو انجن بند ہو گیا۔ اس نے جلدی سے چابی

گھمائی لیکن انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ اسپرے کرنے والا نقاب پوش پھر آ رہا تھا۔ اتنی دیر میں رل کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی اور وہ چیخ رہی تھی۔ اس آدمی کو آتے دیکھ کر رل نے چیخ ماری اور دوسری سیٹ پر سرکی۔ نقاب پوش نے آتے ہی بوتل اندر کر کے اس پر اسپرے کرنا چاہا لیکن تکلیف کے باوجود رل نے اپنا بڑا سا بیگ سامنے کر دیا اور اس نے اسے بچا لیا ورنہ اس بار تیزاب کا اسپرے سیدھا اس کے چہرے پر آتا۔ نقاب پوش کو اس کے بعد موقع نہیں ملا۔ رل نے اس کی چیخ سنی تو ڈرتے ڈرتے بیگ سامنے سے ہٹایا اس سے بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا ایک مزدور حلیے والا آدمی نقاب پوش سے لپٹا ہوا تھا۔ پھر مزدور کی چیخ سنائی دی۔ نقاب پوش نے اس پر بھی تیزاب اسپرے کر دیا تھا۔ مزدور نے اسے چھوڑ دیا اور وہ چھوٹتے ہی اٹھ کر بھاگا۔ اس کا ساتھی پہلے ہی سیاہ کار میں گھس گیا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اتنی دیر میں کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے اور ان میں زیادہ تر آس پاس کی کوٹھیوں کے چوکیدار اور ملازم تھے۔ ان کے ڈر سے نقاب پوش بھاگ گئے تھے۔

رل کا تکلیف سے بُرا حال تھا۔ اس نے جل جانے والے بیگ سے رومال نکال کر چہرے پر رکھا۔ پھر اس نے کار کے آئینے میں دیکھا۔ گردن اور چہرے پر سرخ آبلے پڑ گئے تھے اور یہ بہت خوفناک لگ رہے تھے۔ جس نوجوان مزدور نے اسے بچایا تھا، وہ خود بھی زخمی تھا۔ تیزاب کا اسپرے اس کے ہاتھ پر لگا تھا۔ مگر اس کا زخم معمولی تھا پھر وہ جوان اور مضبوط شخص تھا اس لیے تکلیف برداشت کر رہا تھا۔ وہ رل کی طرف آیا۔ ”میڈم! آپ ٹھیک ہیں... اوہ آپ کا چہرہ...“ اس نے دیکھ لیا تھا۔ رل نے بے اختیار اپنا چہرہ رومال سے چھپا لیا۔ اب وہ تکلیف سے زیادہ یہ سوچ کر مری جا رہی تھی کہ اس کا چہرہ خراب ہو گیا ہے اور اب وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی.... اس نے رونے والے انداز میں کہا۔ ”پلیز! مجھے کسی اسپتال لے چلو۔“

مزدور اپنا بازو تھامے بیٹھا تھا۔ کہنی سے ذرا نیچے تیزاب نے اس کی کھال کو جلا دیا تھا۔ اس نے رل سے کہا۔ ”مجھے ڈرائیونگ آتی ہے لیکن یہاں اسپتال کا نہیں معلوم ہے۔“

اس دوران میں دوسرے آنے والوں نے مدد کی اور ایک نزدیکی اسپتال کا پتا سمجھایا جہاں جلنے والے زخمیوں کا علاج بھی کیا جاتا تھا۔ مزدور لڑکا اسے اسی کی کار میں بٹھا کر اسپتال پہنچا جہاں دونوں کو ابتدائی طبی امداد دی جانے لگی۔

رل اپنے زخم کے لیے بہت پریشان تھی۔ وہ بار بار ڈاکٹر سے پوچھ رہی تھی کہ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اسے تسلی دے رہا تھا کہ زخم اتنا خطرناک نہیں ہے۔ تیزاب نے کھال کا اوپری حصہ جلایا ہے مگر رل کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے اسکن اسپیشلسٹ کو کال کی اور زخم کے بارے میں بتایا۔ اس نے رل کو فوری طور پر اپنے کلینک بلوا لیا۔ وہاں سے جاتے ہوئے رل نے اسپتال والوں کے پاس نوجوان مزدور کے علاج کے لیے بیس ہزار روپے کی رقم جمع کرا دی تھی اور اپنا کارڈ بھی دیا تھا کہ وہ اس سے بعد میں ملے۔ نوجوان کا نام ہاشم علی تھا۔ اتنے خوفناک حادثے میں اطمینان کا یک ہی پہلو تھا کہ کسی نے اسے رل کے طور پر شناخت نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

شیرازی کا غصے سے بُرا حال تھا۔ اسے کچھ دیر پہلے ایک کال آئی تھی جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ رل پر حملہ تقریباً ناکام رہا تھا۔ شیرازی نے یہ کام ایک ایسے شخص کو سونپا تھا جس سے وہ پہلے بھی اسی طرح کے مجرمانہ کام لیتا رہا تھا۔ اس طرح وہ سامنے آئے بغیر ہی دوسروں کو جانی اور مالی نقصان پہنچاتا تھا۔ اس سے پہلے وہ شخص کبھی ناکام نہیں ہوا تھا لیکن اس بار اس کے آدمی ناکام رہے۔ ”انہوں نے سب پلاننگ کے مطابق کیا تھا لیکن نہ جانے کہاں سے ایک مزدور آ گیا اور اس نے رل کو بچا لیا۔ تیزاب نے اس کا کچھ چہرہ متاثر کیا لیکن پورا چہرہ بچ گیا... میں پھر کوشش کروں گا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، وہ پھر تمہیں موقع دے گی؟“ شیرازی نے طنزیہ لہجے میں کہا اور کال کاٹ دی۔ اس نے اپنے لیے ایک جام بنایا اور اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ پھر اسے میز پر پٹخ کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا غصہ کم ہونے لگا تھا۔ اگرچہ رل کا چہرہ پوری طرح بگڑنے سے بچ گیا تھا لیکن تیزاب نے پھر بھی اسے متاثر کیا تھا اور اگر اس کا نشان رہ جاتا تو اس کے فوری طور میں شوبزنس میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ شیرازی جانتا تھا کہ تیزاب سے جلا ہوا زخم ہفتوں اور بعض اوقات مہینوں میں جا کر ٹھیک ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا انتقام پورا نہیں ہوا تھا لیکن اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اچانک موبائل کی بیل بجی۔ اس نے دیکھا، اسے حیرت ہوئی۔ یہ رل کا نمبر تھا۔ وہ اس عالم میں بھی سے کال کر رہی تھی تو کیا وہ معمولی سی زخمی ہوئی تھی؟ تشویش کے ساتھ اس نے کال ریسیو کی۔

”اب تمہیں مبارک ہو۔“ رل نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"کس بات کی؟" اس نے انجان بن کر پوچھا۔

"تمہارے آدمی ناکام رہے... ان سے کہو دوبارہ کوشش کریں۔"

"میرے آدمی...؟" شیرازی نے چالاکی سے کہا۔ "میں سمجھا نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ شیرازی! تیار ہو جاؤ میں جلد تمہیں تمہارے سکوں میں ادائیگی کروں گی۔ تم سمجھتے ہو میں نے تم سے صرف وہ سیکھا ہے جو تم نے مجھے سکھایا ہے؟ نہیں، میں نے بہت کچھ ایسا بھی سیکھا ہے جو تم نے مجھے نہیں سکھایا ہے۔" رل نے کہا اور کال منقطع ہو گئی۔ شیرازی نے بے ساختہ اسے ایک گندی سی گالی دی۔ پھر اس نے اٹھ کر اپنی میز کی دراز کھولی اور اس سے ایک ریوالور نکالا۔ یہ صاف اور چمکتا ہوا جدید طرز کا ریوالور تھا۔ شیرازی نے اس کا معائنہ کیا اور پھر اسے رکھ کر اپنے لیے اگلا جام بنانے لگا۔

☆☆☆

رل ایک بہت صاف ستھرے اور ایسے کمرے میں تھی جہاں پر ہر چیز سفید تھی۔ وہ جس دھاتی میز پر لیٹی تھی، وہ بھی برف کی طرح سفید اور ٹھنڈی تھی۔ یہاں اے سی بہت تیز چل رہا تھا۔ سوائے چہرے کے پوری طرح ایک پلاسٹک کور نما لباس سے ڈھکا ہوا ڈاکٹر شفقت اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہ اسکن اسپیشلسٹ تھا اور ایک طاقتور میگنی فائنگ گلاس سے اس کے زخم کا معائنہ کر رہا تھا۔ اسپتال میں اس کا زخم کسی حد تک صاف کر دیا گیا تھا۔ گردن اور رخسار کے نچلے حصے میں تقریباً چار انچ کی کھال متاثر ہوئی تھی۔ معائنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر شفقت ایک بہت ہی باریک چمٹی نما آلے سے کھال میں پیوست تیزاب کی صفائی بھی کر رہا تھا مگر اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ تیزاب نے جلد کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ رل سکون سے انتظار کر رہی تھی کہ وہ اپنا کام ختم کرے تو وہ اپنے زخم کے بارے میں پوچھے۔ ابتدائی خوف اور بدحواسی کے بعد اس نے خود پر قابو پا لیا تھا اور یہاں آنے کے بعد اس نے شیرازی کو کال بھی کر دی تھی۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ یہ اسی کا کام ہے۔ بالآخر ڈاکٹر شفقت اپنے کام سے فارغ ہوا۔ اس نے چمٹی اور میگنی فائنگ گلاس ایک طرف رکھا۔ رل نے اس کے سوا کسی اور کو اپنا چہرہ دکھانے سے انکار کر دیا تھا اس لیے مجبوراً وہ اکیلا ہی دیکھ رہا تھا ورنہ اپنی مدد کے لیے ایک نرس تو رکھتا۔

"جلد متاثر ہوئی ہے۔" ڈاکٹر نے صاف گوئی سے کہا۔ "اسے بچانے کے لیے علاج طویل اور پیچیدہ ہو جائے گا۔"

"کیا اس میں بہت وقت لگے گا؟"

"بالکل... کم سے کم تین مہینے لگ سکتے ہیں۔ تمہیں پچاس سے ساٹھ ٹریٹ منٹس سے گزرنا ہوگا اس کے بعد ہی جلد سے تیزاب کے اثرات مکمل طور پر ختم ہوں گے۔"

رل کا دل ڈوبنے لگا۔ "اتنا ٹائم...؟"

ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ "اگر جلد بچانی ہے اور پہلے جیسی حالت میں چاہیے... ورنہ آسان حل بھی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"زخم مکمل طور پر صاف کرنا ہوگا اور پھر دوسری کھال کی گرافٹنگ ہوگی۔ کھال بھی تمہارے جسم سے لینا ہوگی۔ لیکن یہ ایک مہینے میں ہو جائے گا البتہ..."

"کیا البتہ؟"

"نشان رہ جائے گا۔ کلر میچنگ نہیں ہو پائے گی۔"

"ڈاکٹر! کچھ بھی ہو جائے تم اسی زخم کو ٹھیک کرو۔"

"میرا بھی یہی مشورہ ہے۔ تم ماڈل ہو اور تمہیں خوب صورت نظر آنا چاہیے۔ لیکن تمہیں تقریباً روز آنا ہوگا اور صفائی کے مرحلے سے گزرنا ہوگا۔ تین میں سے دو مہینے تمہارا زخم ہرا رہے گا اور تمہیں اس کی بہت حفاظت کرنا ہوگی۔ اسے پانی اور دوسری چیزوں سے بچانا ہوگا۔"

رل نے سوچا اور بولی۔ "میں کروں گی۔"

"ابھی تین دن تو تمہیں یہیں داخل رہنا ہوگا تاکہ ابتدائی صفائی کے مرحلے سے گزر سکو۔ میں کوشش کروں گا کہ پہلی پانچ سے سات صفائیاں اسی دوران میں کر لوں۔"

☆☆☆

رل اس وقت اکیلی تھی۔ اس کی سیکریٹری چھٹی کر کے جا چکی تھی۔ اس نے کلینک سے آنے سے پہلے ہی مہناز کو کال کر کے اسے واپس دبئی جانے کو کہہ دیا تھا۔ اس نے مہناز کو نہیں بتایا تھا۔ وہ حیران ہوئی تھی لیکن جب رل نے اسے کہا کہ وہ تنخواہ کے ساتھ چھٹی پر ہے تو وہ خوش ہو گئی۔ اس کے آنے سے پہلے ہی وہ واپس جا چکی تھی۔ ابتدائی صفائیاں بہت تکلیف دہ ثابت ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر شفقت بہت باریک آلات کی مدد سے اس کی کھال کے متاثرہ حصوں کی صفائی کر رہا تھا۔ اس نے زخم کو ایسی پٹی سے ڈھانپ دیا تھا جو ہوادار تھی لیکن گرد اور جراثیم روکتی تھی۔ رل کی کار اس دوران میں ڈینٹ پینٹ ہو کر آ گئی تھی۔ وہ باہر جاتے ہوئے اسکارف لیتی تھی اس سے زخم تقریباً چھپ جاتا تھا۔ وہ شام کے وقت



آئی۔ ڈیوٹی پر موجود گارڈ نے کہا۔ "میڈم! ہاشم علی نامی لڑکا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

رل کے ماتھے پر شکنیں آ گئیں۔ اس نے اسپتال میں بیس ہزار روپے جمع کرائے تھے۔ اس کے خیال میں ہاشم کے علاج کے لیے یہ رقم کافی تھی۔ پھر وہ کیوں آیا تھا؟ کیا وہ اس سے مزید رقم حاصل کرنا چاہتا تھا؟ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ گارڈ کو منع کر دے لیکن پھر اسے ہاشم کا احسان یاد آ گیا۔ اگر وہ بروقت اس کی مدد کے لیے نہ آتا تو اس وقت وہ آرام سے اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھے ہونے کے بجائے نہایت تکلیف کے ساتھ کسی اسپتال کے برن وارڈ میں پڑی ہوتی اور اس کا کیریئر ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہوتا۔ اس نے گارڈ سے کہا۔ "اسے اوپر میرے اپارٹمنٹ تک پہنچا دو۔"

چند منٹ بعد ہاشم اس کے سامنے تھا۔ اس نے صاف ستھری پتلون اور کھلی سی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا زخم تقریباً بھر جانے کی پوزیشن میں تھا۔ رل کے اشارے پر وہ ہچکچاتا ہوا لاؤنج کے صوفے پر ٹک گیا۔ رل نے پوچھا۔ "کیسے ہو اب تم... زخم ٹھیک ہو رہا ہے؟"

"جی میڈم! آپ کی مہربانی سے میرا اچھا علاج ہوا ہے۔ اب پٹی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" اس نے کہہ کر پھر دزدیدہ نظروں سے رل کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "آپ کیسی ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کسی قدر روکھائی سے کہا۔ "کیا تمہیں مزید مدد کی ضرورت ہے؟"

رل کے سوال پر ہاشم علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "آپ غلط سمجھ رہی ہیں میڈم! میں اس لیے آپ کے پاس نہیں آیا ہوں۔"

رل کو افسوس ہوا۔ اس نے جلدی سے نرم لہجے میں کہا۔ "تم جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو... تم میرے محسن ہو اور میں تمہارے لیے وہ سب کروں گی جو میرے بس میں ہو۔"

"اسی وجہ سے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ جو آپ میرے لیے کر سکتی ہیں وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مجھے امید ہے آپ مدد کریں گی تو میری ثمینا مجھے واپس مل جائے گی۔"

رل چونکی۔ "ثمینا..."

"وہ میری منگیتر تھی جی۔" ہاشم نے سادگی سے کہا پھر اس نے شروع سے آخر تک اپنی کہانی سنا دی۔ آخر میں اس نے کہا۔ "میں ثمینا کو تلاش کر رہا ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے۔ مجھے یقین ہے وہ مجھے یاد کرتی ہوگی۔"

"یہ غلط ہے جی، اس نے خود نکاح پر دستخط کر دیے تھے۔" ہاشم نے جوش سے کہا۔ "یہ نکاح غلط ہے۔"

"اگر نکاح غلط ہے، تب بھی وہ کسی کی بیوی بن چکی ہوگی۔ اگر وہ مل جائے اور تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہو جائے تب بھی وہ کنواری تو نہیں ہوگی۔"

ہاشم کا چہرہ پھر سرخ ہوا۔ "مجھے معلوم ہے پر میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ مجھے ہر حال میں قبول ہے۔"

"ٹھیک ہے، اب یہ بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

ہاشم نے ملتجی لہجے میں کہا۔ "آپ بڑے لوگ ہیں، آپ کی ہر جگہ جان پہچان ہے۔ اگر آپ کوشش کریں تو شاید ثمینا مل جائے۔"

"میں کوشش کروں گی۔" رل نے ہامی بھر لی۔ "تمہارے پاس اس کی کوئی تصویر ہے؟"

"جی ہے، دبئی جانے سے پہلے میں نے اس کی تصویر لی تھی۔" ہاشم خوش ہو کر بولا اور ایک تصویر نکال کر رل کی طرف بڑھائی۔ اس نے تصویر لے کر دیکھی اور چند لمحے نظر جما کر دیکھتی رہی۔

"ٹھیک ہے، میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں گی۔ کیا تم یہ تصویر مجھے دے سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں جی، جب آپ اسے تلاش کریں گی تو تصویر بھی آپ ہی رکھیں۔ میں تو اسے تلاش کر کر کے تھک گیا ہوں۔" ہاشم کے لہجے میں مایوسی آ گئی۔ "اس کی وجہ سے میں دبئی میں اپنی نوکری پر بھی واپس نہیں گیا۔"

رل چونکی۔ "تم دبئی میں کام کرتے ہو؟"

"جی میڈم! میں وہاں ایک تعمیراتی کمپنی میں مستری کا کام کر رہا تھا۔ ثمینا کے باپ کے لیے دو لاکھ روپے جمع کرنے تھے۔ میں جمع کر کے لے بھی آیا ہوں۔ آنے سے پہلے میرے ٹھیکیدار نے میرے کام سے خوش ہو کر میرا معاوضہ بھی بڑھا دیا تھا لیکن میں واپس ہی نہیں گیا۔ اب تک تو مجھے نوکری سے بھی نکال دیا ہوگا۔"

"تم اس کی تو فکر مت کرو۔" رل نے سوچتے ہوئے کہا۔ اپنا اندازہ غلط ہونے کے بعد کہ ہاشم اس سے کچھ وصول کرنے آیا تھا، اسے ہاشم سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ سادہ مزاج اور مخلص شخص تھا، تبھی بے دھڑک اسے بچانے کے لیے ان بدمعاشوں سے بھڑ گیا تھا اور زخمی ہونے کے باوجود اس نے ان کو کامیاب ہونے نہیں دیا تھا۔ "میں ثمینا کو تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔ اگر میں کامیاب نہ ہو

سکی، تب بھی تمہارے لیے اتنا کر سکتی ہوں کہ دبئی میں تمہاری نوکری برقرار رہے گی۔"

"میڈم! یہ آپ کی مہربانی ہے لیکن اگر مجھے نینا مل جائے تو میرے لیے یہی سب سے بڑا انعام ہوگا۔"

"تمہارا کوئی فون نمبر ہے جس پر تم سے رابطہ کیا جا سکے؟"

"جی میڈم۔" ہاشم نے اسے اپنا موبائل نمبر دیا۔

نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کرتے ہوئے رِل کو خیال آیا۔ "تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟"

"آتی ہے میڈم! جس کمپنی میں کام کرتا تھا، اس کا وین ڈرائیور میرا دوست بن گیا تھا۔ اس نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی۔ لیکن میرے پاس لائسنس نہیں ہے۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بتاؤ تم ابھی کیا کر رہے ہو؟"

"یہیں ایک ٹھیکیدار کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ اس جگہ کے پاس ایک کوٹھی میں جہاں آپ پر ان غنڈوں نے حملہ کیا تھا۔ آج کل چھٹی پر ہوں۔ جب تک زخم ٹھیک نہیں ہو جاتا، میں کام پر نہیں جا سکتا۔"

"مجھے ایک ڈرائیور کی ضرورت ہے۔ تم میرے پاس کام کرو گے؟"

"کیوں نہیں میڈم۔" ہاشم خوش ہو گیا۔ اس نے رِل حیات سے توقع لگائی تھی کہ وہ نینا کو تلاش کرے گی۔ اس کے ساتھ رہنا ہاشم کے لیے بہتر ہوتا۔ مزدوری میں اسے فرصت کہاں ملتی تھی کہ نینا کو تلاش کرنے کے لیے وقت نکال سکے۔

"بس تو اپنا حساب کر کے کل صبح تک آ جاؤ۔ ڈرائیور کی وردی لیتے آنا۔ میں اس کی قیمت دے دوں گی۔ تنخواہ پندرہ ہزار ہوگی۔ کھانے کے الگ سے دوں گی۔ ڈیوٹی صبح سے رات تک ہوگی۔ اگر رقم کی ضرورت ہے تو بتاؤ؟"

"نہیں میڈم! رقم میرے پاس ہے۔ اسپتال والوں نے بھی مجھے پانچ ہزار واپس کیے تھے۔ آپ پہلی تنخواہ سے کاٹ لیجیے گا۔ میں کل صبح آ جاؤں گا۔"

"اپنی کمپنی کا نام اور پتا بتا دو ورنہ انہوں نے ویزا کینسل کرا دیا تو تم میرے ساتھ بھی دبئی نہیں جا سکو گے۔"

ہاشم نے اس کمپنی کا نام اور پتا بتایا۔ رِل نے ہاشم کے جانے کے بعد زین کو کال کی اور اسے ہاشم اور اس کی کمپنی کے بارے میں بتا کر کہا۔ "اس کمپنی سے بات کرو اور اسے ہاشم کا ویزا کینسل کرنے سے روکو۔"

"تمہیں اس بندے سے کیا دلچسپی ہے؟"

"اسے میں نے ڈرائیور رکھ لیا ہے اور جب میں دبئی آؤں گی تو اسے ساتھ لے کر آؤں گی۔"

"تمہیں یہاں کسی ملازم کی ضرورت نہیں ہے۔" زین نے کہا۔ "کمپنی کی طرف سے تمہیں ملازم بھی فراہم کیے گئے ہیں۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" رِل رکھائی سے بولی۔

"تم واپس کب آ رہی ہو؟" زین نے وہ سوال پوچھ لیا جس کا رِل کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ "سیکنڈ اسپیل کی پلاننگ ہو چکی ہے۔"

رِل ہچکچائی۔ "کیا یہ اسپیل کچھ عرصے کے لیے ملتوی نہیں ہو سکتا؟"

زین چونکا۔ "وہ کیوں؟"

"میرے پاؤں میں تکلیف ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر نے مسلز کا مسئلہ بتایا ہے۔ اس نے کچھ عرصے آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔"

"کتنے عرصے آرام کا کہا ہے؟" زین فکرمند ہو گیا۔

"تقریباً ایک مہینا۔" رِل حیات نے جواب دیا۔ "مسلز بری طرح اسٹریچ ہوئے ہیں۔"

"میرے خدا! یہ تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔" زین نے کہا۔

"مجبوری ہے۔" رِل نے کہا۔

"ایسا کرو تم یہاں آ جاؤ... دبئی میں دنیا کے بہترین ڈاکٹرز موجود ہیں۔"

"میں جس ڈاکٹر کی پیشنٹ ہوں، وہ بھی ماہر ہے۔ میں اس کی ہدایات پر عمل کر رہی ہوں۔"

"میں شوٹ ڈائریکٹر سے بات کرتا ہوں۔"

کال کے بعد رِل نے سکون کا سانس لیا۔ اسے امید تھی کہ زین فی الوقت معاملہ سنبھال لے گا لیکن ایک مہینے بعد کیا ہوگا؟ اس بارے میں رِل نے سوچا نہیں تھا۔ ابھی وہ اپنی ساری توجہ اس مسئلے پر دینا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر یہ خبر نکل گئی تو اس کے کیریئر پر بہت برا اثر پڑے گا اس لیے وہ ممکن حد تک احتیاط کر رہی تھی۔ اس نے اپنا وہ نمبر بند کر رکھا تھا جو یہاں شوبزنس کے لوگوں کے علم میں تھا۔ اسی نمبر سے اس نے شیرازی کو کال کی تھی۔ ہاشم کو اس نے اس وجہ سے رکھ لیا تھا کہ اب اسے اکیلے باہر جاتے ہوئے خوف آ رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہوتا تو اس کا محافظ بھی بن جاتا اور سب سے اہم بات تھی کہ وہ واحد فرد تھا جو اس کے ساتھ ہونے والے حادثے سے واقف تھا اور اس سے خطرہ نہیں تھا کہ وہ یہ بات



افشا کر دے گا۔

جب ہاشم نے نینا کا نام لیا تو وہ چونکی تھی اور پھر اس کی تصویر دیکھ کر وہ دوبارہ چونک اٹھی تھی۔ پہلی بار وہ صرف نام کی مماثلت بھی تھی لیکن دوسری بار جب اس نے تصویر دیکھی تو اس کے اندر گہرا شک سر اٹھانے لگا۔ تصویر والی لڑکی بالکل مختلف تھی لیکن اس کی آنکھیں اور ماتھا بالکل ماڈل نینا جیسا تھا اور سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ اس خانہ بدوش لڑکی کو لے جانے والے کا نام بھی عامر تھا۔ اگرچہ اس نے کریم کو اپنا پورا نام نہیں بتایا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس نے نینا کو اس حد تک تبدیل کیسے کر دیا تھا؟

☆☆☆

شیرازی بہت خوش تھا۔ اس نے نینا کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ ائرپورٹ سے باہر آئے تو ایک شاندار لیموزین ان کے انتظار میں موجود تھی۔ ایک باوردی ڈرائیور نے ان کا سامان ڈکی میں رکھا اور وہ کار کی پچھلی نشست پر آ گئے۔ نینا کو صرف بارہ گھنٹے پہلے پتا چلا تھا کہ انہیں کہیں جانا ہے۔ شیرازی نے منزل کا بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ رات کے وقت طیارے میں سوار ہوئے اور ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد دبئی ائرپورٹ پر اتر گئے۔ اب وہ شہر کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں نینا نے پہلی بار اس سے سوال کیا۔ "ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"ایک بہت بڑا چانس ہمارے ہاتھ آنے والا ہے۔" شیرازی نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "لیکن یہاں نہیں، ہم ہوٹل چل کر اس پر بات کریں گے۔"

ہوٹل میں ان کے لیے دو کمرے مخصوص تھے۔ یہ فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ سامان رکھنے کے بعد شیرازی اس کے کمرے میں آ گیا۔ دونوں کمروں کے درمیان دروازہ تھا۔ نینا بیڈ پر دراز تھی۔ یہاں آنے سے صرف تین گھنٹے پہلے اس نے ایک فیشن شو میں شرکت کی تھی اور وہ تھک گئی تھی۔ شیرازی اچانک اندر آیا تو وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شیرازی نے اشارہ کیا۔ "لیٹی رہو... لیٹی رہو۔"

نینا کو اس کے سامنے لیٹنا اچھا نہیں لگ رہا تھا اور اسے غصہ آ رہا تھا کہ وہ اچانک یوں آ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ درمیانی دروازے کو اندر سے بند رکھے گی۔ "نہیں، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں... تم نے کہا تھا ہوٹل آ کر بتاؤ گے۔"

"ہاں نینا! یہ ہمارے لیے چانس ہے۔ رِل نے جس کمپنی سے معاہدہ کیا تھا، وہ اب اسے پورا نہیں کر سکتی ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ زخمی ہو گئی ہے۔" شیرازی نے کسی قدر تیز انداز میں کہا۔ "اس کے چہرے پر زخم آیا ہے اور وہ کچھ عرصے کے لیے فیلڈ سے باہر ہو گئی ہے۔ اب کمپنی کو اس کی جگہ کسی دوسری ماڈل کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت تم پوری کر سکتی ہو بشرطیکہ تم کمپنی کے مقامی ڈائریکٹر کو راضی کر لو۔"

"میں کیسے راضی کر سکتی ہوں؟" نینا نے پوچھا۔

"تم نے خود کو آئینے میں دیکھا ہے... تم کیا ہو گئی ہو؟" شیرازی لہک کر بولا۔ "ارے تم اب پتھر کو بھی حکم دو تو وہ تعمیل کرے گا۔ گوشت پوست سے بنے انسان کی حیثیت ہی کیا ہے۔"

"مجھے یہ سب نہیں آتا۔" نینا گھبرا گئی۔

شیرازی کا موڈ بدل گیا۔ اس نے نینا کو گھور کر دیکھا۔ "تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے سوائے ڈائریکٹر کے ہر حکم کی تعمیل کے۔ وہ جیسا چاہے اور جو چاہے تم نے پورا کرنا ہے۔ اس کے بعد وہ رِل سے کنٹریکٹ ختم کر کے تم سے کنٹریکٹ کرے گا۔ تم صرف پانچ مہینے میں وہ پوزیشن حاصل کر لو گی جو رِل نے پانچ سال میں حاصل کی ہے۔"

نینا سمجھ رہی تھی کہ شیرازی اسے اشارے کنائے میں کیا سمجھا رہا ہے۔ وہ پوری طرح اس شخص کی مٹھی میں تھی۔ اس نے بے بسی سے شیرازی کو دیکھا اور سر ہلایا۔ وہ خوش ہو گیا۔ "گڈ گرل... تم دیکھنا ذرا سی قربانی دے کر تم کتنا اوپر جاؤ گی۔ رِل جیسی ماڈلز تمہارے قدموں کی دھول بن جائیں گی۔ آج شام کو یہاں ایک شاندار پارٹی میں تمہاری رونمائی ہوگی اور پھر وہ ڈائریکٹر تم سے ملے گا۔ ایک بار تم نے اسے خوش کر دیا تو اس کے بعد سارے کام خود بہ خود ہوتے چلے جائیں گے۔"

شیرازی کے جاتے ہی اس نے درمیانی دروازہ اندر سے بند کیا اور بستر پر گر گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ وہ جس وقت سے ڈر رہی تھی، لگ رہا تھا وہ وقت عنقریب آنے والا ہے۔

☆☆☆

رِل، ہاشم کے ساتھ کلینک سے واپس آ رہی تھی کہ راستے میں ایک جگہ اسے ایک ہورڈنگ پر اشتہار میں نینا نظر آئی۔ ہاشم اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا سر ہورڈنگ کے ساتھ ساتھ گھوم رہا تھا۔ رِل نے یہ چیز محسوس کی تھی۔ اس نے ہاشم سے پوچھا۔ "تمہیں یہ لڑکی اچھی لگتی ہے؟"

ہاشم جھینپ گیا۔ "یہ بات نہیں ہے میڈم! میں اسے دیکھتا ہوں تو نہ جانے کیوں مجھے نینا یاد آ جاتی ہے۔"

"تم جانتے ہو اس کا نام بھی نینا ہی ہے۔" رِل نے

دیکھ سکتا تھا لیکن اس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔
"اچھا... یہ کتنا عجیب اتفاق ہے۔"
رل نے ہاشم کو نینا کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو اس کے خیال میں ہاشم جذباتی ہو جاتا اور لڑنے کے لیے شیرازی کے پاس پہنچ جاتا۔ ظاہر ہے وہ شیرازی جیسے شاطر کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرا رل کا خیال تھا کہ نینا کے لیے ہاشم اب ماضی بن چکا تھا۔ اس نے شوبزنس اور اس کے توسط سے دولت اور شہرت کا ذائقہ چکھ لیا تھا اس لیے ہاشم کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ اس لیے اسے معلوم ہوتا کہ وہ جس ماڈل کو دیکھ کر نینا کو یاد کر رہا تھا، وہی نینا ہے تو وہ اس سے ملنے کی کوشش کرتا اور شاید اس کا ردعمل ہاشم کی امیدوں کو توڑ کر رکھ دیتا، اس لیے بھی رل ہچکچا رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "فرض کرو تمہیں پتا چلے کہ یہی ماڈل نینا اصل میں تمہاری نینا ہے تو؟"
ہاشم بے ساختہ ہنسا۔ "میڈم! آپ مذاق کر رہی ہیں۔"
"نہیں، میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔" رل نے کہا تو ہاشم خاموش ہو گیا۔ رل حیات کو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے ایک مہینے کے قریب ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر شفقت اس کے زخم بھرنے کی رفتار سے مطمئن تھا۔ اس کے مطابق اس نے زخم کا ستر فیصد حصہ نقصان دہ ذرات سے مکمل طور پر صاف کر دیا تھا۔ وہ بہت جانفشانی اور باریک بینی سے کام کر رہا تھا۔ ایک سیشن میں تقریباً ایک سے ڈیڑھ گھنٹا لگتا تھا... یہ وقت رل کے لیے بھی صبر آزما ہوتا تھا۔ وہ ہاشم کو نیچے چھوڑ کر اوپر آئی تو اس کے موبائل پر زین کی کال آنے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی۔
"رل! تم کہاں ہو؟ یہاں گڑبڑ شروع ہو گئی ہے۔"
رل کا دل دھڑک اٹھا۔ "کیا مطلب... کیا ہو رہا ہے؟"
"سنو، کیا یہ درست ہے کہ تمہارے چہرے پر جلنے کا زخم ہے؟"
"ہاں، یہ درست ہے۔" اس نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔ "میں نے تم سے چھپایا تھا لیکن اب میں خود بتانے والی تھی لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟"
"رل! تم نے بہت برا کیا مجھ سے چھپا کر۔"
زین بہت پریشان لگ رہا۔ "شیرازی اپنا کام کر گیا ہے۔ اس نے مجھ سے بالا ہی بالا کمپنی کے ڈائریکٹر سے بات کی اور تمہارے بارے میں بتادیا کہ تم اب ماڈلنگ نہیں کر سکو گی۔ وہ نینا نامی ماڈل کو لایا ہے۔ ڈائریکٹر اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ خوش قسمتی سے اس کی ساس کا انتقال ہو گیا اور اسے فوری طور پر واپس انگلینڈ جانا پڑا۔ ورنہ شاید اب تک تم سے کنٹریکٹ ختم کر کے اسے سائن بھی کیا جا چکا ہوتا۔"
"کیا مطلب؟... نینا اور شیرازی دبئی میں تھے؟"
"بالکل اور یہ معاملہ اتفاق سے میرے علم میں آیا۔ ورنہ میں بھی بے خبر رہ جاتا۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا زخم کیسا ہے اور ہوا کیا تھا؟"
رل نے اسے تفصیل سے بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ "ڈاکٹر مطمئن ہے، زخم بہت تیزی سے بھر رہا ہے اور امید ہے میں آنے والے چھ ہفتے میں پہلے جیسی ہو جاؤں گی۔"
"رل، چھ ہفتے بہت ہوتے ہیں۔ اگر تم مجھے پہلے بتا دیتیں تو میں معاملہ سنبھال لیتا۔ بہر حال، میں دیکھتا ہوں۔"
"یہ اتنی آسانی سے معاہدہ ختم نہیں کر سکتے۔"
"کر سکتے ہیں... یہ معاہدہ دبئی میں اور یہاں کے قوانین کے لحاظ سے ہوا ہے اور اس میں شق ہے کہ چھ مہینے بعد کوئی فریق اگر مطمئن نہیں ہے تو معاہدہ ختم کیا جا سکتا ہے۔"
"میرا کیریئر خراب ہو جائے گا۔" رل فکرمند ہو گئی۔ اس لمحے اسے شیرازی سے نہیں بلکہ نینا سے نفرت محسوس ہو رہی تھی جو اس کا حق چھین رہی تھی۔ اس نے زین کو نینا کے بارے میں بتا دیا۔ وہ حیران ہوا۔
"یہ کیسے ممکن ہے، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں نے نینا کو ٹی وی اور میگزین میں اچھی طرح دیکھا ہے۔"
"تم شیرازی کو نہیں جانتے ہو... وہ شوبزنس کا جادوگر ہے۔ اس کے لیے بالکل ممکن ہے کہ وہ ایک خانہ بدوش جاہل لڑکی کو ایک کامیاب اور پالشڈ ماڈل کا روپ دے سکے۔"
زین سوچ میں پڑ گیا۔ رل کے یقین نے اسے بھی مجبور کر دیا تھا۔ "ٹھیک ہے، وہ اسے سکھا پڑھا سکتا ہے لیکن اس کا چہرہ...؟"
"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" رل بولی۔ "یہ تو سکھانے پڑھانے سے بھی زیادہ آسان کام ہو گیا ہے۔ آج کل کاسمیٹک سرجری فلو کے علاج کی طرح عام ہو گئی ہے۔ میں نے تقریباً ہر سپر ماڈل کو کچھ نہ کچھ کراتے دیکھا ہے۔ ذرا



سوچو، اگر اس خانہ بدوش لڑکی کی ناک کو یہ شکل دے دی جائے اور اس کا نچلا لب کسی قدر موٹا کر دیا جائے تو یہ ماڈل نینا بن جائے گی۔"
"لیکن رخساروں کی ہڈیاں...؟"
"ہڈیاں ویسی ہی ہیں لیکن ایک فاقہ زدہ لڑکی کے مقابلے میں ایک اچھی کھاتی پیتی ماڈل کے رخسار بھرے ہوتے ہیں۔ بس یہ فرق آیا ہے۔" رل بولی اور پھر انکشاف کیا۔ "اس کا نام بھی نینا ہے۔"
زین نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اگر یہ وہی خانہ بدوش لڑکی ہے تب بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اب وہ سپر ماڈل نینا ہے۔ تم جانتی ہو، سپر ماڈلز کا جسم اور چہرہ دیکھا جاتا ہے، ان کا پس منظر کوئی نہیں دیکھتا ہے۔"
رل نے مایوسی سے کہا۔ "اس کا مطلب ہے اس بات کو میڈیا پر اچھال کر بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا؟"
"نہیں بلکہ الٹا شیرازی کو شہرت مل جائے گی۔ سب اسے سراہیں گے کہ اس نے ایک جاہل خانہ بدوش بدصورت لڑکی کو کیا سے کیا بنا دیا۔"
"پھر بھی کچھ سوچو... یہ تمہاری ساکھ کا معاملہ بھی ہے۔"
زین پھر سوچ میں پڑ گیا۔ شیرازی سے اسے بھی نفرت تھی۔ شروع دنوں میں وہ شیرازی کے ساتھ کام کرتا تھا لیکن ایک ماڈل کے معاملے پر دونوں میں تنازع ہوا۔ زین اس لڑکی کو پسند کرنے لگا تھا اور اس کے سر پر شوبزنس کا بھوت سوار تھا۔ شیرازی نے اس کے جنون کو ہوا دی اور بالآخر اسے زین سے الگ کرنے میں کامیاب رہا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر دبئی چلا گیا۔ اس نے رل سے کہا... "فرض کرو، یہ نینا ہی ہے تو ہم اس سے کیسے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟"
رل ذہین تھی لیکن اس وقت اس کا ذہن کچھ زیادہ ہی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ "اگر نینا کے باپ کو اس کے پیچھے لگا دیا جائے۔"
یہ تجویز سن کر زین اچھل پڑا۔ اس نے جوش و خروش سے کہا۔ "تم نے بہترین تجویز دی ہے۔ میرا ایک واقف کار شوبزنس رپورٹر ہے۔ میں اسے یہ کام دیتا ہوں۔ تم ایسا کرو دبئی آ جاؤ۔"
رل نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں یہیں رہوں گی۔ اپنے ڈاکٹر کے علاوہ میں کسی اور سے علاج کرانے کا رسک نہیں لے سکتی۔"
زین مایوس ہوا۔ "اوکے... لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ ڈائریکٹر سے تمہاری ایک ملاقات ہو جائے۔ اس صورت میں تمہیں ایک دن کے لیے یہاں آنا ہوگا۔"
"ہاں، ایک دن کے لیے آ سکتی ہوں۔" رل نے جواب دیا۔ "تم اس رپورٹر کو شیرازی اور نینا کے پیچھے لگا دو۔"
"میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔ وہ دونوں واپس یہاں آ گئے ہیں۔ کاش کہ تم پہلے بتا دیتیں تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔"
"مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ شخص اتنے گھٹیا پن پر اتر آئے گا۔"
"شیرازی شروع سے گھٹیا ترین آدمی ہے۔ حیرت ہے تمہیں پانچ سال اس کے ساتھ رہ کر بھی اندازہ نہیں ہوا۔"
رل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شاید اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ پانچ سال شیرازی کے ساتھ کس طرح رہی تھی۔ اس کے اندر اس کے لیے شدید نفرت تھی۔ اس نے دل میں کہا۔ "اب وقت آ گیا ہے کہ میں اس ذلیل شخص کو اس کے کیے کی سزا دے سکوں۔"

☆☆☆

شیرازی کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ پارٹی میں ملٹی نیشنل کمپنی کا ڈائریکٹر جس طرح نینا سے ملا تھا، اس نے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے منتخب کر چکا ہے۔ اس نے نینا کو اپنے بنگلے پر آنے کی دعوت دی تھی۔ نینا شیرازی کے دباؤ کے آگے مجبور تھی لیکن اس کی خوش قسمتی کہ ڈائریکٹر کو اچانک انگلینڈ سے کال آئی کہ اس کی ساس کا صرف پچاسی برس کی عمر میں ناگہانی انتقال ہو گیا ہے اور وہ اسے دل ہی دل میں کوستا نینا سے ملاقات کی حسرت لیے انگلینڈ روانہ ہو گیا۔ اب اس کی واپسی دو ہفتے بعد ہوتی۔ اس نے شیرازی سے کہا کہ ابھی وہ واپس جائے اور دو ہفتے بعد نینا کو لے کر دوبارہ آئے۔ اس وقت تک وہ کمپنی حکام کو راضی کر لے گا کہ رل سے معاہدہ کینسل کر کے نینا سے معاہدہ کر لیا جائے۔ واپس آ کر نینا نے سکون کا سانس لیا تھا کہ خطرہ دو ہفتے کے لیے ٹل گیا تھا۔

☆☆☆

نینا کا باپ کریم چڑچڑا ہو رہا تھا۔ اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا اور اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ اپنے لیے چرس خرید سکے۔ وہ اپنے خیمے سے نکلا کہ شاید کہیں سے کچھ رقم کا بندوبست ہو جائے۔ وہ ڈیرے سے باہر سڑک تک آیا تو ایک خوش پوش آدمی نے اسے پکارا۔ "کریمو..."

وہ ایک طرف ایک چھوٹی کار کے ساتھ کھڑا تھا۔ کریم اس کے پاس چلا آیا۔ "کیا بات ہے، تم میرا نام کیسے جانتے ہو صاحب؟"

"میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے اپنی بیٹی کا سودا کس سے کیا اور کتنا سستا سودا کیا ہے۔" آدمی نے جواب دیا۔ وہ ایک معروف ٹی وی چینل کا شو بزنس رپورٹر راحیل صدیقی تھا۔ زرین سے اس کی پرانی واقفیت تھی اور شاید اسی وجہ سے زرین نے اسے ترجیح دی تھی۔ راحیل صدیقی یہ بات سنتے ہی بے تاب ہو گیا تھا۔ یہ اس کے کیریئر کا سب سے بڑا اسکوپ بن سکتا تھا۔ کریم کا کھوج لگانے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ کریم چونکا۔

"تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟"

"یہ سوال بیکار ہے۔ تم یہ پوچھو کہ میں تمہارے پاس کیوں آیا ہوں؟"

"کیوں آئے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم شیرازی سے مزید دولت کھینچو کیونکہ وہ خود تمہاری بیٹی سے بے پناہ کما رہا ہے۔"

"کما رہا ہے... وہ کیسے؟"

"اس نے اسے ماڈل بنا دیا ہے۔"

"ماڈل... کیا بابو؟"

"وہ جو ٹی وی اور رسالوں میں اشتہاروں میں کام کرتی ہیں انہیں ماڈل کہتے ہیں۔"

کریم ہنسا۔ "کیا کہہ رہے ہو بابو... وہ تو بہت خوب صورت عورتیں ہوتی ہیں۔ نینا تو بالکل عام سی لڑکی ہے۔"

"وہ عام سی لڑکی کیا ہو گئی ہے اگر دیکھنا ہے تو میرے ساتھ چلو۔"

کریم مشکوک تھا لیکن اسے خیال آیا کہ اسے بھلا کسی سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے اس لیے وہ راحیل صدیقی کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ راحیل صدیقی اسے اپنے چینل کے دفتر لایا۔ یہاں اس نے نہایت چالاکی سے کریم کا ایک انٹرویو ریکارڈ کر لیا اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کریم کو ٹی وی پر نینا کے ایڈز دکھائے۔ وہاں بے شمار رسائل تھے جن میں نینا کی تصاویر چھپی تھیں اور ان میں سے بیشتر ایسی تھیں کہ کوئی غیرت مند باپ ہوتا تو ڈوب کر مر جاتا۔ مگر کریم اس نام کی کسی چیز سے واقف نہیں تھا اس لیے وہ صرف ناقابلِ یقین انداز میں دیکھتا رہا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ نہایت حسین نظر آنے والی ماڈل اس کی بدصورت بیٹی ہے۔ اس نے راحیل صدیقی سے کہا۔ "تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے صاحب! یہ نینا نہیں ہے۔"

راحیل صدیقی نے چند تصاویر اس کی طرف بڑھائیں جن میں نینا شیرازی کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ "یہ شیرازی ہے... تم نے اپنی بیٹی اسی کو بیچی تھی نا؟"

"اس کے ساتھ شادی کی تھی۔" کریم نے جلدی سے کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔ تم نے پیسے بھی اسی بات کے لیے تھے اور نکاح نامے پر دستخط بھی خود کیے تھے۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا جناب؟" کریم کا منہ کھل گیا۔

"جیسے دوسری باتوں کا پتا چلا ہے۔" راحیل صدیقی بولا۔ "اسے چھوڑو، اب سوچو کہ تمہیں شیرازی سے مزید رقم وصول کرنی ہے۔"

مزید رقم کے نام پر کریم کی باچھیں کھل اٹھیں۔ "وہ کیسے؟ اگر میں اس کے پاس گیا تو وہ مجھے جھٹلا دے گا۔ نینا بھی بدل گئی ہے، پر یہ ہوا کیسے صاحب...؟"

"دولت سے سب ممکن ہے۔ تمہاری بدصورت بیٹی کے چہرے کی ڈاکٹری ہوئی ہے۔" راحیل صدیقی نے اسے آسان لفظوں میں بتایا۔ "تم نے دیکھا، نینا کتنی خوب صورت ہو گئی ہے اور اب شیرازی اس سے خوب کما رہا ہے۔"

کریم نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا وہ اس سے دھندا کرا رہا ہے؟"

راحیل ہنسا۔ "نہیں، وہ اسی طرح اشتہاروں میں کام کرتی ہے اور اسے لاکھوں کروڑوں روپے ملتے ہیں لیکن وہ سب شیرازی کی جیب میں جاتے ہیں۔"

کریم کا منہ پھر کھل گیا۔ اس کے نزدیک تو لاکھوں کی رقم بھی بہت بڑی تھی اور جب پانچ لاکھ اس کے پاس آئے تو اس نے انہیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھا تھا لیکن یہ حاصل زیادہ دیر اس کے پاس نہیں رہا تھا۔ کروڑ تو اس کے تصور سے بھی دور کوئی رقم تھی۔ اس نے تھوک نگل کر کہا۔ "وہ کیسے صاحب؟"

"یہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم کس طرح شیرازی سے اپنا حصہ وصول کر سکتے ہو۔"

☆☆☆

واپسی کے بعد نینا دوبارہ مقامی فیشن انڈسٹری اور ایڈ کے شوٹ میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس شام ایک بڑا فیشن شو تھا جس میں آنے والے موسم سرما کے لیے ملبوسات کی نمائش کی جا رہی تھی۔ نینا بھی بطور ماڈل شامل تھی۔ پہلے شیرازی نے سوچا تھا کہ انکار کر دے لیکن پھر اسے خیال آیا



کہ معاوضہ اچھا مل رہا ہے۔ نینا فارغ تھی۔ شیرازی نے اس کے نام سے بینک اکاؤنٹ کھلوا لیا تھا اور نینا سے کئی چیک بلینک سائن کر کے لے لیے تھے۔ بہ حیثیت نینا کے پروموٹر... معاوضے کے چیک اس کے پاس ہی آتے تھے اور وہ انہیں جمع کرا کے ہاتھ کے ہاتھ اکاؤنٹ سے نکلوا لیتا تھا۔ احتیاطاً اس نے اے ٹی ایم کارڈ بھی بنوا لیا تھا تاکہ اگر چیک میں کوئی مسئلہ آ جائے تو وہ اے ٹی ایم کی مدد سے رقم نکلوا لے۔ اس نے چند مہینے میں ہی نینا کی مدد سے اتنا کما لیا تھا کہ اس نے اس پر جتنا خرچ کیا تھا، اس سے کچھ زیادہ ہی وصول کر چکا تھا۔ اب وہ جو حاصل کرتا، وہ اس کا نفع ہوتا۔

شیرازی کا خیال تھا کہ قسمت اس پر مہربان تھی۔ ورنہ اس کا خیال تھا کہ اسے نینا پر بہت محنت کرنا پڑے گی مگر اس کی توقع کے خلاف وہ بہت ذہین اور باصلاحیت لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ آنے والے سالوں میں وہ اس کی مدد سے بہت کما سکتا تھا۔ وہ اس شو میں خود بھی موجود تھا۔ جیسے ہی نینا ریمپ پر نمودار ہوئی، وہاں موجود لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ وہی گنے چنے چند سو افراد تھے جو تقریباً ہر فیشن شو میں شریک ہوتے تھے اور ان کے لیے یہ سب معمول کی بات تھی۔ لیکن نینا کی طرف متوجہ ہونا ثابت کر رہا تھا کہ نینا نے انہیں متاثر کیا تھا اور وہ اس کے بارے میں پُرتجسس تھے۔ نینا کے اتنی جلدی اوپر آنے میں جہاں اس کے حسن اور صلاحیت کا عمل دخل تھا، وہیں اس کے دھند میں چھپے پس منظر کا دخل بھی تھا۔ شو بزنس اور میڈیا کے ساتھ دوسرے لوگ بھی اس کے بارے میں پُرتجسس تھے۔ نینا تک ناکام رسائی کے بعد میڈیا نے شیرازی کو بھی کریدنے کی کوشش کی لیکن اس نے مہارت سے انہیں ٹال دیا۔ البتہ وہ اس تجسس پر خوش تھا۔

نینا پہلی واک کے بعد لباس بدلنے چلی گئی۔ اس دوران میں دوسری ماڈلز ریمپ پر آتی رہیں۔ کچھ دیر میں نینا دوبارہ ریمپ پر نمودار ہوئی۔ اس نے بہت خوب صورت فراک سوٹ پہن رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ ریمپ کے درمیان میں پہنچی، ایک بوڑھا اور حلیے سے فقیر نظر آنے والا شخص ایک طرف سے نمودار ہوا اور اس نے چیخ کر کہا۔ "یہ میری بیٹی نینا ہے۔ یہ شخص اسے زبردستی اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔"

اس نے شیرازی کی طرف اشارہ کیا جو کریم کو یہاں دیکھ کر دم بخود تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ بڈھا بھی اس کے سامنے آئے گا۔ فوراً ہی کیمرے کریم کی طرف گھوم

گئے جو چیخ چیخ کر نینا کو اپنی بیٹی قرار دیتے ہوئے دہائی دے رہا تھا کہ شیرازی کے چنگل سے اس کی بیٹی کو نکالا جائے۔ سیکیورٹی والے آگے آئے لیکن اتنی دیر میں وہاں موجود میڈیا کے لوگوں نے کریم کو گھیر لیا تھا اور اسے باہر لے جانے کی کوشش ناکام بنادی۔ نینا دم بخود ریمپ پر کھڑی تھی۔ اس دوران میں کچھ رپورٹرز اس کی اور شیرازی کی طرف بھی آئے تھے۔ شیرازی بھی گم صم کھڑا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس موقع پر کیا کرے۔ ایک میگزین کی رپورٹر لڑکی نے اپنا ریکارڈر شیرازی کے سامنے کیا۔

"شیرازی! کیا یہ شخص ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

اتنی دیر میں شیرازی نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "بہتر ہوگا تم یہ سوال نینا سے کرو۔"

دوسری طرف نینا ساکت کھڑی تھی۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جس نے اسے پانچ لاکھ میں فروخت کیا تھا اور اب اسے پتا چل گیا تھا کہ اسے بہت سستا بیچا گیا۔ کریم اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر التجا تھی کہ وہ اس کے بیان کی تصدیق کردے۔ نینا کو وہ وقت یاد آیا جب وہ اس سے التجا کر رہی تھی کہ وہ زبردستی اس کی شادی نہ کرے اور کریم نے اسے لا کر شیرازی کی گاڑی میں دھکیل دیا تھا۔ آج موقع آیا تھا کہ وہ اپنے باپ کو جواب دے سکے۔ اسے اسی کے سکے میں ادائیگی کرے۔ اس نے سکون سے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم یہ کون ہے اور کیوں مجھے اپنی بیٹی سمجھ رہا ہے۔"

نینا کی تردید کے ساتھ ہی سیکیورٹی والے حرکت میں آگئے اور انہوں نے کریم کو گردن سے پکڑ لیا۔ شیرازی نے سکون کا طویل ترین سانس لیا۔ نینا کے منہ سے نکلنے والا ایک لفظ اسے تباہ کرسکتا تھا لیکن اس نے کریم کو پہچاننے سے انکار کر کے کریم کی چال ناکام بنادی تھی۔ وہ تیزی سے نینا کے پاس آیا۔ اس کا بازو تھام کر آہستہ سے کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔"

اب نینا بھی گھبرائی ہوئی تھی حالانکہ جب اس نے کریم کے منہ پر انکار کا تھپڑ مارا تھا تو وہ پوری طرح پُراعتماد تھی۔ مگر اب اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ اس نے سر ہلایا اور اسٹیج سے اتر کر باہر کی طرف بڑھی۔ شو کی انتظامیہ آڑے آئی لیکن شیرازی نے الٹا انہیں آڑے ہاتھوں لیا اور ناقص سیکیورٹی پر سناتا ہوا نینا کو وہاں سے نکال لے گیا۔

☆☆☆

ہاشم علی ایک ہوٹل میں رات کا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ ڈیوٹی کے دوران نیچے پارکنگ میں گاڑی کے پاس موجود رہتا تھا اور صرف کھانے کے وقت کہیں جاتا تھا۔ وہ صبح نو بجے ڈیوٹی پر پہنچ جاتا تھا اور شام کو جب رمل اسے چھٹی دیتی، تب جاتا تھا۔ اس شام بھی رمل نے اسے سات بجے کال کر کے چھٹی دے دی تھی۔ وہ چابیاں اوپر دے کر چلا گیا۔ ان دنوں وہ اپنے چند جاننے والے مزدور ساتھیوں کے ہمراہ ایک کچی آبادی کے چھوٹے سے مکان میں رہ رہا تھا۔ دو کمروں میں چار افراد رہ رہے تھے۔ دو ہزار کرایہ تھا اور ہزار کے بل آجاتے تھے۔ مکان صاف ستھرا اور پانی، بجلی اور گیس کی سہولت کے ساتھ تھا۔ سب کے حصے میں ساڑھے سات سو روپے آتے تھے۔ ناشتے سے لے کر رات کا کھانا تک وہ باہر ہی کھاتے تھے۔ پاس ہی ہوٹل تھے جہاں ہر طرح کا کھانا مل جاتا تھا۔ ہاشم دوبارہ ڈیرے کی طرف نہیں گیا تھا لیکن اس رات اس نے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے وہاں ٹی وی پر ایک ایسی خبر دیکھی جس نے اسے مجبور کردیا کہ وہ ڈیرے کی طرف جائے۔ وہ اتنی عجلت میں تھا کہ اس نے جلد پہنچنے کے لیے ٹیکسی لی تھی۔ ڈیرے پر پہنچتے ہی اس نے نظر آنے والے پہلے شخص سے کریم کے بارے میں پوچھا۔

"وہ جالی کے ہوٹل پر ہوگا... اور کہاں جاتا ہے اس چرسی نے۔"

جالی کا کچا ہوٹل ڈیرے کے پاس ہی ہائی وے پر تھا۔ ہاشم وہاں پہنچا تو اسے کریم چرس پیتے ہوئے مل گیا۔ وہ ایک طرف درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ مگر وہ اتنا ہوش میں تھا کہ اس نے ہاشم کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ "تو پھر آگیا؟"

"تم جانتے ہو میں کیوں آیا ہوں۔ کل تم نے ٹی وی پر کیا ڈراما کیا تھا؟"

"وہ سب ایک ٹی وی والے کا کام تھا۔ وہی مجھے لے کر..."

"اسے گولی مارو، یہ بتاؤ کہ وہی نینا ہے؟"

"ہاں وہی حرامزادی ہے۔ اس نے صورت بدل لی ہے پر آواز تو نہیں بدل سکتی۔" کریم نے نفرت سے کہا۔ "اپنے باپ کو پہچاننے سے انکار کردیا۔"

ہاشم نے گہری سانس لی۔ "اگر باپ تم جیسا ہو تو اسے باپ ماننے سے انکار کردینا چاہیے۔ اس نے بالکل ٹھیک کیا۔"

کریم حقارت سے ہنسا۔ "تو کیا سمجھتا ہے تُو جائے گا تو وہ تجھے پہچان جائے گی؟ نہیں... وہ تجھے بھی نہیں پہچانے گی۔ وہ بہت اونچی ہوا میں اڑ رہی ہے۔ اب بھول جا



اسے۔"

کریم کی بات نے ہاشم کو چپ کرادیا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر وہاں سے پلٹ آیا۔ کیا واقعی نینا اس کے لیے بھی بدل گئی تھی؟ اب وہ اسے بھی نہیں پہچانے گی؟ یہ سوچ کر ہی اس کا دل ڈوبنے لگا۔

☆☆☆

رمل ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔ گزشتہ روز وہ یہ خبر نہیں دیکھ سکی تھی لیکن آج صبح کی خبروں میں اسے پھر سے شامل کیا گیا تھا۔ رپورٹر راحیل صدیقی کے مطابق نینا نے اپنے باپ کو پہچاننے سے انکار کردیا تھا مگر کریم مصر تھا کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔ اس چینل نے راحیل صدیقی کی وجہ سے یہ خبر اس طرح نشر کی تھی کہ وہ نینا کے خلاف جارہی تھی لیکن باقی چینلز کا رویہ مختلف تھا اور ان چینلز سے شیرازی کا یہ بیان نشر کیا جارہا تھا جس میں اس خبر کو نینا کے خلاف اسکینڈل قرار دیا گیا تھا۔ بہ قول شیرازی کے شوبزنس کی کچھ شخصیات نینا کی اتنی جلدی مقبولیت سے خوفزدہ ہو کر اس کے خلاف اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی تھیں۔ رمل مایوس تھی، اس نے زین کو کال کی اور شکوہ کیا۔

"یہ تو کچھ نہیں ہوا۔"

"راحیل صدیقی نے احمقانہ انداز میں یہ کام کیا۔" زین بھی خفا تھا۔ "وہ پرانا رپورٹر ہے اور مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس اہم ٹپ کو اس طرح استعمال کرے گا۔"

"تم نے دیکھا شیرازی کی ریپوٹیشن اور اچھی ہوگئی ہے۔ تقریباً سارے چینل اس خبر کو نینا کے فیور کے ساتھ دے رہے ہیں۔" رمل بولی۔ "وہاں کی کیا خبر ہے؟"

"یہاں حالات اچھے نہیں ہیں۔" زین نے صاف گوئی سے کہا۔ "تمہیں کسی بری خبر کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ڈائریکٹر ساس کے انتقال پر گیا ہے لیکن وہاں وہ نینا کے لیے کام کر رہا ہے۔"

"لگتا ہے اس کا دل آگیا ہے نینا پر۔" رمل کے لہجے میں تلخی تھی۔ زین نے سرد آہ بھری۔

"کچھ ایسا ہی ہے۔ تم سے معاہدہ میرٹ پر ہوا تھا لیکن یہاں شیرازی نے دوسرا حربہ استعمال کیا ہے۔ میرا خیال ہے، ڈائریکٹر تم سے پہلے بھی خوش نہیں تھا۔"

"ہاں، میں نے اسے گھاس ڈالنے سے انکار کردیا تھا۔"

"بس یہی بات اس کے دل میں اٹک گئی ہوگی۔ اب تمہارے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا اور شیرازی نے بیک ڈور استعمال کیا تو اسے موقع مل گیا۔ میں تو ... کام کر رہا ہوں۔ زین وہ کمپنی کے ڈائریکٹرز میں شامل ہے اور میں ایک عام افسر ہوں... آئی ایم سوری۔" زین کا لہجہ معذرت خواہانہ ہوگیا۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے بغیر کسی لالچ کے مجھے یہ پروجیکٹ دلوایا ہے اور اگر یہ میرے ہاتھ سے نکلتا ہے تو اس میں میرا بھی قصور ہوگا۔"

"نہیں، بغیر لالچ کے تو نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں شیرازی سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ بہرحال، وہ زیادہ خوش قسمت نکلا۔" زین نے سرد آہ بھری۔

رمل نے فون بند کیا تھا کہ اس کی بیل بجی۔ ہاشم کی کال تھی۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے، وہ ڈیوٹی پر آچکا تھا۔ رمل نے کال ریسیو کی۔ "میڈم! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں... نینا کے معاملے میں۔"

رمل اس کے لہجے پر ٹھٹکی تھی لیکن اس نے انکار نہیں کیا۔ "ٹھیک ہے، اوپر آجاؤ۔"

چند منٹ بعد مضطرب ہاشم اس کے سامنے تھا۔ اس نے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ ماڈل نینا ہی اصل نینا ہے؟“

رل نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے لیکن ابھی تک اس کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔ تم نے ٹی وی پر دیکھا تھا؟“

”جی میڈم! آپ نے مجھے بتایا نہیں۔“ ہاشم کے انداز میں شکوہ تھا۔

”میں نے اسی وجہ سے تمہیں نہیں بتایا تھا۔ ایک تو اس کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔“

”تصدیق ہو گئی ہے۔ کریم کا کہنا ہے کہ وہ نینا ہی ہے۔“

رل نے گہری سانس لی۔ ”دوسرے مجھے شبہ ہے کہ وہ ماضی سے سارے ناتے توڑ چکی ہے۔ اگر تم نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو وہ تمہیں بھی پہچاننے سے انکار کر دے گی۔“

”وہ ایسا نہیں کر سکتی۔“ ہاشم نے بے یقینی سے کہا۔ ”میں ایک بار اس سے ضرور ملوں گا۔“

”میرا مشورہ ہے کہ ابھی تم اس سے ملنے سے گریز کرو۔“ رل نے کہا۔ ”شیرازی بہت طاقتور شخص ہے۔ وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”تب میں کیا کروں؟“

”ابھی صبر کرو اور دیکھو شاید حالات تمہارے حق میں بہتر ہو جائیں۔“

ہاشم نے پھر کچھ نہیں کہا اور سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

شیرازی اور نینا ایک ٹی وی شو میں شرکت کر کے واپس جا رہے تھے۔ شیرازی بہت خوش تھا کیونکہ اس شو میں اس نے اپنی پوزیشن صاف کی تھی اور نینا نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ پورے اعتماد سے شو میں میزبان اور لوگوں کا سامنا کرتی رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر تردید کی تھی کہ فیشن شو میں اچانک گھس آنے والے فقیر نما بوڑھے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اسے نہیں جانتی۔ شیرازی نے اس واقعے کے بعد اسے اپنے بنگلے پر بلا لیا تھا۔ شاید وہ ڈر گیا تھا اس لیے نینا کو ہر وقت اپنے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی کامیابی کی کنجی تھی۔ اس نے نینا کو داد دی۔

”تم نے بہت اچھا پرفارم کیا ہے۔“

”میں نے صرف سچ بولا ہے۔ میرا اس شخص سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا باپ اسی دن مر گیا تھا جب اس نے مجھے تمہارے حوالے کیا تھا۔“

”اب مجھے تمہارے لیے کوئی اچھا سا پس منظر بنانا ہو گا... بلکہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ عرصے بعد ہم ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے جائیں گے۔ پھر کسی کو تمہارے بارے میں بتانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔“

”مجھے رل حیات کی جگہ کام مل جائے گا۔“ نینا نے کہا۔ ”اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

شیرازی چونکا۔ ”اس کے ساتھ... ایک حادثہ پیش آیا تھا جس سے اس کا چہرہ متاثر ہوا ہے۔“

”اس لیے تم نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔“

اس نے نینا کو گھورا۔ ”تو رل نے کیا کیا تھا... اس نے بھی تو موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔“

نینا گاڑی سے باہر گزرتی روشنیاں دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ فائدہ شیرازی اٹھا رہا ہے۔ اچانک اس کی نظر برابر میں چلتی کار کی طرف گئی اور وہ چونک گئی۔

☆☆☆

رل کلینک جانے کے لیے نیچے آئی تو ہاشم کار کے پاس اس کا منتظر تھا۔ وہ اداس دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً اسے نینا کا خیال آ رہا تھا۔ رل اس سے ہمدردی محسوس کر رہی تھی لیکن وہ اس کے لیے کیا کر سکتی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا۔ اگر وہ نینا سے کسی طرح رابطہ کرے اور اسے ہاشم کے بارے میں بتا کر اس کا ردِعمل دیکھے... اگر وہ ہاشم کے لیے اب بھی اپنے دل میں کوئی گنجائش رکھتی تھی تو بات آگے بڑھ سکتی تھی۔ اس نے سوچ کر یہی بات ہاشم سے کہی تو وہ خوش ہو گیا۔ ”میڈم! آپ کا مجھ پر احسان ہو گا۔ ایک بار مجھے معلوم ہو جائے کہ نینا مجھ سے اب بھی محبت کرتی ہے یا...“

”اگر اس نے انکار کر دیا تب؟“

ہاشم نے گہری سانس لی۔ ”تب میں اسے اپنی قسمت سمجھ کر اس سے دور رہوں گا۔“

”اگرچہ یہ بہت مشکل ہے کیونکہ وہ شیرازی جیسے آدمی کے چنگل میں ہے اور وہ کسی سے بھی اسے آزادی سے ملنے نہیں دیتا ہے۔ پھر بھی میں صرف تمہاری خاطر کوشش کروں گی۔“

”میں ساری عمر آپ کا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔“

کلینک پر ڈاکٹر شفقت رل کا منتظر تھا۔ زخم کی صفائی کا مرحلہ اب تک تکلیف دہ تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ تکلیف کم ہوتی جا رہی تھی یا وہ عادی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر شفقت نے زخم سے پٹی ہٹا کر معائنہ کیا اور بولا۔ ”کنڈیشن بہتر ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے اب ایک مہینا اور لگے گا۔“

”نشان تو نہیں پڑے گا؟“

”نہیں پڑے گا۔“ ڈاکٹر شفقت نے یقین سے کہا۔ ”اتنا طویل اور مشکل علاج اسی وجہ سے کرنا پڑ رہا ہے انشاء اللہ بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔“

ڈیڑھ گھنٹے بعد رل واپس آئی اور وہ فلیٹ جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ ہاشم اب خوش تھا اور پہلے کی طرح اداس نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے رل سے کہا۔ ”میڈم! اگر نینا نے انکار بھی کر دیا، تب بھی میں خوش ہوں گا کیونکہ مجھے اس کی خوشی زیادہ عزیز ہے۔“

”اگر اس میں ذرا بھی عقل اور سمجھ باقی ہوگی تو وہ تم جیسے اچھے آدمی سے کبھی دور نہیں ہوگی۔“

وہ اس وقت ساحل کی طرف جانے والی ایک معروف سڑک سے گزر رہے تھے۔ ایک کار ان کی کار کے برابر میں آگئی۔ ہاشم ٹریفک کی طرف متوجہ تھا پھر وہ ایک لمحے کے لیے اس کار کی طرف متوجہ ہوا اور اسی لمحے کار لہرائی۔ رل ہل گئی۔

”کیا ہوا؟“

”میڈم۔“ ہاشم پُرجوش لہجے میں بولا۔ ”ابھی برابر سے جو کار نکلی ہے اس میں نینا ہے۔ وہ اسی کے ساتھ بیٹھی ہے۔“

رل نے اچک کر آگے دیکھا اور اسے شیرازی کی میرون کرولا شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے تصدیق کی۔ ”ہاں یہ اسی کی کار ہے۔ تمہیں یقین ہے اس میں نینا بھی تھی؟“

”جی میڈم! میں نے خود دیکھا ہے اور اس نے بھی مجھے دیکھا تھا وہ پلٹ کر اسے کچھ کہہ رہی تھی پھر کار آگے نکل گئی۔“

”اس کا پیچھا کرو۔“ رل نے اضطراری لہجے میں کہا۔ اس نے یہ حکم سوچے سمجھے بغیر دیا تھا۔ ہاشم نے کار آگے بڑھانے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے وہ سست لین میں تھا جبکہ شیرازی کی کار فاسٹ لین میں تھی اس لیے وہ جلدی آگے نکل گئی۔ گاڑیوں کا تسلسل ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اس لیے ہاشم کو بڑی دیر بعد فاسٹ لین میں آنے کا موقع ملا اور اتنی دیر میں میرون کرولا بہت آگے نکل گئی تھی۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں رل کو اطلاع دی۔ ”میڈم وہ آگے نکل گیا ہے۔“

”تم چلتے رہو، میں اس کے گھر سے واقف ہوں۔“

☆☆☆

”ہاشم۔“ نینا کے منہ سے نکلا۔

## بیوی

ایک بے حد موٹی بیوی کا شوہر بہت دبلا پتلا تھا۔ دونوں کی اکثر لڑائی رہتی تھی۔ محلے والے تنگ آ گئے۔ ایک روز محلے کے چند افراد جمع ہوئے کہ انہیں نصیحت کریں۔

ان میں سے ایک نے کہا۔

”میاں بیوی کو پیار و محبت سے رہنا چاہیے کیونکہ دونوں گاڑی کے پہیوں کے مانند ہیں۔“

”اسکوٹر اور ٹریکٹر کے ٹائر سے آخر گاڑی کیسے چل سکتی ہے؟“ یہ سن کر شوہر بولا۔

(محمد طٰہٰ رحمانی، ملتان)

”کیا...؟“ شیرازی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا کہا تم نے؟“

”ہاشم... برابر والی کار میں ہاشم ہے۔“ نینا ہذیانی انداز میں بولی۔

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں نے خود دیکھا ہے۔ میں ہاشم کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتی۔“

”بکواس مت کرو۔“ یک دم شیرازی نے غرا کر کہا۔ ”اگر وہ ہاشم ہے، تب بھی تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تعلق ہے۔“ نینا چلائی تو شیرازی نے اسے تھپڑ مارا۔ اس نے زیادہ قوت صرف نہیں کی تھی اور بچا کر مارا تھا، اس کے باوجود نینا کا سر گھوم گیا اور ایک لمحے کو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ حواس بحال ہونے پر اس نے پلٹ کر دیکھا لیکن رات کی تاریکی اور گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی چکا چوند میں اسے وہ گاڑی دکھائی نہیں دی۔ درحقیقت اس نے گاڑی پر غور ہی نہیں کیا تھا، اس نے تو صرف ہاشم کو دیکھا تھا۔ شیرازی ہونٹ بھینچ کر ڈرائیو کر رہا تھا اور کار کی رفتار تیز کر دی تھی۔ اب نینا سہمی بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ بنگلے کے سامنے پہنچ گئے۔ ہارن کے جواب میں ملازم نے آ کر گیٹ کھولا اور وہ گاڑی اندر لے گیا۔ پورچ میں گاڑی روک کر اس نے نینا کو اترنے کو کہا لیکن جب وہ بیٹھی آنسو بہاتی رہی

تو شیرازی نے اسے کھینچ کر اتارا اور گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ اپنے بیڈ روم میں لے جا کر اس نے ہاتھ گھما کر نینا کو بیڈ پر پھینک دیا اور گرج کر بولا۔

''چپ ہو جاؤ اور ٹسوے بہانا بند کرو۔''

''پلیز۔'' نینا نے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہاشم ہی تھا۔''

شیرازی اس کی طرف جھکا اور اس کے کھل جانے والے بال مٹھی میں جکڑ کر غرایا۔ ''اب اس کا نام بھی مت لینا... تم میری بیوی ہو، یہ بات مت بھولا کرو۔''

نینا کراہنے لگی۔ اس کے بال جیسے اکھڑے جا رہے تھے۔ شیرازی نے ایک جھٹکا دے کر اسے چھوڑ دیا۔ نینا نے جدید فیشن کی چھوٹی سی ٹی شرٹ اور اسکن فٹ جینز پہن رکھی تھی۔ اگرچہ رونے اور تکلیف سے اس کا حلیہ خراب ہوا تھا مگر پھر بھی وہ بہت دلکش اور حسین لگ رہی تھی۔ شیرازی نے اسے غور سے دیکھا تو اس کا موڈ پھر بدل گیا۔ نینا سہمی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ہمیشہ سہم جاتی تھی اور جب شیرازی اسے یوں دیکھتا تھا تو اس کا دل چاہتا کہ وہ ان نظروں سے بچ کر کہیں بھاگ جائے۔ اس وقت شیرازی کی آنکھیں کسی بھیڑیے جیسی ہو جاتی تھیں جس نے کوئی میمنہ دیکھ لیا ہو۔ نینا نے جلدی سے اٹھتے ہوئے اپنی اوپر ہو جانے والی شرٹ درست کی۔ شیرازی اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ ''تم اچھی لگ رہی ہو۔ سوری! مجھے غصہ آ گیا تھا۔ آؤ، میرے پاس آؤ۔''

نینا ہچکچائی تو شیرازی نے خود کھینچ کر اسے اپنے پاس کر لیا۔ رویے کے مقابلے میں اس کا لہجہ نرم تھا۔ ''جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تو اس وقت میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ تم اتنی بدل جاؤ گی اور اتنی خوب صورت ہو جاؤ گی۔''

شیرازی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ کسمسا گئی پھر اس نے شانہ جھٹک کر اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ اگلی بار شیرازی نے اس کی... ٹانگ پر ہاتھ رکھا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے سرکی لیکن شیرازی نے اسے موقع نہیں دیا۔ اس نے نینا کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور آواز کی نرمی بھی غائب ہو گئی۔ وہ کسی درندے کی طرح غرایا۔ ''یہ مت بھولو تم میری بیوی بھی ہو اور میں چاہوں تو ابھی اپنا حق بھی استعمال کر سکتا ہوں۔''

''میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔'' نینا سرکش لہجے میں بولی۔ وہ خود کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ ''جو نکاح نامہ تمہارے پاس ہے، اس پر میرے سائن نہیں ہیں۔''

''تمہارے نہیں ہیں لیکن تمہارے باپ کے تو ہیں جسے میں نے پانچ لاکھ روپے دیے تھے۔''

''تب اسی کے پاس جاؤ۔'' نینا بولی۔ ''تم نے مجھ سے کہا تھا جیسے تم چاہو گے میں ویسا کروں گی... تو تم مجھے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔ کیا تم بھول گئے ہو؟''

''وعدہ تو کیا تھا لیکن تم ایسی ہو گئی ہو کہ میرا وعدہ توڑنے کو دل چاہ رہا ہے۔'' شیرازی نے للچائے ہوئے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے، تب میں شو بزنس چھوڑ دوں گی اور صرف بیوی بن کر رہوں گی۔'' نینا نے مزاحمت جاری رکھی۔ ممکن ہے کوئی اور وقت ہوتا تو شیرازی یہ بات سن کر اسے چھوڑ دیتا لیکن اس وقت اس پر شیطان سوار تھا۔ اس نے کہا۔ ''کیوں، جب تم اس گورے کے لیے مان سکتی ہو تو مجھے کیوں روک رہی ہو؟''

''اس کے لیے تم نے مجھے مجبور کیا تھا۔'' نینا بولی۔

''تو اب بھی میں مجبور کر رہا ہوں... مان جاؤ۔'' شیرازی ہانپنے لگا۔ کثرتِ شراب نوشی نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ نینا عورت ہونے کے باوجود فٹ اور مضبوط تھی۔ وہ اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ شیرازی نے غصے میں اسے بستر پر پٹخ کر تھپڑ مارا۔ نینا زور سے چلائی مگر دوسرے تھپڑ کے بعد اس کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ کمرا اور روشنیاں اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ شیرازی اس پر حاوی ہو گیا۔

☆☆☆

رل نے شیرازی کے بنگلے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اس کا بنگلا ہے۔''

ہاشم نے سڑک کے دوسری طرف کار روک دی۔ گیٹ کے پاس پورچ میں میرون کرولا دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر رل سے کہا۔ ''وہ اندر ہی ہے۔''

''ہاشم! تمہیں یقین ہے کہ وہ نینا ہی تھی؟''

''اتنا یقین جتنا اپنے زندہ ہونے کا یقین ہے۔'' ہاشم نے کہا اور کار سے اترنے لگا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''میں نینا سے ابھی ملوں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ وہ مجھ سے اب بھی محبت کرتی ہے یا نہیں؟''

''ہاشم! رک جاؤ۔ اس طرح جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ شیرازی تمہیں نینا سے نہیں ملنے دے گا۔''





''میں چھپ کر جاؤں گا۔ اسے پتا نہیں چلے گا۔'' ہاشم نے کہا۔ ''اگر میں پکڑا جاؤں تو آپ خاموشی سے چلی جایئے گا۔ میں آپ کا نام نہیں لوں گا۔''

''ہاشم! میری بات سنو...'' رل نے اسے روکنا چاہا لیکن اتنی دیر میں وہ سڑک کراس کر کے بنگلے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ہاشم گیٹ کے پاس پہنچا۔ اس نے آس پاس دیکھا اور پہلے چھوٹا گیٹ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اب اس کے پاس سوائے گیٹ پھلانگنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے گلی سنسان تھی اور کسی نے اسے گیٹ پھلانگتے نہیں دیکھا۔ اندر جاتے ہی ہاشم نے چھوٹا گیٹ کھول کر گاڑی کی طرف دیکھا اور پھر اندر بڑھ گیا۔ اس وقت چوکیدار نہ جانے کہاں تھا کوئی ملازم وغیرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا پورچ کے پاس پہنچا تھا کہ ایک نسوانی چیخ سنائی دی اور اس نے نینا کی آواز پہچان لی۔ وہ تڑپ گیا۔ اس کے ساتھ کوئی ظلم ہو رہا تھا۔ آواز اوپر والے فلور سے آئی تھی۔ ہاشم نے آس پاس دیکھا۔ ایک سخت شاخوں اور مضبوط تنے والی بیل ستون کے ساتھ اوپر چڑھ رہی تھی۔ ہاشم نے اس کے تنے کو گرفت میں لیا اور اوپر جانے لگا۔ ذرا دیر میں وہ اوپر بالکونی میں تھا۔ اس نے کھڑکی سے اندر جھانکا۔

نینا بستر پر بے سدھ پڑی تھی اور شیرازی پاس بیٹھا اسے شیطانی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھایا... تو ہاشم تڑپ کر حرکت میں آیا۔ اس نے بالکونی کی طرف کھلنے والے دروازے کو دھکا دیا اور اندر گھس گیا۔ ہاشم کا خون رگوں میں ابل رہا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی شیرازی پر چھلانگ لگائی اور اسے لیتا ہوا بستر سے دوسری طرف جا گرا۔ وہ اندھا دھند ہاتھ چلا رہا تھا۔ مگر اناڑی پن کی وجہ سے اس کے بیشتر وار خالی جا رہے تھے۔ اگر وہ ذرا سنبھل کر وار کرتا تو شیرازی اس کے چند تھپڑ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ہاشم کے جذباتی طرزِ عمل کی وجہ سے اسے سنبھلنے کا موقع مل گیا اور اس نے کوشش کر کے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ ہاشم قالین پر گرا اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، شیرازی نے ماربل کی بھاری ایش ٹرے پھینک کر ماری جو سیدھی ہاشم کے سر پر لگی اور وہ اٹھتے ہوئے چکرا کر دوبارہ گر گیا۔ شیرازی تیزی سے الماری کی طرف لپکا اور اس نے اندر سے ریوالور نکال لیا۔ اس دوران میں ہاشم ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن اس کا جسم ڈول رہا تھا۔ ضرب سخت تھی اور وہ خود پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شیرازی نے دانت پیس کر اسے چند ناقابلِ بیان گالیاں دیں اور بولا۔ ''اچھا ہوا تم خود کتے کی موت مرنے یہاں چلے آئے۔ تمہیں مار کر میں پولیس کو بتاؤں گا کہ تم چوری کی نیت سے آئے تھے اور میں نے تمہیں شوٹ کر دیا۔''

شیرازی نے کہتے ہوئے گولی چلا دی۔ مگر اسی لمحے وہی ایش ٹرے اس کے سر سے ٹکرائی اور گولی نہ جانے کہاں چلی گئی... شیرازی چکرا کر گرا اور نینا نے دوسری بار اس کے سر پر ضرب لگا کر اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ پھر وہ ہاشم کی طرف لپکی۔ وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی اور پھر سہارا دے کر اسے نیچے بٹھایا۔ ''ہاشم! تو ٹھیک ہے نا؟'' نینا نے گلوگیر لہجے میں کہا تو ہاشم نے جان لیا کہ اس نے محبت کی بازی جیت لی ہے۔

☆☆☆

رل بے چین تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ہاشم نے اس طرح جا کر غلطی کی ہے۔ وہ پکڑا جائے گا اور جیل کی ہوا کھائے گا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے اپنا پرس اٹھایا اور کار سے اتر کر بنگلے کی طرف بڑھی۔ ہاشم چھوٹا گیٹ کھول گیا تھا اس لیے اسے اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ پورچ تک آئی تھی کہ اسے فائر کی دبی ہوئی آواز سنائی دی۔ فائر اوپر ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اندر آئی تو بدحواس ملازم وہاں موجود تھا۔ یقیناً اس نے بھی فائر کی آواز سن لی تھی۔ اسے دیکھتے ہی رل نے پرس سے پستول نکال لیا۔ حملے کے بعد وہ مستقل پستول رکھنے لگی تھی۔ اس نے پستول کا رخ ملازم کی طرف کر دیا۔ ''شیرازی کہاں ہے؟ کوٹھی میں اور کتنے لوگ ہیں؟''

''بس میں ہی ہوں جی۔'' وہ لرزتی آواز میں بولا۔ ''صاحب اوپر ہیں۔''

رل جانتی تھی کہ اوپر شیرازی کا بیڈ روم کہاں ہے۔ وہ اوپر آئی اور اس نے آہستہ سے بیڈ روم کا دروازہ کھولا تو نینا ہاشم کو بازوؤں میں سمیٹے بیٹھی نظر آئی۔ رل کا دل دھڑک اٹھا۔ کیا شیرازی نے ہاشم کو شوٹ کر دیا تھا اور وہ خود کہاں تھا؟ رل نے دروازے کو مزید کھولا۔ اسے شیرازی نظر آ گیا۔ وہ فرش پر دراز تھا اور بظاہر ساکت تھا لیکن پھر رل کی نظر اس کے ریوالور والے ہاتھ پر گئی۔ وہ کسی سانپ کی طرح آہستہ سے حرکت کر رہا تھا جیسے بے خبری میں ڈسنا چاہتا ہو۔ پھر اس نے ریوالور نینا اور ہاشم کی طرف کیا۔ رل عجلت میں حرکت میں آئی اور اس نے شیرازی کے ہاتھ کا نشانہ لے

کر گولی چلادی نشانہ ٹھیک لگا اور گولی نے شیرازی کی ہتھیلی میں سوراخ کر دیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ کراہ کر رہ گیا۔

"بس، اب حرکت مت کرنا۔" رِل اندر آتے ہوئے بولی۔ فائر کی آواز نے نینا اور ہاشم کو چونکا دیا تھا۔ ہاشم کی حالت بہتر تھی۔ وہ اٹھ گیا۔

"میڈم! نینا مجھ سے اب بھی محبت کرتی ہے۔"

نینا شرما گئی۔ "میں ہر روز دعا کرتی تھی کہ کہیں سے تو آجائے۔"

شیرازی اٹھ بیٹھا تھا اور اس نے اپنے ہاتھ پر رومال باندھ لیا تھا۔ رِل کی مستعدی اور نشانے کو دیکھتے ہوئے اس نے دوبارہ ریوالور اٹھانے کی جرأت نہیں کی لیکن وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"ہاں، مجھے تمہارے شیطانی سر میں سوراخ کرنا چاہیے تھا جس میں بڑا شیطانی دماغ ہے۔" رِل نے اعتراف کیا۔

"اس شخص نے ٹریس پاس کیا ہے۔" شیرازی نے ہاشم کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اسے جیل میں سڑ ھا دوں گا۔"

"اچھا۔" رِل نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟ اور یہ میرا ڈرائیور ہے۔ میں پولیس کو بتاؤں گی کہ یہ میرے ساتھ تھا۔"

ہاشم پولیس کا سن کر گھبرا گیا۔ اس نے رِل سے کہا۔ "میڈم! یہاں سے چلیں... چلو نینا۔"

"تم لوگ دفع ہو جاؤ لیکن نینا نہیں جائے گی۔" شیرازی غرایا۔ "یہ میری بیوی ہے۔"

"تمہارے پاس نکاح نامہ ہے، اسے لے کر عدالت میں آجانا۔" رِل نے کہا اور پستول کا رخ اس کی طرف کیے ہوئے دروازے کے پاس آئی۔ اس نے ہاشم سے کہا۔ "ریوالور اٹھالو۔"

ہاشم نے ریوالور اٹھالیا۔ شیرازی بے بس سانپ کی طرح تلملا رہا تھا مگر دو ہتھیاروں کے سامنے بے بس تھا۔ وہ اسے کمرے میں چھوڑ کر نیچے اتر آئے۔ نینا سہمی ہوئی تھی اور اس نے یوں ہاشم کا ہاتھ تھام رکھا تھا جیسے ہاتھ چھوٹا تو وہ اس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائے گا۔ رِل نے نینا سے کہا۔ "اپنی تمام چیزیں اور کاغذات لے لو۔"

☆☆☆

دو ہفتے بعد رِل دبئی میں تھی۔ اس کے زخم تقریباً بھر چکے تھے اور ڈاکٹر شفقت نے اسے مکمل طور پر صاف کر دیا تھا۔ اس نے ایک کریم دی تھی جس کے مسلسل استعمال سے جلد کا داغ بھی مٹ جاتا اور وہ پہلے کی طرح ہو جاتی۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں تھی۔ یہاں بھی شیشے کی دیوار کے پاس دبئی کا خوب صورت ساحل اور بہت نیلا سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ رِل نے زین کو کال کی۔ "میں دبئی آگئی ہوں۔"

"شکر ہے، یہاں معاملات ٹھیک ہو رہے ہیں کیونکہ شیرازی نے نینا کے لیے انکار کر دیا ہے۔"

"اسے انکار کرنا ہی تھا۔" رِل معنی خیز لہجے میں بولی۔ "کیونکہ نینا اس کے پاس نہیں ہے۔"

"تمہارا معاہدہ بچ گیا ہے۔"

"نہیں، اب میں اسے منسوخ کر رہی ہوں۔" رِل نے کہا۔ "میں دیے جانے والے معاوضے سے مطمئن نہیں ہوں۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" زین چونک گیا۔

"ہاں کمپنی کو بتادو کہ اگر وہ مزید دس کروڑ روپے کی ادائیگی کرتی ہے تو معاہدہ برقرار رہے گا ورنہ اسے منسوخ سمجھا جائے۔" رِل نے کہا اور کال کاٹ دی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ لوگ اب کسی صورت اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔ وہ دس کروڑ اوپر سے ادا کریں گے اور یہ رقم وہ نینا اور ہاشم کو دے گی تاکہ وہ اپنا مستقبل سنوار سکیں۔ نینا نے شوبزنس کی دنیا کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ رِل انہیں اپنے ساتھ دبئی لے آئی تھی۔ وہ ایمل کو بھی ساتھ لے آئی تھی۔ اب اس کی حالت بہتر تھی اور وہ دبئی کے بدلے ہوئے ماحول میں خوش تھی۔ ایمل بھی شیرازی کی ڈسی ہوئی تھی۔ وہ ایک دن بہن سے ملنے آئی تھی۔ رِل ان دنوں شیرازی کے ساتھ رہ رہی تھی اور وہ شوٹ پر گئی تھی۔ اس کی عدم موجودگی میں شیرازی نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ایمل کو بے آبرو کر دیا تھا۔ تب سے وہ خوف کے سائے میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ اسے دورے پڑنے لگے تھے اور راتوں کو خوفناک خواب اسے چیخنے چلانے پر مجبور کرتے تھے۔ ڈاکٹر افتخار کے علاج سے وہ بہتر ہوئی تھی۔ رِل کو امید تھی کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی اور نارمل زندگی بسر کرے گی۔ خود اپنے بارے میں اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ ابھی اس کے پاس کچھ وقت تھا اور وہ اسے شوبزنس کے حوالے کرنا چاہتی تھی۔ جب اس کا سورج ڈھل جاتا، تب وہ سوچتی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ نینا اور ہاشم کے ہوتے ہوئے اسے ایمل کی بھی فکر نہیں تھی۔ وہ اس کی دیکھ بھال کر سکتے تھے۔ اس کے خیال میں شیرازی کے لیے یہ سزا کافی تھی کہ وہ بزعم خود جن ماڈلز کا تخلیق کار بنا تھا، وہی اس کے منہ پر جوتا مار کر چلی گئیں۔

(!)